دھوپ کی تیزی اور گرمی سے بچنے
ٹھنڈک حاصل کرنے اور آنکھوں کی
حفاظت کیلئے ہمارے گوگلس استعمال کیجئے

ہر بات کو بہتر طور پر سننے
اور بہرے پن سے بچنے کیلئے
آپ ہمارے "ہیرنگ ایڈ" پر بھروسہ کیجئے
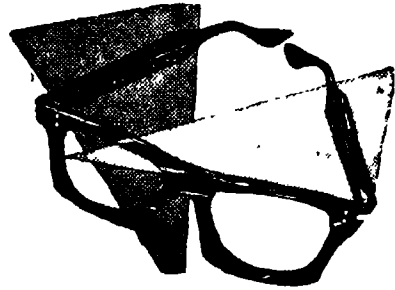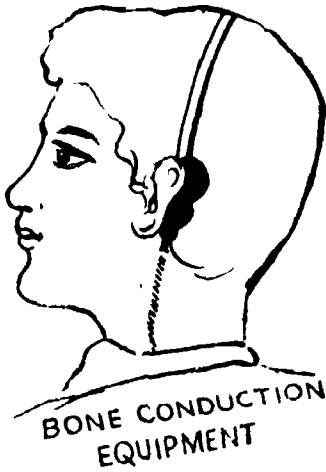
★ نسخے کے مطابق چشمہ کی تیاری کی گارنٹی

★ مردوں اور عورتوں کیلئے نئے اور خوبصورت فریم

★ سنیما پروجکٹر اور فوٹو کیمرہ شیشے

★ دیدہ زیب گوگلس اور عینک کے دوسرے سامانوں کیلئے

برائے مہربانی ہمیں یاد رکھئے

اشوک اوپٹیکل ورکس (سائنٹفک عینک ساز)

مراد پور پٹنہ - ۴
فون نمبر 23652

ہزاری باغ روڈ - رانچی

علی عباس حسینی
ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہینگے

علی عباس حسینی
بیگم حسینی اور صاحبزادیاں - گیتی آرا حسینی، نازش حسینی

شعاع مہر درخشاں

مہدی عباس حسینی

باقر عباس حسینی

گیتی آرا حسینی←

←کشور زیدی

چراغ

علی عباس حسینی

چراغ افروز

مولانا سید محمد صالح مرحوم (اور انکے والد ماجد)

ایک فنکار ـــ ایک معلم

فنکار صرف فن کی تخلیق ہی نہیں کرتا بلکہ نسلوں کی تعلیم و تہذیب کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے
علی عباس حسینی' حسین آباد ہائر سکنڈری اسکول کے یوم یو ۔ این ۔ او کی تقریب میں

جب آتش جواں تھا
علی عباس حسینی ۱۹۲۰ء میں
نواب زادہ سید محمد مہدی
کیساتھہ

دن جوانی کے گئے موسم پیری آیا
علی عباس حسینی ۱۹۶۵ میں وفا ملک پوری کیساتھہ

فراق گورکھپوری

جمیل مظہری

→ سید احتشام حسین

سہیل عظیم آبادی ←

ڈاکٹر اختر اورینوی

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

ڈاکٹر شکیل الرحمن

ڈاکٹر احراز نقوی

علی جواد زیدی

شمیم کرہانی

نادم سیتا پوری
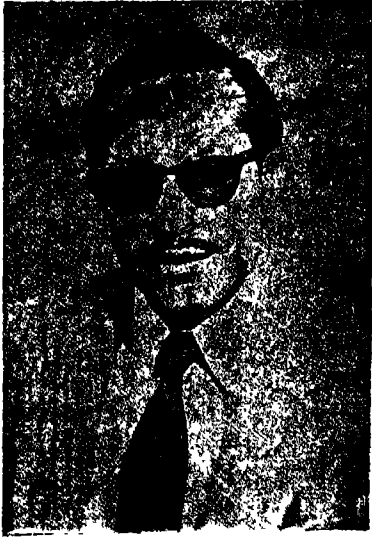
اظہر علی فاروقی

ڈاکٹر سلام سندیلوی
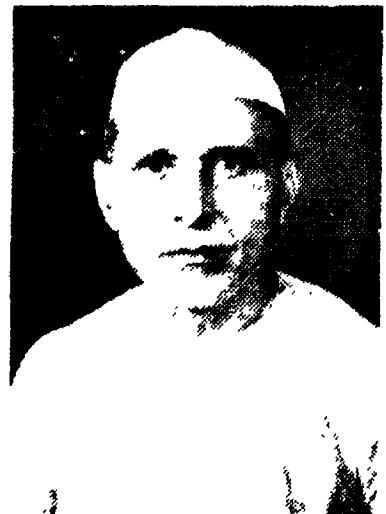
سالک لکھنوی

سید کلب مصطفےٰ

رام لعل

علی عباس حسینی

نذر امام

غالب امام

مظہر امام

شمیم حنفی
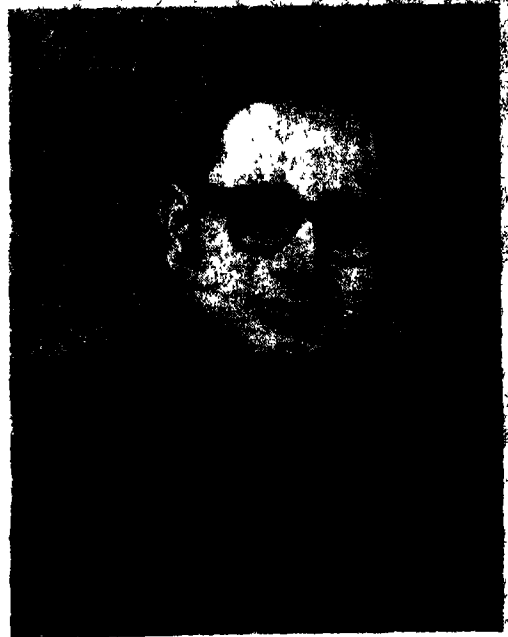
ہوش عظیم ابادی

رفو گران قبائے بہار ہیں ہم لوگ

علیم‌اللہ حالی　　وفا ملک پوری　　کلام حیدری

(مدیران صبح نو)

صحت مند ادبی قدروں کا علمبردار

جلد ۱۲ ○ (جاری شدہ ۱۹۵۲) ○ شمارہ ۱، ۲، ۳

علی عباس حسینی نمبر

۱۹۶۵ء

○ مرتبین ○

وفا ملک پوری • کلام حیدری • علیم اللہ حالی

اس شمارہ کی قیمت
تین روپے پچاس پیسے

پتہ
ماہنامہ صبح نو۔ پوسٹ بکس ۱۶، پٹنہ ۴

زر سالانہ
سات روپے

حکومت بہار کی طرف سے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

اے اے رضوی پرنٹر و پبلشر نے نیبل لیتھو پریس، پٹنہ میں چھپوا کر
دفتر صبح نو قطب الدین لین، پٹنہ ۴ سے شائع کیا۔

نشانِ راہ

نذرانے

126 ۔8.92

خط و خال

فکر و خیال

چشمِ آئینہ نگر

(حسینی صاحب خود اپنی نگاہ میں)

متاعِ جلوہ

(تخلیقات کا انتخاب)

پیمانۂ ذوقِ تحسین

(پیغامات)

تصویریں :-

راہِ سخن

علی عباس حسینی نمبر کا اعلان کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ جیسے ہم نے خود کو کسی کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے اور ایسا لگا کہ جیسے بارہ برس میں صبح نو نے جو بھی عزت کمائی تھی اُسے داؤں پر لگا دیا ہے صبح نو کی نیک نامی کے علاوہ اور ہمارے پاس کون سا بینک بیلنس تھا جس سے تقویت ہوتی اور اس نیک نامی کے بھی درپے دوستوں دشمنوں کی کمی نہ تھی، ہم نے تو اس مصلحت وقت کو بھی ملحوظ نہ رکھا کہ علی عباس حسینی کی بجائے کسی ایسی شخصیت پر نمبر شایع کرتے جو بڑے بڑے افسروں کے دوست ہوتے۔ جن کے ہاتھوں میں معزز نوکریوں کی بجائیاں ہوتیں کہ کم از کم اس طور پر ہزار پانچ سو کاپیوں کے پیسے پیشگی مل جاتے یا اشاعت کے بعد فروخت ہونے کا یقین ہوتا، مگر ہم تو محض اعتراف کمال کے طور پر اور اپنے سالانہ خریداروں کے لئے نمبر شایع کر رہے ہیں جن سے تو ہمیں بس وہی ملے گا جو بارہ عام نمبروں کے عوض ملتا ہے

علی عباس حسینی جیسے تاریخ ساز ادیب و نقاد کے لئے اُردو کے دوسرے کسی ایسے ادارہ کو نمبر نکالنا تھا جو مالی اعتبار سے مطمئن ہے، مگر ایسے اداروں کی نظر علی عباس حسینی پر کیوں پڑے۔ کیا سنسنی خیز جنسی اور جاسوسی ناولوں سے کمائے ہوئے پیسے اس لئے ہیں کہ ان کو برباد کیا جائے؟ علی عباس حسینی نے تو اُردو ادب کو اپنا خون جگر دیا ہے، انہوں نے بزنس کہاں کیا ہے؟ اور جب انہوں نے خون جگر دے کر اردو ادب کی آبیاری کی ہے تو انہیں اس بات کا حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ ان پر کوئی نفع اندوز کام کرنے والا اپنے پیسے ضائع کرے۔

نفع و نقصان کے اسرار و رموز سے ناواقف صبح نو نے علی عباس حسینی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کر کے یہ قلبی طمانیت تو ضرور محسوس کی کہ وہ ایک ایسی شخصیت سے متعلق نمبر شایع کر رہا ہے جس کا نام اور کام اردو ادب کی تاریخ میں ایک وقار اور وزن رکھتا ہے، مگر یہ تشویش بھی ساتھ ساتھ رہی کہ ایسی شخصیت کے شایان شان نمبر ہو سکے گا یا نہیں اور اب کہ تین سو صفحات پر مشتمل یہ نمبر مرتب کیا جا چکا ہے تو ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم اپنے حوصلے کے مطابق کام نہیں کر سکے ہیں، ہمارے ذہن میں جس شان و شکوہ کے نمبر کا تصور آتا ہے وہ بے مائیگی کی نذر ہو گیا۔

تو کیا ہم ایک عظیم فن کار کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں؟ کیا ہم اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے ہیں؟

ہم اپنے حوصلہ اور معیار کے پیش نظر جب اس نمبر کو دیکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ابھی حسینی صاحب کا قرض ادا نہیں ہوا ہے، لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ہم نے علی عباس حسینی پر کام کی ابتدا کی ہے۔ یہ نمبر پورے طور پر ان کے فن کی نقد و تفسیر نہیں کرتا مگر کیا سنگ بنیاد کی اہمیت سے کبھی بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔؟؟ کیا قطب مینار کی رفعت و جلال، تاج محل کے حسن و عظمت اور دیوار چین کی وسعت و رفتار میں ان کی بنیادوں کو کوئی دخل نہیں؟

بڑا کام ہمیشہ بڑی مدت میں ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ روم کی تعمیر ایک دن میں نہیں ہوئی تھی، کون جانے کہ تخلیق عالم میں "ہو جا" اور "ہو گیا" کے درمیان کتنی وسیع مدت تھی۔ ارتقا کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن اس سے خالق کی اولین تخلیق کی عظمت پر کیا حرف آتا ہے، علی عباس حسینی پر آئندہ بہت کام ہوگا۔۔ بہت کام ہونا چاہئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ کوشش راہبر بنے گی، ہمارا یہ نمبر ایک نمونہ ہوگا جس کو سامنے رکھ کر لوگ بہتر نمونے بنانے کی کوشش کریں گے۔

زندگی کے ہر معاملہ میں ہم غیر ضروری رسوم و رواج کی مخالفت کرتے رہے ہیں مگر آج جب ہم ان حضرات کا جنھوں نے اس نمبر میں خصوصیت کے ساتھ ہماری مدد کی ہے، شکریہ ادا کر رہے ہیں تو ایک رسمی اور روایتی طریقے کو اپنائے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ آخر ہم جناب سہیل عظیم آبادی علامہ جمیل مظہری اور ڈاکٹر نذر امام کے اس تعاون کو کیوں کر ظاہر کریں جس کے بغیر یہ نمبر نہیں نکل سکتا تھا۔

مضمون نگار حضرات نے جس طرح ہماری دعوت قبول کرتے ہوئے اس نمبر میں شرکت کی ہے، اس سے ہمیں مستقبل کے لئے بڑی ڈھارس بندھی ہے، ان کی یہ قلمی معاونت ہمارے ایقان و استقلال کی ضامن ہے، ہماری درخواست پر جس فراخ دلی سے فن کاروں نے تعاون کیا وہ ان کی عظمت کی دلیل ہے ورنہ ہم مواد کے اعتبار سے اتنا وزنی نمبر شایع نہ کر پاتے۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض مضامین ہماری دلی خواہش اور کوشش کے باوجود اس نمبر میں شامل نہ ہو سکے۔ جو آئندہ شمارے میں شایع ہوں گے دراصل اگلے شمارے کو اس نمبر کا ضمیمہ سمجھا جا سکتا ہے۔

ادارہ

یہ جنوری، فروری اور مارچ ۱۹۶۵ء کا مشترکہ شمارہ ہے اس کے بعد اپریل ۱۹۶۵ کا شمارہ شایع ہ

علیم اللہ حالی

دیارِ لکھنؤ

"گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے"

غالبؔ کا دل طوافِ کوئے ملامت کے لئے پندار کا صنم کدہ ویران کر دیتا تھا۔ میرے لئے علمی و ادبی مراکز کی سیاحت اور وہاں کے برگزیدانِ ادب سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کا جذبہ میری کمزوری بنا ہوا ہے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میری دلی تمنا رہی ہے کہ اہم سے اہم ادبی و علمی مرکز میں رہوں، وہاں تعلیم حاصل کروں اور اپنے ذہن کی تربیت انہیں فضاؤں میں کروں، مگر میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی ہائی اسکول کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اس جذبہ نے پہلی بار مجھے سب سے زیادہ پریشان کیا۔ میری قسمت کی درازدستی دیکھئے کہ میری اس تمنا کی تکمیل تو کجا مجھے بہار کے ایسے علاقوں میں رہنا پڑا جہاں کے لوگ صحیح زبان سنتے دیکھ کر ہنستے اور تعجب کرتے رہے۔ میں عرصہ تک اس ماحول میں اجنبیت محسوس کرتا رہا اور شاید وہاں مجھ سے ملنے والے اور میرے ذوق و شوق کو سمجھنے والے لوگ بھی مجھے اجنبی سمجھتے تھے۔ آئی اے کے بعد جب بی اے پڑھنے کی بات آئی تو میں علی گڑھ جانے کے لئے کوئی بہانہ اور کوئی سہارا ڈھونڈنے لگا میں اُردو لے کر آگے پڑھنا چاہتا تھا اس لئے کہ پہلے ہی سے اردو میں ایم اے کرنے کی سوچے ہوا تھا، میری اقتصادی اور کچھ سماجی الجھنوں نے میرے بھٹکے ہوئے شوق کو پھر زنجیر پہنا دی اور میں جہاں تھا وہیں رہ گیا، میرے شوق کو (اور شاید کسی حد تک صلاحیت کو بھی) دیکھ کر میرے پروفیسر صاحب نے آنرس رکھنے کی تجویز کو پسند کر لیا اور ہر طرح کی تعلیمی مدد دینے کا وعدہ کر لیا، مجھے یاد ہے کہ کالج کے امتحانات میں میری اُردو کی کاپی مثالی تصور کی جاتی تھی اور پروفیسر صاحب تمام لڑکوں کو میری کاپی دکھاتے تھے۔ ایک بار میں نے جواب کے پرچے میں "تعیّن" کا لفظ استعمال کیا اور اس کے لئے "کی" کا حرف لکھا تھا۔ پروفیسر صاحب کے ذہن میں صرف "تعیّن" کا لفظ تھا۔ اس لئے سبھوں کی کاپیاں دکھاتے ہوئے جب میری باری آئی تو انہوں نے کہا کہ "اس بار آپ کی کاپی میں صرف ایک غلطی ہے آپ نے تعیّن کو مونث لکھ دیا ہے۔" میں نے کہا "جی یہ تعیّن نہیں تعئین ہے جو یقیناً مونث ہے۔" اس لئے انہوں نے پھر کہا تعئین نہیں یہ کوئی لفظ نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" لیکن میں نے اس کے صحیح ہونے پر اصرار کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ غرض میں اسی کور دہ جگہ میں رہ کر بی۔ اے کے امتحان میں بھی نمایاں طور پر کامیاب ہو گیا۔ مجھے اپنا نتیجہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی تھی اس لئے کہ اردو آنرس کے امتحان میں میں سر فہرست آیا تھا۔ مجھے اس روز ایسا محسوس ہوا گویا اردو زبان بھی مجھے اسی قدر چاہتی ہے، جتنا میں اُسے چاہتا ہوں۔ محبت کے بدلے محبت پا کر انسان کو جو خوشی محسوس ہونی چاہئے وہی خوشی مجھے بھی ہوئی تھی۔

ایم۔ اے کی تعلیم کا مسئلہ میرے لئے بڑا اہم بنا ہوا تھا، مگر یہ بھی طے ہوا اور کیسے طے ہوا یہ ایک ناقابلِ فراموش حسن اتفاق ہے پھر اس حسن اتفاق نے میری زندگی میں جتنے طربناک اور کربناک لمحات پیدا کئے انہیں بیان کرنے کے لئے تو ایک دفتر چاہئے۔

ازیں فسانہ ہزاراں ہزار دارم یاد

قربت سے محبت بڑھتی ہے، جیوں جیوں میں اردو کی تعلیم حاصل کرتا گیا میرے جنونِ شوق کے انداز بڑھتے گئے اور ادبی مذاق کی تشنگی جوان ہوتی گئی، محترم وفا ملک پوری اور ان کے "صبح نو" سے میرا تعلق کافی قدیم ہے۔ وفا صاحب اس اسٹیٹ میں محرم کی مجلسیں پڑھتے تھے جس میں میرے ابا جان منیجر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ وہ زاہدانہ انداز رہائش اور علمی تعمق کی وجہ سے ابا جان کے ملنے جلنے والوں اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں ہیں۔ مگر وہ ابا جان سے سن و سال میں اتنے ہی چھوٹے ہوں گے جتنا چھوٹا میں اپنے چچا جان سے ہوں۔ وفا صاحب سے میری قربت اس وقت بڑھنے لگی جب وہ ادب و شاعری سے زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ میں نے موصوف کے ذہنی ارتقا کی وہ منزلیں دیکھی ہیں جن میں وہ مذہبی قیادت کی ذمہ داریاں مختصر کرتے ہوئے شاعری اور ادب و صحافت سے سچا عشق کرنے لگے ہیں، شاعری وہ پہلے بھی کرتے تھے مگر سلام۔ مرثیوں۔ نوحوں اور قصیدوں کے بعد جو غزلیں پیش کرتے تھے ان سے بھی عموماً ہجر و وصل کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، مگر رفتہ رفتہ وفا صاحب ادب کے گلگشت کی تازہ ہواؤں میں سانس لینے لگے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب ان کی مے سخن میں بے خود و سرشار بنانے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ابھی تو ان کی شاعری میں نہ جانے کتنی نا آفریدہ بہاریں انگڑائی لینے والی ہیں۔ انہوں نے بڑی چاہ کے ساتھ پورنیہ سے "صبح نو" نکالا۔ میں نے انہیں بار بار کہتے سنا ہے کہ "صبح نو" ان کی زندگی کی عزیز ترین شئے ہے، محبت جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے اتنی ہی شدید اور بے پناہ بنتی جاتی ہے۔ چنانچہ وفا صاحب دن بدن "صبح نو" میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں، اس کی پائیداری اور اس کے معیار کی بلندی کے لئے وہ اپنا سارا وقت اور ساری محنت صرف کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے دس سال کے عرصے میں "صبح نو" کو کن کن حالات سے گزرنا پڑا ہے انھیں کچھ میں بھی سمجھتا ہوں، مجھے یاد ہے کہ جب "صبح نو" پورنیہ سے نکلتا تھا تو ایک بار پرچہ شائع کرنے کے لئے وفا صاحب کے پاس پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کے زیور رہن رکھ کر صبح نو شائع کیا تھا۔ وہ زیور واپس لیا گیا تھا یا نہیں مجھے یاد نہیں۔ یہ بات پرانی ہوگئی ہے لیکن اہم باتیں پرانی ہو کر بھی تازہ رہتی ہیں، میں اس واقعہ کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔ ادب و صحافت سے اسی غیر معمولی محبت کی وجہ سے انہوں نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی۔ اور صبح نو نکالنے کے لئے کسی مستحکم انتظام کے بغیر پٹنہ چلے آئے ؎

اے خوشا عاشقِ سرمست کہ بر پائے حبیب سر و دستار نہ داند کہ کدام اندازد

پٹنہ آکر صبح نو ہر لحاظ سے بہتر ہوگیا، علمی معیار کے لحاظ سے کافی اور مالی استحکام کے لحاظ سے کسی حد تک وفا صاحب کو صبح نو اتنا پیارا ہے، کہ جب بھی اس کو سنوارنے سجانے اور اس کے معیار کو بلند کرنے کے سلسلہ میں کسی نے کوئی تجویز رکھی۔ انہوں نے بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اس میں کتنا خرچ ہوگا اس تجویز کی تائید کی۔ انہوں نے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے اخراجات کیونکر پورے ہوں گے انہیں تو بس صبح نو کی ترقی اور ہر دلعزیزی چاہئے۔ کبھی "نئی تحریر نمبر" کی بات چلی تو کبھی "انتخاب نمبر" کی تجویز رکھی گئی، کبھی "اختر اورینوی نمبر" کی سوجھی تو کبھی "آنند نرائن ملا نمبر" کی۔ غرض صبح نو کی فلاح سے ہٹ کر اب تو گویا کوئی بات بھی سوچنے کی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جناب سہیل عظیم آبادی نے "علی عباس حسینی نمبر" نکالنے کی رائے دی تو وفا صاحب اس کے لئے بھی یوں تیار ہوگئے جیسے اس میں کوئی دشواری ہی نہیں تھی۔ تیاریاں شروع ہوگئیں، مضامین آنے لگے اور اب کام اس منزل پر پہنچ گیا کہ نمبر شائع ہونا ناممکن نہ تھا۔ اس نمبر کی تکمیل کے سلسلہ میں جناب علی عباس حسینی صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ میرے لئے تو یہ موقع ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل کی صورت لے کر آیا۔ لکھنؤ جانا یقینی ہوگیا۔ اور ہم لوگ روانہ ہوگئے ؎

جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ

لکھنؤ میں جناب علی عباس حسینی صاحب ہم لوگوں کے منتظر تھے، انہوں نے ہمارے استقبال کے لئے اسٹیشن پر کچھ لوگوں کو بھیجا تھا مگر نہ ہم انہیں پہچان سکے اور نہ وہ ہم لوگوں کو، وزیر گنج کے ایک حصے غوث گنج میں ۱۰۵ نمبر کا مکان ہے اسی میں حسینی صاحب رہتے ہیں۔

جب رکشہ مکان کے پاس رکا اور ہم لوگوں نے آواز دی تو اندر سے ایک خوش رو نوجوان تشریف لائے۔ یہ حسینی صاحب کے بھانجے ابو جعفر حسینی صاحب تھے، ہمیں اپنے کو متعارف کرنے کی ضرورت نہ پیش آئی۔ اس لئے کہ حسینی صاحب کے گھر میں سب لوگ ہماری آمد کے منتظر ہی تھے۔ ابو جعفر صاحب نہایت با اخلاق اور باسلیقہ آدمی ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چند سال پہلے تک وہ لکھنے لکھانے کی طرف کافی مائل تھے اور انہوں نے بڑی اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ابو جعفر صاحب بڑے تپاک سے ملے فوراً ہی انہوں نے باہر کا ملاقاتی کمرہ کھولا اور ہمارے سامان کو اوپر کی منزل میں رکھوانے لگے۔ ہم لوگ بیٹھے ہی تھے کہ اندر سے جناب علی عباس حسینی صاحب مسکراتے ہوئے کچھ تیز تیز قدم آگے بڑھے۔ لانبا قد، صحت مند جسم، سرخ و سفید رنگ، چہرے پر الو لکالی انداز کی داڑھی، بالوں میں مانند سحر رنگ شباب، ہونٹوں کی ساخت ایسی کہ ہر آن ایک خفیف تبسم آنکھوں میں خلوص، نیکی، شرافت اور سادگی، چہرے بشرے سے تجربہ اور محنت کی شدت اور تسلسل۔ یہ ہیں اردو کے وہ مشہور و معروف افسانہ نگار جنھوں نے نہ صرف پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اردو افسانوں میں سماجی کشاکش، اقتصادی الجھن، نفسیاتی پیچیدگی وغیرہ موضوعات کو بھی مخصوص اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے، چند منٹوں کی تمہیدی اور رسمی گفتگو کے بعد ہم لوگوں کو اوپر کی منزل میں جانے کے لئے کہا گیا۔ اوپر کی منزل میں ایک کمرہ ہے جس میں خود حسینی صاحب رہتے ہیں۔ کمرہ بڑا ہے اس لئے اسی میں دو چار پائیاں اور بچھا دی گئی تھیں۔ گویا یوں انتظام تھا کہ حسینی صاحب، وفا صاحب اور میں، تینوں اسی کمرے میں تھے۔ مجھے اس انتظام سے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ میں خود چاہتا تھا کہ حسینی صاحب سے تفصیلی ملاقاتیں ہوں تاکہ مجھے ان کی جزئیات سے واقفیت ہو سکے۔

سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے جن کے لئے خاص طور پر لکھنو گئے تھے وہ اب ہمارے سامنے تھے۔ کچھ دیر تک چائے کے ساتھ ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی، حسینی صاحب بڑی دلچسپی اور نہایت اشتیاق کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ وہ کافی رک رک کر آہستہ روی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ تھکتے اور اکتاتے نہیں، ہم لوگ تھکے ہوئے تھے اس لئے رات سویرے سو گئے دوسری صبح اٹھے تو ہم لوگ تازہ دم تھے، جیوں ہی آنکھ کھلی حسینی صاحب کی پرشفقت شخصیت سامنے تھی، انہوں نے بڑی خندہ جبینی کے ساتھ نئی صبح میں ہمیں لبیک کہا۔

لکھنو میں عام دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے مقامات ہیں جن کی سیر کو لوگ سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ چڑیا گھر، عجائب خانہ، میڈیکل ہاسپٹل، حسین آباد کا امام باڑہ، آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اس سے متعلق بھول بھلیاں اور حضرت گنج وغیرہ ایسے مقامات ہیں جنھیں باہر سے جانے والے لوگ سب سے پہلے دیکھتے ہیں اور ان کی سیر کے بغیر لکھنو کی سیاحت کو نامکمل سمجھتے ہیں، مگر ہم لوگ تو جرعہ کشان ادب میں سے ہیں اس لئے سیر و تفریح کے پروگرام کو آخری دن پر چھوڑ رکھا۔ ہمارے لئے تو علم و ادب اور شعر و سخن کے نوادر ہی سب سے زیادہ وجہ کشش ہیں۔ اسی لئے اہم مقامات کی سیر کے بجائے ہم لوگوں نے ناشتہ کی میز پر اہم شخصیتوں سے ملنے کا پروگرام بنانا شروع کیا۔ ابھی یہ پروگرام سازی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ باہر سے کسی کی آواز آئی۔ معلوم ہوا مولانا اختر علی تلہری صاحب تشریف لائے ہیں، مولانا کو میں بہت دنوں سے جانتا تھا، شاید اس وقت سے جب میں ساتویں، آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کبھی کبھی ان کے مضامین پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ آج ان سے ملنے والا ہوں، مسرور دل میں عقیدت و عظمت لئے حسینی صاحب اور وفا صاحب کے ساتھ باہر کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

مولانا اختر علی تلہری

مولانا کی جو تصویر میں نے اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی وہ اس سے کافی مختلف نکلے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ لمبے چوڑے بھرے جسم، سفید بارعب چہرے، گھنی خشخشی داڑھی اور مجتہدانہ جاہ و جلال کی شخصیت ہوں گے

جتنا بلند عام طور پر گفتگو کرنے کی ہمت پڑتی ہے نہ خواہش ہوتی ہے مگر مولانا کی شخصیت ان کی تحریر کے عالمانہ تبحر و تعمق کے بالکل برعکس ہے چھریرا قد معمولی جسم، سانولا رنگ، داڑھی صاف، ترشی ہوئی مونچھیں اور آنکھوں پر عینک، گفتگو میں سادگی اور بے تکلفی شخصیت کے یہ عناصر ان تصوری علامہ سے یکسر مختلف ہیں۔

مذہب کے علاوہ علامہ تطہیری نے فلسفہ و معقولات اور ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں مختلف فلاسفۂ عالم کے افکار و نظریات ملتے ہیں۔ مذہب کے سلسلہ میں علامہ تطہیری کافی وسعت قلب و نظر کے قائل ہیں، اُن کی شخصیت کا سب سے حسین پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی علمی گہرائی کا بے ضرورت مظاہرہ نہیں کرتے اور بڑی خوش مزاجی کے ساتھ ہر مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں، یہ ادیبانہ زندگی انہیں ادب دوستی کے انعام کے طور پر ملی ہے۔ ان سے کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور جب تک ہم لوگ لکھنؤ میں رہے روزانہ ایک آدھ بار ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ باتیں کرتے وقت خاص انداز سے سر و گردن کو جنبش دیتے۔ ان کے ساتھ ہم لوگ دفتر سرفراز گئے۔ یہاں سید مصطفٰے حسن رضوی ایڈیٹر سرفراز سے ملاقات رہی۔ پھر ہم لوگ کچھ اور لوگوں سے ملتے ملاتے سید مسعود حسن رضوی صاحب کے یہاں پہنچے، ان سے ملنے کی بھی بید تمنا تھی۔ ان کے تنقیدی اور تحقیقی کاموں سے واقفیت تو پہلے ہی سے تھی۔

سید مسعود حسن رضوی

جب ہم لوگ ان کے مکان میں داخل ہوئے تو وہ باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے "کلیات فائز" کے کتابت شدہ صفحات کا مقابلہ کر رہے تھے، ان کی بغل والی کرسی پر ایک دوسرے صاحب بیٹھے تھے۔ مسعود صاحب اصل پڑھتے جاتے تھے اور وہ صاحب کتابت شدہ تحریر دیکھ رہے تھے۔ ہم لوگوں نے اپنے کو متعارف کرایا اور پاس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار منٹوں میں انہوں نے کام سمیٹ لیا اور ہم لوگوں سے محو گفتگو ہو گئے۔ "بھئی بہت ہی مصروف آدمی ہوں، تحقیق و تنقید اور نادر کتابوں کی اشاعت وغیرہ کے کاموں میں اس قدر مصروف رہتا ہوں کہ مضامین لکھنے اور رسالے والوں کی فرمائشات پوری کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی، صبح ناشتہ کر کے کام میں لگ جاتا ہوں، درمیان میں کھانے اور دو گھڑی آرام کرنے کا وقت نکال کر پھر مصروف ہو جاتا ہوں۔"

اس تمہید کے بعد وہ اس طرح سے گفتگو میں محو ہو گئے کہ شاید اپنی ساری مصروفیتوں کو بھول گئے تھے، وہ بڑی خوش خلقی کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ کبھی ادبی شخصیتوں کی بات چلی تو کبھی جریدوں کی۔ کبھی شاعری کی گفتگو ہوئی تو کبھی تحقیق و تنقید کا تذکرہ ہوا، غرض مختلف موضوعات سامنے آئے۔ مرثیوں کی بات چھڑی تو انہوں نے کہا کہ تمام اصناف شاعری یا نثر میں دیگر زبانیں اردو زبان سے بہت آگے ہیں مگر صرف مرثیہ ایسی صنف سخن ہے جس میں معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے اُردو کو فضیلت حاصل ہے وہ بہت دیر تک اردو مرثیہ نگاری پر اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے رہے۔

ان سے رخصت ہو کر ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ کافی دیر ہو چکی تھی، سب لوگ منتظر تھے ———

شام کے جلسے میں جناب رام لعل، مسٹر ھٹیانی اور ستیش بترا سے ملاقاتیں رہیں، رام لعل صاحب اردو کے کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے مسلسل ریاضت کی ہے صرف یہی نہیں کہ وہ کافی دنوں سے لکھتے رہے ہیں بلکہ وہ اپنے اوقات کا ایک حصہ مطالعہ میں بھی صرف کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں نئی آگاہیاں بھی ملتی ہیں۔

رام لعل صاحب کے فن میں دور جدید کی اقتصادی اور سماجی الجھنوں کی بڑی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ ہمارے وہ افسانہ نگار جو کافی زمانے سے لکھتے رہے ہیں عام طور پر جدید کی طرف مائل نہیں ہو رہے ہیں یا پھر وہ اس دور کے تقاضوں سے پورے طور واقف نہیں ہیں۔ رام لعل صاحب کے یہاں "آئینے کے سامنے" "نئی دھرتی، پرانے گیت" اور "پھر آواز تو پہچانو" تک

جو ارتقائی سفر لمبا ہے۔ اس سے ان کے ذہن کی زرخیزی اور عصری تقاضوں کو سمجھنے کے سلسلے میں غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے موصوف بڑے خلوص کے ساتھ پیش آئے اور جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے اوقات ہمارے ساتھ گزارنے کی کوشش کی۔ بڑے اصرار کے ساتھ وہ مجھے اور وفا صاحب کو اپنی رہائش گاہ واقع چارباغ لے گئے وہاں چائے ناشتہ کے ساتھ دیر تک ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی ——— ستیش بترا صاحب سے سرسری ملاقات رہی۔

لکھنؤ کی اور دوسری ادبی و علمی شخصیتوں سے ملنے ملانے میں محترم علی عباس حسینی اور علامہ اختر علی تلہری کے ساتھ ساتھ رام لعل صاحب بھی رہے۔ ایک شام یونہی گھومتے پھرتے جب ہم لوگ اس علاقے سے گزر رہے تھے جہاں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی دریا باد سے آکر ٹھہرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ موصوف ان دنوں یہیں ہیں، اُن سے ملاقات کی یہ بالکل غیر متوقع صورت نکل آئی تھی۔ لہٰذا میں نے غیر معمولی مسرت محسوس کی۔ محترم حسینی صاحب نے ہم سب ملنے والوں کے نام بھجوائے، اندر سے خبر آئی کہ کل چائے پر تکلیف کرنے کی فرمائش کی گئی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

دوسرے روز ہم لوگ وہاں وقت پر پہونچ گئے، جیوں ہی ہم لوگوں کی آمد کی خبر ملی، مولانا تشریف لے آئے۔ سادہ وضع، قدرے پست قد بھرا بھرا جسم، چھوٹے چھوٹے ترشیدہ بال، بڑی سفید داڑھی، جسم سے ضعیفی آشکار، چال ڈھال میں وقار و تمکنت، ملنے جلنے میں خندہ روئی، پیشانی اور نشست و برخاست کے انداز میں تقدس اور مذہبیت ——— یہی وہ عالم بے بدل جسے دنیا عبدالماجد دریا بادی کے نام سے جانتی ہے۔ مولانا سے ملتے ہی ان کی تمام پرانی تحریریں میرے سامنے آگئیں، جن میں تعقل و تفلسف کی ایک دنیائے بیکراں موجود ہے۔ موصوف سے کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں اور میں عقیدت و احترام کے ساتھ ان کے تمام ارشادات کو تبرک سمجھ کر سنتا رہا۔ انہوں نے ہم لوگوں کی چائے اور ناشتے سے خاطر کی۔ ناشتہ میں لکھنؤ کی مخصوص بالائی تھی۔ تھوڑی دیر تک بالائی اور ملائی کے الفاظ پر بات چلتی رہی، مولانا موصوف نے بتایا کہ واجد علی شاہ کے دور میں خود انہوں نے پہلی بار ملائی کو بالائی کہا۔ اور تب سے پڑھے لکھوں میں یہی لفظ چل پڑا۔ میں ٹائی لگا کر ان کے پاس گیا تھا، مجھے خوف تھا کہ کہیں موصوف کو یہ روش ناگوار نہ لگے۔ نہ جانے کیسے اس موضوع پر بھی بات چل پڑی۔ انہوں نے فرمایا کہ مسلمانوں کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ روح کی طرف توجہ دینی چاہئے، ظواہر پر زیادہ اصرار نہ کرنا چاہئے۔ غرض تقریباً نصف گھنٹہ تک مختلف علمی، سماجی اور مذہبی گفتگو ہوتی رہی، جب تک ہم لوگ رہے وہ بڑے سکون اور خوش دلی کے ساتھ محو گفتگو رہے۔ ہم لوگ وہاں سے نکلے تو سب ان کے علم و دانش، فکر و فلسفہ اور اخلاق و اخلاص کی باتیں کر رہے تھے۔ میں ان سے مل کر واپس آیا تو خواہ مخواہ بھی یہ شعر بار بار یاد آ رہا تھا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لکھنؤ میں جب تک رہا، نئے اور پرانے ادیبوں، شاعروں اور دوسرے عالموں سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ مولانا افقر موہانی، جناب خورشید احمد، مولانا خیر بہوروی، مولانا کلب عابد صاحب، مولانا کلب صادق صاحب، فضل نقوی، سید کلب مصطفٰے صاحب، ڈاکٹر رفیق حسین، خواجہ اطہر حسین صاحب، آفتاب اختر تلہری وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔

مولانا افقر موہانی اساتذۂ سخن میں سے ہیں اور اب اس منزل پر پہونچ چکے ہیں جب وہ خود "مسند بے پیر فرمایا ہوا" کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ خورشید احمد صاحب محکمۂ اطلاعات سے متعلق ہیں۔ صاحب ذوق اور نہایت خوش خلق آدمی ہیں۔ محترم حسینی صاحب سے اُن کی رشتہ داری

سکتا ہے ـــــــ مولانا خیر بہوروی علم و ادب کے میدان میں مشہور صاحب قلم ہیں، ادبی تحقیقات اور ٹھوس علمی کاموں پر انہوں نے اپنی زندگی گزاری ہے اور اب تک انہیں دشوار گزار راہوں پر چل رہے ہیں، ان کے تجربات کو دیکھتے ہوئے جناب مقبول احمد لاری نے تحریک کے جیسے کام کے لئے مولانا خیر بہوروی صاحب پر ساری ذمہ داریاں سونپ دی ہیں۔

مولانا کلب عابد اور مولانا کلب صادق صاحبان خاندان اجتہاد کے ان نوجوان علما میں سے ہیں جو شیعی عقائد کی تبلیغ و تلقین کرتے ہوئے ان عناصر پر خاص طور پر زور دیتے ہیں جن سے بین اسلامی فضا قائم ہو سکتی ہے، اپنے شعبۂ کار میں ان کی صلاحیت اور ان کی صلح جو پالیسی انہیں شیعوں اور سنیوں میں مساوی طور پر محبوب بنا رہی ہے۔

ایک روز ہم لوگ فرنگی محل کی طرف نکل پڑے۔ صدر دروازے سے داخل ہو کر ابھی باب الافتا تک پہونچے تھے اور مولانا رضا انصاری صاحب کے بارے میں لوگوں سے پوچھ ہی رہے تھے کہ ایک طرف سے مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری صاحب تشریف لاتے ہوئے دکھائی دئے، جن کی شخصیتوں کی علمی ادبی اور مذہبی فوقیت کا بالغیب ایمان موجود تھا۔ ان کو آنکھوں سے دیکھ کر کتنی مسرت ہوئی۔ اس کا اندازہ ہر صاحب عرفان کو ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، گفتگو زیادہ ادبی مسائل پر ہوتی رہی، تھوڑی دیر کی بات چیت ہی سے یہ اندازہ ہو گیا کہ موصوف تقریباً تمام ادبی پرچوں کو بغائر پڑھتے ہیں اور ان کے مشتملات کے سلسلہ میں ان کی رائے نہایت مناسب اور مفید ہے۔ یہیں مولانا کے بڑے صاحبزادے مولانا ہاشم فرنگی محلی سے بھی ملاقات ہوئی۔

یاد دہلوی

جن شخصیتوں سے خاص طور پر ہمیں ملنا تھا ان کی فہرست میں محترمہ یاد دہلوی کا بھی نام تھا۔ یاد صاحبہ کبھی کبھار مشاعروں میں بہار کے اطراف میں بھی آتی رہتی ہیں۔ وہ لکھنؤ میں ہماری رہائش سے ایک ڈیڑھ فرلانگ پر رہتی ہیں۔ میں، وفا صاحب اور ابو حنیف بھائی ایک شام اُن کے یہاں پہنچے تو وہ نہیں تھیں، معلوم ہوا کلکتہ مشاعرہ میں گئی ہوئی ہیں، آج کل میں آنے والی ہیں۔ لکھنؤ کے معروف اور خوشگوار روز و شب کو چھوڑ کر ایک روز کے لئے مجھے ہردوئی (لکھنؤ سے تقریباً ساٹھ میل دور) جانا ضروری تھا۔ چنانچہ یاد صاحبہ کے یہاں لکھنؤ آنے کی اطلاع دے کر ہم لوگ واپس ہوئے تو ایک آدھ روز تک پھر ان کی رہائش گاہ "سحر منزل" کی طرف رُخ نہ کر سکے۔ کم و بیش ڈیڑھ دن مجھے ہردوئی آنے جانے اور وہاں اپنے ایک عزیز سے ملاقات کرنے میں لگ گئے۔ وہاں سے واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ یاد صاحبہ نے ہم لوگوں کو از راہ کرم شب کے کھانے پر بلایا ہے، مجھے اُن سے ملنے کے لئے یوں بھی دوبارہ جانا پڑتا۔ اب تو ان کے ہاں جانا ایک خوشگوار اخلاقی فریضہ بن گیا تھا۔ یاد صاحبہ ہم لوگوں کی منتظر ہی تھیں۔ مجھے ان کی شخصیت میں خلوص، سادگی اور بے تکلفی کی صفات نظر آئیں۔ پر تکلف کھانے کے بعد ہماری ضیافت کی تکمیل کے لئے میرے اصرار پر انہوں نے غزلیں بھی سنائیں۔

یاد صاحبہ کی غزلیں سوز و ساز و آرزو و جستجو کا مرقع ہوتی ہیں اور ان کے ہر شعر سے تغزل کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان کا کلام سن کر میرے اس ایمان کی تجدید ہو گئی کہ غزل میں اب تک نئے معجزات پیدا کرنے کی وہی صلاحیت موجود ہے جو پہلے تھی۔ اس کو اردو شاعری کی آبرو نہیں کہا گیا ہے۔ غزل کے عام طور پر زوال کی وجہ ایسے شعرا کی کمی ہے جو اس صنف سے حبّ للّٰہی رکھتے ہوں۔ اس کے لئے جس والہانہ پن جس گداختگی اور کسنگی کی ضرورت ہے وہ عموماً اس دور کے غزل گو شعرا کے یہاں بہت کم ملتی ہے۔ ؏

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یوں تو لکھنؤ میں ہم بادہ کشانِ سخن جس جگہ بھی بیٹھ گئے میخانۂ سخن کا نقشہ بن گیا مگر وہ نشست بالخصوص بھولی نہیں جا سکتی جو پروفیسر شبیہ الحسن صاحب نونہروی کے دولت کدے پر "اردو مصنفین لکھنؤ" کی طرف سے منعقد ہوئی تھی۔ اس میں عموماً ہر میکش ساقی تھا یا پھر ہر ساقی میکش تھا۔

اس بزم سخن کی کارروائی علامہ اختر علی تلہری کی صدارت میں شروع ہوئی اور ساحر لکھنوی، اقبال ندیم، شارب لکھنوی، بہار لکھنوی، نہال رضوی، ناوک لکھنوی، ہزار لکھنوی، سالک لکھنوی، ڈاکٹر رفیق حسین، جناب وفا ملک پوری، علامہ اختر علی تلہری اور صہبیت خاص میں عملی حصہ لیا۔ بڑی دل چسپی اور دل جمعی سے لوگوں نے ایک دوسرے کی چیزیں سنیں۔ شعرائے کرام کے علاوہ جناب علی عباس حسینی، جناب رام لعل، جناب سید کلب مصطفےٰ، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، نواب افتخار حسن وغیرہ شریک تھے۔ اور پروفیسر سید شبیہ الحسن صاحب شرکائے بزم کی خاطر و تواضع میں سراپا اخلاص نظر آ رہے تھے۔

مجھے یاد نہیں کہ کس تاریخ کو میں مرزا حیدر حسین صاحب ایڈیٹر پیام اسلام اور راجکمار امیر حیدر خاں آف قیصر باغ سے ملا تھا مگر ان دونوں حضرات کی شخصیتوں میں مجھے ایسے نقوش ملے جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل حسن کے گوشے اتنے بے پناہ ہیں کہ اگر کوئی انہیں چند صفات میں محدود کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ جب میں ایسی شخصیت سے ملتا ہوں جو اپنے طرز رہائش اور وضع قطع اور تعلیم و تربیت کے اعتبار سے مذہبی کہے جا سکتے ہیں تو ہمیشہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا تو یہ مجھے معائب و نقائص سے پر ملیں گے، یا پھر نہایت قابل توصیف اور محبوب و مطبوع۔

مرزا حیدر حسین صاحب سے مل کر میرے اوپر دوسرا اثر طاری ہوا۔ چند لمحوں کی گفتگو ہی میں موصوف مجھے روشن خیال، وسیع مشرب، خوش خلق، وضع دار اور صاحب دل معلوم ہوئے۔ جب میں مذہبی حلقہ و ماحول میں ایسی شخصیتوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ایسے حضرات اس آئیڈیل انسان کی طرف اشارہ نما ہیں مذہب جس کی تعمیر و تشکیل کا دعویٰ کرتا ہے۔

راجکمار امیر حیدر خاں آف قیصر باغ کی شخصیت کے ان پہلوؤں نے مجھے بے حد متاثر کیا جس سے انکی خوش گوئی، خندہ جبینی اور علم و ادب سے گہری دل چسپی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ انگریزی، اردو اور فارسی و عربی زبان و ادب پر ایسی دسترس رکھتے ہیں جو اس دور میں بہت کم لوگوں کو میسر ہے۔ موصوف سے کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، درمیان میں مختلف ادبی اور مذہبی موضوعات آتے رہے۔ کچھ دیر تک وہ قرآن کے مختلف انگریزی ترجموں پر عالمانہ اور مدلل انداز سے تبصرہ فرماتے رہے۔ اگر راجکمار موصوف اپنے مطالعہ و افکار کے نتیجہ میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیں تو نہ جانے کتنے لوگوں کو روشنی ملتی رہے اور کتنے دقیق اور اہم مسائل ادب و مذہب کے سامنے آتے رہیں۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں ہم لوگ علی عباس حسینی صاحب کے دولت کدے پر مقیم رہے، وہ خود اور ان کے گھر کے تمام افراد ہم دو مہمانوں سے اتنی شفقت و موانست کے ساتھ ملتے رہے کہ اب بھی جب میں لکھنؤ سے واپس آ چکا ہوں میرے سامنے ذہن کے مناظر ہیں۔ حسینی صاحب اگرچہ اپنی وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے قدیم طرز رہائش کے مظہر ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت میں نئے دور کی آزاد خیالی ہے۔ بلکہ صحیح طور پر یہ کہنا مناسب ہے کہ حسینی صاحب کے یہاں جدید و قدیم کا امتزاج ہے۔ وہ زندگی کے کسی معاملہ میں انتہائیت کے شکار نہیں ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ توازن ان کے گھر کے دوسرے افراد سے مل کر اور ان کا طرز رہائش دیکھ کر اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

ان کی اہلیہ محترمہ (جنھیں اب میں چچی کہتا اور سمجھتا ہوں) بھی روشن خیالی میں حسینی صاحب کے ساتھ ہیں۔ پہلے روز تو انہوں نے ہم لوگوں کے سامنے آنے میں تکلف کیا۔ لیکن دوسرے دن سے اپنی صاحبزادیوں گیتی آرا صاحبہ اور نازش کے اصرار پر وہ ہم سبھوں کے سامنے آنے لگیں اور کھانے ناشتے میں شریک ہونے لگیں۔ ان کی پرمزاح اور پرخلوص گفتگو ہم لوگوں کے دل بہلانے کا بڑا اچھا ذریعہ تھی۔ وہ یوں تو خاموش خاموش سی رہتی تھیں لیکن جب موڈ میں آ کر گفتگو کرتیں تو بات چیت میں اپنی پوری دل چسپی ظاہر کرتیں

ان کے ریمارکس (Remarks) بڑے ہی لطیف اور حسین ہوتے۔

حسیبی صاحب کے یہاں دستر خوان پر بہت اہتمام ہوتا ہے، یہ بات ہم لوگ پہلے سن چکے تھے۔ لکھنؤ جا کر شنیدہ دیدہ ہو گیا۔ ہم لوگ وہاں اس طرح رکھے گئے تھے کہ چند دنوں کے لئے ہم نے اسے اپنا گھر سمجھ لیا تھا۔ خود اس گھر کے تمام افراد بھی اسی طرح پیش آتے تھے اس لئے اگر دستر خوان کے اہتمام کو یہ سمجھیں کہ وہ ہم مہمانوں کی خاطر داری کی وجہ سے تھا تو غلط ہوگا۔ دستر خوان سجانا، چیزوں کو قرینے سے رکھنا، کھانے کی چیزوں میں رنواع واقسام پیدا کرنا، کھانا اور کھلانا اس گھر کے ہر فرد کو اس کا آرٹ آتا ہے گیتی آرا صاحبہ خصوصیت سے اس فن میں مہارت رکھتی ہیں۔ سلاد کاٹنے اور اسے سجا کر سامنے میں رکھنے میں تو وہ ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ انہوں نے ایک بار ایک پلیٹ پر سلاد کی تین منزلہ کھوٹی کی تھیں اس دن انہوں نے اس سہ منزلہ عمارت سازی پر کافی داد حاصل کی۔

لکھنؤ میں ہمارے چھ سات دن گزر گئے تو بہت افسوس ہوا۔ اولاً تو اس وجہ سے کہ یہ وقت اتنا جلد کیوں گذر گیا۔ دوم یہ کہ وہاں ،ور زیادہ ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ دوسرے دن محترم وفا صاحب کو بینیا کے مشاعرہ میں شرکت کرنی تھی، اور تیسرے دن ہمارا کالج کھلنے والا تھا۔

لکھنؤ میں ہمیں جس طرح یگانگت، خلوص اور مؤانست کا ماحول ملا اور مشہور علماء، ادباء اور شعراء کرام کی صحبتیں حاصل ہوئیں وہ پھر اسی شہر صد رنگ میں چلنے پر اصرار کرتی ہیں۔ میں لکھنؤ گیا تھا ایک تشنگی مٹانے کے لئے، علم و ادب کی تشنگی مگر وہاں سے لوٹ کر جو آیا ہوں تو وہی کیفیت ہے جو فیض احمد فیض نے اپنے سفر لکھنؤ کے بعد لکھا تھا یعنی یہ کہ،

"تسکین کی بجائے پیاس کا احساس لے کر لوٹا ہوں لیکن اس کے باوجود لکھنؤ کی ایسی یادیں بھی دل میں ہیں جن سے آج بھی تسکین ہوتی ہے۔"

(رضیہ سجاد ظہیر کے نام ایک خط۔ ۲۲ مئی ۵۳ء۔ مطبوعہ ہمارا ادب گورکھپور)

"یارب ابھی جو بول رہے تھے وہ کیا ہوئے"

ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ لکھنؤ میں مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری صاحب فرنگی محلی سے ملاقات ہوئی تھی، پھر چند دنوں کے بعد ان کا خط بھی آیا جس میں انہوں نے "صبح نو" کے علی عباس حسینی نمبر کا شدید انتظار ظاہر کیا تھا ـــــ آج علی عباس حسینی نمبر تیار ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ وہ شخص نہ رہا جس نے اس نمبر کو دیکھنے کی بے انتہا تمنا ظاہر کی تھی۔

مولانا صبغۃ اللہ شہید ایک بے بدل عالم دین، ایک خدا آگاہ بزرگ اور تقویٰ و پرہیزگاری، محبت و مؤانست اور مواخاۃ اسلامی کی گرانقدر مثال ہی نہ تھے بلکہ انہیں ادب کے میدان میں بھی دستگاہ حاصل تھی، عظیم شخصیتوں کی پیدائش کے سلسلہ میں باری تعالیٰ ازل سے محتاط ہے اور کبھی بھی ان کی اتنی زیادہ تعداد نہیں ہوتی بس یہ ان کی خصوصیت، ان کی انفرادیت اور ان کی بے ہمائی پر آنچ آئے۔ مولانا شہید فرنگی محلی بھی انہیں نادر شخصیتوں میں تھے، دنیا کو ہر تھوڑے وقفے کے بعد ایسا گراں قدر سرمایہ کھونا پڑتا ہے، لیکن مستقبل نے ہمیشہ اس کی اشک شوئی کی ہے۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ آج کے نقصان کی تلافی سے مستقبل بھی عاجز ہے۔ میں مولانا شہید کے سانحۂ ارتحال پر ان کے ورثاء کے صبر اور ان کی روح کے انشراح و طمانیت کے لئے دعا گذار ہوں۔

وفا ملک پوری

ابو جعفر حسینی

وہ آئیں گھر میں ہمارے....

گرمیوں کے دن تھے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کی بابت ماموں جان (سید حسینی صاحب (علی عباس حسینی مشہور افسانہ نگار) سے کچھ مشورہ لینے ان کے ہاں گیا تو ڈاکیے نے ڈیوڑھی میں ان کی ڈاک دی۔ کئی خطوط اور کئی رسالے۔ میں نے حسب معمول جب صبح نو کا شمارہ پڑھنے کے لئے اٹھایا تو اس میں علی عباس حسینی نمبر کا اعلان دیکھ کر اچھل ہی تو گیا۔ میں سوچنے لگا واقعی وہ کتنا مبارک دن ہوگا جب یہ نمبر لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ایک عظیم شخصیت کی کارگزاریاں، اسکی زندگی اور تصنیفات۔ دنیا کے سامنے ایک جامع صورت میں پیش ہوگی مگر...

سوال یہ اٹھا کہ صبح نو کے مدیر حضرت وفا ملک پوری کون بزرگ ہیں جنہوں نے یہ بیڑہ اٹھایا ہے ماموں جان سے ان بزرگوار کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں باوجود اپنے حافظہ پر زور دینے کے وفا ملک پوری صاحب سے کبھی ملاقات کا کوئی واقعہ یاد ہی نہیں آیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد وفا ملک پوری صاحب کا ایک خط آیا کہ وہ دو چار دن کے لیے لکھنؤ آنے کا پروگرام بنا رہے ہیں تاکہ حسینی صاحب کی مختلف تصویریں حاصل کر سکیں اور نزدیک سے انکی شخصیت کا کچھ اور مشاہدہ کر سکیں۔

وفا صاحب اپنی عدیم الفرصتی کے باعث اپنا پروگرام ملتوی کرتے رہے اور میں بھی انکے اس حوصلے سے کچھ مایوس سا ہوتا گیا۔ اچانک ایک طویل خاموشی کے بعد ایک دن انکا خط پھر وصول ہوا کہ وہ یکم نومبر ۱۹۶۴ کو یقینی طور پر لکھنؤ تشریف لا رہے ہیں۔ چنانچہ ماموں جان کے ہاں انکے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں بھی اس استقبالیہ میٹی کا ایک ممبر بنا لیا گیا اور میرے ذمہ انکے قیام و طعام کا انتظام سپرد کیا گیا۔ مگر شام کی ڈاک سے ایک ایکسپریس خط ملا جس میں موصوف نے کچھ شکستہ سے کام لیتے ہوئے مطلع فرمایا تھا کہ ممکن ہے کہ وہ ۲ نومبر کی صبح کو لکھنؤ پہونچیں انکے ساتھ میاں حالی سلمہ بھی ہونگے۔

اس شک و قیاس نے ایک دوسرا مسئلہ ہی کھڑا کر دیا۔ پہلی ہی شام کو انکے قیام و طعام کا انتظام کیا جائے کہ دوسری کی صبح کو۔ ان حضرات کو چارباغ لینے کے لئے کون جائے۔ پہچاننے کا مسئلہ اور بھی ٹیڑھا تھا۔ طے پایا کہ مشہور افسانہ نویس جناب رام لعل صاحب جو ریلوے میں ایک افسر بھی ہیں حضرت وفا کی تصویر یا صبح نو کا شمارہ ہاتھ میں لے کر انہیں تلاش کرینگے اور انکا ساتھ نمود الحسن صاحب رضوی ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر) دینگے۔ شام کو دہرہ دون ایکسپریس دیکھنے کی ڈیوٹی ان حضرات کی تھی۔ اور صبح کو یہ کار خیر سیانده پٹھان کوٹ کے لیے میرا اور میرے ماموں زاد بھائی میاں احسان عباس کے ذمہ تھا۔ مگر حضرت وفا کو پہچاننے کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ پھر بقول انکے میاں حالی سلمہ کو بھی کوئی

نہیں ہو رہا تھا میں نے ایک تجویز پیش کی کہ کیوں نہ صبح نو کی ورق گردانی کی جائے شاید ہمیں ان کی تصویریں نظر آجائیں۔ سب لوگوں نے یہ تجویز پسند کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے موجود شمارے لوگوں کے ہاتھوں میں کھل گئے مگر تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کے چہرے مایوسی کے گہرے تاثرات سے دوچار ہونے لگے۔ اتفاقاً گیتی آرا حسینی کی تیز نظروں نے ایک مشاعرہ کی ہل چل میں حضرت وفا کو تلاش کر ہی لیا۔ موصوف کی شخصیت ٹوپی اور شیروانی میں ملبوس نظر آئی۔ تصویر اتنی چھوٹی تھی کہ چہرہ کے خدوخال صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ ایک دوسری تصویر میں موصوف نے عینک بھی لگا رکھی تھی۔ خیال تھا کہ کوئی شرعی داڑھی بھی چہرہ مبارک پر ہوگی مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا اور فطری طور پر ہم لوگوں کو یہ خوشی ہوئی کہ چلو زیادہ بزرگ نہیں نکلے۔ لیکن یہ میاں حالی سلمہ صبح نو میں خود تو کہیں نظر نہ آئے بلکہ ان کے مضامین اور ان کی آزاد نظمیں ضرور دکھائی دیں جس سے ان کے "سلمہ" ہونے کی بات کچھ جچتی نظر نہیں آرہی تھی۔ ۔ کیسے تنقیدی مضامین اور خشک آزاد نظموں کے خالق "سلمہ" ہوں گے یہ بات ایک دلچسپ موضوع بن گئی۔

باتوں ہی باتوں میں شام ہوگئی۔ ہم لوگوں کی نظریں دیوار گھڑی پر رہ رہ کے اٹھنے لگیں۔ ماموں جان اپنے مصلے کو نماز مغرب تمام کرکے لپیٹنے لگے اور حافظ جی باورچی خانہ میں چولہے سے لگے ہوئے میاں کے اس حکم کا انتظار کرنے لگے کہ چاول کی ہانڈی ابھی چڑھائیں یا نہیں۔ کیونکہ لکھنؤ میں چاول کی حالی نا بالی اس شدت کو قدرے اہم بنائے ہوئے تھی۔ پھر یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بہاری ہونے کے ناتے حضرت وفا اور حالی صاحب کو چاول زیادہ مرغوب ہے کہ روٹیاں۔۔۔ یہی حال نمک مرچ کا بھی تھا۔ حافظ کے لیے عجیب الجھن کی منزل تھی کہ مرچیں کہیں زیادہ نہ ہوجائیں ورنہ مہمان کیسے کھا سکیں گے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازہ پر دستک ہوئی اور میں اس یقین کے ساتھ ڈیوڑھی کی طرف لپکا کہ وفا صاحب آگئے مگر محمود صاحب کی عدم موجودگی نے ایک سلانڈ کے لیے امید ختم کر دی تھی۔ یکایک ایک شیریں آواز کانوں سے ٹکرائی "حسینی صاحب کا یہی مکان ہے؟"

"جی ہاں" میں نے کہا اور ایک اچٹتی نظر اپنے مخاطب پر ڈالتے ہوئے کسی اور کو پیچھے اندھیرے میں پہچاننے کی کوشش کی۔ شیروانی اور ٹوپی کے اندر وہی شاعرانہ چہرا ابھرا۔ اب مجھے خوش آمدید کہنے میں کیا دیر تھی۔ جلدی سے گھر میں آکر ماموں جان کو خبر دی۔ گیتی اور نازش سنبھل کر کھڑی ہوگئیں۔ ممانی جان نے اپنا کھلا ہوا پاندان سمیٹا اور ماموں جان تخت کے نیچے اپنا ناگرا ڈھونڈھنے لگے۔

میں نے ڈرائنگ روم کھول کر ان حضرات کو بٹھایا اور اسٹیشن پر کسی کے نہ ملنے پر تعجب کا اظہار کیا۔ وفا صاحب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے فرمایا "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خط مل گیا تھا۔" میں نے کہا جی ہاں جناب! لیکن آپ کے ایکسپریس خط نے کچھ مشکوک کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ محمود صاحب اور رام لعل صاحب آپ لوگوں کو تلاش کر رہے ہوں"

ابھی جواب نہیں ملا تھا کہ ماموں جان سنتے ہوئے کمرہ میں آگئے اور وفا صاحب و حالی صاحب اپنے تصوراتی میزبان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ تھوڑی رسمی گفتگو کے بعد میں ان حضرات کو پہلی منزل والے کمرہ میں رہائش کے لیے لے گیا جہاں ہر چیز پہلے ہی سے گیتی اور نازش نے باقاعدہ رکھ دی تھی۔

ان لوگوں کو اوپر والے کمرہ میں پہنچا کر جب میں نیچے آیا تو دالان میں کھڑی ممانی جان، گیتی اور نازش نے وفا صاحب اور حالی سلمہ کے بارے میں سوالات کی بوچھار کر دی۔ "وہ کیسے ہیں، کیا شکل ہے، کیا صورت ہے۔ زبان کیسی ہے۔ عمر کتنی ہے مزاج کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

عورتوں کے ایسے سوالات کا جواب دینا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا "اب تو وہ آپ کے مہمان ہیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے گا۔" مگر ممانی جان نے ایک پیار بھری گھڑکی میں مجھ سے سب کچھ اگلوا لیا۔

یہاں تو آپ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ وفا صاحب اور حالی سلمہ کیسے ہیں تو سنیئے۔ میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے ان لوگوں سے کہا۔
"اچھا تو آپ سنیئے۔ میانہ قد، گیہواں رنگ، چوڑا چہرہ، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، داڑھی ندارد۔ آنکھوں پر خوبصورت سنہری عینک، گنگناتی آواز، شیروانی پائجامہ اور ٹوپی میں ملبوس۔ سیدھے سادے خوش مزاج۔ اسم بامسمّیٰ وفا ملک پوری مدیر صبح نو اور آپ میانہ قد، گھنگھریالے بال، کھلتا رنگ۔ دھان پان بدن، بیضوی چہرہ، ہلکی ہلکی مونچھیں، شیریں آواز۔ پتلون قمیص، ٹائی اور جیکٹ میں ملبوس۔ چھوٹے بھالے میاں علیم اللہ حالی یقینی سلمہ کہلانے کے حقدار۔ گیا میں کسی ڈگری کالج کے لکچرر اور ماہنامہ صبح نو کے نوجوان معاون مدیر۔
ممانی جان نے کچھ اور سوالات کرنے کے لیے پہلو بدلا ہی تھا کہ محمود صاحب نے آواز دی وہ اندر بلا لیے گئے انہوں نے اپنی روداد بڑی مایوسی سے سنائی۔ بعد میں انہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ حضرات بخیریت یہاں تک آ پہونچے۔ اور جب محمود صاحب کا تعارف وفا صاحب سے ہوا تو معلوم ہوا کہ وفا صاحب ناظمیہ عربک کالج کے طالب علم ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کے گلی کوچوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگرچہ بیس سال کا زمانہ درمیان میں حائل ہو چکا ہے مگر خوب سیریں کی ہیں شام اودھ کی۔
ہاتھ منہ دھونے کے بعد ان حضرات کی چائے سے تواضع کی گئی اور پھر علی عباس حسینی نمبر کی داستان چھڑ گئی۔ کیسے اس خیال نے جنم لیا۔ کیسے لوگوں نے مخالفت کی۔ کن لوگوں نے مضمون بھیج دیئے۔ کن لوگوں نے ابھی نہیں بھیجا ہے اور کن لوگوں نے وعدہ کیا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں رات کے ساڑھے نو بج گئے۔
حافظ جی نے نیچے سے کراہتے ہوئے آواز دی "کھانا تیار ہے حضور"
میں سب لوگوں کو نیچے دالان میں لگے ڈائننگ ٹیبل تک لے گیا۔ ظاہر ہے کہ ملت ابراہیمی پر یقین رکھنے والے اور مہمان نوازی میں سچا لطف لینے والے حسینی صاحب کا دسترخوان تھا جنہیں ہر دم اچھی دعوتیں کھانے اور کھلانے کا شوق رہتا ہے اگرچہ پہلی نومبر کو اتوار ہونے کی وجہ سے اور کچھ وفا صاحب کے مشکوک پروگرام کے باعث زیادہ تکلف سے کام نہیں لیا گیا تھا پھر بھی زبان کی چاشنی اور بھوک بڑھانے کے لیے کچھ چیزیں موجود تھیں۔ حضرت وفا اور حالی صاحب کے لیے کچھ ترکاریوں کا بھی اضافہ تھا ورنہ ماموں جان کے کھانوں میں تو گوشت کی مقدار زیادہ ہوتی ہی ہے۔
حضرت وفا اور حالی صاحب نے بالکل گھریلو انداز میں لکھنوی تکلف سے قدرے بے نیاز ہو کر کھانا نوش فرمایا۔ یہ معلوم کر کے بہت ہی تعجب ہوا کہ حالی صاحب کو چاول بالکل مرغوب نہیں وہ صرف روٹیاں ہی پسند کرتے ہیں۔ ہاں اگر بریانی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔
"حالی صاحب! میں نے سرگوشی کی" چاول کے نہ کھانے سے آپ اپنے بہاری ہونے میں شک پیدا کر رہے ہیں" "نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے" حالی صاحب نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا۔
"یہ میری بچپن سے عادت ہے۔ میرے گھر والے بھی چاول بہت کم کھاتے ہیں"
وفا صاحب کھانے کی ہر چیز کے ذائقہ اور اچھی تیاری کی تعریف کرتے رہے اور وہیں ہی کھڑے لاغر حافظ جی دونوں ہاتھ جوڑ کر "عنایت ہے" "قدردانی ہے" "شکریہ حضور کا" کہتے رہے کھانا کھانے کے بعد پھر سب لوگ اوپر والے کمرہ میں سونے کے لیے چلے گئے۔ ممانی جان جو قریب ہی کمرہ میں بیٹھی تھیں مسکراتی ہوئی نکلیں وہ ان دونوں حضرات کی خوش مزاجی، سادگی اور خلوص سے بے حد متاثر دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن میں کچھ تنقید نہ کرتے ہوئے فوراً خدا حافظ کہتا ہوا اپنے آشیانے کی طرف چل دیا۔
دوسری صبح ناشتہ پر ڈبل روٹی کی لکھنؤ میں قلت کا چرچا تھا۔ میاں احسان محلہ کی ساری دکانیں کھنگال کر آئے آیا کی بکریاں بھی ٹٹول آئے تھے مگر ہر جگہ مایوسی ہی رہی۔ حافظ جی اور رنگینی نے اس درمیان میں پوریاں چھان ڈالی تھیں۔۔

باندھے ہوئے تھے۔ گھی کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں ادھر ہی مڑ گیا۔ گول گول پھولی اور کھری تلی ہوئی پوریاں کسی جنوبی حسینہ کے رخساروں کی طرح لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ ایک پتیلی میں آلو کی "پٹیا بھجیا" لال مرچ مسالوں میں لپٹی ہوئی کسی ریگستانی عورت کی سرخ سرمگیں آنکھوں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی ہی میٹھی ہوئی کیتلی [illegible] بازش انہیں پالیوں میں نکال کر اس طرح رکھ رہی تھیں گویا دیکھی کہ ان کی تشبیہوں میں فرق نہ آنے پائے۔

حافظ جی نے پوریاں سے لڑ سالی اماری اور پیالی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غازی ماموں جان نے "بینا یا پٹیا بھجیا" اور جھری لے کر تیار ہوئے، ناشتہ [illegible] کا [illegible]۔ ناشتہ تیار ہو چکا تھا پھر ڈائننگ ٹیبل پر چن بھی دیا گیا۔ حضرت وفا اور حالی صاحب ماموں جان کی قیادت میں نیچے اترے۔ ماموں جان نے ان بہاریوں کو پٹیا بھجیا سے متعارف کرایا اور وہ لوگ بھی اسکے ذائقے کے معترف ہوئے۔ پھر پٹنہ کی باتیں چھڑ گئیں۔ وہاں کے کھانوں کی قسمیں اور مرچ مسالے۔ غازی پور اور لکھنؤ کے کھانوں کی قسمیں اور نمک مرچ ۔۔۔ حالی صاحب چونکہ ناشتہ ہی پر چائے پیتے ہیں لہٰذا انکے سامنے ابھی پیالی آئی تھی کہ باہر سے علامہ اختر تلہری کی آواز آئی اور سب لوگ اٹھ کر باہری کمرہ میں پہونچ گئے۔ وہیں چائے کا دور چلا۔

ناشتہ کے بعد وفا صاحب نے ازراہ تکلف اور ہلکی سی جسارت سے کام لیتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ وہ لوگ دن بھر ادھر اُدھر ملنے ملانے اور دیگر کاموں میں مشغول رہینگے۔ لہٰذا دوپہر کو ان لوگوں کے طعام کا انتظام نہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ماموں جان کو بھلا یہ تجویز کب گوارا ہوتی۔ بولے "صاحبو! یہ علی عباس حسینی سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ قطعاً غلط تجویز ہے۔ آپ لوگ دوپہر میں بھی کھانا کھائینگے اور رات میں بھی۔" پھر وفا صاحب کی طرف گھور کر دیکھنے لگے۔ موقعہ غنیمت دیکھ کر حالی صاحب چپکے سے کھجے کے پیچھے ہو لیے۔ وفا صاحب بھی کچھ ہنسی روکتے ہوئے جلدی سے اپنا ہاتھ تولیے سے پوچھنے لگے۔ اور بولے "اسی لیے تو ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہنے کی۔"

ماموں جان نے کہا "ہاں اس شرط پر آپ آزاد ہیں اگر کوئی اپنے ہاں کھانے پر مدعو کر لے۔"

اسکے بعد وہ لوگ مولانا اختر علی تلہری صاحب کے ساتھ سہ روزہ "سرفراز" ہفتہ وار کے دفتر اور سید مسعود حسن ادیب کے یہاں جانے کے لیے کپڑے تبدیل کرنے اوپر کمرے میں چلے گئے۔

دوپہر میں جب کھانے پر سب لوگ اکٹھا ہوئے تو ماموں جان کے ہاں "ملی لاور" پر پہلی تاریخ کی جھلک تھی۔ چنانچہ حالی صاحب کو خاص طور سے مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا "جناب! آج رات میں آپ بریانی ضرور کھائینگے" اور وہ گردن جھکا کر "جی ہاں" کہتے ہوئے بیگن کی ایک پھانک کو لقمہ بنانے لگے۔ پاس ہی بیٹھے ہوئے وفا صاحب نے مسکراتی نظروں سے حالی صاحب کو دیکھا اور کہا "حالی سلمہ کو بریانی سے اپنی شاعری کی طرح شوق ہے۔ وہ ضرور بریانی کھائینگے۔" اور حالی صاحب جواب دیے بغیر گوشت کے قریب رکھی ہوئی آلو گوبھی کی تشتری اپنی طرف اٹھانے لگے۔

رات میں جب یہ لوگ کچھ لوگوں سے نیاز حاصل کرکے سنجے واپس آئے تو کیتی اور نازش نے دسترخوان [illegible] اچھی طرح سجا رکھی تھی۔ ماموں جان کو سچ پوچھیے تو آج ہی کھانے اور کھلانے میں کچھ لطف بھی آ رہا تھا۔ دوران طعام روسا اور امراء کے دسترخوانوں کا تذکرہ چھڑ گیا۔ ماموں جان نے سر سالار جنگ کی اس دعوت کا واقعہ بیان کیا جو نواب زادہ محمد مہدی آف پٹنہ کے بڑے صاحبزادے کی شادی کے سلسلہ میں براتیوں کو دی گئی تھی۔ اس میں اتنے قسم کے کھانے تھے کہ عقل حیران تھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس قسم کا کھانا ہے اور کس طرح کھایا جاتا ہے۔ غرض کھانا کے خوش ذائقہ ہونے کی داد دیکر حافظ جی سلام کرتے ہوئے چلے گئے۔

حضرت وفا اور حالی صاحب تو میر تقی میر کی

لکھنؤ میں پہلی شام" سننے کے لیے ماموں جان کے پیچھے پیچھے زینے پر چڑھتے لگے اور میں ان حضرات کو شب بخیر کہتا ہوا اپنے نشیمن کی طرف چل دیا۔

تیسری صبح میاں احسان ڈبل روٹی لے ہی آئے اور ناشتہ میں توسٹ بٹر کا بھی اضافہ ہو گیا اور یہ خشخاش سے تیار کیا ہوا حریرہ پھیلی کے انڈوں کا دھوکا تو دے ہی رہا تھا۔ ناشتہ سے فرصت پا کر وفا صاحب نے پھر کچھ گوگو بستے اٹھنے کی خواہش ظاہر کی اور ایک پروگرام کے تحت ماموں جان نے ان صاحبان کو اپنے ساتھ لے لیا اور دوپہر تک اچھی خاصی چہل قدمی کرا دی۔

کھانے کے اختتام پر ماموں جان اور لڑکیوں کی فرمائش ہوئی کہ وفا صاحب اپنے کلام سے ہم لوگوں کو بھی نوازیں مگر کوششیں ہوتی رہتی ہیں آخر گھر والے کیوں محروم رہیں پھر اس بیگمانی فرمائش کے سامنے فقیر عشق نے سر جھکا ہی دیا۔

ہم لوگ ماموں جان کے تخت کے پاس بڑے بڑے صوفوں پر آرام سے بیٹھ گئے۔ حالی صاحب سے کچھ سنانے کی گذارش کی گئی موصوف نے قدرے تکلف سے کام لیا اور فرمایا "جی! میں نے غزلیں بہت کم کہی ہیں جو یاد بھی نہیں ہاں نظمیں دو ایک یاد ضرور ہیں۔"

"ارے وہ سنا دو نہ کیا کہنے۔ وفا صاحب نے حالی صاحب کو کچھ سہارا دیا اور انھوں نے پہلو بدل کر اور اپنے گھنگھریالے بالوں کو اپنی انگلیوں سے اور پیچھے دال۔ بتاتے ہیں تخت للفظ غزل پڑھی جو پسند کی گئی۔ پھر ایک نظم سنائی جس کا خاکہ اپنے اندر ایک نوعیت خاص رکھتا تھا۔ حالی صاحب کے کلام میں انوکھے پیرے، مرقعے اور نئے روشن خیالی کی جھلک تھی اور اس بات کا ثبوت کہ مستقبل قریب میں وہ ایک اچھے اور پختہ شاعر ثابت ہوں گے۔

حضرت وفا ملک پوری نے دو بہت ہی اچھی غزلیں سنائیں موصوف کی مترنم آواز نے ان کے کلام کو اور بھی حسن بخش رکھا تھا۔ کلام کی پختگی سادگی اور معنویت نے سامعین کا دل موہ لیا تھا چنانچہ ابھی تیسری غزل کی فرمائش ہو ہی رہی تھی کہ

باہر سے کسی نے آواز دی۔ معلوم ہوا کہ سنتیش بترا صاحب تشریف لائے ہیں۔ ماموں جان انکو خوش آمدید کہنے باہر چلے گئے اور بعد میں وفا صاحب اور حالی صاحب بھی اردو کے اس مشہور افسانہ نگار کی مزاج پرسی کو پہونچے سنتیش بترا صاحب کے ساتھ مسٹر بھٹیانی خازن اردو کلب لکھنؤ نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہے۔ جہاں دو ادیب بیٹھ جائیں وہاں تو ادب کی باتیں ہوتی ہی ہیں۔ چہ جائیکہ جہاں نقاد، شاعر اور صحافی بھی آ جائیں ایک اچھا خاصا ادبی ماحول پیدا ہو گیا پھر رام لعل صاحب کی تشریف آوری نے اور بھی سونے پر سہاگہ چڑھا دیا۔

چائے کے بعد ستیش بترا صاحب اور مسٹر بھٹیانی نے اجازت چاہی اور نماز عصر ادا کرتے ہی وفا صاحب اور حالی صاحب مولوی عبدالماجد دریابادی صاحب کے ہاں ماموں جان اور رام لعل صاحب کے ساتھ ان کی مزاج پرسی کے لیے وقت معینہ پر تشریف لے گئے۔

شب میں جب وفا صاحب لوٹے تو معلوم ہوا کہ مولانا دریابادی کے ہاں سے مشرف بہ اسلام ہو کر رام لعل صاحب کے صنم کدہ تک بھی تشریف لے گئے تھے اور دیوالی کی مبارکباد انہیں بہ نفس نفیس پہنچائی۔

جب کھانا نوش فرما کر یہ لوگ بالائی منزل کی طرف حسینی صاحب سے الٰہیات کے موضوع پر ایک گہرا مطالعہ سننے کے لیے تشریف لے گئے تو میں اپنے گوشہ تنہائی کی طرف بڑھ گیا۔

چوتھی صبح ناشتہ کے بعد ہی کچھ تجارتی نقطۂ نگاہ کی غرض سے لوگ نکلے اور دوپہر کے کھانے پر یہ معلوم ہوا کہ شام کو لاری ہاؤس میں جناب مقبول احمد لاری صدر ہیرا کاڈی لکھنؤ کی طرف سے حضرت وفا اور حالی صاحب کو عصرانہ پیش کیا جائے چنانچہ شام کو ۴ بجے علامہ اختر علی تلہری۔ خواجہ اطہر حسین اور ماموں جان کے ساتھ وفا صاحب اور حالی صاحب

لارڈ بہادر تشریف لے گئے۔ اگرچہ حالی صاحب اپنے نام اور
پیشہ کے لحاظ سے ان بزرگانہ صفات والے بن جانے کے لیے
مجبور تھے مگر دل انکا ہم جیسے نوجوانوں کے ساتھ لکھنؤ کی
سیر کرنے کے لیے مچل رہا تھا۔ لکھنؤ اور شام اودھ کے بارے
میں انہوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا چنانچہ سرزمین لکھنؤ پر قدم
رکھتے ہی انکا دل بے ساختہ شام اودھ کی حسین رعنائیاں اور
انکی جادوگری دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ہوٹل کے دروازہ کے
باہر قدم بڑھاتے ہوئے بڑی مسرت سے مجھے دیکھا اور بولے۔
"جعفر بھائی! میں کل آپ کے ساتھ جاؤنگا۔ میں ذرا لکھنؤ
دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کل آپ اس اولڈ
پارٹی سے جدا ہو کر ینگ پارٹی سے مل کر تو دیکھئے تو کیا مزہ آتا ہے"

"جی ہاں۔ وہ بولے" میں تو اب گھبرا سا گیا ہوں۔ جدھر
جاتا ہوں داڑھیاں ہی داڑھیاں دکھائی دیتی ہیں۔" انکے لہجے میں
بڑی مایوسی تھی۔

"اچھا تو آپ ابھی سے داڑھی والوں سے گھبرا گئے۔"
حضرت وفا نے ہنستے ہوئے ایک چوٹ کی اور انکو اپنے ساتھ لیتے
ہوئے آگے بڑھ گئے۔

لیکن رات میں جب کھانا کھا کر حالی صاحب سونے کے لیے
اوپر جانے لگے تو بولے۔ "جعفر بھائی! چونکہ کل ۵ نومبر کو اردو کلب
کی ہونے والی نشست بڑے صاحب کے مکان پر انکے بیمار ہو جانے کی
وجہ سے ملتوی ہو گئی ہے لہذا میں ہردوئی اپنے کچھ عزیزوں سے ملنے
جا رہا ہوں انشاءاللہ دوسرے دن آپ کے ساتھ پھر لکھنؤ کا پروگرام
ہو سکے گا۔

میں خاموش ہو گیا۔ مگر کل کی ادھوری نشست کو مکمل
کرنے کے اصرار نے وفا صاحب اور حالی صاحب کو پھر کچھ سنانے پر
مجبور کر دیا اور ہم لوگ بڑی دیر تک ان حضرات کے کلام کی بندشوں
شیرینی اور نئی فکروں سے اپنا سر دھنتے رہے۔

صبح کو جب میں حالی صاحب کے کمرہ میں پہونچا تو حضرت
سو رہے تھے اور نیچے حافظ جی باورچی خانہ سے غائب تھے کھانی
دستے انکی جگہ گیتی اور ممانی جان نے لے رکھی تھی۔ تاکہ ناشتہ
تیار کر کے حالی صاحب کو ہردوئی جانے کے پہلے دے دیا جائے
آج حافظ جی بیمار ہو گئے تھے۔ ماموں جان کے ہاں حافظ جی
بقول انکے سلمانؓ کا درجہ رکھتے ہیں۔ باورچی خانہ میں انہیں کی
حکومت چلتی ہے کوئی دوسرا دخل نہیں دے سکتا۔ "بی بی"
کا ہلکا سا اعتراض بھی ناپسند خاطر نہیں ہوتا۔ وہ جس عالم میں ہوں
کام کرتے رہینگے۔ انکے خیال میں کوئی دوسرا ٹھیک سے نہیں
کر سکے گا مگر آج حافظ جی بیمار تھے۔ ممانی جان باورچی خانہ میں
الجھی ہوئی تھیں۔ انکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا معلوم نہیں یہ سرخی
آگ کی تپش کی وجہ سے تھی یا حافظ کے جان بوجھ کر بیمار
ہو جانے کی وجہ سے۔ کیونکہ وہ پرہیز کرتے نہیں اور اکثر اس
ضعیفی میں ثقیل چیزیں کھا بیٹھتے ہیں جو ان کو تڑپا دینے کے لیے
کافی ہوتی ہیں۔

بہر نوع حالی صاحب ناشتہ کرنے کے بعد ہردوئی کے لیے
روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن تک انکو بخیریت پہونچانے کے لیے میاں
احسان ساتھ ہو لیے اور وفا صاحب ماموں جان کے ساتھ پھر
اپنے کاروباری کام کی غرض سے نکل گئے۔

دوپہر میں کھانا کھانے کے بعد وفا صاحب نے کچھ آرام
کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور اجازت پاتے ہی خوشی خوشی
اوپر سونے کے لیے چلے گئے۔ ماموں جان نے اپنے ساتھ لائے ہوئے
ایک بنڈل کی طرف دیکھا اس میں سے کچھ اپنی مطبوعہ کتابیں
سر سید احمد پاشا۔ شمیم بانو۔ ہمارا گاؤں۔ ناول کی تاریخ و تنقید
کومل نگری۔ اور گانے امان نکالیں اور حضرت وفا اور پروفیسر
علیم اللہ حالی کے نام انہیں یادگاری تحفہ قرار دیا۔ تھوڑی دیر
آرام کرنے کے بعد پسندوں کے خیال نے ماموں جان کو لیٹنے
نہ دیا۔ انہیں ندامت تھی کہ وہ مہمانوں کی دل پسند تواضع
چیزوں کی نایابی کی وجہ سے نہیں کر پا رہے تھے۔ موجودہ گرانی
اور قلت انکے مقولہ زیستن برائے خوردن کو خوردن برائے زیستن

کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ غرض انہوں نے پسندے کے لئے سارے مسالوں کی ہدایات خود گیتی کو دیں۔ ابھی اس "علم سینہ" کی تعلیم ختم نہ ہونے پائی تھی کہ معلوم ہوا کہ نواب افسر حسین صاحب آفت نرہی تشریف لائے ہیں۔ پھر عابد سہیل صاحب مدیر کتاب لکھنؤ بھی آ گئے۔ وفا صاحب کو خبر دی گئی اور وہ ان حضرات سے ملنے کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ اور میں صحن میں کھڑا ان ہی کا یہ مطلع مسکرا مسکرا کر دہراتا رہا ع

یہ جو پنچھی ہے امانت تری لوں سینہ بہ سینہ

چائے کے بعد جب یہ حضرات رخصت ہوئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ نماز مغرب کے بعد وفا صاحب نے کلب مصطفیٰ صاحب ایڈوکیٹ کے ہاں جانے کے لئے استخارہ دیکھا تو منع آیا۔ پھر وہ مجھے بیگم مفتی رضا انصاری فرنگی محلی کو ٹیلیفون کرنے اور سحر و منزل میں شاہجہاں بانو یاد دہلوی سے ملنے کے لئے چلے۔

گولا گنج کی پیچ گلیوں کو پار کر کے جب ہم لوگ سحر و منزل کے زینہ پر چڑھنے لگے تو دروازہ پر شاہجہاں بانو یاد دہلوی "آرٹسٹ" کی چلتی تختی دکھائی دی۔ احتیاطاً "کال بل" بجائی کہ دریافت کریں کہ کب تک آئینگی۔ ایک عورت نمودار ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ ابھی تشریف لائی ہیں۔ وہ ہم لوگوں کو اندر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ ڈرائنگ روم باقاعدہ سجا ہوا تھا۔ جگر مراد آبادی اور غالب دہلوی کی آشام داڑھیوں کے درمیان شاہجہاں بانو ساقی کی یاد دلاتی نظر آئیں۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ خود ہنستی بولتی اندر چلی آئیں۔

رسمی تسلیم و آداب کے بعد وفا صاحب سے مشاعروں کی گفتگو شروع ہو گئی اور بعد میں چلتے وقت کل رات میں کھانے کا اصرار بھی ہوا۔ وفا صاحب کشمکش میں پڑ گئے کہ حسینی صاحب کی اجازت کے بغیر انکے لذیذ کھانوں سے کیسے محروم ہو جائیں۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے "کہئے جناب اجازت ہے!"

شاہجہاں بانو یاد صاحبہ کے اصرار پر یا مرد بیان کی نیابت کرنا ہی پڑی۔

"اچھی بات ہے کل رات وفا صاحب اور حالی صاحب آپ کے ہاں ضرور ماحضر تناول فرمائینگے۔"

"اور آپ بھی تشریف لائیے گا؟" یاد صاحبہ نے مجھ سے فرمایا۔

"میں!۔۔۔"

"جی ہاں، آپ کشور زیدی کے بھائی ہیں۔ وہ میری بڑی اچھی سہیلی ہیں۔ تو حسینی صاحب کو بھی مدعو کرتی مگر وہ بہت بزرگ ہیں۔ ڈر لگتا ہے ذرا۔"

اور جب ہم لوگ چلنے لگے تو پھر کل کا اصرار رہا۔

سحر و منزل سے نکل کر جب گھڑی پر نگاہ پڑی تو آٹھ بج رہے تھے۔ وفا صاحب کو چلتے وقت گیتی کا ایک جملہ یاد آیا "دیکھئے ۸ بجے تک یہ لوگ پلٹ آئیں تو سویرا ہے۔" چنانچہ ہم لوگ گھر کی طرف چلنے لگے کیونکہ اب رضا انصاری صاحب کا ملنا بھی مشکل تھا۔ ٹیلی فون پر معلوم ہوا کہ وہ قومی آواز کے دفتر سے تشریف لے جا چکے ہیں۔

ہم لوگ کچھ خوش، کچھ اداس گھر پہنچے۔ اور ماموں جان کو روداد سنائی تو وہ کچھ ناراض سے ہو گئے "تم لوگ تو بزرگوں کی نصیحتوں پر عمل کرتے نہیں۔ اپنی من مانی کرتے ہو۔ اگر پہلے ٹیلی فون کر لیا ہوتا تو رضا انصاری بھی مل گئے ہوتے اور۔۔۔" مگر اب کرنا کیا تھا۔ دوسرے دن ملنے کی امید لئے وفا صاحب ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھے جہاں سیخ کباب کی سوندھی سوندھی خوشبو سب کو مسحور کر رہی تھی۔

حالی صاحب کی غیر حاضری رات کے کھانے پر بری طرح محسوس کی گئی۔ اگرچہ انکا انتظار کافی دیر تک رہا۔ مگر یہ حضرت دوسرے دن قریب بارہ بجے تشریف لائے۔ اور اس طرح مسٹر بھٹیانی کے یہاں صبح کے ناشتے سے جو ان لوگوں کے اعزاز میں ہوا تھا محروم رہے۔

چونکہ آج شب میں شاہجہاں بانو یاد [illegible] کے ہاں ان لوگوں کی دعوت تھی اور دوسرے دن روانگی کا پروگرام تھا لہٰذا دیہاتی کھانا کھلانے کی ٹھہری اور خالص باوری طریقوں سے کھانا تیار کرایا گیا۔ نیا چاول، "سگ پتیا"، کڑھی، آلو کا کباب۔

زردے کے موجد
احمد حسین دلدار حسین پرائیویٹ لمیٹڈ
چوک لکھنؤ
تیار کردہ
زردہ
قوام
گولی
اسکی لذت شروع سے آخر تک یکساں قائم رہتی ہے
احمد حسین دلدار حسین پرائیویٹ لمیٹڈ
ہیڈ آفس:۔ چوک لکھنؤ-۳
کارخانہ: عبدالعزیز روڈ لکھنؤ
فون:۔ ۳۵۳۱۷
فون:۔ ۲۵۹۵۴

غضنفر نواب دانش عظیم آبادی

ممتاز فنکار
علی عباس حسینی

128776
19.07.92

عطا ہوا تجھے وہ زورِ خامہ فرسائی
کہ ہاتھ چوم لے تیرا فسانہ آرائی

ترے قدم پہ سلاست جھکائے سر اپنا
ترے قلم کی فصاحت کرے پذیرائی

تری بلاغتِ فن سے فرشتے حیرت میں
کہ تیری پشت پہ ہے کوئی دستِ بالائی

تری ادائے نگارش میں، وہ کشش ہے کہ روز
ادب سے دیکھتا ہے جھک کے چرخِ مینائی

تری کہانیاں وہ جذب و کیف رکھتی ہیں
کہ سن کے رم نہ کریں آہوانِ صحرائی

ترے فسانوں میں نشتر بھی ہے خمار بھی ہے
کہ چونک اٹھا کوئی پڑھ کر کسی کو نیند آئی

تصورات میں شان و شکوہ و رفعت کوہ
نگارشات میں ہے بے پناہ پہنائی

تری جناب میں حاضر معانی و الفاظ
ترے ہی در پہ مضامیں کریں جبیں سائی

ہے تو ہی شانہ کشِ زلفِ پرخمِ ادراک
تو ہی فسانہ نویسی کی علتِ غائی

کہیں پہ تو نے کی، تحلیلِ سرِّ نفسیات
کسی مقام پہ شرحِ نکاتِ گیرائی

ہزار فلسفہ و منطق اک طرف ممتاز[1]
اور ایک سمت تری سادگی و رعنائی

تری نگارشیں جیسے شراب پی کے غزل
شعورِ شاعرِ رنگیں میں لے اک انگڑائی

کبھی کبھی تری تحریر ایسی لگتی ہے
کہ جیسے دور پہ بجتی ہو دھیمی شہنائی

ترے قلم میں وہ تاثیر ہے خرد کی قسم
کہ عشق ہی نہیں ہو جائے حسن سودائی

تپاں ہے تیرے لیے پارہ[2] صورتِ سیماب
ترے فراق میں روتی ہے ارضِ آبائی

کسے نصیب ہو دانش یہ دن بجز عباس
کہ جیتے جی ہوئی تیری یہ قدر افزائی

ادب ہے بس علی عباس ذی حشم کے لیے
قلم ہے تیرے لیے اور تو قلم کے لیے

[1] ممتاز آپ کا عرف نام ہے آج سے کم و بیش بیالیس سال قبل اسی نام سے پہلے پہل میرے کان آشنا ہوئے تھے۔ (دانش)

[2] پارہ ضلع غازی پور آپ کا وطن مالوف ہے جہاں کے لوگ اب آپ کی اک نگاہ غلط انداز کو ترستے ہیں۔ (دانش)

مچھلی شہری

سلام

حسینی کے افسانوں میں دلکشی ہے

حسینی کے افسانوں میں روشنی ہے

حسینی کے افسانوں میں زندگی ہے

مگر خود حسینی کے احوالِ دل بھی

کسی خاص عالم بنا احتیاط سے پوچھو

کسی بزمِ شبستانِ اطہر سے پوچھو

اگر فکر میں ہو تو کشور سے پوچھو

ہیں جب آپ بھی ہمدوش شیریں حبیب و تحسینا ہوں

تو خود آپ ان کو ادیبوں میں سب سے کہیں دیکھتا ہوں

وہ اردو فسانے کے اس دور میں بھی

ہمیں فکر و فن کی ضیا دے رہے ہیں

نئے لکھنے والوں کو از راہِ شفقت

خیالات کا آئینہ دے رہے ہیں

وہ ذہنوں کی اس مضطرب سی فضا میں

چمن زارِ دل کی ہوا دے رہے ہیں

سلام ان کو مجھ سے محبت رہی ہے

مجھے بھی ہمیشہ عقیدت رہی ہے

ندیم کرمانی

میرے ماموں جان

[جناب سید علی عباس حسینی مدظلہ]

(۱)

ترے مزاج نے پائی شگفتگی گل کی
شفق کی نرم کرن سے ترا ضمیر بنا
ملی حیات کو پاکیزگی محبت کی
حسینیت کے شرف سے ترا خمیر بنا

(۲)

نگاہ و فکر کی تابانیاں کبھی نہ گئیں
اگرچہ وقت کا موسم ہوا کبھی غم آلود
عجب تضاد کا سنگم ہے پیکرِ مومن
لبِ آشنائے تبسم نگاہ غم آلود

(۳)

مثال ہی نہیں ملتی نوازِ طبیعت کی
کہیں تو ابرِ سرِ دشت و کوہسار کہیں
مسافرانِ رہِ مہر و عاشقی کے لیے
ترے وجود کو اک نخلِ سایہ دار کہیں

(۴)

سرشت مہر کی ہے دائم جلوہ گری
سوائے نور ملے کیا سحر کے آنچل سے
خیال سادہ میں رنگینیوں کا عکس لطیف
کرن سی پھوٹ رہی ہے سفید بادل سے

(۵)

ثباتِ دل نے حوادث سے مات کب کھائی
جنوں ہمیشہ حریفِ غمِ زمانہ رہا
سکندرانہ شکوہ و جلال کے باوصف
مزاجِ سید خوش خو قلندرانہ رہا

(۶)

ملی ہے جب بھی زبانِ قلم بیاں کے لیئے
کھلے ہیں اہلِ نظر پہ حقائق و اسرار
ہر اک فسانے کی سیرت بلند پاتا ہوں
کہ ہے مصنفِ کردار صاحبِ کردار

(۷)

ملا ہوں تجھ سے تو محسوس یہ ہوا ہے مجھے
ہنوز ملنے کے ارمان پائے جاتے ہیں
دراز عمر تری اے نمونۂ اخلاق!
ابھی زمانے میں انسان پائے جاتے ہیں

(۸)

ترے قلم نے، قلم کی ہر ایک جنبش نے
ہزار تذکرۂ نو بہار چھیڑے ہیں
ضمیرِ نوعِ بشر کی تہوں کو کھولا ہے
حیاتِ فطرتِ انساں کے تار چھیڑے ہیں

(۹)

تری نگاہ نے ماضی کی روح کی ہے تلاش
ترے شعور نے فردا کی ضو کو ڈھونڈا ہے
نہ جانے کتنے اندھیروں میں ٹھوکریں کھا کر
نگارِ فن کے لیئے صبحِ نو کو ڈھونڈا ہے

(۱۰)

مطالعات کا جادہ جہانِ صد اسرار
مشاہدات کی منزل رموز سے معمور
چھپا کے پیرہنِ لفظ میں دکھائے ہیں
حیاتِ عصر کے پھوڑے سماج کے ناسور

(۱۱)

قلم کی سیر ادب کے چمن میں یوں جیسے
دیارِ لالہ و گل میں صبا ٹہلتی ہے
حکایتِ چمنِ زندگی سنائے جا
اداس اداس طبیعت ذرا بہلتی ہے

(۱۲)

ملا ہے نیری نگارش کے توشہ خانے میں
تبر بھی، جام بھی، تیشہ بھی، آبگینہ بھی
غبارِ چہرۂ دہقانِ سوگوار کے ساتھ
جبینِ محنتِ مزدور کا پسینہ بھی

(۱۳)

نقابِ ظلم کو نوکِ قلم نے چاک کیا
جفا کی روح ترے طنز کی شکار رہی
شہوں کے قصر پہ زردار کے نشیمن پر
کہاں کہاں تری بجلی نہ شعلہ بار رہی

(۱۴)

سپردِ صفحۂ قرطاس کی ہے جراَت سے
ادائے فتنہ گری گاؤں کے غداؤں کی
جو وقتِ شام گھروں کے دیے بجھاتی ہیں
سنی ہیں تو نے وہ سرگوشیاں ہواؤں کی

(۱۵)

سکوت کھیت کے پگ ڈنڈیوں کی خاموشی
کلی کا خواب، بیاباں کی آبلہ پائی
کنارِ نہر شبِ ماہ، دردِ مہجوری
جنوں پسند حسینہ کی شامِ تنہائی

(۱۶)

شفق، بہارِ چمن، پنکھڑی، صبا، شبنم
نئے شباب کی چنری، نئے سہاگ کی نتھ
ہلوں کے زمزمے، پونم کے نقرئی کھلیان
رواں جنوں کی اجالی میں مدیو کا رتھ

(۱۷)

ندی کا موڑ، پہاڑوں کا سرد سناٹا
حسین شام کا گھونگھٹ، بھری بھری چھاگل
شباب و خضاب کی راتیں، گلال کا موسم
غبار خوردہ گریباں، پھٹے ہوئے آنچل

(۱۸)

وفا کی ایسی کہانی خودی کی وہ روداد
کہ جس کو سن کے دلوں میں کلی سی کھلتی ہے
تری فسانہ طرازی کے سادہ پیکر میں
دیارِ ہند کے گانوں کی روح ملتی ہے

(۱۹)

عناں مڑی ہے جو شہروں کے قصرِ زر کی طرف
تو کانپ اٹھی ہیں تہذیبِ نو کی بنیادیں
لہو کے رنگ نظر آئے ہیں تہِ غازہ
ملی ہیں موجِ تبسم میں لاکھ فریادیں

(۲۰)

کہاں وفا کی صداقت کہاں جنوں کا خلوص
طلسم اڑتے ہیں پریوں کی رقص گاہوں میں
نمائشوں کے تمدن کی زندگی جیسے
پڑا ہو پیکرِ بے جاں ہوس کی باہوں میں

(۲۱)

فریب و مکر و ریا و نمود و حرص و ہوا
تہِ لباس ہزاروں ہی داغ ملتے ہیں
گھٹی ہوئی انسانیت مٹی تو نہیں
انہیں اندھیروں میں اکثر چراغ ملتے ہیں

(۲۲)

فسانۂ غمِ ہستی فقط فسانہ نہیں
ملے گی کوئی حقیقت ہر اک فسانے میں
کسے نصیب تری کلکِ حق نگار کا حسن
پڑے ہیں یوں تو مصنف بہت زمانے میں

(۲۳)

ترا تبسم ترے آستاں کا اک ذرہ
جسے عروجِ سخن تیری مکرمت سے ملا
یہ شوقِ نغمہ سرائی یہ ذوقِ فنکاری
جو کچھ ملا تری آغوشِ تربیت سے ملا

اعترافِ کمال

● ہوش عظیم آبادی

ہنوز جس سے سلام و پیام کچھ بھی نہیں
بنا ہے آج وہ مرکز مرے خیالوں کا
کوئی ضرور نہیں ہے تعارفِ شخصی
کمال عین تعارف ہے باکمالوں کا

○

وہ کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو دیکھنا یہ ہے
کہ اُس میں ندرتِ فکر و خیال ہے کہ نہیں
یہ بات خود سبب اعتراف ہے یعنی
ہے جس کی بات وہ اہلِ کمال ہے کہ نہیں

○

جب اس نظر سے حسینی کے فن کو دیکھتا ہوں
تو ایک جلوۂ صد رنگ مسکراتا ہے
ہر اک فسانے میں عکاسی حیات کے ساتھ
کمالِ فکر و نظر معجزے دکھاتا ہے

○

خوشا وہ زورِ قلم جس کی ایک جنبش میں
نوائے چنگ بھی ہے نغمۂ رباب بھی ہے
زہے وہ جذبۂ جوشِ رقم جو پیری میں
مصوّرِ ہمہ کیفیت شباب بھی ہے

○

یہ دیکھتا ہوں کہ سارا معاشرہ گویا
ہے آج دعوت صد رنگ اک نظر کے لئے
یہ زندگی جو حقیقت بھی ہے فسانہ بھی
ہے بے قرار خود اپنے فسانہ گر کے لئے

علی عباس حسینی ایک نظر میں

مرتبہ
ادارہ

نام :۔ سید علی عباس حسینی

وطن :۔ موضع پارہ ضلع غازی پور۔ (یوپی)

تاریخ ولادت :۔ ۳ر فروری ۱۸۹۷

والد ماجد :۔ جناب مولانا سید محمد صالح صاحب مرحوم و مغفور

تعلیم :۔ ایم اے۔ ایل ٹی۔

پیشہ :۔ معلمی، افسانہ نویسی اور مضمون نگاری۔

سب سے پہلا افسانہ :۔ پژمردہ کلیاں (۱۹۱۸ء)

سب سے پہلا افسانہ جو شایع ہوا :۔ حیدر کامل (۱۹۲۵) زمانہ کانپور

سب سے پہلا ناول :۔ سید احمد پاشا (۱۹۱۹ء)

مدت ملازمت (سرکاری) :۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۵۴ء

افسانوں کے مجموعے جو اب تک شایع ہو چکے ہیں :۔ (۱) رفیق تنہائی (مکتبہ لاہور۔ (۲) باسی پھول (مکتبہ لاہور) (۳) میلہ گھومنی (مکتبہ لاہور) (۴) آئی سی ایس (انڈین پریس الٰہ آباد) (۵) کچھ ہنسی نہیں ہے (انڈین پریس الٰہ آباد) (۶) ہمارا گاؤں (فروغ اردو لکھنؤ)۔ (۷) پھولوں کی چھڑی (دانش محل لکھنؤ) (۸) ایک حمام میں (اردو اکیڈیمی سندھ کراچی)

افسانوں کی تعداد :۔ تقریباً ڈھائی سو سے زیادہ۔

دیگر نگارشات :۔ پانچ ناول۔ ایک ڈرامہ اور کچھ تنقیدی مضامین۔

شادیاں (دو) اور اولادیں :۔ سید مہدی عباس حسینی ڈبل ایم اے۔ کمیونیٹی ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ میں انگریزی کے ایڈیٹر ہیں۔ بڑی صاحبزادی کشور زیدی بی اے (مشہور اہل قلم۔ اب تک اپنی کتابوں پر پانچ انعامات حاصل کر چکی ہیں) ان سے چھوٹے باقر عباس حسینی ایم اے (اینتھروپالوجی) جو آج کل امریکہ میں مزید ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔۔ انکے بعد اصغر عباس حسینی (جو بمبئی میں فلم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں)۔ انکے بعد ثریا آرا حسینی ایم اے (سائیکولوجی) ہیں اور اب اسی موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ سب سے چھوٹی نازش حسینی نے اس سال ہائی اسکول پاس کیا ہے اور ان دنوں انٹر سائنس میں پڑھ رہی ہیں۔

سید اختر علی تلہری

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی تھی
اس وقت جوبلی کالج لکھنؤ میں عربی و فارسی کے معلم کے فرائض ادا کرتا تھا۔ اور
وہیں وہ بھی تاریخ و انگریزی کے مدرس کی حیثیت سے گورنمنٹ ہائی اسکول
رائے بریلی سے بدل کر آئے تھے چند ہی دنوں میں اس ملاقات نے دوستی و
یگانگی کی صورت اختیار کر لی اور خدا کا شکر ہے کہ اب بھی جبکہ ہم عمر کی آخری منزلیں
طے کر رہے ہیں اس اخلاص و اخوت میں کوئی کمی نہیں۔

میں نے حسینی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اسلیئے مجھے انکے بارے میں کچھ لکھتے
ہوئے خاصی جھجھک محسوس ہوتی ہے۔ بارہ برس جوبلی کالج میں ہم دونوں گویا ہم نوالہ
ہم پیالہ رہے ہیں۔ اور مزاجوں اور طبیعتوں میں یکسانیت کے علاوہ خیالات و نظریات
میں بھی بڑی حد تک اتفاق رہا ہے۔ اس لیے حسینی کا پول کھولنا ایک طرح اپنا
بھی پول کھولنا ہے۔

وہ اچھے خاصے لمبے قد کے مالک بھاری بھرکم شخص ہیں۔ رنگ گندمی ہے
ترش مزاج اور مرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی ہیں۔ انکی طینت کا خمیر جن عناصر سے
تیار ہوا ہے ان میں کہیں سے کینہ و حسد و نفرت و دل آزاری کی گنجائش نہیں ہے
گویا وہ صحیح معنوں میں سید ہیں۔ وہ صاف گو بھی غضب کے ہیں۔ کوئی بات اگر مزاج کے
خلاف ہوتی ہے تو وہ منہ پر دھڑلے سے صاف صاف کہہ دیتے ہیں۔ مگر کسی کی طرف سے
دل میں برائی لیئے رہنا ان کے لیئے ناممکن ہے۔ ان کا مقولہ ہے کہ بڑے سے بڑے
آدمی کو بھی ایک چھوٹا آدمی نقصان پہنچا سکتا ہے مگر چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی
بڑے سے بڑی شخصیت جب تک توفیق الٰہی شامل نہ ہو نفع نہیں پہنچا سکتی۔
حسینی کی یہی مخلصانہ روش اپنے شاگردوں سے بھی رہی ہے اور اپنے ماتحتوں
سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد بھی ان سے محبت کرتے ہیں اور انکے
ماتحت، ساتھی ملاقاتی اور دوست بھی۔

حسینی کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ تاریخ کے ایم اے ہیں مگر انگریزی ادب اور
فلسفہ الٰہیات بھی انکی خاص دلچسپی کی چیزیں ہیں انہیں انگریزی ناول پڑھنے کا
شوق ہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں "ہوکا" ہے۔ اور جب تک انہیں کوئی خاص تصنیف
نہیں کرنا ہوتی ہے وہ زیادہ تر وقت انہیں کے مطالعہ کی نذر کرتے ہیں۔ پہلے
قریب قریب چھ گھنٹے روزانہ پڑھتے تھے اب جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں چودہ پندرہ
گھنٹے یہی بیکاری کا مشغلہ ہے۔ ان کو لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق ہے چاہے
وہ کسی دائرے کی چیز ہو۔ ترجیح حق انگریزی ناول ہی کو حاصل ہے۔

ان کی تصنیفات بکثرت ہیں۔ ان میں نصف درجن سے زیادہ افسانوں کے
مجموعے ہیں۔ رفیق تنہائی۔ آئی سی ایس۔ کچھ ہنسی نہیں۔ باسی پھول۔ میلہ گھومنی۔
الجھے دھاگے۔ ہمارا گاؤں وغیرہ۔ دو ناول ہیں مر سید احمد پاشا۔ شاید کہ بہار آئی
ایک مزاحیہ ہے حکیم بابا۔ ایک ایک ایکٹ کے ڈراموں کا مجموعہ نو رتن۔
اور ایک تنقیدی کتاب "ناول کی تاریخ و تنقید" میری نظر سے گذرے ہیں۔
آخر الذکر ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو اس موضوع پر اردو میں نہ صرف اول اور
ایک حد تک حرف آخر کا بھی درجہ رکھتا ہے۔ یہ تصنیفات حسینی کی وسعت نظر کی
شاہد ہی نہیں ہے بلکہ انکے بے لاگ غیر جانب دارانہ انتقاد کی بھی۔ انہوں نے
مستحکم اصول کی ترازو پر تول کر ہر ناول نویس کو وہی جگہ دی ہے جسکا وہ صحیح
معنوں میں مستحق ہے۔

اعتدال و میانہ روی حسینی کا خاص شعار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح
معنوں میں ترقی پسند ہونے کے باوجود نام نہاد ترقی پسندوں کی نظر میں
"قدامت پسند" ہیں۔ ان حضرات کے یہاں ترقی پسندی کے لیے ایک مخصوص

سیاسی نظریے پر ایمان لانا اور اسی کا ڈھنڈھورا پیٹتے رہنا ضروری ہے۔ فن کا اب جتنا بھی خون ہو۔ اخلاقی قدریں اور انسانی رشتے، ازلی قدریں بھی برباد ہوں، انسانی مقتضیات خواہ سب مٹ جائیں مگر وہی سوچ جو مارکس اور لینن نے انکے زمانے میں سوچا ہے۔ اسی سانچے میں ڈھالنا اور جو سانچا ان کا محبوب ہے اور جہاں انقلاب ہی آزاد اصول سے بغاوت کر دیں کی تعلیم ناگزیر اشتراکیت کے پیش رہے گئے ہیں۔

اب یہ ہر شخص کے بس کی بات تو نہیں۔ حسینی "حریتِ فکر" کے علمبردار ہیں آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہارِ رائے کے مؤید۔ وہ کسی آمرانہ بنائے ہوئے سانچے میں کیسے ڈھل سکتے ہیں۔ انہوں نے خود بھی کچھ پڑھا لکھا ہے۔ خود بھی کچھ سوچا سمجھا ہے وہ اس طرح کی آمریت کے بنائے ہوئے شکنجوں میں کیسے کسے جا سکتے ہیں۔ پھر وہ خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ موحد ہیں۔ مسلم ہیں۔ مومن ہیں۔ پھر انہوں نے جو راہ اختیار کی ہے وہ مطالعہ کے بعد، غور و فکر کے بعد۔ ایسی حالت میں انہیں غیر مبصرانہ تقلید کی زنجیروں میں، جو الحادی ہی سہی کیونکر جکڑا جا سکتا ہے۔ وہ شاید اثنا عشری ہیں مگر تکفیری جھگڑوں سے بے نیاز۔ اپنے زعم میں بھرپور احترام نماز کے سختی سے پابند ہونے کے باوجود وہ کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ کچھ تو اس لیے کہ مجمع میں ان کا نماز پڑھنے سے جی نہیں بھرتا اور کچھ اس لیے کہ وہ اپنے اور اپنے معبود کے درمیان کسی دوسرے کے حائل ہو جانے کو پسند نہیں کرتے۔ ہاں تو وہ مروجہ اصطلاحی معنوں میں، ترقی پسند نہیں ہیں لیکن اگر ترقی پسندی کے معنی ہیں انسانیت کو اس کے اعلیٰ مدارج کی طرف لے جانا۔ اس کی جسمانی، ذہنی، اقتصادی، ثقافتی اور روحانی ترقیوں کے لیے اُسے ابھارتے رہنا اور زمین کو ایک بہتر دنیا بنانے کی مساعی میں صرف کرنا اور صالح اقدار کو ابھارنا اور منور بنانا تو حسینی یقینی طور پر اور بہتر طور پر ترقی پسند ہیں۔

حسینی صاحب نے بہت سے انتقادی مضامین بھی لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا کوئی مجموعہ کتابی صورت میں اب تک شائع نہیں ہوا۔

اس نوع کا ان کا ایک مقالہ جو پروفیسر کلیم الدین احمد کی "اردو شاعری پر ایک نظر" کے ایک باب "گلِ نغمہ" سے متعلق ہے طنز و نقد کی ایک نادر مثال ہے۔ حسینی صاحب نے اسی زمانہ میں ایک ضخیم کتاب ان تمام اعتراضات کے جواب میں لکھ ڈالی ہے جو مولانا آزاد و حالی کے زمانے سے اب تک ان کے اصناف پر کیے گئے ہیں یا کیے جاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب اب تک غیر مطبوعہ حالت میں پڑی ہے۔ ناول کی تاریخ و تنقید کی طرح یہ بھی حسینی کا ایک غیر فانی کارنامہ ہوگا۔

بحیثیت افسانہ نگار کے حسینی صاحب بڑے بڑے افسانہ نگاروں سے آگے نکل گئے ہیں۔ حسینی حقیقت پسند ہیں وہ جنسی مسائل پر بھی لکھتے ہیں۔ البتہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کے اس نوعیت کے افسانوں میں فحاشی یا لذتیت نہ پیدا ہونے پائے۔ حسینی کے افسانوں کا کینوس اپنے معاصرین سے خاصا بڑا ہے۔۔۔۔۔

وہ آج کل تعمیری افسانے اور کہانیاں لکھنے پر زیادہ مائل ہیں۔ غالباً وہ اپنے فن کے بناؤ سنگار سے زیادہ ملک کی بیداری اور تعمیر میں حصہ لینا زمانۂ حاضرہ کے ادیب کے لیے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا تازہ ترین ناولچہ "ندیا کنارے" اسی جذبہ کا نتیجہ ہے۔

"مظہر امام کی شاعری زخمِ تمنا بھی ہے اور تمنائے زخم بھی۔ وہ گلہ مند ہی نہیں حوصلہ مند بھی ہیں۔ رومانیات ہو یا سماجیات زندگی سے اُن کا بڑا مفاہمانہ سمجھوتا ہے۔ وہ مصلحت پسند نہیں مصالحت پسند ہیں اسی لئے انکی شاعری میں جذبات و احساسات کی بڑی شریفانہ ترتیب و تہذیب ملتی ہے انکا کلام محض انکے ادبی ذوق کا نہیں انکی شخصیت کا بھی اظہار ہے"

— آرشد کاکوی

مظہر امام کا خوبصورت شعری مجموعہ

زخمِ تمنّا

جدید اردو شاعری کی ایک قابلِ مطالعہ مثال

ضخامت ۱۷۶ صفحات — قیمت تین روپیے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

خط و کتابت میں اپنا خریداری نمبر ضرور لکھا کریں۔

— جواب طلب امور کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ آنا ضروری ہے۔

سہیل عظیم آبادی

حسینی صاحب

اخلاق، خلوص، وضع داری اور اس قسم کے الفاظ ہم روز بولتے ہیں، ان لفظوں کے معنی لغت کی کتابوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ لیکن عملی دنیا میں ان کے معنی اگر تلاش کیجئے تو بڑی مایوسی ہوگی۔ بلکہ کبھی کبھی تو گمان ہوگا کہ لغت مرتب کرنے والوں نے یہ الفاظ محض زیب داستان کے لئے، یا کتاب کی زینت کے لئے اکٹھا کر لئے ہیں۔ ورنہ ان لفظوں کے واقعی کوئی معنی نہیں۔ یا پھر شاید کسی زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہوں گے، جن کے لئے ان الفاظ کا استعمال جائز اور درست ہو۔ اس وقت ان لفظوں کے بھی معنی ہوں گے، مگر اب ایسے لوگ دیکھنے میں نہیں آتے۔ اور اب کتابوں سے باہر ان لفظوں کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

مگر جو لوگ حسینی صاحب سے مل چکے ہیں، اور انھیں جانتے ہیں۔ انھیں اب بھی ان لفظوں کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ کہیں گے کہ ان لفظوں کے معنوی مرکب سے حسینی صاحب کا کردار بنا ہے۔ حسینی صاحب سراپا اخلاق، سراپا خلوص اور سراپا وضع داری ہیں — حسینی صاحب کو ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔ اُن کے اعزا، ان کے احباب، اُن کے رفقا، ان کے ملنے جلنے والے، ان کے شاگرد اور اُن کے افسانے پڑھنے والے اور ان میں سے ہر ایک کی رائے اُن کے بارے میں یہی ہوگی۔

جاننے کو تو کہہ سکتا ہوں کہ حسینی صاحب کو اسی وقت سے جانتا ہوں، جب افسانے پڑھنے کا شوق ہوا۔ ان دنوں افسانہ نگاروں میں پانچ نام سرفہرست آتے تھے۔ پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے، جو افسانے لکھتے تھے۔ لیکن سرفہرست یہی نام آتے تھے۔ مجھے پریم چند، سدرشن اور حسینی صاحب زیادہ پسند تھے۔ اس کی بڑی وجہ اُن کا سیدھا سادہ انداز بیان، اور زندگی سے قربت تھی۔ قدرتی طور پر ان سے عقیدت بھی دل میں پیدا ہوئی۔ اور ان سے ملنے اور ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش تھی۔ برادر گرامی علامہ جمیل مظہری اور بعض دوسرے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ حسینی صاحب کا ابتدائی زمانہ پٹنہ میں گزرا ہے۔ تو وطن کی نسبت سے اُن کی ذات سے زیادہ قربت محسوس کرنے لگا۔ ان کو خطوط بھی لکھے، اور جواب میں شفقت سے بھرے ہوئے خطوط بھی آئے۔ اس طرح قربت زیادہ بڑھتی گئی۔ اس زمانے میں کلکتہ کا ادبی ماحول شباب پر تھا۔ مولانا آزاد وہاں تھے۔ گرچہ مجھ جیسے طالبعلم کے لئے اُن کی بارگاہ میں کیا جگہ ہو سکتی تھی۔ پھر بھی زیارت کا شرف حاصل کر ہی آتا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ مگر مولانا آزاد کے علاوہ اور بزرگ بھی وہاں تھے، جن کی ادبی حیثیت مسلم تھی۔ آغا حشر، نواب نصیر حسین خیال، خان بہادر رضا علی وحشت، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا شایق احمد عثمانی، پروفیسر طاہر رضوی، علامہ جمیل مظہری اور بہت سے دوسرے نئے اور پرانے لکھنے والے موجود تھے۔ قابل قدر ادبی نشستیں ہوتی تھیں جہاں دو چار مل بیٹھے۔ ادبی گفتگو شروع ہو جاتی تھی۔ ان کے علاوہ باہر سے بھی ادیب اور شاعر کلکتہ آتے ہی رہتے تھے منشی پریم چند، پنڈت سدرشن، اختر شیرانی، احسان دانش اور بہت سے دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوتی۔ کئی بار سنا کر

حسینی صاحب بھی تشریف لانے والے ہیں لیکن کم سے کم میرے سامنے وہ کلکتہ نہیں پہنچے ۔ اور اُن سے ملنے کا شوق بڑھتا ہی رہا ۔ اور خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا ۔ کبھی کبھی مجھے خط لکھنے میں دیر ہوجاتی تو وہ خود خط لکھتے ۔ خاص کر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو انہوں نے تقریباً اصول بنا لیا کہ جب بھی میری کوئی چیز نظر سے گزرتی ۔ تو خط ضرور لکھتے ۔ ان خطوں میں وہ اتنی ہمت افزائی فرماتے تھے کہ اس وقت کبھی کبھی غلط فہمی ہونے لگتی تھی ۔ اور جب اُن کی کتاب " ناول کی تاریخ اور تنقید " شائع ہوئی تو ایک جلد مجھے بھیجی ۔ جب بھی اُن کا کوئی گرامی ملتا ۔ تو اس سے اندازہ ہوتا کہ میں جس قدر اُن کی عزت کرتا ہوں ، اُن کی شفقت اس سے کم نہیں ۔ لیکن ملاقات کا موقع نہیں نکل سکا ۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں نے ماہنامہ تہذیب جاری کیا تو لکھنو جانے کا اتفاق ہوا ۔ ان دنوں وہ وہاں حسین آباد انٹر کالج کے پرنسپل تھے ۔ خوش ہوا کہ ملاقات کا شرف حاصل کروں گا لیکن جب ان کے دولت خانے پر پہنچا ۔ تو معلوم ہوا کہ دو دن پہلے وہ اعظم گڑھ جا چکے تھے ۔ واپس آ کر انھیں خط لکھا ۔ اور حسینی صاحب نے جواب میں جو کچھ لکھا اسے بھلایا نہیں جا سکتا ۔ اُن کی نیکی شرافت اور بزرگانہ شفقت خط کے ہر لفظ سے جھلکی پڑتی ہے ۔ وہ خط اب بھی میرے پاس محفوظ ہے ۔ غلطی تو میری تھی کہ میں نے انھیں اطلاع تک نہیں دی تھی ۔ اور اچانک لکھنو پہنچ گیا تھا ۔ مگر وہ اس طرح اپنے تاسف کا اظہار کر رہے تھے ۔ جیسے اُن کی وجہ سے مجھے زحمت اُٹھانی پڑی تھی ۔

پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی ۔ اور وہ بھی سرسری طور پر ۔ آل انڈیا ریڈیو کا ساہتیہ سماروہ ہوا ۔ موضوع تھا " ہندوستانی زبان کا مختصر افسانہ " ان دنوں میں سری نگر اسٹیشن پر متعین تھا ۔ ملک کی ہر زبان کے کچھ سربرآوردہ افسانہ نگاروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی ۔ اردو افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی اور حسینی صاحب مدعو تھے ۔ اسی موقع پر اُن سے پہلی ملاقات ہوئی ۔ گرچہ یہ ملاقات بے حد مختصر تھی ۔ لیکن ان کی سادگی اور اُن کی نیکی نے مجھے بہت متاثر کیا ۔ ان کی تصویر جو میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھی ، انھیں اس سے سوا پایا ۔

حسینی صاحب سے ایک بار مل کر کوئی انھیں بھول نہیں سکتا اُن کی نیکی شرافت ، سادگی اور بے ریائی سے متاثر ہونا لازمی ہے ۔ اکہرا بدن ، سانولا رنگ چہرے پر متانت ، لیکن غرور نہیں ۔ سیدھے سادے انداز میں باتیں کرتے ہیں ۔ جب ملتے ہیں بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں ۔ سب سے پہلے گھر بھر کی خیریت پوچھ لیتے ہیں ۔ پھر کوئی دوسری گفتگو شروع کرتے ہیں ، در کہیں نمائش نام کو بھی نہیں ہوتی ۔ جن سے ان کے تعلقات ہیں تو مخلصانہ ۔ ورنہ بالکل نہیں ۔ وہ خواہ مخواہ لوگوں سے ملنے کے عادی نہیں ہیں ۔ اور اس وجہ سے انھیں نقصان بھی پہنچا ۔ لیکن وہ اپنی عادت نہیں بدل سکے ۔ اگر تھوڑی سی زمانہ سازی کرتے تو بہت سے فائدے حاصل کر سکتے تھے ۔ لیکن یہ ان کی طبیعت کے خلاف بات ہے ۔ جس شخص سے جی نہیں ملتا ۔ اس سے الگ ہو جاتے ہیں ۔ اور جس سے ملتے ہیں ، اسے اپنا سمجھ کر ملتے ہیں ۔

حسینی صاحب کو زیادہ سمجھنے کا موقع اس وقت ملا جب میں سری نگر سے تبدیل ہو کر دلی آ گیا ۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس فلیٹ میں میرا قیام تھا اس کے نیچے والے فلیٹ میں حسینی صاحب کے بڑے صاحبزادے مہدی حسینی رہتے تھے ۔ مجھے سری نگر سے آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ حسینی صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے ۔ ان دنوں وہ ساہتیہ اکیڈمی کے لئے ایک کتاب کا ترجمہ کر رہے تھے ۔ کتاب کا نام تو اس وقت یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ کسی امریکی مفکر کی کتاب تھی ۔ انھیں جلد ہی ترجمہ کر کے دینا تھا ۔ اس بار لگ بھگ وہ ایک مہینہ دلی میں رہے ۔ اور ہر روز صبح و شام ملاقات ہوتی رہی ۔ اس کے بعد بھی مجھے اور مہدی حسینی صاحب کو ایک ہی جگہ کوارٹر ملے ۔ حسینی صاحب دلی تشریف لاتے رہے اور ملاقات کا موقع ملتا رہا ۔

حسینی صاحب نہایت خوش اخلاق بزرگ ہیں طبعاً وہ قدامت پسند ہیں ، لیکن اُن کے خیال میں وسعت ہے اور وہ حال کو سمجھتے اور اس سے مصالحت کرنے کے بھی قائل ہیں ۔ زمانے کی تبدیلیوں کو سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ نباہنا جانتے ہیں ۔ بلکہ اگر جدت سلیقے کے ساتھ ہو ، تو اُسے سراہتے ہیں ، البتہ جدت میں وحشت کو وہ ناپسند کرتے ہیں ۔ اپنے عزیزوں سے بھی باتیں کرتے ہیں تو کبھی ان پر دباؤ نہیں ڈالتے

اور اپنی کسی بات کو زبردستی منوانا نہیں چاہتے ۔ اپنے نقطۂ نظر کو سمجھانے اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور کبھی اپنا نقطۂ نظر دوسروں پر لادنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ بلکہ جو کچھ کہتے ہیں اُن کی حمایت میں وزن دار دلیلیں پیش کرتے ہیں ۔

ایک بار ایک خاتون افسانہ نگار کے افسانوں کا مجموعہ میرے پاس آیا ۔ میں نے وہ کتاب حسینی صاحب کو پڑھنے کو دی ۔ انھوں نے وہ کتاب بڑے شوق سے پڑھی ۔ اور کہانیوں کی تعریف کی ۔ البتہ ایک کہانی پر انھیں سخت اعتراض تھا ۔ یہ کہانی ایک ایسی لڑکی کی تھی جو بار بار محبت کا فریب کھا کر خود کو ٹوٹتی اور برباد کرتی رہتی ہے اور آخر میں مایوسیوں کا شکار ہو کر مر جاتی ہے ۔ کہانی کا انداز ذرا سا کا تھا حسینی صاحب کو اس کہانی کے موضوع اور انداز تحریر سے سخت اختلاف تھا اور انھوں نے پڑھنے کے بعد جب کتاب واپس کی تو دوسری کہانیوں کی تعریف کے ساتھ اس مخصوص کہانی کی بڑی بُرائی کی ۔ میں نے لکھنے والی خاتون کے نقطۂ نظر کو سمجھانے کی کوشش کی اور وہ میری دلیلوں کو تردید کرتے رہے ۔ آخر میں انھوں نے فرمایا کہ جس تحریر میں حسنِ خیال حسنِ بیان نہ ہو اور جسے پڑھنے کے بعد دل میں گداز در صحت مند جذبات بیدار نہ ہوں ۔ تو کیا ضروری ہے کہ ایسی چیز لکھی ہی جائے ۔ یہ بحث الگ ہے کہ ایسی چیزیں لکھی جائیں یا نہیں ۔ میں یہاں پر صرف حسینی صاحب کے خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں ۔

روزانہ زندگی میں حسینی صاحب بے حد سیدھے سادے آدمی ہیں ۔ غصہ تو شاید انھیں آتا ہی نہیں ۔ یا پھر غصہ آتا ہوگا تو یقینی طور پر وہ اس کو دبانے پر قادر ہیں ۔ میں نے بارہا دیکھا کہ ملازم نے حماقتیں کیں ، اور نقصان بھی ہوا ۔ لیکن وہ نوکر پر غصہ ہونے کے بدلے ایک دو پُرلطف جملے کہہ کر خاموش ہو گئے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ۔ بلکہ جب اُن کے بچے خفا ہونے لگے تو انھوں نے سمجھانا شروع کیا ۔

حسینی صاحب نماز پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں ، اور دن کا کوئی کام نماز کے بعد ہی شروع کرتے ہیں ۔ زیادہ وقت پڑھنے یا لکھنے میں صرف ہوتا ہے ۔ جب کچھ لکھنا نہیں ہوتا تو پڑھتے ہیں ، اور ہر قسم کی کتاب پڑھتے ہیں ۔ اور جب تھک جاتے ہیں تو آرام کرتے ہیں ، یا باتیں ۔ دلی کے قیام کے دنوں میں اُن کا حکم تھا کہ میں ان سے ہر روز ملا کروں ۔ اور میں اس کی کوشش بھی کرتا تھا ۔ اگر کسی دن حاضر نہ ہو سکتا ، تو وہ خود تشریف لے آتے اور دیر تک بیٹھتے ۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں ان کی خدمت میں کئی دنوں تک حاضر نہ ہو سکا ۔ دفتر سے نکل کر کسی دوست کے یہاں چلا گیا ۔ ان دنوں دلی میں مشاعروں کا سلسلہ بھی تھا ۔ غرضکہ ملاقات نہ ہو سکی ۔ ایک دن جب رات کو گھر واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ دو بار تو حسینی صاحب خود تشریف لائے ، اور دو بار انھوں نے ملازم کو بھیجا ۔ دوسرے دن سویرے ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ تو انھوں نے شکایت فرمائی ۔ اور پھر اصرار کے ساتھ بولے کہ جب تک دلی میں قیام ہے روز مل لیا کرو ۔ پھر کون جانے کب ملاقات ہوگی ۔ بعض اور ملنے والوں سے معلوم ہوا کہ یہ خصوصیت کچھ میرے ساتھ نہیں ۔ بلکہ حسینی صاحب کے تعلقات جن لوگوں کے ساتھ ہیں ۔ اُن کے ساتھ وہ اسی طرح محبت سے پیش آتے ہیں ۔ دلی میں انھوں نے جس انداز سے ہر روز ملنے کی فرمائش کی تھی اور اس انداز میں جتنا اپنا پن اور جتنا خلوص تھا ، اسے میں آج تک نہ بھول سکا ہوں اُن کا یہ فرمانا بھی درست ہی نکلا کہ "پھر نہ جانے کب ملاقات ہو" دلی سے چلے آئے اب چار سال ہو رہے ہیں ، پھر ملاقات نہ ہو سکی ۔

حسینی صاحب جب کسی سے ملتے ہیں تو پہلے یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ کون کس حد تک ملنے کے لائق ہے ۔ اور اسی لحاظ سے اس سے تعلقات بڑھاتے ہیں ، یا ملتے ہیں ۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اُن سے کوئی ملنے آیا اس سے خوش اخلاقی کے ساتھ ملے ، اس سے خاطر کی ۔ اس سے باتیں کیں ۔ لیکن یہ ملاقات جہاں سے شروع ہوئی ، وہیں ختم بھی ہوئی ۔ جب دوبارہ سہ بارہ وہ شخص ملنے آیا ۔ تو ملاقات کر لی اور باتیں کر لیں لیکن اتنی ہی دیر تک ۔ اور اس کے بعد بات ختم ۔ ایسے وقتی ملنے والوں سے ملنے کے لئے وہ زیادہ فکر مند نہیں رہتے ۔ لیکن جن لوگوں سے انھیں خلوص ہو جاتا ہے ۔ اُن سے ملنے کے لئے وہ بے چین سے رہتے ہیں ۔ اور ملاقات ہو چکنے کے بعد ہی انھیں اطمینان ہوتا ہے جن لوگوں سے اُن کے تعلقات مخلصانہ ہو جاتے ہیں اُن سے پھر کوئی تکلف نہیں برتتے ۔ اور جو آدمی انھیں نہیں جچا اُس سے بد اخلاقی بھی نہیں برتتے ۔ یہ اُن کے بس کی بات ہی نہیں ۔ لیکن دوری دور سے ملتے ہیں ۔ دراصل ایسے لوگ حسینی صاحب کو نہیں جان سکتے ۔ نہیں سمجھ سکتے

ہ چار سال سے زیادہ ہوئے حسینی صاحب کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ اور جی بار بار چاہتا ہے۔ لیکن انھیں بھول نہیں سکتا۔ ایسے نیک
ریف، با اخلاق، وضع دار اور شفیق بزرگ کو کون بدنصیب بھولے گا۔
حسینی صاحب نے سیکڑوں افسانے لکھے ہیں۔ اور پڑھنے والوں نے ان کے فن کی عظمت کا لوہا مانا ہے۔ اسی طرح جو
گ ان سے ملے ہیں وہ اُن کی ذات و صفات کی عظمت ماننے پر مجبور ہیں۔ جو لوگ اُن کے افسانے بھی پڑھ چکے ہیں۔ اور اُن سے
بھی ہیں۔ اُن کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ عظیم فنکار ہیں یا عظیم انسان — اور آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ
وہ عظیم فنکار بھی ہیں اور عظیم انسان بھی

جرأت انتخاب

علی عباس حسینی نمبر نکال کر آپ خدمت محض ادب کی نہیں، شرافت و مشرقیت کی بھی انجام دے رہے ہیں۔ اور اس لئے دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بڑے ظالم تھے وہ لوگ جنھوں نے پریم چند اور بابائے اردو عبدالحق کی طرح حسینی کا بھی شمار ترقی پسند ادیبوں میں کیا۔ اگر یہ لوگ بھی ترقی پسند تھے تو پھر ہم سب بھی ترقی پسند ہیں اور غیر ترقی پسند کوئی بھی نہیں۔

بہر حال آپ کی یہ جرأت انتخاب داد تحسین ہی کے قابل ہے۔ والسلام

دریاباد ضلع بارہ بنکی

(مولانا) عبدالماجد

مبارک تجویز

مکرمی، تسلیم

آپ کا نامہ کرم ملا اور یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ "صبح نو" کا ایک خاص نمبر جناب علی عباس حسینی صاحب کے نام سے نکال رہے ہیں۔ اس میں مجھ سے "مقالہ" نہ لکھا کر آپ نے میری کم مائگی کی شرم رکھ لی جس کے لئے شکر گزار ہوں لیکن اس نیک اور مبارک تجویز کے ساتھ بہت خوشی کے ساتھ خود کو وابستہ کرتا ہوں۔ علم اور ادب اور اقدار صالحہ کے خادموں کی عزت کرنا اپنی تہذیب اور اپنی قومی زندگی کی شرافتوں کی قدر کرنا ہے۔ حسینی صاحب نے اپنی زندگی ادب اور تعلیم کی خدمت میں گذاری ہے اور میری نظر میں یہ خدمت دنیا کی بہت سی نام نہاد سرفرازیوں سے بہت زیادہ بلند ہے۔ خدا انہیں ابھی بہت سال تک اس خدمت کو جاری رکھنے کا موقع عنایت کرے۔

مخلص

خواجہ غلام السیدین

سی I / ۵ تلک لین، نئی دہلی

علی جواد زیدی

علی عباس حسینی ۔ شخصیت کے چند پہلو

جن کو جتنا ہی قریب سے دیکھئے ان کے بارے میں کچھ کہنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ میں نے علی عباس حسینی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے بارے میں کئی بار لکھا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ہر بار ایک تشنگی کا احساس ہوا ہے۔ جب ان کی پرانی تحریریں پڑھتا ہوں تو قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ گوشہ چھوٹ گیا وہ بات ادھوری رہ گئی اور حسینی بھی کچھ بدل سے گئے ہیں۔ کچھ آگے بڑھ گئے ہیں۔ سن کے اعتبار سے، فن کے اعتبار سے، فکر کے اعتبار سے۔

حسینی کی یہ بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کہ وہ ابھی تک بڑھے جا رہے ہیں۔ قد کے اعتبار سے نہیں کیونکہ ویسے ہی ماشاء اللہ بلند قامت ہیں چھ فٹ کچھ انچ ہونگے۔ میٹرک پیمانوں میں شاید ایک دو شمار اور زیادہ بارعب ہوں لیکن ادبی قامت کے اعتبار سے وہ مسلسل بڑھتے ہیں اور صحیح معنوں میں ترقی پسند ہیں۔ آرزو مرحوم ہوتے تو اعتراض کر بیٹھتے کہ "میاں تجاہل صاحب! یہ آپ بھی ترقی پسند بننے لگے۔ یہ ترقی پذیر کہنے کا محل ہے۔" وہ نہیں ہیں لیکن میں احتیاطاً ترقی پذیر کہنا پسند کروں گا کیونکہ اصطلاحی معنوں میں انہیں ترقی پسند کہنے پر شاید بعض جامد ذہنوں کو اعتراض ہو۔

یوں تو ان کا فن مسلسل ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ وہ تجربوں سے نہیں گھبراتے بلکہ وہ گھبرانا ہی نہیں جانتے ان کے قوی پیکر میں بہت ہی توانائی ہے اور وہ بے خطر ہر راستے پر چل پڑتے ہیں۔ مگر آنکھیں کھول کر چلتے ہیں اور ٹھوکروں سے لیتے چلتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی کام کرانا ہو تو مخالفت کر کے دیکھئے۔ وہ بڑے سے بڑا چیلنج قبول کر لینگے۔ کبھی اعلان کرینگے کبھی خاموش ہی رہینگے لیکن ع

جس بات پہ ٹوکے جاتے ہیں وہ بات دوبارہ کرتے ہیں

کہتے ہیں کہ وہ ان سیدوں میں ہیں جنکے اجداد صاحب سیف و قلم تھے

حسینی نے جو زمانہ پایا اس میں تلوار آثار قدیمہ میں شامل ہو چکی تھی اس لیئے انہوں نے سیف کا کام بھی قلم ہی سے لیا۔ جب بھی انہوں نے قلمی جہاد کیا تو ان کے قلم میں تلوار کی تیزی اور خون آشامی تھی۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے انہوں نے حکومت برطانیہ کے خلاف فرضی ناموں سے لکھا اور مخبروں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت اسکی یہ سزا بھی بھگتی کہ خاطر خواہ ترقی نہ ملی۔ اور دور افتادہ یا معمولی معمولی شہروں میں تبادلے ہوتے رہے جہاں وہ علمی اور ادبی ماحول کو ترستے رہے۔

سیاست ان کا میدان نہیں تھا وہ سرکاری ملازم تھے جن کے لیئے سیاست شجر ممنوعہ ہے لیکن ان کے دل میں بھی وہی چنگاری تھی جس نے پریم چند سے دوران ملازمت میں "لال فیتہ" لکھوالیا تھا۔ البتہ پریم چند کی طرح انہوں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور اپنی سیاسی ہمدردیوں کو دیہاتیوں، کسانوں اور مزدوروں کی ہمدردیوں کا روپ دے دیا۔ وہ دیہات میں رہے تھے۔ اس کی گلیوں کی دھول اور کیچڑ سے رستی ہوئی جھونپڑوں، ٹپکتے ہوئے چھپروں، خاموش چولہوں، پھٹے پرانے کپڑوں سے وہ واقف تھے۔ گندگی، جہالت، توہمات، غریبی، غرض اس سب کو انہوں نے دیکھا تھا دور سے نہیں بلکہ اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔

وہ زمیندار گھر میں پلے تھے لیکن بڑے زمیندار نہیں تھے۔ ان کے یہاں کھیتی بھی ہوتی تھی۔ ان کے دروازے پر بیل بھی بندھے ہوتے تھے۔ وہ وقت پڑنے پر اپنے ہاتھوں سے کنویں سے پانی نکال سکتے تھے۔ کدال سنبھال سکتے تھے اور پھر انہوں نے کشتیاں لڑی تھیں، کبڈیاں کھیلی تھیں، "خدا جہان" کھیلا تھا۔ گلی ڈنڈا، آنکھ مچولی، اندھا غار، گیند بھڑ بھڑ اور نہ جانے کیا کیا کھیل کھیلے تھے وہ تیر سکتے تھے، دوڑ سکتے تھے۔ وہ دھول میں لوٹ سکتے تھے۔ وہ سوندھی

...وں کی جو شہرت بھی جانتے تھے۔

انہوں نے کئی طرح کے کرداروں کو بہت پاس سے دیکھا تھا۔ زمیندار کا وہ ملازم جس کا دنیا میں کوئی نہ تھا [illegible] وہ بیوہ، عیدارن جو پردہ کے پیچھے رہ کر حکومت کرنا جانتی تھی وہ راسوتے اور ٹھاکر۔ وہ سید اور برہمن جو آن پر جان دیتے تھے۔ ان کا مذہب [illegible] تھا اور جن کا اخلاق سرمایہ مذہب [illegible] سے الگ نہ تھا [illegible] تھے۔ انہوں نے [illegible] کی دیکھی تھی [illegible] کی لہلہاتی جوانی [illegible] نہ ہونے کے باعث بہت سفری ہو گئی۔ وہ [illegible] ان کے پہلو میں ایک دل تھا [illegible] جو بہت [illegible] تھا [illegible] دوست جس کے ہاتھوں میں [illegible] تھا [illegible] سے دھواں نہیں اٹھتا تھا لیکن [illegible] اسلامی ہمدردی کا سمندر امنڈ پڑتا تھا۔ انہوں نے ترچھے بانکے جوان [illegible] گزارا [illegible] میں سبھی دیکھی تھیں۔ انہوں نے اس [illegible] ہوس، عشق، مالیخولیا، جنون، نیاز مندی [illegible] صحیح اعمال، بے عملی، دولت، افلاس، اندھیرا، اجالا سب کچھ دیکھا تھا۔ انہوں نے دیہات کی زندگی کو روتے بھی دیکھا اور نئی زندگی کی کروٹ بدلتے بھی دیکھا۔ اور اس سب کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی۔ شہروں کی زندگی کو بھی انہوں نے دیکھا مولوی اور قائد، مسٹر اور مولانا سبھی کو جانچا پرکھا اور ہر بار ہر تجربے پر تجربے کے ہر موڑ پر ان کا قلم اٹھا ایک اصلاحی مجاہد کی طرح۔

پھر انہوں نے محسوس کیا کہ اصلاح کی سست رفتاری دراصل پیوند ہے پرانے کپڑے جب گل سڑ جائیں تو ایک پیوند کے بعد دوسرا پیوند لگاتے رہنے سے درست نہیں ہوتے بلکہ اور خستہ ہو جاتے ہیں۔ پیوند کی انتہا ہے کہ رفوگر کی کاریگری کے قصے [illegible] پڑھنا انہوں نے ترک کر دیا مگر انہوں نے انقلاب کا نعرہ کبھی نہیں لگایا۔ وہ نعرے سے بہت گھبراتے ہیں۔ نعرہ تو بڑی چیز ہے تقریر کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے بعض افسانے (مثلاً کیا کیجئے) تقریباً نعرہ بازی کی سرحد تک آپہنچے ہیں۔ اس کے آگے وہ اس لئے نہیں بڑھتے کہ اپنی ترقی پذیری یا ترقی پسندی کے باوجود وہ بنیادی طور پر گاندھی وادی ہیں

بقول ع میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

اور پہونچے کی نہ کہیے یہ محبت کا پیغام کبھی کبھی انقلاب کی سرحد تک تو پہونچ ہی جاتا ہے۔

حسینی طبعاً خانہ نشین قسم کے لوگوں میں ہیں۔ دوست احباب ہوں تاش ہوں، کتابیں ہوں تو وہ کئی کئی دن گھر میں پڑے رہ سکتے ہیں۔ تاش جوے سے نہیں کھیلتے مگر بڑے جوش و خروش سے کھیلتے ہیں۔ ہر بازی کے بعد با آواز بلند بحث و تنقید کرتے ہیں۔ اور اپنے پارٹنر کی ایک ایک غلطی گنا ڈالتے ہیں وہ بھی جو شاید خود انہیں کی غلطی کا نتیجہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں ہار پسند نہیں ہے اگر وہ مسلسل جیتتے رہیں تو کوئی تنقید نہ کریں۔

ہار کے تصور سے بھی ان کے احساس خودی کو چوٹ لگتی ہے۔ وہ عربوں کی طرح لڑنے والے ہیں اور کبھی کبھی اپنے عربی النسل ہونے پر فخر بھی کرنے میں صدیوں ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے اس عربی انداز میں یہ ترمیم ہوئی ہے کہ خود لڑائی کی ابتدا نہیں کرتے بلکہ مخالفین کے دو ایک وار سے تو درگزر کر جاتے ہیں یہ درگزر ان کی کمزوری کی علامت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے عتاب کے عواقب سے گھبراتے ہیں۔ اگر انہیں مدعی کی کسی حرکت پر غصہ آ ہی گیا تو انہیں اپنی خانہ نشینی ترک کرنا ہوگی۔ تاش چھوڑنا پڑیگی۔ کتب بینی کو معرض التوا میں ڈالنا پڑے گا۔ وہ اس کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ ہاں جب تیار ہوگئے تو ہوگئے ع

[illegible] را فگند زیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

وہ تو کہیے کہ ایسے مواقع کم آتے ہیں۔

اگر ان پر یہ کیفیت اکثر و بیشتر طاری ہوتی تو سوائے سیاست کے ان کی کہیں اور گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ تقریریں کرتے تنبیہیں کرتے، اپنے مخالف کے خلاف فضا ہموار کرتے، اس کا سماجی مقاطعہ کرتے یہاں تک کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ اور پھر حسینی بالکل ہی بدل جاتے۔ انکی گردن کی پھولی ہوئی رگیں، انکے پھولے ہوئے نتھنے، ان کا تمتماتا چہرہ، ان کی پیشانی پر لکیروں کے جال بناتا ہوا غصہ سب کافور ہو جاتا۔ وہ سب کچھ بھول جاتے جیسے اچھے ادیب مسترد مسودوں کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن ارباب تحقیق بھی تو ہوتے ہیں وہ انہیں مسترد مسودوں پر عمارتیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ میں نہ محقق ہوں، نہ دانشمند اور نہ کتابوں کا بوجھ ہی سر پر لادے پھرتا ہوں اسلئے میں اس کوچہ سے بیگانہ وار ہی گزر جانا چاہتا ہوں۔

ویسے بھی حسینی مخالفتوں کو پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنی طبیعت سے واقف ہیں۔ سیلاب کے دھارے کی طرح معلوم نہیں کب اور کدھر مڑ پڑے ابھی بڑے زور شور سے مخالفت کر رہے ہیں کسی نے یاد دلا دیا کہ ارے وہ تو آپ کے دوست کا بھتیجا۔ فلاں ادیب کا نواسا۔ خود آپ کے ملازم کے

سالے کا بھانجا ہے۔ آپ کا یا آپ کے ہم جماعت کا شاگرد رہ چکا ہے۔ اسے
بیچارہ موزیب ہے۔ شریف نوجوان ہے۔ غرض ان کے لیے کوئی توانائی کی صورت
نکال دی گئی۔ اور ان کی مخالفت ہوا ہو گئی۔ ادھر آئی ادھر گئی۔ اس سے یہ سمجھنا
غلط ہوگا کہ وہ ڈانواڈول مزاج کے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ بڑے ہی وضعدار ہیں اور
وضعداری عزیز و اقارب، ہم پیشہ، ہم جماعت، ہم درس، ہم نوالہ و ہم پیالہ،
ہم سن، ہم نماز اور ہم رقیب سے متعلقین اور متوسلین سبھی کو اپنے دامن میں لے لیتی ہے
جہاں مخالفت [illegible] گی۔ کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی مداخلت کرے گا
اور وضعداری حائل آ جائے گی۔ مخالفت بھی وضعداری میں شامل ہے۔ مگر
بلکہ حسینی کے نظام وضعداری میں مخالفت کم اور درگزر زیادہ۔

وضعداری کی حدود میں ظاہری شکل و صورت، لباس و عادات بھی
شامل ہیں۔ حسینی نے شیروانی، بڑی موری کے پاجامے اور ترکی فلٹ ٹوپی
(جسے بعض اوقات ایرانی ٹوپی بھی کہا جاتا تھا) کی فضا میں آنکھیں کھولیں۔
اور اسی کو اختیار کیا۔ امتداد زمانہ سے اس میں صرف گول کالی فلٹ ٹوپی
کو خیر باد کہا ہے۔ ورنہ نہ یونیورسٹی کی تعلیم اور نہ پرنسپلی ان کو شیروانی اور
پاجامے کے ترک پر آمادہ کر سکی۔ وہ اس پر بڑا ناز کرتے ہیں کہ انہوں نے
زمانے کی عام رو کا مقابلہ کیا اور ان علامات وضع کو باقی رکھا۔ اس لیے وہ
[illegible] پروری کی دلیل لے آتے ہیں۔ ہاں ایک زمانہ ایسا ضرور تھا کہ وہ
شیروانی کے ساتھ پینٹ کا بھی استعمال کرنے لگے تھے اور اس میں تھوڑی سی
وضعداری کا شائبہ تھا یعنی کمر پیٹی نہیں باندھتے تھے بلکہ کندھوں سے
گیلس لٹکاتے تھے۔

داڑھی بھی ان کے گھر میں خاندانی چیز تھی۔ ان کے والد مولوی سید محمد صالح
صاحب عالم و زاہد تھے اور گول گھیرے دار داڑھی رکھتے تھے۔ حسینی نے بھی
داڑھی بڑھائی لیکن ذرا سی ترمیم بھی کر لی۔ لہلہاتی ہوئی موروثی داڑھی کے
مقابلے میں انہوں نے فرنچ کٹ داڑھی کو ترجیح دی۔ اور پھر داڑھی غائب ہو گئی
اس غیبت میں مونچھوں نے بھی کچھ دنوں ساتھ دیا۔ اور آخر میں پھر اُسی
نقطے پر پہونچ گئے جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ اب مونچھیں پھر واپس آ گئی ہیں اور
داڑھی نے رجعت کی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اب یہ داڑھی سفید ہو گئی ہے
اسے آپ کا جی چاہے تو تجربہ پسندی کہیے یا تقاضائی مناسبت۔ رجعت قہقری
یا ترقی روحانی کچھ بھی سمجھیے لیکن متلون مزاجی نہیں کیونکہ ان کے مزاج میں
وہ شے جسے تلون کہیں ہے ہی نہیں۔

سفید داڑھی اصل میں حسینی کے مذہبی رجحانات کی بھی نقیب ہے
وہ بہت ہی خدا ترس اور پابند صلوٰۃ ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ البتہ
یہ نہیں کہہ سکتا کہ سب روزے رکھتے ہیں یا کچھ ناغہ بھی کرتے ہیں۔ بعض ایسے
کمزور [illegible] بھی ہوتے ہیں جن کی تحقیق کرنے کی ہمت نہیں۔ ان کی مذہبیت بھی
عجیب و غریب چیز ہے کبھی کبھی تو وہ توہم پرستی کی سرحدوں کو چھو آتے ہیں اور
فال، جھاڑ پھونک، پیشین گوئی وغیرہ کے جال میں بھی پھنس جاتے ہیں۔ اور کبھی وہ طبقہ
علما کے خلاف جہاد بول دیتے ہیں۔ دراصل لکھنؤ کے اس جدید تعلیم یافتہ گروہ میں
جس میں شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ، شیخ ممتاز حسین
جونپوری، مولانا اختر علی تلہری، خواجہ [illegible] حسین، پروفیسر سید مسعود حسن
رضوی ادیب شامل تھے حسینی کافی پیش پیش تھے اور اس گروہ کا ایک
کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے قوم کی علما پرستی اور [illegible] کی اندھی تقلید کا
طلسم توڑ دیا۔ حسینی کی خوش اعتقادی اور پرخلوص مذہبیت اب بھی باقی ہے
[illegible] بھی وہ بے جا رسوم و رواج کے مخالف ہیں تقشف، تنگ نظری
وہم پرستی، جہالت، [illegible] وغیرہ کے دشمن ہیں۔ وہ مذہب کو صرف
روح کی بلندی اور نفس کا تزکیہ سمجھتے ہیں مناظرہ بازی اور عصبیت سے
بیری ہیں۔ [illegible] اسکے خلاف جہاد کرتے رہے ہیں۔

قریب ترین دوستوں میں سبھی مذہب و ملت کے افراد شامل ہیں۔ دھرم
ان کے نزدیک ایک فلسفیانہ ذہنی کیفیت، اخلاقی اقدار اور اعلیٰ کردار
کا مجموعہ ہے اور اگر یہی دھرم ہے تو اس پر ہم کو اور آپ کو بھی کیا اعتراض
ہو سکتا ہے۔ اکثر علمائے زمانہ ان سے ان کی بے باکی اور صاف گوئی پر
ناراض بھی رہے ہیں۔ اور بہت سے خالص دہریے ان کی انسانیت دوستی
اخلاقی بلندی اور معاشی، اقتصادی اور سیاسی معاملوں میں ترقی پسندی کے
مداح بھی پائے گئے ہیں۔

لباس اور ظاہری شکل و شباہت ہی نہیں طعام اور لوازمات طعام کے
معاملے میں بھی حسینی وضعدار ہیں۔ اچھا کھانا کھاتے اور کھلاتے ہیں۔
اچھے کھانے سے مراد مرغن، مصالحے دار اور مختلف انواع و اقسام کے کھانے ہیں
شاہی دسترخوانوں کی منتخب ترکیبیں ان کے مطبخ میں اکثر آزمائی جاتی ہیں۔
اور پھر دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ دعوت کام و دہن کا سامان بنتی ہیں

اس میں بیگم حسینی اور حسینی کے ملازم حافظ کی دلچسپیوں کو بھی بڑا دخل ہے۔

حسینی کا ملازم حافظ جی بھی ایک ادارہ ہے۔ حسینی کے یہاں آنے سے پہلے وہ حضرت موہانی کی خدمت میں بھی رہ چکا ہے۔ انہی صحبت کا نتیجہ ہے کہ اسے بہت سے شعرا کا منتخب کلام زبانی یاد ہے۔ حسینی کے یہاں آرزو لکھنوی کا قیام مدتوں رہا اور پھر تمیم کرہانی [illegible] شریک جلالی اعظم [illegible] اعظم کا قیام بھی رہا۔ [illegible] کی صحبت میں اسے [illegible] ادب پر مزید جلا ہوئی اور حافظ [illegible] جگر، حسرت اور آرزو وغیرہ کا بہت سا کلام زبانی یاد کر لیا۔ اسی لئے کسی [illegible] میں ایک [illegible] نہیں گزرا ہے لیکن [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کے استعمال [illegible] عربی کے [illegible] "رواۃ شعر" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حافظ اب حسینی کا ملازم نہیں ہے بلکہ وہ افراد خاندان میں شامل ہے۔ امور خانہ داری کی ساری ذمہ داری اسی پر ہے اور وہ بعض انتظامی امور میں حسینی صاحب تو الگ رہے بیگم حسینی کی مداخلت بھی گوارا نہیں کرتا۔ حافظ جی حسینی کی زندگی کے اس پہلو پر ایک زندہ تبصرہ ہے حسینی اپنی روزمرہ کی زندگی میں نہ صرف یہ کہ بیحد سادہ ہیں بلکہ [illegible] خورد و بزرگ کا فرق محسوس نہیں ہونے دیتے۔

اس سادگی میں پرکاری بھی ہے۔ وہ اپنے خوردوں کو بلکہ بعض اوقات اپنے بیٹے اور داماد تک کو ساتھ لے کر تاش کھیل سکتے ہیں اور اس ایک لمحہ خاص میں بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ انکا خورد ہے۔ وہ فلمیں دیکھنے کے شوقین ہیں اور فلمیں تنہا نہیں دیکھتے بلکہ کسی نہ کسی کو ساتھ ضرور لیتے ہیں چاہے وہ ان کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ دو ایک بار دلچسپ باتیں بھی دیکھنے میں آئیں۔ ان کے دو بھانجے ایسے بھی ہیں جو انگریزی سے نا واقف ہیں ان کو ساتھ لے کر حسینی اکثر فلم دیکھنے جایا کرتے تھے اور انٹرول میں انکو کہانی کا خلاصہ سمجھاتے تھے۔ اس ڈیڑھ گھنٹے کی "فٹنگ" میں ان غریبوں کے حصے میں صرف حسینی کے پان اور سگریٹ ہی آتے تھے۔

پان، سگریٹ اور حقہ کے حسینی بیحد شائق ہیں لیکن ان سب سے زیادہ شوقین وہ آموں کے ہیں۔ آم کی فصل آئی اور حسینی کے چہرے پر ایک تازہ بشاشت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ گھر میں جب دیکھئے دسہری، لنگڑے، ثمر بہشت، چونسہ، الفانسو، سفیدہ، جوسواں وغیرہ گمگما رہے ہیں اور چھلکے اور گٹھلیاں اپنی ڈھلتی جوانی کی داستانیں سنا رہی ہیں

اس زمانے میں دوستوں کی دعوتیں بھی اکثر ہو جاتی ہیں اور پھر شعر و سخن کی محفلیں بھی گرم ہوتی ہیں۔

شعر و سخن کی محفلوں سے حسینی کو خاص لگاؤ ہے۔ وہ شاعر نہیں ہیں بلکہ اشعار کو بالکل رواں پڑھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن شعر کا کوئی لفظ چھوڑ دے نہیں۔ فارسی اردو کے بہت سے منتخب اشعار یاد ہیں۔ ابھی حال ہی میں جناب کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی کہہ دیا تھا۔ اور اردو شاعری پر کچھ اور بھی ایرادات کیے تھے۔ بس پھر کیا تھا حسینی کی سخن فہمی مائل بہ احتجاج ہوئی اور انہوں نے ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی ایک مستقل کتاب تصنیف کر ڈالی۔ جس میں تمام اصناف سخن کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے نظم و غزل کا بہت ہی ستھرا انتخاب یکجا کر دیا۔ سنا ہے کہ وہ انتخاب کراچی میں طبع ہو رہا ہے۔

حسینی کے گھر پر مختلف اوقات میں جوش ملیح آبادی، آرم لکھنوی، منے آغا ذکی، سروش لکھنوی، اختر علی تلہری، تمیم کرہانی، اعظم، سالک لکھنوی، آنند نرائن ملا، احتشام حسین، مہذب لکھنوی، فرقت کاکوروی، شوکت تھانوی، پرتو لکھنوی، وغیرہ کا کلام میں نے اکثر سنا ہے اور کبھی کبھی یہ فریضہ خود بھی انجام دیا ہے۔ کبھی باہر سے آنے والوں میں جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، وامق جونپوری، راہی معصوم رضا وغیرہ کا کلام بھی سننے کو مل گیا ہے۔ سننے والوں میں خواجہ اطہر حسین، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، جیسی ہستیاں موجود ہوتی تھیں اور یہ مختصر صحبتیں بہتوں کی تشکیل ذوق کا سبب بن جاتیں۔ غرض حسینی اگرچہ نثر نگار ہیں اور انہوں نے شعر کا کوئی مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا ہے لیکن انہیں شعر و سخن سے خاص شغف ہے اور اس باب میں انکا مطالعہ بھی بیحد وسیع ہے۔

حسینی کا ذوق مطالعہ مثالی ہے۔ انہوں نے انگریزی اور اردو زبان کا کوئی ناول ایسا نہ ہوگا جو نہ پڑھا ہو۔ قدیم سے قدیم بھی اور جدید سے جدید بھی۔ جن غیر ملکی زبانوں کے تراجم انگریزی یا اردو میں ہوئے ہیں انکا افسانوی ادب بھی کسی استثنا کے بغیر انہوں نے ضرور پڑھ ڈالا ہے۔ زندگی بھر اپنے فرائض منصبی کے بعد جو وقت ملا اسکا کم ہی حصہ انہوں نے تفریحوں میں گذارا ہوگا۔ زیادہ تر وقت مطالعہ ہی میں گزرا۔ وہ دیر تک پڑھتے ہیں اور ہمیشہ بستر یا تخت پر لیٹ کر پڑھتے ہیں اور جب تک پڑھتے رہتے ہیں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ گھر کے شور، بچوں کے لڑائی جھگڑے، خانہ داری کی الجھنیں، مالی پریشانیاں کسی خیال کو

مطالعہ میں مخل نہیں ہونے دیتے۔

وہ صرف افسانوی ادب ہی نہیں پڑھتے۔ عام ادب کی کتابوں کے علاوہ مذہبیات کا مطالعہ بھی اچھا خاصا ہے۔ ادب ہی کی طرح وہ تاریخ کے بھی اچھے طالب علم رہے ہیں۔ انکی زندگی تاریخ ہی پڑھاتے گذری ہے وہ ہندوستان کے قدیم ثقافتی ورثے کے بڑے قدر داں ہیں اور اشوک اعظم پر انہوں نے خاصا کام کیا ہے۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ انہوں نے ایک پوری کتاب اشوک اعظم پر لکھی تھی اور پھر بعد میں اپنے ایک عزیز کو دے دی۔ میں نے حسینی کو تاریخی ماخذوں کے انبار میں غرق ہو کر اس کتاب کی تالیف میں مصروف دیکھا ہے اور پھر سرورق پر مصنف کی جگہ پر ایک عزیز کا نام لکھے بھی اپنی ہی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی اکیڈیمی نے شایع کی ہے، وہ ان عزیز کے نام سے ہی شایع ہوئی ہے۔ اسی طرح انہوں نے ایک ناول بھی ایک رئیس کو بخش دیا تھا۔ دونوں ہی سے حسینی کو ان کی محنت کا نقد معاوضہ ادا کیا اور حق تصنیف خرید لیا۔ ایک درسی کتاب بھی انہوں نے اپنے ایک سابق پرنسپل کے نام مرتب کی تھی۔ ان معاملات کی اصلی نوعیت یہ ہے کہ حسینی ہمیشہ کے فضول خرچ واقع ہوئے ہیں۔ اکثر مقروض رہا کیے ہیں۔ جب قرض زیادہ ہو جاتا تو اسی قسم کی فیاضانہ تصنیف فروشی پر اتر آتے تھے۔ بارے اب یہ سلسلہ منقطع ہوا ہے۔

حسینی نے بہت کچھ لکھا ہے جو اُن کے نام سے نہیں شایع ہو سکا ہے اب اسکے جاننے والے بھی کم ہی رہ گئے ہیں کہ کب کب اور کہاں کہاں انکی تحریریں فرضی ناموں سے شایع ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے خود اپنے نام بھی جو کچھ لکھا ہے اسکا حجم بھی بہت زیادہ ہے۔ سیکڑوں افسانے کئی ناول بہت سی درسی کتابیں، مضامین، تبصرے، مقدمے انکے قلم کی جیتی جاگتی یادگاریں ہیں۔ انہوں نے قلم سے کافی کمایا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جو کچھ کمایا قلم ہی سے کمایا ہے۔ اور کمایا تو پھر بے دردی سے اڑایا بھی۔ لطف یہ ہے کہ کسی غیر ضروری مد میں کچھ خرچ نہیں کیا۔ حقوق اعزا و احباب و ہمسایہ کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ مہمان نوازی اور خاطر مدارات میں جی کھول کر خرچ کرنے کو ثواب عظیم اور آئندہ کے لیے کچھ بس انداز کرنے کو گناہ کبیرہ جانتے ہیں۔

حسینی کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا دوستی ان کی فطرت ہے۔ جس سے ملتے ہیں بس گھل مل جاتے ہیں اور اس پر محبت عنایت، مشورہ، صلاح نیک وغیرہ اس طرح نچھاور کرتے ہیں کہ وہ دوستی کے معاملے میں کنارے پر [illegible] ہو [illegible] ازکم ہمیں تو اس [illegible] [illegible] [illegible] مجبوری ہو آتی ہے [illegible] ہر طبقے میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] گویا [illegible] اور [illegible] [illegible] انگریزی دانوں میں منکرین روحانیات میں اور صوفیان صافی میں بیٹر باروں میں کنڈے بازوں میں پہلوانوں میں، [illegible] ڈاکٹروں اور وکیلوں میں ممبران اسمبلی اور وزیروں میں لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہوں لنگوٹیا یار [illegible] [illegible] ہیں، وہ ایسے بھی جو صرف [illegible] دوست رہ گئے ہیں کہ [illegible] [illegible] کبھی [illegible] کیا [illegible] ایسے [illegible] دوست ہیں جو حسینی اگر دوست نہ بنائیں تو کریں کیا۔ اور ایسے بھی کہ [illegible] وہ [illegible] [illegible] چاہیں تو وہ انہیں کبھی نہ چھوڑیں۔ ان میں شاعر و [illegible] کے حاضر باش بھی ہیں اور [illegible] ہاکی اور فٹ بال کے میدان میں [illegible] بھی۔ ان میں آموں کے ماہر بھی خصوصی بھی ہیں اور لطیفے اور [illegible] بھی۔ اگر ان کے سب دوست ایک ہی جگہ ہو جائیں تو وہ مجمع کچھ عجب چوں کا مربہ ہو جائے گا۔ لیکن [illegible] ان میں ایک قدر مشترک ہوگی۔ ان [illegible] کا خیال اور کم ازکم ظاہر [illegible] [illegible]

اسباب ظاہری میں چھڑی، کھدر، بیڑی، پانوں اور سگریٹوں کے ڈبے اور فاؤنٹین پن ایسے ان کے جسم کے ساتھی ہوں۔ یہ کہیں بھی ہوں اور کسی حالت میں بھی ہوں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ چھڑی کے سوا بستر پر بھی پہنچا کر رکھ دی جاتی ہیں اور حسینی کا بستر بھی دراصل بستر نہیں ہے۔ وہ ناشتہ کی میز بھی ہے لکھنے کا میز بھی ہے آرام گاہ بھی ہے اور کبھی کبھی مقربین کے لیے ڈرائنگ روم بھی۔ لکھتے وقت وہ کروٹ لیٹ جاتے ہیں اور لیٹے ہی لیٹے افسانے اور مضمون مکمل کر لیتے ہیں۔ اور ہاں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ یہی بستر اُن کا کتب خانہ بھی ہے۔

کتابوں کے بڑے رسیا ہیں بہت پڑھتے ہیں، اب بھی برابر پڑھتے رہتے

سید غالب امام

ممتاز چچا

بزرگوں سے ممتاز چچا کی افسانہ نگاری اور کمالِ فن کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ بدقسمتی سے خود کچھ پڑھنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ پہلے شعور نہ تھا اور جب شعور آیا تو غمِ دوراں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ورنہ اپنے اِک بزرگ ہی نہیں بلکہ ملک کے تسلیم شدہ اہلِ قلم کو نہ پڑھنا، چھوٹے موٹے گناہ سے کم نہیں، جن کی تعریف میں شاعر کہہ اٹھتا ہے ؎

تری نگارشیں جیسے شراب پی کے غزل   شعورِ شاعرِ رنگیں میں لے اِک انگڑائی   (دانش عظیم آبادی)

مجھے ۱۹۳۹ء کی وہ شام آج بھی یاد ہے جب میں اپنے عم بزرگوار (جناب سید بندہ حسن صاحب) کے ساتھ پارہ ضلع غازی پور کے ایک بڑے احاطہ میں داخل ہو رہا تھا وہ شہر نہ تھا کہ الکٹرک کی چکاچوند ہوتی اور بجلی کے پنکھے چلتے ہوتے۔ گرمی کی خاطر سے قدرت نے جو بلا عجت کی اک کھڑکی کھول رکھی تھی، اس کی خوشگوار ہوا بڑی روح پرور تھی، شاید اس لئے (بہ تصرف) کہ ؎

ہم کاملانِ دہر کا، گر لیو زمیں ادب   آتے نہیں ہیں روز یہاں آسماں سے ہم   (حکیم محمود مرحوم)

ممتاز چچا بھی وطن آئے ہوئے تھے، کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ بیٹھنے والے حضرات سب ہی میرے بزرگ تھے اور وسط میں ایک کرسی پر اک ممتاز شخصیت تشریف فرما تھی جیسے ستاروں میں چاند۔

یہ اب سے ۵۲ سال پہلے کی بات ہے، میرا سن اُس وقت کوئی بارہ سال ہوگا۔ جو کچھ سنتا آیا تھا، اُس سے جو نقشہ میرے دماغ میں بن رہا تھا وہ ذرا بھیانک تھا۔ "بہت بڑے افسانہ نگار ہیں وہ، چوٹی کے لکھنے والے ہیں، دیش بھر میں ان کا بول بالا ہے، ہر شخص ان کے قلم کا لوہا مانتا ہے۔" صاحبِ قلم اور مفکر کے تصور نے اِک خاموش اور خشک تصویر تیار کی تھی، لوہا منوانے کی اصطلاح سن کر یہ خیال ہوتا تھا کہ بھاری بھرکم، کالے اور تند خو ہوں گے۔ لیکن وہاں پہونچنے پر لانبے، گورے، ہنس مکھ اور خلیق و شفیق ممتاز چچا ملے۔ میرے دل و دماغ کی متوحش کیفیت اُس پر خلوص ماحول میں پہونچتے ہی ہوا ہوگئی اور میرے غلط تصورات کی اونچی کوٹھی دھم سے زمین پر آ رہی۔

میرے تعارف کے بعد انہوں نے خلوص و محبت اور دعاؤں کے ساتھ مجھے بغلگیر کیا۔ بات ہی بات میں فرمایا کہ سلمہٗ پہلی بار اپنے وطن آئے ہیں، ان کی عام دعوت ہونی چاہئے۔ لہٰذا کل میں کل اعزا کو مدعو کرتا ہوں مگر دعوت پلاؤ قورمہ کی نہ ہوگی۔ بلکہ غالب کی یاد میں صرف آم کھائے جائیں گے۔ چنانچہ دوسرے ہی روز سے تانتا بندھ گیا اور ہر روز کسی نہ کسی عزیز کے یہاں آموں کی دعوت ہوتی رہی۔ ہفتہ عشرہ تک خوب خوب غالب کی یاد منائی گئی۔ سننے میں آیا کہ کھانے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی جدت فرمایا کرتے ہیں۔

دوسری ملاقات جناب ممدوح کے دولتکدہ پر لکھنؤ میں ہوئی، سالہا سال کے بعد دالان میں ہم دونوں بیٹھے تھے، اندر کمرہ میں ریڈیو کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کس "بھاشا" میں بول رہا ہے تو فرمایا کہ "روسی"۔ روس جانے کی ایک پیشکش ہے اس لئے

شادی کا ایک راز؟
شادی کا ایک راز منصوبہ بند کنبہ ہے اس سے آپ کو اپنی ازدواجی زندگی زیادہ خوشگوار بنانے میں مدد ملے گی۔
بچے سچ مچ خدا کی دین ہیں تاہم بچے زیادہ ہوں تو دکھ اور پریشانی کا باعث بن سکتے ہیں۔
بچے زیادہ ہوں تو گھر بار کے اخراجات کو چلانا بھی مشکل ہوتا ہے۔
بچوں کی پیدائش میں وقفہ ڈالنے کے کئی طریقے ہیں۔ یہ سادہ، آسان اور محفوظ ہیں۔
اگر ایک
اور دوسرے بچے کی پیدائش میں تین برس یا اس سے زیادہ کا وقفہ ڈالا جائے تو اس سے ماں کی صحت اچھی رہتی ہے
اور بچے خوشی خوشی پروان چڑھتے ہیں۔ یہی نہیں اس سے ماں باپ کو ہر بچے پر زیادہ توجہ دینے کا موقع بھی ملتا ہے
یہی وہ عمر ہے جس میں بچوں کو زیادہ توجہ اور پیار کی ضرورت ہوتی ہے
معلومات و مفت مشورے کے لئے قریبی فیملی ویلفیئر پلاننگ سنٹر میں تشریف لائیں
یاد رکھیں:۔ چھوٹا کنبہ ہی خوشحال کنبہ ہوتا ہے

سید کلب مصطفیٰ

میرے استاذ محترم

آج بیالیس تینتالیس برس بیت جانے کے بعد بھی ۱۹۲۱ء کی اُس شام کا کیف آگیں تصور میرے دل و دماغ میں باقی ہے جب ایک سرو قد، چھریرے بدن، چوڑی ہڈی، بیضاوی چہرے، کھلتے گندمی رنگ، خوبصورت خد و خال بڑی بڑی چمکدار آنکھوں اور دلکش انداز کی شخصیت کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور اتنے دنوں کے بعد بھی جب میں آج اس شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو ماضی کی وہ دلفریب یادیں ایک ایک کرکے نگاہوں کے سامنے آتی جا رہی ہیں جو اس شخصیت سے وابستہ ہیں۔ یہ شخصیت علی عباس حسینی کی ہے جس کو آج ادبی دنیا ایک فن کار کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔

حسینی صاحب کا تقرر ۱۹۲۱ء میں بطور اسسٹنٹ ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول رائے بریلی میں ہوا تھا۔ میں اُن دنوں ہندو ہائی اسکول رائے بریلی میں زیر تعلیم تھا۔ برادر معظم سید کلب عباس صاحب نے حسینی صاحب کی طرف اشارہ کرکے مجھے ہدایت کی کہ میں ان کے گھر پر ہما کر شب میں مطالعہ کیا کروں۔ ان کے ساتھ ان کے بھانجے سید اعظم حسین اعظم اور ان کے چھوٹے بھائی آغا بھی رہتے تھے۔ یہ لوگ کسی مدرسے میں داخل نہ تھے، مگر تھے میرے ہم سبق اور میں انھیں لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ خود حسینی صاحب ہم لوگوں کو پڑھانے میں وقت نہ دے سکتے تھے البتہ ان کے یہاں حاضری کے نتیجہ میں ان کی نفاست پسندی، خوش ذوقی اور سلیقہ مندی کا مجھ پر اچھا خاصا اثر پڑا۔ ان کی گفتگو بڑی دلآویز ہوتی تھی اور ان کی باتوں سے جی نہیں اکتاتا تھا۔ وہ صرف اپنی ہی نہیں کہتے تھے بلکہ دوسروں کی بھی سُنتے تھے۔

جب میں نے نویں درجے سے ہندو اسکول چھوڑ کر گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا تو ان سے براہ راست فیضیاب ہونے کا موقع بھی مجھے ملا۔ وہ ہم لوگوں کو انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ انگریزی بولتے وقت حسینی صاحب کا لب و لہجہ انگریزوں کا سا ہوتا تھا، اور تاریخ پر ان کو اچھا عبور حاصل تھا۔ ان کی طرز تعلیم بڑی ہی دلکش تھی پڑھاتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا گویا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں دسواں درجہ پاس کرکے میں نے لکھنؤ کے گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج میں داخلہ لیا تو حسن اتفاق سے حسینی صاحب بھی تبدیل ہوکر وہیں آگئے تو لکھنؤ میں بھی ان کے لطف و کرم سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ملنے لگا۔ جس کا سلسلہ ۱۹۲۸ء تک قائم رہا۔ پھر میں بغرض تعلیم آگرہ چلا گیا اور جب تعلیم ختم کرنے کے بعد واپس ہوا اور ۱۹۳۴ء میں پھر شرف نیاز حاصل ہوا تو بھی لطف و کرم اور شفقت و رافت کا وہی پہلا سا انداز قائم رہا۔ بلکہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس سے متعلق ہونے اور قومی معاملات میں میرے اور حسینی صاحب کے درمیان ہم آہنگی کی وجہ سے اس انداز میں اور استواری پیدا ہوگئی۔

لیکن ۱۹۳۸ء سے جب انھوں نے شیعہ کانفرنس سے علیحدگی اختیار کی تو ملنے جلنے کا سلسلہ نسبتاً کم ہوگیا۔ اور جب ان کا قیام ۱۹۴۰ء سے لکھنؤ میں ہوا تو وہ بالعموم لکھنؤ سے باہر رہنے لگے۔

حسینی صاحب کو انگریزی تصویریں دیکھنے اور ناولیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اور انہوں نے جتنی انگریزی تصویریں دیکھیں اور ناولیں پڑھی ہوں گی شاید کم لوگوں نے دیکھی یا پڑھی ہوں گی۔ اب تک ان کو رات میں کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی اور بقول خود ان کو پڑھنے کا "ہوکا" ہے۔ انھوں نے ناولیں بھی لکھی ہیں اور ناولوں کی تاریخ بھی۔ افسانے بھی اور مضامین بھی۔ انہوں نے اپنی خطابت مطالعہ کی کثرت اور اپنی فنی تخلیقات کی ندرت و جاذبیت کی وجہ سے دنیائے ادب میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ بنالی ہے اور معاصرین میں ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔

ان کی سرشت میں دردمندی، دلی اور جذبۂ تحفظ نوعی اس طرح ممزوج ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اچھے دوست تو ہیں ہی دشمن شاید کسی کے بھی نہیں ہیں۔ اندھی تقلید کے قائل نہ ہوتے ہوئے بھی یہ اصلاً مذہبی آدمی ہیں۔ ان کی نظر مذہبی امور پر بالعموم فلسفیانہ اور منطقیانہ رہتی ہے۔ ابتدائے ملازمت میں وہ کبھی کبھی سوٹ بھی پہنتے تھے اور داڑھی بھی منڈواتے تھے مگر یہ صورت حال تھوڑے ہی دن تک باقی رہی اور ایک مدت سے وضعداری کے ساتھ ان کا لباس چوڑی مہری کا پائجامہ، اچکن اور کشتی دار ٹوپی ہے۔ ان کے چہرے پر داڑھی کہنا چاہئے۔ ابتدائے سفر زندگی میں بھی اور اب وسط سفر میں بھی ان کی شخصیت کو نمایاں کرتی ہے۔

وہ اپنے شاگردوں سے اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں اس لئے ان کے شاگرد بھی ان کو دل سے چاہتے اور ان کی عزت کرتے ہیں اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کی محبت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بھی کیا جاسکتا ہے، جو میرے ساتھ پیش آیا۔ جوبلی کالج میں ۱۹۴۱ء میں ہمارے پرنسپل صاحب نے یہ حکم نافذ کیا تھا کہ کھیلوں کے مختلف آئٹم (items) میں سے ایک طالب علم صرف تین آئٹم میں حصہ لے سکتا ہے۔ میں نے اپنے لئے تین دوڑیں منتخب کیں اور دو میں کامیاب ہونے کے بعد جب تیسری لمبی دوڑ لگانے لگا تو مقابلہ کرنے والوں میں سب سے پیچھے تھا اور دیکھنے والوں میں حسینی صاحب بھی تھے۔ میری اس "سست رفتاری" پر حسینی صاحب کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ میں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو شاید شرارتاً یا ان کے جذبۂ شفقت کو اور ہوا دینے کے لئے اپنی چال اور سست کردی۔ یہ صورت حال حسینی صاحب کے لئے مزید پریشانی کا باعث بن گئی۔ حتیٰ کہ ایک ایک کرکے میرے ساتھ دوڑنے والے گرنے لگے اور دو تین اور چکروں کے بعد بس چار دوڑنے والے میدان میں رہ گئے۔ اب حسینی صاحب کے چہرے کی رنگت تو بدلی مگر مجھے سب کے آگے دیکھنے کی خواہش ان کے دل میں بدستور باقی رہی۔ ان کی اس دلی خواہش کو پورا کرنے کے خیال میں میں یہ بھول گیا کہ ابھی دو چکر باقی ہیں، اور یہ سمجھ کر کہ ایک ہی چکر باقی رہ گیا ہے۔ میں نے اپنا سارا دم صرف کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخری چکر تک اتنا دم باقی نہ رہا کہ میں اول آسکتا اور میں ان میں تیسرا ہوگیا۔ اس سال کھیل کود اور دوڑ بھاگ میں تو مجھے کالج سے انعام ملے ہی مگر تقریری مباحثوں کا انعام انہوں نے خود اپنے پاس سے مرحمت فرمایا۔ جس میں ان کی پڑھی ہوئی دو انگریزی ناولیں تھیں، اور ایک پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کی "ہماری شاعری" کے طبع اول کا وہ نسخہ بھی تھا جو محدود تعداد میں طبع ہوا تھا اور جو اس وقت بھی کمیاب تھا۔ یہ تحفے آج بھی ایک سرمایۂ گرانمایہ کے طور پر میرے پاس موجود ہیں اور نہ صرف حسینی صاحب کی شفقت و محبت کی یاد ہی دلاتے بلکہ یادوں کے ان چراغوں کو روشن بھی کئے ہوئے ہیں۔

یوں تو خوش نصیبی سے میرا سابقہ شفیق و لائق و فائق استادوں ہی سے رہا لیکن اگر مجھ سے اپنے ایک ہی استاد کا نام بتانے کو کہا جائے تو میری زبان پر حسینی صاحب ہی کا نام آئے گا۔

سید مسعود حسن رضوی

علی عباس حسینی اور مَیں

یہ خبر میرے لیئے دلی مسرت کا باعث ہے کہ ادارہ صبحِ نو اردو کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار علی عباس حسینی صاحب کی ادبی خدمتوں کے اعتراف میں ایک خاص نمبر شایع کرنے والا ہے۔ علی عباس حسینی صاحب میرے بہت قدیم اور مخلص دوست ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں میں نے کیننگ کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ اور علی عباس صاحب نے غازی پور سے مَیٹرک اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے لکھنؤ میں ایک بورڈنگ ہاؤس قائم کیا۔ میں پہلا طالب علم تھا جو اس بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوا۔ چند روز کے بعد علی عباس صاحب کے عم محترم جناب اسحاق الحسینی صاحب مرحوم انکو اپنے ساتھ لکھنؤ لائے۔ تعلیم کے لیئے کرسچین کالج میں اور قیام کے لیئے اسی بورڈنگ ہاؤس میں انکو داخل کر دیا۔ علی عباس صاحب لکھنؤ میں نو وارد تھے اور میں یہاں کئی سال پہلے سے مقیم تھا۔ عمر میں بھی ان سے بڑا تھا۔ اور اپنی افتادِ مزاج کے اعتبار سے اپنے ہم عمروں میں بڑا معلوم ہوتا تھا اسلیئے جناب اسحاق الحسینی صاحب نے انکی نگہداشت میرے سپرد کر دی۔ اس وقت سے ہم دونوں میں جو بزرگانہ دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات قائم ہوئے وہ اب تک قائم ہیں۔

افسوس ہے کہ میں علی عباس صاحب کے ادبی کارنامے کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ ان کا خاص فن افسانہ نویسی اور ناول نگاری ہے اور میں اس فن سے اس قدر بیگانہ ہوں کہ اسکے بارے میں کچھ لکھنا اپنی بے مائیگی کی تشہیر کرنا ہے۔ بس صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ناول بینی کا شوق انکی فطرت میں داخل ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی ناول پڑھنا انکا بہترین مشغلہ تھا۔ وہ سال بھر میں اتنے ناول پڑھ ڈالتے تھے جتنے میں نے عمر بھر میں نہ پڑھے ہونگے۔ شاید ہی کوئی ایسا مشہور ناول نگار ہو جس کے ناول انگریزی زبان میں مل سکتے ہوں اور علی عباس حسینی صاحب نے ان کو پڑھ نہ ڈالا ہو۔

شاعری سے بھی علی عباس صاحب کو بہت دلچسپی تھی۔ جس زمانے میں وہ اور انکے اور میرے مشترک دوست جناب مرزا حامد حسین مرحوم الٰہ آباد میں فنِ تعلیم کی ٹریننگ حاصل کر رہے تھے میں بھی بسلسلۂ ملازمت الٰہ آباد میں مقیم تھا۔ تقریباً ہر تعطیل کے دن یہ دونوں رفیق میرے یہاں آجاتے تھے اور دن کا زیادہ حصّہ میرے شعر پڑھنے اور انکے شعر سننے میں گذرا کرتا تھا اور اسی اثنا میں شعروں اور شاعروں کے بارے میں بحثیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد علی عباس صاحب کو بعض ذی اثر اور حکام رس عزیزوں اور بزرگوں کی مدد سے اگزیکیٹو لائن میں کوئی ممتاز منصب ملنے کی امید تھی اور میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان کو ٹریننگ کالج میں داخل ہونے کا مشورہ دیتا رہتا تھا۔ آخر جب انکی وہ امید پوری نہ ہوئی تو انہوں نے میرے مشورے پر عمل کیا اور ٹیچرز ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے لکھنؤ میں طالب علمی کے زمانے میں وہ میرا ایک اہم مشورہ قبول کر چکے تھے یعنی انگریزی جرنلزم کا خیال

ترک کرکے اردو لکھنے کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اس کا بیان خود ان ہی کی زبانی سنیئے:۔

"میری شخصیت تین ذوات گرامی سے بہت متاثر ہوئی وہ ہیں نواب زادہ محمد مہدی علوی ایم ال اے پٹنہ، مرزا حامد بیگ بی اے ال ٹی لاہوری اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ۔ نواب زادہ کی صحبت نے مجھے دل کا گداز عطا کیا۔ مرزا کی دوستی نے مجھے زندگی پر ہنسنے کا سلیقہ دیا اور مسعود صاحب کے اخلاص نے مجھے خادم اردو بنا دیا۔ حق یہ ہے کہ اگر مسعود صاحب اس طرف توجہ نہ دلاتے تو میں انگریزی کا جز ملت بن جاتا۔ مگر اردو میں انشا پردازی کا خیال بھی دل میں نہ آتا۔ کالج میں تعلیم پانے کے زمانہ میں اگر کوئی شوق تھا تو وہ انگریز کی طرح انگریزی بولنے اور لکھنے کا۔ اردو تو بڑی کم مایہ اور ناقابل التفات زبان محسوس ہوتی تھی۔ مگر مسعود صاحب نے غیرت دلائی کہ گھر کا دیا بجھا کر مسجد کا چراغ جلانے والے نہ بنتا ہیں نہ جانے ان کی اس ہدایت کا نتیجہ اردو کی ترقی میں اضافہ ہوا یا اس پیاری زبان کی کوئی قابل قدر خدمت۔ اس کا فیصلہ آئندہ نسلیں کریں گی۔ مگر اردو کی وہ لگن جو اب مجھ میں ہے وہ مسعود صاحب کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے" [1]

غرض یہ ہے ایک مشورے سے اردو کو علی عباس حسینی صاحب کا سا ادیب ملا۔ اور دوسرے مشورے سے ان کو ایسا ماحول ملا۔ اور اتنا وقت ملا کہ وہ اردو ادب کی کافی خدمت کرسکے اور وہ اس امتیاز کے مستحق قرار پائے کہ ایک موقر رسالہ ان کے لئے خاص کر اپنا خاص نمبر نکالے۔ انہوں نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اس میں مجھ کو کسی حد تک شریک سمجھا جا سکتا ہے۔

مشہور قول ہے الدال علی الخیر کفاعلہ۔

اور جب ان کی ادبی خدمت میں میری شرکت ہے تو اس خدمت سے جو عظمت ان کو حاصل ہوئی ہے اس میں تھوڑا سا حصہ میرا بھی ہے۔ وہ حصہ نہ مجھے کسی سے لینا ہے نہ کسی کو مجھے دینا ہے وہ خود بخود مجھے پہونچ رہا ہے۔ اس پرمسرت احساس کی صورت میں کہ میں نے اردو کو ایک فنکار دیا اور اردو نے اس کو یہ اعزاز و افتخار بخشا۔

ناول نگاروں اور ناشروں سے

جناب علی عباس حسینی کی کتاب "اردو ناول کی تاریخ و تنقید" کا نیا ایڈیشن نظر ثانی اور اضافے کے شائع ہونے والا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی تھی، اس لئے اس کے بعد کے بیس سال کے ناولوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ناشرین اور مصنفین سے التماس ہے کہ وہ اس مدت میں شائع شدہ ناولوں کی ایک ایک کاپی مصنف موصوف کے مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کر دیں۔ ناشرین ۱۹۴۴ء کے بعد مطبوعہ ناولوں کی مکمل فہرست بھی ارسال کرسکتے ہیں۔

پتہ درج ذیل ہے

جناب علی عباس حسینی

۱۰۵ غوث گنج ۔ وزیر گنج

لکھنؤ

---

[1] نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر۔ حصہ دوم۔ اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۹۹۹

ممتاز بھائی

نواب زادہ سید محمد مہدی

(۱)

ادبی دنیا جن کو علی عباس حسینی یا حسینی کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے وہ اعزائے قریب کے لیے "ممتاز بھائی" یا دوسرے رشتوں سے چچا، ماموں، دادا اور نانا وغیرہ ہیں۔ کوئی بزرگ، صرف ممتاز بھائی پکارنے والا اب باقی نہیں ہے ہاں ان بڑوں کی یاد باقی ہے اور باقی رہے گی۔

مجھ سے جب اس خصوصی نمبر کیلئے کچھ لکھنے کی فرمائش وفا صاحب کی تو میں نے اپنی نا اہلی کا عذر کیا تھا اور سمجھا تھا کہ وقت گذر جائیگا، در بات ٹل جائیگی مگر جب صبح نو میں میرا نام بھی لکھنے والوں کے زمرہ میں شائع کر دیا گیا تو اب ع دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں تجھے۔

بہرحال حسینی کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ یا افسانہ نگاری میں ان کو کیا درجہ دیا جائے گا یہ تو ادیب جانیں یا تنقید نگار ہیں، تو تنقید کو سوائے خردہ گیری کے آج تک کچھ اور نہ سمجھ سکا (گو مجھے تسلیم ہے کہ میرا یہ خیال میری جہالت اور کم علمی کی بنا پر ہو سکتا ہے) اسلئے حسینی کو تو چھوڑیئے مجھ سے ممتاز بھائی کے متعلق سنئے: ع از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس۔

ممتاز بھائی کا سن گیارہ اور میرا نو برس کا تھا۔ جب ممتاز بھائی ہمارے چھوٹے ماموں اور اپنے چچا جناب سید محمد اسحاق حسینی صاحب مرحوم معروف بہ مجھلیا (خدا مرحوم کے درجات عالی کرے) کے ساتھ یہاں پٹنہ میں رہنے لگے۔ انکا مکان محمدن اسکول کے قدیم پھاٹک کے سامنے تھا تعلیم کا سلسلہ مدرسہ سلیمانیہ سے شروع ہوا۔ مدرسہ اس وقت جناب خان بہادر سید احمد علی خاں صاحب مرحوم و مغفور کے مکان محلہ مغلپورہ (کانٹو کاپل) میں تھا اور مدرسہ کی نئی عالی شان عمارت زیر تعمیر تھی اور ہم دونوں اسی مدرسہ میں ابتدائی تعلیم کے مدارج طے کر رہے تھے۔ ہمارا کوئی اپنا بھائی نہ تھا اسلیئے ہم دونوں برادران یوسف کے خلاف حقیقی بھائی سے زیادہ قریب اور ایک دوسرے کے چاہنے والے دوست بن گئے۔ اور اس خلوص اور محبت کی گرہ مضبوط سے مضبوط تر بندھتی گئی۔ ایک ایسا لطیفہ سنئے جس سے اس والہانہ محبت کا سراغ ملتا ہے جو ممتاز بھائی کو مجھ سے تھی۔ ایک دن یہ اتفاق ہوا کہ میں اپنے بڑے چچا (جناب نواب حاجی سید بادشاہ نواب صاحب مرحوم جنت مکان) کے سامنے انکے پکارنے پر ننگے سر بدخیالی میں چلا گیا یہ امر ہمارے استاد اور اتالیق جناب مولوی سید حیات علی صاحب مرحوم الہ آبادی کو بہت ناگوار گذرا۔ انہوں نے اس فروگذاشت پر جب ہماری سزا کی تو ممتاز بھائی سے نہ رہا گیا اور انہوں نے مولوی صاحب کے منہ پر سامنے رکھی ہوئی کتاب دے ماری جسکی سزا میں بجائے میرے انکی شدید تادیب ہوئی اور وہ ہنستے ہوئے سہ گئے۔

مدرسہ سلیمانیہ میں (وہ) مجھ سے ایک درجہ نیچے تھا اور میرے ساتھیوں میں ناقابل فراموش ہمارے مخلص مولانا سید عدیل اختر صاحب مرحوم تھے (جو بعد میں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے پرنسپل ہوئے اور قبل از وقت داغ مفارقت دے گئے) ممتاز بھائی کے ساتھیوں میں قابل تذکرہ خان بہادر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب جعفری ملا فاضل مولوی فاضل بی ایچ ڈی وغیرہ (سابق منولی امامباڑہ ہوگلی اور حال مقیم پاکستان) ہیں۔ جن کی ماشاء اللہ ابھی تک صحت بھی جوان ہے اور دل بھی جوان ہے۔ مدرسہ کے امتحان میں ممتاز بھائی برابر اول آتے رہے اسلیئے ہمارے ماموں صاحب نے طے کیا کہ انہیں انگریزی تعلیم دلائی جائے۔ اور زمانہ کا بھی یہی تقاضا تھا۔ مگر مدرسہ کے مدرس اعلیٰ جناب مولانا سید فرمان علی صاحب قبلہ مرحوم و مغفور (مفسر قرآن) چاہتے تھے کہ عربی ہی کا سلسلہ خاندانی روایات کی بنا پر

اسقوان کے بعد ایک رومانی ناول بیس دن میں مکمل کیا گیا اسکا نام "تقدیر کے تین خط" تھا جو پہلے اس وقت کے جوانی کے جذبہ کے تحت میں رومانی ہونے کی وجہ سے بہت پسند ہوا تھا اور اسکو بڑھ کر پسند کرتا تھا اور اسی وجہ سے جب اسکا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو ممتاز بھائی نے اس ناول کو ہمارے نام معنون کردیا۔

۱۹۱۱ء میں ممتاز بھائی نے L.T. پاس کیا اور رائے بریلی میں گورنمنٹ اسکول میں ملازمت کرلی۔ B.A. اور L.T. کے درمیان ممتاز بھائی کی خاندان ہی میں اپنے چچا کی لڑکی سے شادی ٹھہر گئی اور پھر رک بھی گئی مگر قسمت سہرے کے پھول نہ کھل سکے مگر بعد میں یہ پھول کھلے مگر چھ سال بعد مرجھا گئے۔ مرحوم کی یادگار ایک لڑکا نور نظر سید مہدی عباس حسینی اطال اللہ عمرہ ہے جو آجکل قسمت سے ڈیولپمنٹ منسٹری میں ڈپٹی سکریٹری ہیں اور بھانجا بھی ہیں بھی یادگار ہے۔

۱۹۲۳ء سے ممتاز بھائی کے مزاج میں ناول نویسی اور افسانہ نگاری میں پختگی زیادہ آگئی اور Pastmasters کے انداز پر ایک ناول تالیف کیا جو بڑے خوبصورت نام کے ان کے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۲۶ء کے بعد سے میرا قیام اس مکان بڑی حویلی سے منتقل ہوکر دوسرے مکان جو باولی والا کے نام سے موسوم تھا رہنے لگا۔ یہ وہی مکان تھا جہاں متعدد بار آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا اجلاس ہوا کیا اور پہلا اجلاس زیر صدارت حضرت مکان ہز ہائینس نواب صاحب بہادر رامپور ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں اجتبیٰ حسین صاحب رضوی (حال پرنسپل ملت کالج دربھنگہ) سے ہمارے مراسم اور تعلقات کا سلسلہ عزیزی علامہ جمیل مظہری کے بدولت ہمارے لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں قائم ہوگیا اور موصوف بھی ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر ساتھ رہنے لگے۔ اس سال گرمیوں کی تعطیل میں ممتاز بھائی کے قیام کا زمانہ بڑے پرلطف ادبی صحبت اور مذاکروں میں گذرا۔ علامہ جمیل بھی شام کو آجایا کرتے تھے انکے علاوہ اجتبیٰ رضوی کے برادر عظیم ابادی مرحوم کا میرا یہاں بھی رہتا تھا۔ غرض کوئی شام ایسی نہ گذرتی جس میں کوئی نہ کوئی دلچسپ معلومات کا دفتر نہ کھلتا ہو۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ اسی زمانہ میں ہم نے ایک بڑی ادبی خدمت اپنے سر منڈھ لی تھی اور وہ جناب شاد مرحوم کے دیوان کی ترتیب اور اشاعت۔ مرحوم کے صاحبزادے سید حسین خاں صاحب مرحوم حیات تھے اور میں خود ان سے دیوان کے اجزا لاتا تھا نقل کرتا اور اس جز کو واپس کرکے دوسرا اجزا لاتا تھا

یہاں اسکا تذکرہ کچھ بے محل سا ہوسکتا ہے لیکن چونکہ یہ بات بھی ایک ادبی خدمت سے متعلق ہے اور اب اس ضمن کی محنت کے بارآور ہونے کی امید بھی تو باقی نہ رہ گئی۔ اسلئے اسکے حالات کچھ تفصیل سے دیئے دیتا ہوں کہ شاید بعد میں اسکا کوئی پھل مل سکے۔ جناب شاد مرحوم نے اپنی حیات میں تیرہ مرتبہ اپنا دیوان ترتیب دیا تھا اور ردیفوں کے حسب پہلا دیوان مرتب ہوگیا۔ صاف ہوگیا اور جلد بھی بندھ گئی تو مرحوم نظر ثانی کتابت کی اصلاح کے خیال سے کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ کتابت کی اصلاح کے ساتھ نفس کلام پر بھی اصلاح شروع ہوگئی اور بالآخر یہ صاف شدہ نسخہ پھر مسودہ ہوگیا۔ اور اس زمانہ کی جدید غزلیں بھی بڑھتی گئیں یہاں تک کہ دوسرے نسخے کے صاف کرنے کا کام پھر سے شروع ہوا اور بعد اختتام اس کا بھی یہی حشر ہوا جو پہلے نسخہ کا ہوا تھا۔ ان دواوین کی اصل ترتیب کا سن تو اب بھول گیا ہوں لیکن میرے اس ذخیرہ میں جس میں یہ تمام کلام نقل ہے سب لکھے موجود ہیں۔ بہرحال میں نے یہ التزام کیا تھا کہ جب سب کی نقل کرچکا تو پہلے نسخہ کی نقل تمام کی اصل بنیاد قرار دیکر حاشیہ پر تمام وہ تبدیلیاں سلسلہ وار لکھتا گیا جو وقتاً فوقتاً جناب شاد مرحوم نے فرمائی تھیں۔ اس کام میں کامل ۶ مہینے صبح سویرے سے ۱۰ بجے رات تک مصروف ہوتا رہا۔ اور جب یہ سب مراحل طے ہوگئے اور یہ طے ہوا کہ اب طباعت کے مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے تو ایک جاڑے کی رات کو ۱۰ بجے شب کے بعد ایک موٹر آئی اور اس میں سے جناب علی اکبر صاحب کاظمی مرحوم اور جناب مہاراجکمار صاحب محمود آباد دام اقبالہ اترے میں گھبرا کر سر سے ملا کر آتی رات کو زحمت کی کیا وجہ ہوئی بہرحال قصہ مختصر یہ کہ مہاراجکمار صاحب نے فرمایا کہ راجہ صاحب خود آتے مگر وہ لیڈی امام صاحبہ کی وجہ سے رک گئے اور مجھے بھیجا ہے کہ کلام شاد جو میں نے مرتب کیا ہے اس کی اشاعت وہ کرنا چاہتے ہیں اسلئے وہ تمام کاغذات اور مسودات دیدو۔ پہلے مجھے اپنی اور اپنے احباب کی محنت کا خیال آیا تو معذرت کرنے کو جی چاہا مگر پھر یہ خیال کرکے کہ بہرحال ہم سے بہت بہتر اور اعلیٰ پیمانہ پر اشاعت اور طباعت کا سامان ہوگیا ہے خود غرضی ہم کو نہ کرنی چاہیئے۔ ہم نے بالآخر تمام مسودات کا بستہ حاضر کردیا اور اپنے معزز مہمان کو رخصت کرکے کچھ تھکا تھکا سا کمرے میں لوٹ آیا۔ بہرحال میں مقدرات کا سخت قائل ہوں اور تدبیر کو تقدیر کا تابع کہتا ہوں۔ وہ بستہ میرے یہاں سے جانے کے بعد آج تک کہیں پڑا ہوگا لیکن اسے اب تک کچھ حاصل نہ کرسکا۔

خیر تو اس ذکر کو یہیں ترک کرتا ہوں اور ممتاز بھائی کے پتہ لگانے

سلسلہ کی طرف کچھ متوجہ ہوتا ہو۔ ۱۹۳۸ء تک جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہر سال
کم از کم ایک بار تو ہم دوسرے شہروں کی پوری چھٹیاں ساتھ گزارتے تھے لیکن ۱۹۳۹ء
سے ۱۹۴۴ء تک اب و دانہ نے دوسرا رخ موڑ دیا اور سال بسال کا معمول منقطع
ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء میں البتہ میرے بڑے بیٹے کی شادی خانہ آبادی کے سلسلہ میں کہ یہ
رشتہ ممتاز بھائی کا طے کیا ہوا تھا پٹنہ جانا ہوا اور وہاں برات میں حیدرآباد کا سفر ہوا
جو دو ایک واقعات کی وجہ سے یادگار رہے گا۔ رسارہ کیلئے ہم لوگوں کا یہ پہلا اتفاق تھا کہ
اتنے نشست روز ریل کے سفر یعنی سفر میں گزریں مختلف طبقات کے لوگ براتی تھے
اور سب اپنی اپنی پارٹی شپ پوری کرنے کی بنا پر ایک ڈبے سے دوسرے میں
اکثر جنکشنوں پر بدلتے رہتے تھے اسی ادلا بدلی میں ایک موقع ایسا آیا کہ جس
ڈبے میں نواب حاجی حضرت محمد نظیر الحسن صاحب مرحوم (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے
قلم کانپتا ہے اور دل دھک دھک کرنے لگتا ہے جو اپنے نظیر آپ تھے انکی شرافت، انکا
خلوص، انکی سخاوت، انکا تحمل، انکی دوستی تو دیکھنے کی چیز تھی مگر افسوس کہ نیرنگی زمانہ
کی نظر لگ گئی اور شب ۱۷ اور ۱۸ مئی کو قضا کے ہاتھ نے ہم لوگوں سے چھین لیا
ع زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے) خیر تو اسی کمپارٹمنٹ میں نواب سید علی سجاد صاحب
(خدا انکو برقرار اور انکے حقہ کو سدا گلزار رکھے) حسب عادت حقہ کے بھرنے
کے انتظام میں اپنے ملازم کو ہدایت دے رہے تھے کہ گاڑی چل پڑی اور کمپارٹمنٹ
میں حقہ بھڑکنے سے محفوظ رکھنے کیلئے ایک خاص سفری ہوادار صندوقچہ جو
خاص اس سفر کیلئے بنا تھا اس میں چلم تیار ہونے کے لئے رکھ دی گئی۔ اور سب
باتوں میں لگ گئے دفعتہ ممتاز بھائی پکار اٹھے کہ آگ لگ گئی اور فوری بھٹیے اور
ظاہر ہوا عین وقت تمام تباکو وغیرہ کے ساتھ اٹھا کر کمپارٹمنٹ کے باہر پھینک دیا
ادھر تو وہ صندوقچہ زمین سے ٹکرا کر چور ہوا اور آگ کی چنگاریاں ہوا میں اڑنے
لگیں ادھر ممتاز بھائی نے منہ بنا کر پہلے نواب علی سجاد صاحب سے تعزیت حقہ کے
سامان کی ادا کی اور پھر یہ فقرہ بھی جما دیا کہ ریل والے اگر تحقیقات کو آتے تو
پھر اس قانون شکنی کے مجرم نواب سجاد ہی نہیں بلکہ ہم سب کو اقبال جرم
کرنا ہوگا کہ یہ نجاست کا حقہ تھا۔ مگر سجاد صاحب کچھ مرجھائے، کچھ افسردہ کچھ
متفکر کہ اب لیا تباکو کہاں ملے گا سراسیمہ سے تھے کہ نواب نظیر مرحوم نے نہایت
متانت سے فرمایا کہ بھائی میں حقہ بھر دونگا اور تباکو بھی جسکے آپ عادی ہیں
سجاد صاحب خوش ہو گئے باچھیں کھل گئیں اور جلدی جلدی یہ پوچھنے لگے کہ
کیا آپ نے بھی حقہ شروع کر دیا ہے۔ مرحوم نے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ دیکھئے
ممتاز بھائی نے آپ کے تباکو کا ڈبہ الگ رکھ چھوڑا ہے۔ سجاد صاحب
گلے سے لپٹ گئے اور خوش ہو گئے۔

دوسرا واقعہ اس شادی کی یادگار ایک ادبی مضمون ہے جس میں کرشن چندر نے
رخصتی کے وقت کے اسٹیشن کے کچھ واقعات لکھے گئے ہیں عنوان بھول گیا ہوں

ممتاز بھائی اور میری زندگی میں اب جبکہ میری عمر ۷۵ کو پہونچ چکی ہے
اتنے دنوں کے ساتھ رہنے اور قلبی اور صلبی رشتہ داری کے سلسلہ میں ان گنت
واقعات گذرے ہیں انکو دہراؤں تو دفتر کا دفتر ہو جائے۔ افسانوں کے سلسلہ کی
ایک بات یاد آ گئی۔

ایک اور بھی افسانہ ممتاز بھائی نے ہمارے ساتھ لکھا وہ ہے "صفیر قفس"
ہوا یہ کہ لیڈی سلطان صاحبہ کا گیا میں آپریشن ہوا ہم دونوں بھائی ان کی
عیادت کے لئے گیا گئے۔ سر سلطان مرحوم نے (جن کا ساتھ لطیف النفس، کریم، خلیق اور
جملہ صفات انسانیت سے متصف بزرگ ملنا اب محال ہے) ہم نوجوانوں کی
سیر و تفریح کے لئے ایک مخصوص لاری کا انتظام کر دیا جو ہمیں دن بھر گیا کے
متصل مختلف مقامات پر لئے لئے پھری اور ہم تمام مناظر اور قابل دید مقامات
کی دید سے آنکھیں سینکتے رہے۔ اسی سلسلہ میں بودھ گیا کے مندر اور
بودھی درخت کی زیارت ہوئی۔ ساتھ میں عزیزی نجم الحسن سلمہ (نجو میاں)
علی اکبر کاظمی مرحوم (سابق منسٹر تعلیم ریاست کشمیر) بھائی منظور صاحب
(اللہ انکو زندہ اور انکی زندہ دلی کو سلامت رکھے) اور کچھ اعزا بھی ساتھ
رہتے تھے۔ ہم لوگ تاش کھیلتے، ادبی بحثیں کرتے، فلسفہ چھانٹتے۔
اور بھائی منظور سب کی ہجو کرتے۔ صفیر قفس اسی سفر کے تاثرات اور
نظاروں کا ایک ہلکا پھلکا بیان ہے۔ رومان محض تخلیقی پیداوار ہے۔
کیونکہ کچھ تو لکھنا ہی تھا اسلئے اتنا افسانوں کے متعلق بھی لکھ گیا۔ ہمارے
بھائی میں ادبی افسانہ نگاری اور دوسری ادبی خصوصیات میں کیا جگہ ہے
اور انکے کیا خصوصیات ہیں وہ ناقدین جانیں البتہ دبے لفظوں میں
اتنا عرض کرونگا کہ مجھے سب سے زیادہ جو افسانہ پسند ہے اس کا عنوان ہے
"بختیارک کا نسخہ" مگر مجھے نجی زندگی کے چند واقعات لکھ کر آخر میں
یہ عرض کرنا ہے کہ میرے تمام اعزا میں اتنا شاکر، اتنا متحمل، اتنا ہمدردی کا
پتلا اور دوست مجھے نہیں ملا۔ میں نے اتنے دنوں کے ساتھ میں کبھی بھی
ممتاز بھائی کو بگڑتے نہ دیکھا نہ سنا اسی کے ساتھ اتنا مفلس بھائی ہمیں

دوسرا انہیں طلا جب کوئی کمائی نہ تھی تب بھی مفلس اور جب دونوں ہاتھ سے کمانے لگے تب بھی مفلس روپیہ آنے اور جانے میں دن اور گھنٹہ نہیں لگے بہت تھے اور ہیں۔ لیکن یہ کسی کا احسان لیں یا مدد قبول کریں ناممکن ہے۔ لیا تو قرض اور آیا تو فوری قرض ادا لیکن پھر ہمیشہ قرضدار اور پھر کبھی کسی کے قرضدار بھی نہیں۔

۲

میں نے تو یہ مضمون ختم ہی کر دیا تھا مگر عزیزی سہیل عظیم آبادی کو گھر کے بھیدی کی یہ باتیں اتنی پسند آئیں کہ ان کا اصرار ہے کہ ممتاز بھائی کے متعلق اور بھی جتنی باتیں یاد آتی جائیں وہ سب لکھ بھیجو۔ تو مناسب ہے اوپر والے کا حافظ معلوم پھر ہمیں اسکا کب سلیقہ کہ اپنے پیارے بھائی (ہم اسی طرح ایک دوسرے سے خطوط میں تخاطب کرتے تھے) کے بارے میں جو کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھوں اُسے گلدستہ کی طرح سجا کر ادیبوں کے تصور میں پیش کریں۔ کیا کیا جائے تقاضا وفا اور سہیل کا بہت اصرار امتثال امر پر مجبور کر رہا ہے۔ جیسے جیسے کچھ باتیں یاد آتی جاتی ہیں وہ ممتاز بھائی کے سلسلہ میں ٹانکتا جاتا ہوں۔ ممکن ہے ان میں سے اس پیاری شخصیت کا کوئی پہلو زیادہ نمایاں ہو جائے اور طلبائے ادب کو اسکے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو۔ یہ بیان میرے محبوب بھائی کا ہے اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میری انکی دوستی ۱۹۰۷-۰۸ میں شروع ہوئی جب وہ پہلی بار اپنے وطن پارہ ضلع غازی پور (یوپی) سے پٹنہ آئے اور میرے چھوٹے ماموں اور اپنے چچا کے یہاں مقیم ہوئے اس دور کو مدرسہ سلیمانیہ والا دور کہا جا سکتا ہے اسی زمانہ میں ہمارے منجھلے چچا مرحوم کی اکلوتی لڑکی کی شادی جناب سید علی ضامن صاحب (مرحوم جونپوری) سے ہوئی۔ اس شادی کا انجام بھی ایک عبرتناک داستان ہے اسلئے شادی کے بیس دن کے بعد جہاں جالے ہوئے تھے وہاں جنازہ تیار ہوا اور لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ کرایا گیا؎

اب آیا دھیان اے آرامِ جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تجھے بھولے تھے ہم اسبابِ شادی میں

خیر تو اس شادی خانہ بربادی کے موقع پر ممتاز بھائی بھی شریک تھے اور ایک فوٹو گروپ جو لیا گیا اس میں ممتاز بھائی اپنے کم سنی کے صورت و لباس میں نظر آتے ہیں۔

اسی زمانہ کی ایک اہم بات یاد آگئی جس نے ممتاز بھائی سے انکا وہ حافظہ چھین لیا جسکے لیے وہ ہم چشموں میں ممتاز تھے اور جسکے کھو جانے کے بعد وہ اپنی تقریر و تحریر میں بار بار ماتم کرتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ہم لوگوں نے ایک چھوٹا سا خوبصورت بلی کا ایک مادہ بچہ پالا۔ ادھر مرغیاں بھی پلی تھیں اور وہ انکے ساتھ کھانے پینے میں شریک رہتی تھی۔ اور بڑی یگانگی اور انسیت کے ساتھ پلتی بڑھتی رہی۔ دفعتاً اسکی کایا پلٹی اور وہ انہیں مرغیوں پر جھپٹنے لگی اور قاتلانہ حملہ کرنے لگی۔ لڑکیوں نے غوغا مچانا شروع کیا۔ ممتاز بھائی چھوٹی بہنوں کی چہیتی مرغیوں کی جان خطرے میں دیکھ کر بلی کی تادیب پر اتر آئے اسلئے وہ بجائے گھر کے صحن کے کھپریل پر گھومنے لگی۔ اور موقع کی تاک میں رہ کر "گریلا جنگ" کرنے لگی۔ طے ہوا کہ اسکو دریا بدر کر دیا جائے۔ پکڑ کر بورے میں بند کی گئی اور ملازم کو بورا دیا گیا کہ اسے گنگا جی کے نذر کر آئے۔ اس نے راستے ہی میں بورا کاٹا اور ملازم کی گردن کی دانتوں سے بوٹی اتارنی چاہی وہ چیخا اور بھاگا کہ "اس بلی پر آسیب ہے میں اسے کبھی نہ ہاتھ لگاؤنگا"۔ دوسری بار پکڑی گئی۔ ممتاز بھائی میر کارواں بنے اور اپنے کئی ہمجولیوں کی مدد سے محمڈن اسکول کے اندھے کنویں میں ڈال آئے۔ گو کنویں میں پانی نہ تھا مگر اندر سے گھرا ہوا تھا اور کافی گہرا تھا اسلئے امید تھی بلکہ یقین تھا کہ اس میں سے نہ نکل سکے گی۔ وہ دوسرے ہی دن پھر کھپریل پر بیٹھی "میاؤں میاؤں" کرتی دکھائی دی۔ اب گھر کی مستورات میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں "ہو نہ ہو کوئی جن اس پر ضرور سواری کرتا ہے"۔ ممتاز بھائی نے جو سنا تو انکا غصہ اور بڑھا "اب کی مل جائے تو مار ہی ڈالونگا"۔ اتفاق یہ کہ پھر ایک بہن (جو بعد میں ممتاز بھائی کی دلہن بنی) کی مرغی کی گردن کی لالچ میں بی بلی صاحبہ پھر تشریف لائیں اور مرغی پر حملہ کر ہی دیا۔ گو مرغی تو اسکے منہ سے چھڑا کر حلال کر دی گئی مگر بلی کی گردن میں رسی باندھ کر کھمبے سے جکڑ دی گئی۔ ممتاز بھائی شام کو اسکول کے میدان سے جو پلٹے تو کسی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر خبر دی کہ آج پھر ایک مرغی شہید ہوئی اور ڈاکو گرفتار شدہ رسی سے بندھا حاضر ہے۔ ممتاز بھائی کے آتشِ غیظ کو بھڑکانے کے لیے آنسو پٹرول بن گئے۔ انہوں نے بلی کی دونوں پچھلی ٹانگیں پکڑیں اور دہلیز کے پتھر کو دھوبی کا پاٹ بنا کر بلی کو دھو ڈالا اس وقت تک کہ دم نہ دیا

اس نے بتایا ہے: وہ ہم کو لیے ہوئے الہ آباد آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہونے چلے آئے۔ نبی بھائی نے ہمیں کیا کیا کہا ہوگا خدا ہی جانے۔

ان بھائی سے جو اولادیں ہیں ان میں ماشاء اللہ کشور زیدی ملیحہ آبادیہ ہے، باقر عباس ہمارا امریکہ میں سائیکولوجی میں ریسرچ کر رہا ہے۔ میاں طالب حسینی علمی دنیا میں گم ہیں اور اسسٹنٹ ڈائرکٹری کرتے ہیں۔ اسکی بہن گہتی ایم اے سائیکولوجی میں کر چکی اور سب سے چھوٹی ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھی ہے۔

آپ شاید ان خشک باتوں سے گھبرا گئے ہوں تو ایک عجیب واقعہ بھی سن لیجئے غالباً ۲۴-۱۹۲۵ کا واقعہ ہے۔ ممتاز بھائی جب پٹنہ آئے تو کچھ ایسا پروگرام بنا کہ ہم نوجوانوں کی ٹولی بغیر کسی بزرگ نگراں کے کلکتہ چل دی۔ ممتاز بھائی کے علاوہ اس سفر میں میرے ایک بہت عزیز دوست اور زندہ دل شخصیت منظور صاحب یالی (جو علی اکبر کاظمی مرحوم جنکا ذکر قبل میں آچکا ہے منظور صاحب انکے اپنے چچا ہیں) ساتھ تھے اور میر قافلہ بھی تھے۔ ایکدن منظور صاحب نے جو بڑے پریکٹیکل آدمی ہیں اور جو آج کل پاکستان میں ہیں یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ ممتاز بھائی افسانہ لکھتے ہیں مگر ابھی کچے ہیں اس لیے ان کو کوٹھوں کی سیر کرادی جائے تاکہ اپنی نظر سے وہاں کی زندگی بھی دیکھ لیں اور انکی آنکھ کھلا دی جائے۔ منظور کا فیصلہ تھا لیکن معاملہ نازک، تنہا زبان کھولنے کی ہمت انکے مقابلہ میں کس کی ہو سکتی تھی۔ غرض تاب گفتن نہ یارائے نہفتن عجیب پریشانی اور الجھن میں دن کٹا۔ شام ہوئی دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک فٹن پر منظور صاحب کے ساتھ بھیگی بلی کی طرح بیٹھ گئے اور انھوں نے فٹن والے کو ایک خاص بدنام گلی کی طرف جانے کا نادری حکم صادر فرمایا۔ بس کیا دیکھا اور کیا سنا اسکو نہ پوچھیے۔ ہم دو ناتجربہ کاروں کی حالت بری تھی۔ جاڑے کا زمانہ تھا مگر شرم سے عرق عرق۔ بار بار ہزار منت سماجت کی یہاں تک کہ دست بستہ اصرار و تکرار کہ ارے بھائی منظور اب رحم کرو اور جلد اس منحوس محلہ سے لوٹ چلو۔ مگر منظور صاحب کو تو آج مفت کی شراب پینے کو نہیں دیکھنے کو تو مل رہی تھی۔ وہ بھلا کب سننے والے تھے۔ بالآخر ایک مکان کے سامنے فٹن رکوائی اترے اور ہم لوگوں کو کھینچ کر اتارا۔ سامنے سیڑھیاں تھیں اشارہ کیا کہ اوپر چلو مگر یہاں قدم کیسے اٹھ سکتے تھے۔ پھر فرمایا کہ اچھا ہمارے پیچھے چلے آؤ۔ وہ تو اوپر منزل پر پہونچ گئے اور ہم لوگ مشکل سے دو ایک زینہ طے کر پائے تھے۔ پانوں تلے زمین نہیں دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ صورت ایسی ہوگئی تھی کہ منظور صاحب کو ہم لوگوں کے حال زار پر رحم آیا۔ پلٹے اور کڑک کر ممتاز بھائی سے بولے کہ "بس دیکھ لی آپ کی کاغذی ناؤ۔" گاڑی پر جب بیٹھ لیے تو ہم لوگوں نے بھی چین کی سانس لی اور اب جو دیکھتے ہیں ہم دونوں بھائیوں کے سروں کی ایرانی ٹوپیاں جو اسی دن غلام حسین اور مرزا جعفر کی دوکانوں سے لوئر چیت پور روڈ سے خریدی گئی تھی بجائے ٹوپی کے پائتابے کی طرح کی کوئی چیز بن چکی تھی منہ پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور زبان تالو سے خشک ہو کر چپکی ہوگئی تھی۔ مختصر یہ کہ اسکے بعد سے ممتاز بھائی کے متعلق وہ خود بتائینگے لیکن ہم سے آپ جس طرح کا حلف چاہیں اٹھوالیں کہ اس دن کے بعد پھر کسی کوٹھے کے زینہ کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت کی ہو تو...... غالباً منظور صاحب کو اپنی ظرافت کے ساتھ سبق بھی دینا منظور تھا بہرحال

سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

وہ غالب کے الفاظ میں بجا طور پر فریاد کر سکتے ہیں کہ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آخر میں، اتنا لکھنے کی جسارت کرونگا کہ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ حسینی صاحب کے افسانوں میں وہ فحاشی، عریانی اور لذتیت کبھی نہ پائینگے جو آج کل کے بڑے سے بڑے افسانہ نگار نے اپنی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ سمع خراشی کی معافی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

فاطمہ سیریز کی پہلی پیش کش
زخم و نشتر
نذر امام کے انشائیوں کا مجموعہ
پتہ مکتبۂ صبح نو پوسٹ بکس ۴۲ - پٹنہ ۴

غلام احمد فرقت کاکوروی

غالبؔ کا خط — علی عباسؔ حسینی کے نام

تاراجِ ادب کے شاہد عینی ، میاں علی عباس حسینی کو غالب خستہ جاں کا سلام دعا پہنچے !

میاں ! تمہاری باریٔ تعالیٰ کے حضور میں شب بیداری اور میری روز شب مے خواری و سیاہ کاری مسلّم ۔ پیمانۂ عدل میں تمہاری نیک اعمالیوں سے میری بد اعمالیوں کا پلڑا بھاری ۔ میں نے نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا ۔ نہ زکوٰۃ دی نہ فطرے کی رقم ادا کی ۔ پھر کس منھ سے اپنی مغفرت کے لئے دعا کرتا اور ریاکاری کا ایک اور بوجھ اپنے اوپر دھرتا ۔ شراب پیتا اور کباب کھاتا تھا ، دوستوں کو خط لکھتا اور شعر کہتا تھا ۔ بس یہی روزگار تھا اپنا ۔ چہ ستم ظریفی یہ کہ اپنی ان تمام نازیبا حرکتوں پر دل ہی دل میں خجالت محسوس کرتا مگر اس کا اظہار یوں نہ کرتا کہ اپنے گناہوں سے اس درجہ خائف تھا کہ کچھ بنائے نہ بن پڑتا تھا ۔ مائے فرخ بنارسی نے کیا میرے حسب حال مقطع کہا ہے ۔ سنو ! ظالم کہتا ہے ؎

خجل ہیں اپنے گناہوں پہ اس قدر فرخ
کبھی غریب کو دیکھا نہیں دعا کرتے

اِن آنکھوں نے غدر کا منظر دیکھا ہے اور اس کا انجام بھی ۔ تم نے دوسری جنگ عظیم کا اختتام اور سلطنتِ انگریزی کا آفتاب لبِ بام دیکھا ۔ ادب نے دونوں کے اثرات قبول کئے ۔ شعر و ادب کے متوالے دونوں میں مارے گئے ۔ فرنگیوں نے انگریزی کا پھندا ہم یوں کے گلے میں ڈالا ۔ اور آزادیٔ وطن کے بعد اہل وطن نے ہندی کا جنیو اردو والوں کے گلے میں ڈالا ۔ اب تمہارے ہندوستان سے " یا حق کچھ کہتے ہیں " کی آوازیں آتی ہیں ۔ اور عالمِ برزخ کو آنے والی ریلیں اردو شعرا کو ویگن بھر بھر کے " عدم آباد " پہنچا جاتی ہیں ۔ غدر میں عبور دریائے شور کی سزا پاتے تھے یا پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے ۔ اب عبور دریائے حیات کی سزا پاتے ہیں یا ہندی کے دار پر لٹکا جاتے ہیں ۔ سنتا ہوں کہ اودھ کے شریف مسلمان گھرانوں تک میں اردو کا خط پڑھنے والا عنقا ہے ، اردو داں دوا کو بھی نہیں ملتا ۔

میاں ! میں نے اِسی مصلحت سے ڈاڑھی نہ رکھی کہ اول غدر کے دور کی پیداوار اور پھر گنہگار' قابلِ گرفت چیز کون رکھتا ۔ غدر میں مسلمانوں کی گرفت ڈاڑھی دیکھ کر ہوتی تھی ۔ جتنی لمبی ڈاڑھی ہوتی اتنی لمبی سزا ملتی ہر شخص ڈاڑھی رکھتے ڈرتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے گناہوں کو دو آتشہ بنانا ہٹ دھرمی سمجھتا تھا ڈاڑھی رکھوں تو شراب نہ چکھوں اور شراب نہ پیوں تو کیونکر جیوں میرے ڈاڑھی تھی بھی اور نہیں بھی گویا ۔ " ہر چند کہیں کہ تھی نہیں تھی " ۔

زیرو نمبر کی مشین سے منڈا تا تھا ۔ اُسترے کو یوں قریب نہ لاتا تھا کہ ہمیشہ عاقبت پیش نظر تھی ۔ صاحب ! جو لوگ ڈاڑھیوں سے

مسلم ہو کر شراب خانے جاتے ہیں، اور خُم کے خُم لنڈھاتے ہیں ان سے تو بہر حال دُور رہوں۔ وہ دوزخ کے جلتے پھکتے چیلوں پر لوٹیں لگائیں گے اور ریچھ جیسے جہنم کی نرم گرم راکھ پر موسم سرما میں اپنا بستر لگائیں گے۔ یہ سالے کے سالے صرف ڈاڑھیوں ہی کے سہارے گرفت میں آئیں گے۔ مشیت کے قربان، ایک ہی چیز وسیلۂ جنت بھی اور جہنم بھی۔

صرف مسلمانوں پر ہی کیا موقوف، جنس تک میں فرشتوں کی پکڑ دھکڑ کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ عورت کا سنگار اس کے بال ہیں جو زلف گرہ گیر بن کر عشاق کو زہر کھلواتے ہیں اور فراق یار میں انگاروں پر لٹواتے ہیں وہی اس کی گنہگاری کی صورت میں فرشتوں کی گرفت میں آتے ہیں اگر فرشتے اس کی زلفیں پکڑ لیں تو ایک اچھی بھلی عورت کو قدِ آدم کھڑا کر لیں لاکھ جتن کریں مگر چھوٹنے کا سوال نہ پیدا ہو

میاں! یہ تمہارے لکھنؤ کے شیخوں نے کیا اُڑا رکھی ہے کہ اثنا عشری حافظِ قرآن نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ سیّدوں کے ملازم تک حافظ ہوتے ہیں۔ کہاں ہیں تمہارے بھٹی پر چڑھے حافظ۔ "اُن کو نکالو نا۔ " لے قبلہ! وہ میں ہی تو ہوں حضور کے آنے کی اطلاع سرکار (حسینی صاحب) کو دے رہا ہوں۔"

"کینی بی بی! میاں سے فرمادیجئے کہ کوئی بالغ صاحب دہلی سے آئے ہیں۔ جب سرکار کے آنے کا وقت ہوتا ہے بالغ اور نابالغ صاحب آجاتے ہیں بیگم صاحبہ! میاں کی ڈبیہ میں پان لگا کر بھیج دیجئے۔ سر پر چوگوشیا پہنے ہاتھ میں ڈنڈا لئے"

"جی ہاں! ابھی بلاتا ہوں۔ ارے میاں حافظ۔ حافظ کو بھیج دو۔"

آداب عرض کرتا ہوں سرکار!۔ تو حضور دلّی سے آئے ہیں؟!۔ ماشاء اللہ۔ آج حضور پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

میاں یہی تمہارے حافظ ہیں۔! سبحان اللہ۔ سیّد بھی بلا کے ذہین ہوتے ہیں۔ کالا جوتا نہیں پہنتے۔ نیلے ملازم رکھتے ہیں پھر ملازم بھی کیسے۔ کھانا بھی پکائیں۔ گھر کا سودا سلف بھی لائیں۔ جھاڑو برتن بھی کریں۔ اور رات بھی ڈیوڑھی میں بسر کریں۔ میاں تم تو حافظوں کے آقائے نامدار ہو۔ کیونکہ سیّد ابرار اور مولا علی کے پرستار ہو۔ سُنا ہے کہ ملازمت سے پنشن پلتے ہی تم نے ڈاڑھی کا کنٹھا گلے میں ڈال لیا۔

میاں حالی ایک دن کہتے تھے کہ میاں علی عباس حسینی تو اب ہمارے سمدھی ہو گئے ہیں کیونکہ میاں غلام السیّدین کی لڑکی انھیں کے بڑے صاحبزادے میاں مہدی عباس حسینی سے منسوب ہے خدا مبارک کرے!۔

بہو بھی پڑھی لکھی۔ صاحبزادیاں بھی خدا نظر بد سے بچائے۔ تمہاری اولادیں شاہجہانپور کے گرہ بازوں کی طرح جس وقت پرواز کریں گی تو عرش کے تارے توڑیں گی۔ ایک بیٹا امریکہ میں۔ دوسرا مسوری میں۔ بڑی صاحبزادی آکاش وانی دلّی میں۔ بچیاں پڑھ رہی ہیں ماشاء اللہ بہت پھل باپ ہو۔ اب سنتا ہوں کہ اپنے بیشتر اوقات "اللہ ہو، اللہ ہو" میں گزارتے ہو۔ اعمال کرتے ہو۔ استغفار پڑھتے ہو۔ سید کی بخشش پر شک کرنے والا کافر۔ دیکھو صاحب! میں اس درجے بداعمال رہا ہوں کہ تمہارے اعمال کو نگاہ حرص سے دُور رکھتا ہوں۔ میاں تمہارے اعمال کی تصدیق کرنے والے اوراق پر مہر ثبت کرنے والے تو حوضِ کوثر پر ہوں گے، مگر مرزاؤں کے اعمال پر کون دستخط کرے گا؟ کون سُنتا ہے فغانِ درویش قہرِ درویش بہ جانِ درویش

۱؎ حسینی صاحب کے قدیم وفادار ملازم ۲؎ منجھلی صاحبزادی جو ایم اے کر چکی ہیں اور اب پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہی ہیں

۳؎ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دلی۔

میں نے تو سوچ لیا ہے کہ اپنے اعمال نامہ کی تصدیق آپ کروں گا اور ایک ایک گناہ اپنے سر اور دھر لوں گا اور کہوں گا کہ صاحب گنہگاروں کا ناظم ہوں۔ محکمہ بدی کا ہو یا نیکی کا۔ افسر افسر سب برابر ہیں۔ تم نماز پڑھتے ہو میں شراب پیتا ہوں۔ یہ منھ سے یہ کافر لگی نہیں چھوٹتی۔ تمہاری پیشانی سے سجدہ گاہ نہیں چھوٹتی۔ تمہارے ماتھے کا داغ میدانِ حشر میں چمکے گا تو میرے دامن ہائے عصیاں کہاں لگ کے گئے گذرے ہوئے ہیں جو جواب بن کر گنہگاروں میں نہ دمکیں۔ انعام دونوں پائیں گے۔ تم کو کھرے سکوں میں جو کچھ ملے گا دہی کھوٹے سکوں میں مجھے ملےگا۔ تم مقام علیین پاؤ گے تو میں بھی جہنم کے نچلے طبقے میں نہ بیٹھوں گا۔ مقام اعلیٰ ہی پاؤں گا۔ تم نے حافظ کو ملازم رکھا، میں نے ڈومنی کو، ڈومنی شوہر نہ ہونے پر شوہردار رہی۔ تمہارے حافظ کی شادی ہونے پر اس کی بیوی کی عصمت برقرار رہی۔ تم سے لیکر تمہارے نوکر تک میرا حساب و کتاب برابر رہا۔ تمہاری نیکیوں نے اگر میری بدی کی شناخت کرائی تو میری بدی بھی تمہاری نیکیوں کی شناخت میں کام آئی۔ ہائے عمر خیام کیا کہہ گیا ہے ؎

من بدکنم و تو بہ بد مکافات دہی

پس فرق میانِ من و توچیست بگو

میں بھی دو مصرعے پڑھ کر پروانۂ نجات حاصل کر لوں گا اور میدان حشر سے چل دوں گا۔ عاقبت دونوں کی حسب حال رہے گی۔

میاں اعظم حسین تمہارے حقیقی بھانجے ہوتے ہیں۔ تمہاری کتابیں دے گئے ہیں میں نے ان کتابوں کو سر آنکھوں پر رکھا، اور انھیں تکیہ بنایا دیہاتوں سے شہروں تک کے موجودہ معاشرہ کا جائزہ لیا تو ہائے کرکے رہ گیا جہاں جہاں کا تم نے نقشہ کھینچا ہے وہاں کی معاشرت کا منظر آنکھوں میں کھپ گیا ہے۔ اندازِ بیان کی دل کشی تمہارا ہی حصہ ہے جو پڑھتا ہے تمہاری فن کاری کی داد دیتا ہے۔

میاں! ایسے فن کار روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ شاید خدائے سخن میر تقی میر تمہارے ہی لئے یہ کہہ کر آگئے ہیں ؎

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں

تب ہم سا کوئی صاحب صاحب نظر ہوئے ہے

"رفیقِ تنہائی"[1] نکالتے ڈرتا ہوں کہ اس عالم برزخ میں کیوں گھر والی سے تو تو میں میں ہو۔ وہ رفیق تنہائی اپنے تئیں سمجھتی ہے اور میری رفیق کتابیں ہیں۔ دلّی میں میاں عارف کے بچے منٹ منٹ کی خبریں گھر پہنچاتے تھے اور گھر والی سے آٹھ پہر طوفان اٹھواتے تھے یہاں ملائکہ اِدھر کی اُدھر لگاتے ہیں اور بی جاہ لو بن کر الگ ہٹ جاتے ہیں۔

آج کل سنتا ہوں کہ انیس کا مقبرہ تعمیر کرانے میں زمین کا گز بنے ہوئے ہو یہ عمر ہی مقبرے بنوانے والی اور مقبروں پر حافظ مقرر کرنے والی ہوتی ہے۔ قوی کی کمزوری کا نزلہ ہر دور میں مذہب پر گرا ہے یہی ڈاڑھیاں رکھواتا ہے، نمازیں پڑھواتا ہے، اور آخری منزل میں سرخرو کراتا ہے۔

تمہاری دعاؤں کا طالب

اسداللہ خاں غالب

---

[1] حسینی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ

علی عباس حسینی

علی عبّاس حسینی کا جوابی مکتوب

بحضور اقدس عالی جناب مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دہلوی جعل اللہ قبرہ مزار ملائکۃ الرحمۃ

پیر و مرشد ! آداب مودبانہ قبول فرمائیے۔

میاں فرقت کاکوروی سلمہ کے ذریعہ مکتوب گرامی مجھ ناچیز تک پہنچا۔ نہ جانے کس موکھے یا نابدان سے یہ حضرت سرسراتے، ضربیں لگاتے، آپ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں اور آپ کے حضور میں ہم جیسوں کا ذکر کر کے آپ کا وقت خراب کرتے ہیں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوئے لگا ہے کہ باب عالی کے حاجب اور دربان بہت بوڑھے ہو گئے ہیں کہ بار بار اونگھ جاتے ہیں اور انھیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کون گیا۔ یا پھر یہ سفرِ جنت کے ایسے چور راستوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ جن کی حضرت کے فرشتوں تک کو خبر نہیں ! چلئے، اسی بہانے انھوں نے جنت تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈ ہی نکالا اور ہم وہاں تک رسائی کے لئے اپنی داڑھی کے بالوں کی کمند بناتے ہی رہے !

اب یہ میری داڑھی پر نہ ہنسیں گے تو اور کون ہنسے گا ؟ لیکن، پیر و مرشد ! ان سلمہ سے پوچھئے کہ یہ میری ہی گود میں بیٹھ کر "بازی بازی، از ریش بابا ہم بازی" کی طفلانہ حرکت میرے ہی معاملے میں انھوں نے کیوں روا رکھی ہے۔ آخر مجھ سے کہیں بڑے بڑے دیو قامت ادیبوں کی عالی شان چھتنار داڑھیاں انھیں کیوں نہ نظر آئیں، وہ سر سید، حسرت موہانی، راشد الخیری، برنارڈ شا، رسکن ٹالسٹائے اور ٹیگور کی ریش ہائے مقدس کیوں نہیں نوچتے ؟ ان کی خاصی لمبی داڑھیوں کے سامنے تو میری فرینچ کٹ، بالکل ویسی ہی ہے، جیسے خرمے کے پیڑ کے مقابل گملے کا پام !

پھر وہ یہ کیوں بھول گئے کہ میں آپ کا پیرو ہوں۔ مجھ سے کبھی بھیڑ چال نہیں چلی جاتی۔ جب سے آپ فردوس آشیاں ہوئے ہیں، ان جدید تعلیم یافتہ حضرات نے "چاروں ابروؤں کا صفایا" اپنا شعار بنا لیا ہے۔ مجھے ان لوگوں کی "نہ ہی اون میں، نہ تتی اون میں !" والی صورت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس لئے میں نے عین جوانی میں داڑھی رکھ لی تھی اور اس شد و مد کے ساتھ رکھی تھی کہ پہلی بیوی کو تاروں کی چھاؤں کی جگہ اسی کے سایہ میں بیاہ کے لایا اور چھ برس کے بعد اسی کے شامیانے کے نیچے ان کا تابوت مقبرہ پہنچایا۔ دوسری، جو بحمدہ اب تک موجود ہیں، جب آنے لگیں تو ان کو بھی یہی داڑھی بھرا چہرہ مصحف کے ساتھ آرسی میں دیکھنا نصیب ہوا۔ مگر یہ نیک قدم نکلیں قدرے شکی مزاج۔ بس اردگرد کے مولوی گھرانوں کا وطیرہ دیکھ کر جھٹ یہ گمانِ بد دل میں لے بیٹھیں کہ میں بھی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہوں۔ اس لئے اپنے گھر میں خوش گوار فضا قائم رکھنے کے لئے اور اپنے روئے سیاہ کی ظلمت کم کرنے کی غرض سے اپنے موئے سیاہ کھیت چڑھا دیئے !

لیکن اب جب کہ میرے لئے وہ زمانہ قریب ہے، جب میں اپنے آباء و اجداد کے حضور میں باریابی کا فخر حاصل کرنے والا ہوں، محض اس ڈر سے چہرے پر پھر سے خس و خاشاک اگا لئے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان بزرگوں کی سپید سپید داڑھیوں کے حلقہ سے

مانوس خدمت گار فرشتہ، کاکوروی جیسے بے ریش و بروت چہرے کو دیکھ کر راستہ روک کر کہیں "اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے!" پھر مجھے نثر نگاری نے دونوں تھما رکھا ہوں۔ دونوں آزادوں کی قدم بوسی کے لئے بھی تو جانا ہے۔ ان کے سامنے اگر اپنے سلمٰی جیسا منھ لے کر جاؤں تو وہ کیا کہیں گے؟ ان کے نظریات لاکھ ترقی پسندانہ سہی، لیکن چہرے مہرے سے تو میری ہی طرح قدامت پسند نظر آتے ہیں۔

اور یہ جو پانچ وقت سر جھکاتا، ٹکریں لگاتا اور "ایاک نعبد" کہتا ہوں تو وہ اس لئے ہرگز نہیں ہے کہ میرے غلط سلط سجدوں سے مجھے فی سجدہ ستر ستر محل مل جائیں گے، اور ایسی جنت میں بلا لیا جاؤں گا جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں۔ میرا خونی رشتہ، وہ کتنا ہی دور کا سہی، مگر اس سے ہے، جس نے "الفقر فخری" کہہ کر بے نیازانہ سر افتخار بلند کیا۔ میں ان محلوں کو لے کر کیا کروں گا اور وہ بھی اتنی وافر تعداد میں! قائم و سجاب کے گردوں پر کسی دن بھی تو بے فکری سے "ٹانگ پسار کے" نہ سو سکوں گا! اور یہ "لاکھوں برس کی حوریں" اور لاکھوں کی تعداد میں۔ خدا ہی بچائے ان سے! اچھی خاصی عذاب جان بن جائیں گی۔ ایک کی طرف دیکھا، تو دوسری خفا، دوسری سے مسکرا کر بات کی تو تیسری نے منھ پھلایا۔ تیسری کو آنکھ مار کر بہلایا تو چوتھی روٹھ گئی۔ چوتھی کو منتیں کر کے منایا تو پانچویں بپھر گئی، پانچویں کے سامنے ہاتھ جوڑے، تو چھٹی نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ انہیں کسی طرح رام کیا تو ساتویں اپنا دکھڑا لے بیٹھیں! غرض ہم تو انھیں حوروں اور حورزادیوں کے ہو رہے۔ نہ اپنا کوئی وقت اور نہ اپنا کوئی مقام سکون و اطمینان بس ہر وقت اسی چرخے میں لگے رہے۔ آدمی سے مشین بن گئے، انسان کی جگہ، بے داغے سانڈ! سو، حضرت اس جنت کی مجھے رغبت نہیں۔ میرے الٹے سیدھے سجدے اس لئے ہیں کہ مجھے اپنے محبوب شاعروں اور ادیبوں کی زیارت کرنی ہے، دیار محبوب میں پہنچنا ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس وادی گل پوش میں پہنچ کر "الف لیلہ" کے مصنف سے نہ ملوں، فردوسی و خسرو، سعدی و جامی و عرفی و نظیری کی دست بوسی نہ کروں۔ حافظ و خیام، مولانا روم و مفتی میر محمد عباس کے حضور میں حاضری نہ دوں۔ میر تقی و میر حسن، میر انیس و میر مونس، میر نفیس و میر وحید، مرزا دبیر و مرزا اوج، میر عشق و سید تعشق، مولانا حالی و ڈاکٹر نذیر احمد، مرزا رسوا و ڈاکٹر اقبال اکبر الہ آبادی و شاد عظیم آبادی کی قدم بوسی کا شرف نہ حاصل کروں؟ ان سب سے ملاقات کا یہی ایک بہانہ اور لٹکا ہے۔

ع تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے!

ابھی تو یوم آخر کو آتے آتے ہزاروں لاکھوں برس لگیں گے۔ آخر اس درمیانی مدت میں ان بارگاہوں میں رسائی کے لئے ایک ٹوٹا پھوٹا سہی، مگر پروانۂ راہداری تو ہونا ہی چاہئے۔ ورنہ کہاں گھسنے دیں گے ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو، رسم و راہ منزل کے پابند، صلوٰۃ و صوم کے عادی، حاجب فرشتے ان باکمالوں کی محفلوں میں!

میرے حضرت! آپ جب اپنے کو مے گسار و گنہگار کہتے ہیں تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ آپ تو مئے وحدت کا جام طہور پئے ہوئے ہیں ؎

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

بھلا آپ نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا! اس تجاہل عارفانہ کے قربان، آپ تو خود ہی اقرار کر چکے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس لئے میں ان بتولوں میں نہیں آنے کا۔ میں آپ کا مقام پہچانتا ہوں۔ مجھے تو شوق ہے کہ میں آپ کو پاس سے آکر دیکھوں

اور مولانا حالی کے "حیوان ظریف" کو دنیا پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے دیکھ کر غمِ دوراں کو بھول جاؤں۔ پھر وہاں پہنچ کر یہ بھی تو دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ سے اور میاں غیاث سے کیسی نبھ رہی ہے۔ حضرت ناسخ، قمرن در بغل، اب بھی دور بیٹھے اعتراضوں کی بوچھار کرتے ہیں یا آپ کے کمال کی عظمت نے انھیں گنگ بنا دیا ہے۔ مرزا یگانہ جنھوں نے آپ کی قند پارسی کو "لاا جیون کی فارسی!" کا طعنہ دیا تھا، وہ آپ کے دربار میں کتنی اکڑ اور کیسے ٹھسکے سے حاضری دیتے ہیں اور بے خود موہانی، جو فارسی دانی کے غرّے کے باوجود، آپ کے سامنے سر بسجود تھے۔ ان سے اور ان کے دوست یاس یگانہ سے اب بھی چوٹیں چل رہی ہیں کہ نہیں؟

غرض۔ آپ لاکھ چاہیں کہ مجھے اپنی بارگاہ میں آنے سے روک دیں اور اپنے دربار میں نہ آنے دینے کے لئے ہزار بہانے تراشیں، میں آؤں گا، ضرور بالضرور آؤں گا اور ڈنکے کی چوٹ وہیں آؤں گا جہاں آپ کا قیام ہے! اگر وہ جنت کے سوا کوئی اور مقام ہے تو یہ ملاؤں والی جنت کم سے کم میرے معاملے میں 'جائے جہنم میں'! مجھے وہی مقام اسفل پسند ہے، جہاں اسد گردگار، غالبِ کل غالب کا غلام خاص اسد اللہ غالب ہے! آخر "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے مصداق میرا نام بھی تو علی ہے۔ آپ جس کے والہ و شیدا، میں بھی اسی کا فدائی اور دیوانہ۔

اور چونکہ میں شعر عاری کا لکھنے والا انظم لکھنے سے عاری ہوں۔ اس لئے اپنے برادر عزیز جمیل مظہری کا آپ کی مدح میں وہ قصیدہ بہ آواز بلند پڑھتا آؤں گا، جو انہوں نے تشبیب بنا کر آپ کے آقا کی منقبت میں ضم کر دیا ہے اور آپ کو ہم سر قنبر بنا دیا ہے!

"اے خدائے سخن، اے خالقِ معنی، ترا نام — عالمِ فن میں ہے تسبیح زبانِ تحسیں
مرغِ تخئیل پہ گم ہے تری منزل کا سراغ — فلک العرش ہے اوروں کا، جو ہے تیری زمیں
شوق نے مانگ لیا تھا دلِ منصور و جنید — فکر نے چھین لیا تھا پرِ جبریلِ امیں
سلکِ مضموں ہے کہ آئینِ حسن تلاش — حسنِ بندش ہے کہ سرمایۂ عقدِ پرویں
کبھی الفاظ کو دی روحِ معانی تو نے — کبھی معنی کو دئے خلعتِ الفاظِ حسیں
کہیں طغیانِ مئے و مستیِ مینائے سرور — کہیں طوفان نے و نالۂ دل ہائے حزیں
تیرے پیمانے سے سرجوش ہے کمالِ دانش — تیرے آئینہ میں حیراں ہے جمالِ خودبیں
تیرے افکار کے سانچے میں ڈھلے کتنے دماغ — تری رفتار کی گرمی سے بنی کتنی زمیں
تری شوخی سے تبسم، تری مستی سے سرود — تری حکمت سے تعقل، تری حیرت سے یقیں
ترے اک شعر میں غلطاں ہمہ ندیٰ ہمہ ہد — ترے اک جام میں رقصاں ہمہ دنیا ہمہ دیں
خمِ اقبال بہ ایں نسبتِ مینا، اک جام — سحرِ بنگال ازیں نشۂ صہبا سنگیں
ہر صنم تیری خدائی کا طلب گارِ سجود — تیرا دیوان ہے اک عالمِ بت خانۂ چیں
دیکھتے سب ہیں اس آئینے میں صورت اپنی — چہ تعقل، چہ توہم، چہ تحیر، چہ یقیں!
مختصر یہ ہے کہ دو جز کی یہ چھوٹی سی کتاب — آیت اللہ ہے، من جملۂ آیاتِ مبیں!"

اور یوں اپنے ہی لئے نہیں، بلکہ اپنے بعد آنے والے مظہری کے لئے بھی، آپ کی خدمت میں رسائی کے لئے راستہ صاف کر لوں گا! —

بندۂ خاص: علی عباس حسینی

سید احتشام حسین

علی عباس حسینی کے افسانوں کی فضا

زندگی اور فن کی اخلاقی بنیادیں

علی عباس حسینی کے افسانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے ایک جگہ یہ سطریں لکھی تھیں:-

"حسینی انسان دوستی، اصلاح، اخلاقی نصب العین اور شرافتِ نفس کے تصورات کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ اسلئے وہ آہستہ آہستہ شباب کی رومان انگیزیوں سے باہر نکل آئے اور وسیع سماجی دائرہ میں کہانیوں کے خدوخال ابھارنے لگے۔ حسینی کا فن مقصد کے گہرے سایوں کے باوجود کہانی کو کہانی بنانے، پلاٹ کی تعمیر میں محنت کرنے اور خوبصورت زبان استعمال کرنے کا فن ہے۔ ترقی پسندی سے متاثر ہونے کے دور میں بھی ان کے خیالوں کا مرکزی نقطہ کوئی اخلاقی نصب العین ہی رہا ہے جو اکثر و بیشتر کرداروں کے انتخاب میں نمایاں ہوا ہے۔"

آج جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ کم و بیش اسی اجمال کی تفصیل ہوگی کیونکہ انہیں ایک انسان کی حیثیت سے بھی جانتا ہوں اور ایک افسانہ نگار اور ادیب کی حیثیت سے بھی۔ کسی حد تک ان کی کتابِ زندگی بھی دیکھی ہے اور ان کی تحریریں بھی پڑھی ہیں۔ اس لیے میں تھوڑا بہت ان کی زندگی اور تصورِ فن کے تعلق کو بھی سمجھتا ہوں۔ اس مختصر مضمون میں اسی کو گرفت میں لانے کی کوشش کی جائیگی کیونکہ فنکار اپنے فن میں نہیں چھپتا اور افسانہ کے کردار لکھنے والے کی غمازی کرتے ہیں۔

یوں دیکھا جائے تو اردو مختصر افسانہ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال کی تھی جب حسینی نے افسانہ نگاری شروع کی۔ اس وقت تک اس میدان میں صرف چند کھلاڑی اترے تھے اور قابلِ ذکر تو صرف پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری تھے جنہوں نے ۱۹۲۰ تک اپنی اپنی راہیں چن لی تھیں اور انہیں پر بڑھتے جا رہے تھے۔ پریم چند کی ذہنی تربیت ہی نہیں زندگی کے تجربے بھی ایسے تھے جو اُن کو عام زندگی اور اسکے مسائل سے قریب کرتے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ کی جدید فضا سے قریب ہونے کی وجہ سے ایک مخصوص سماجی ماحول اور اسکی اصلاح کے خیالات سے سرشار تھے اور نیاز نے اس رومانی اور تخیلی دنیا کو اپنی جولانگاہ بنایا تھا جو افسانہ طرازی کے لئے موزوں تو بہت تھی لیکن اس حقیقت پسندی سے دور تھی جس کا مطالبہ بیسویں صدی کا ذہن کرنے لگا تھا۔ بیان کی لطافت، اظہار کا حسن، افسانوی انداز تینوں کے پاس تھا لیکن چونکہ پریم چند کی دنیا وسیع تھی اسلئے رنگینی اور جذبات انگیزی کی کمی واقعات کے تنوع سے پوری ہو جاتی تھی۔ اب جو علی عباس حسینی بھی اس دوڑ میں شریک ہونے کے لئے میدان میں آئے تو انہیں ان صلاحیتوں اور تجربوں سے کام لینا پڑا جو خود انکے پاس تھے۔

ان کا ذہنی اثاثہ کیا تھا اور کس حد تک افسانہ نگاری کے لئے

موزوں اور مناسب تھا اسکا اندازہ ہو جائے تو انکے فکر کی بنیادی
نوعیت کے سمجھنے میں بھی آسانی پیدا ہو جائے۔ وہ مشرقی اتر پردیش کے
ایک شریف زمیندار کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جنکے پاس
کچھ تو اپنے بہتر ماضی کا غرور تھا۔ کچھ آبا و اجداد کے ان کارناموں کی
یادیں جب ان کا کارواں ہندوستان میں آیا تھا۔ کچھ عربی فارسی کی
رہ رسمی تعلیم جو رسمی اخلاق اور مذہب کی بے روح تلقین کرتی ہے اور
ہب کی تعلیمات میں نہ صرف بزرگوں کا احترام اور عقائد کا بے چون و
را تسلیم کیا جاتا ایک طرح کی لازمی نوعیت رکھتا ہے بلکہ انہیں کو اقدار
حیات کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ڈھرا کلاسکی انداز
کا ہوتا ہے یعنی ہر بات ایک ضابطہ اور نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔
ملک میں بادشاہ یا حاکم کا مقام۔ اپنے علاقہ میں بادشاہ کے نائب کا
مقام۔ قصبہ یا گاؤں میں زمیندار کا مقام۔ گھر میں باپ یا کسی
اور خاندانی بزرگ کا مقام۔ یہ ساری چیزیں معین اور مرتب ہوتی ہیں
انسان اپنا مقام پہچانتے ہیں۔ عورتیں اپنی حیثیت سے واقف
ہیں۔ کس کے کیا حقوق ہیں اور سماج میں کن چیزوں کو اچھا
اور کن باتوں کو برا سمجھا جاتا ہے ان کے بارے میں زیادہ اختلاف
رائے کی گنجائش نہیں۔ علی عباس حسینی کے خون میں یہ ساری
روایتیں رواں دواں تھیں۔

اب اسکا دوسرا پہلو دیکھئے۔ علی عباس حسینی کے ابتدائی
نقوش حیات اس خاندانی ماحول میں ابھرے جس کی معیشت کا دارومدار
زمینداری پر تھا۔ اور زمینداری گاؤں میں واقع تھی۔ زمینداروں
کی خرابیوں کے ساتھ کچھ ایسی اچھائیاں بھی ہوتی ہیں جو ان کے
کردار میں خاص طرح کا بانکپن اور احساس خودی پیدا کرتی ہیں۔
احساس بگڑ کر ضد، اکڑ، بے جا تفاخر اور خودسری کی صورت
اختیار کرتا ہے لیکن سنور جاتا ہے تو وضعداری، شرافت، خدمت
اور انسانی ہمدردی کا روپ دھار لیتا ہے۔ انہیں زمینداروں کی
مختلف قسموں سے گاؤں کی معیشت اور معاشرت کا تانا بانا
رہتا ہے۔ کہیں اتحاد، اتفاق اور بھائی چارہ ہے، کہیں تعصب
نفرت، بغض اور اجڈپن۔ علی عباس حسینی کے کرداروں میں

ایسے ہی بوڑھے اور جوان زمیندار ہیں جو کہیں میر صاحب ہیں، کہیں
ٹھاکر صاحب۔ کہیں شیخ صاحب ہیں کہیں بابو صاحب۔ یہ اکثر
و بیشتر اپنے طبقہ کی خوبیوں اور خامیوں کے مظہر ہوتے ہیں اور
مشکل ہی سے بدلتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دیتے ہیں۔ حالانکہ زمانہ
بدلتا رہتا ہے اور ان کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی رہتی ہے۔

اسی جگہ سے حسینی کے شعور کا تیسرا پہلو سامنے
آتا ہے وہ ایک قدامت پسند مشرقی وضع کے پابند گھرانے
میں پیدا ہوئے لیکن قسمت نے آہستہ آہستہ انہیں جدید تعلیم
حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس تعلیم کی مختلف منزلوں کا
تذکرہ نہیں کرنا ہے بس اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ
اس تعلیم نے اس ذہنی کشمکش کے دروازے کھول دیئے جو
قدیم اور جدید، مشرق اور مغرب، روایت اور درایت،
سائنس اور مذہب کے تصادم کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس طرح
گویا ان کے ذہن کے بعض گوشوں میں نئے تصورات اور خیالات
نے انگڑائیاں لینا شروع کیا اور وہ کسی طرح اس مفاہمت کی
کوشش کرنے لگے جس کے بغیر ذہنی کشمکش کا خاتمہ نہیں ہو سکتا
اگر اس بات کو صاف الفاظ میں کہا جائے تو اسکا مطلب
یہ ہے کہ وہ ان روشن خیال لوگوں میں گنے جانے لگے جو نہ تو
قدیم سے یکسر بغاوت کرتے ہیں اور نہ جدید کو دیکھ کر ہر قدم پر
لاحول پڑھتے ہیں۔ انہوں نے ان اصلاحی راستوں کی
تلاش شروع کی جو رندی اور زہد یا خودسری اور کورانہ تقلید کے
درمیان سے گذرتے تھے۔

لکھنؤ میں طالب العلم اور استاد کی حیثیت سے علی عباس
حسینی کے طویل قیام کی بھی اتنی اہمیت ہے کہ اسے ان کی ذہنی
تشکیل کا تذکرہ کرتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنؤ
ایک خاص قسم کی نفاست پسند ہندوستانی تہذیب کا مرکز تھا۔
جس کی زبان، لہجہ، نشست و برخاست، محافل و مجالس۔
ادبی نشستوں اور مشاعروں کا ایک خاص انداز تھا جہاں کی
زندگی حالات کے اچھے خاصے بدل جانے کے بعد بھی اُسی انداز

فضا کی غماز تھی جیسے فسانۂ عجائب، گلزارِ نسیم اور طلسم ہوشربا کے صفحات میں زندگی ملی تھی، اور جیسے خود حسینی کے زمانے کی تغیر پسندی بھی مٹا نہیں سکی تھی۔ وہاں کی فضا میں اب بھی ایک نشہ سا گھلا ہوا تھا۔ ایک بے نام رنگینی اور مستی تھی اور "زراز دست رفتہ" کی یادیں پیدا ہونے والی تعیش تھا جسکے پیچھے سے معاشی بدحالی جھانک رہی تھی لکھنؤ کی پابندی وضع، تکلف اور تصنع، احساس برتری میں بھی ایک خاص طرح کا بانکپن تھا جو دیہات کی عزت نفس والی وضعداری سے مختلف ہونے کے باوجود اس سے ملتا جلتا تھا۔ لکھنؤ میں مذہبی مجلسیں اور محفلیں بھی تھیں اور مشاعرے بھی۔ مل بیٹھنے کی جگہیں بھی تھیں اور عظمت رفتہ کی یادگار رستان عمارتیں بھی۔ قدیم معاشرت کا نمائندہ چوک بھی تھا اور جدید روشنی میں بستا ہوا حضرت گنج بھی۔ اس نے علی عباس حسینی کے تخلیقی ذہن کے لئے حقائق اور تخیلات کو جوڑ کر پیش کرنے کے لیے بہت سا مواد تھا۔ انہیں دیہات کی سادہ زندگی نے جو شعور بخشا تھا اس میں شہری زندگی کی تابانیوں نے کئی اور رنگ ملا دیئے۔ اس طرح انکا ذہن ہر منزل پر تجربوں کے خزانے سمیٹتا رہا۔

تجربوں کا جو خزانہ یوں جمع ہوا تھا اس میں حسینی کے وسیع مطالعے نے اضافہ کیا۔ وہ کتابیں پڑھتے نہیں حریص انسانوں کی طرح انہیں کھا لیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا پڑھتے ہیں کہ بعض اوقات انہیں یاد نہیں رہتا کہ وہ اس کتاب کو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ اچھا خاصا پڑھ لینے کے بعد یاد آتا ہے کہ وہ پرانا سبق دہرا رہے ہیں۔ ویسے تو انہوں نے مذہبیات تاریخ فلسفہ اور نفسیات کا مطالعہ بھی خاطر خواہ کیا ہے لیکن انکا اصل میدان تخلیقی ادب ہے افسانے اور ناول (خواہ کسی قسم کے ہوں) جو اردو یا انگریزی میں دستیاب ہو جاتے ہیں وہ انہیں تیز رفتاری سے پڑھ ڈالتے ہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ اکثر مطالعہ تنقیدی نہیں بلکہ تفریحی ہوتا ہے۔ کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے اگر آپ اچانک ان کے پاس پہونچ جائیں اور وہ ایک کتاب سامنے رکھے ہوئے باقاعدہ بیٹھے ہوئے آنسو پونچھ رہے ہوں۔۔ یہ جذباتیت ان کی فطرت ہے۔

ہر وقت کی گفتگو میں، کھیل کود کے میدان میں، سینما ہال میں، محفل مشاعرہ میں، جذباتی واقعات کے بیان میں اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا بہہ نکلنا ایک معمولی سی بات ہے۔ شاید اسی جذباتیت کے رجحان نے انہیں زندگی کی ان گہرائیوں میں جانے کا موقع نہیں دیا جن سے کوئی مخصوص فلسفۂ حیات مرتب ہوتا۔ ان کی ساری توجہ چند اعلیٰ اخلاقی قدروں پر رہی جن سے انسانیت کو فروغ ملتا ہے اور شاید اسی لیے انہوں نے کسی مخصوص طرز نگارش کی پیروی بھی نہیں کی بلکہ اپنی کہانی کہنے کے ڈھنگ کو اپنا ہی رکھا اور اپنی دنیا اپنے ہی تجربوں میں تلاش کی۔

ذکر تھا اس فضا کا جس میں علی عباس حسینی کا ذہن اور شعور پروان چڑھا اسلیئے ان باتوں پر زیادہ زور دیا گیا جو ان سے بہت قریب تھیں۔ جن کے انتخاب میں بڑی حد تک جبر کی کارفرمائی تھی۔ خاندانی ماحول، دیہات کا ماحول، لکھنؤ کا ماحول یہ سب گویا زندگی میں آ ہی گئے لیکن اس ماحول سے باہر جس ہندوستان کی تشکیل ہو رہی تھی اسکے جو سیاسی اور معاشی مضمرات تھے اس کے اندر چھپی ہوئی طبقاتی اور سیاسی کشمکش کبھی طرف ہو جانے یا کسی سے ہمدردی کرنے کا سوال تھا۔ ان میں انتخاب کی گنجائش تھی۔ علی عباس حسینی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، سرکاری ملازم تھے اسلیئے قومی آزادی کی جو جد و جہد چل رہی تھی اسکو شجر ممنوعہ سمجھ سکتے تھے لیکن اپنے دل اور خیال کی دنیا میں وہ اسکے لیئے آزاد تھے کہ وطن پرستی اور آزادی کے جذبات سے دلچسپی لیں۔ عملی سیاست میں تو شریک نہیں ہو سکتے تھے لیکن جذباتی طور پر جہد آزادی کو سراہ سکتے تھے۔ یہ انتخاب کا مسئلہ تھا اور چونکہ وہ بنیادی طور پر انسانیت کی قدروں کو عزیز رکھتے تھے اسلیئے سرکاری نوکری کی پابندیوں کے باوجود انہوں نے رجعت پسندی کا ساتھ کبھی نہیں دیا۔ بلکہ مبہم طور پر ہی سہی ہمیشہ ترقی کے قدرداں رہے۔ حسینی اپنی ذہنی افتاد اور تربیت، معاشی مجبوری اور ذمہ داری کے احساس کی وجہ سے وہ نہ کر سکے جو پریم چند نے کیا لیکن اپنے

دل میں وطن کی محبت کا بت بنانے اور اسے پوجتے رہے۔ ملک کی
معاشی بدحالی پر روتے اور ترقی کے خواب دیکھتے رہے چنانچہ
جس زمانہ میں ترقی پسندی کے تصورات عام ہو رہے تھے اور
ہندوستانی سیاست میں معاشی آزادی کے خیالات جگہ پا رہے
تھے حسینی نے متعدد افسانوں میں زندگی کے اسی پہلو کی عکاسی
اور ترجمانی کی ان کے وہ افسانے جو "کچھ ملتی نہیں ہے" میں شامل
ہیں اسی محور پر گھومتے ہیں، اور اسی کے اثرات میلہ گھومنی کے اکثر
افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔

اس طرح ہم علی عباس حسینی کے ذہنی ارتقا کا ایک خاکہ
بنا سکتے ہیں اور ان کے افسانوں میں ان کے تصورات کی جلوہ گری
آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ انہیں کسی مخصوص نقطۂ نظر کے چوکھٹے
میں بٹھانا مشکل ہے۔ لیکن ان کے اخلاقی مطمح نظر کو سمجھ لینا مشکل
نہیں ہے۔ ایک جگہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:-

"میں آرٹ کو پروپگنڈا بنانے کا قائل نہیں اور نہ افسانہ نگار
کی جگہ سیاسی لیڈر بننے کا خواہشمند۔ میں تو اس طرح کا انسان
بنانا چاہتا ہوں جو بے وقوف والے ناصر ماموں تھے یا نور و نار
والی ذکیہ! قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے تصادم اور شور میں
اکثر انسانیت کی شیریں آواز دب جاتی ہے۔ میں اسی کے گن
گانا چاہتا ہوں۔ خواہ کوئی ملنے یا نہ ملنے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے"

ابتدائی افسانوں میں قصہ کو دلچسپ بنانے کی طرف حسینی
کی توجہ اتنی زیادہ ہو جاتی تھی کہ وہ اس نقطہ نظر کو پوری طرح
اجاگر نہیں کرتے تھے۔ لیکن اسکے نقوش رفیق تنہائی کے افسانوں میں
بھی مل جاتے ہیں۔ جو انکا پہلا مجموعہ ہے۔

رفیق تنہائی کے قربان میاں کی بے بسی اور بے آس زندگی
ہر طرح کی انسانی محبت سے محروم ہو کر ایک کتے کی محبت میں تبدیل
ہو گئی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ انسان ہر حال میں محبت اور ہمدردی کا
بھوکا ہے پسکھی میں بھی ظاہری دشمنی کے پیچھے چھپی ہوئی انسانی
محبت اور ہمدردی روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے اور یہ موضوع
جو ابتدائی افسانہ نویسی میں ایک فطری جذبہ کی طرح ابھرتا ہے
پختہ شعور کے زمانے میں لکھے ہوئے افسانوں میں زیادہ نفسیاتی گہرائی کے
ساتھ رونما ہوتا ہے۔ نور و نار کی ذکیہ اور بیوقوف کے
ناصر ماموں میں انسانیت کا یہ رنگ بہت گہرا اور چوکھا ہے

علی عباس حسینی کی کہانیوں کے زمیندار اور کسان اپنی آن
اور عزت کے لئے اپنی جانیں دینے کو تیار نظر آتے ہیں۔ لیکن محبت اور
ہمدردی کے نقش سلیمانی سے ایک لمحہ میں بدل جاتے ہیں۔ اس طرح
کے افسانے درجنوں کی تعداد میں ملتے ہیں جہاں دیہات کی پوری
فضا سامنے آجاتی ہے۔ علی عباس حسینی کے انسان عام طور سے
اچھے انسان ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات میں اپنی درندگی اور
شیطنت چھوڑ کر خوش اخلاق اور نرم دل بن جاتے ہیں۔ بعض
حالتوں میں یہ تغیر اس قدر جلد ہوتا ہے کہ اس پر یقین نہیں آتا
لیکن حسینی کی جذباتیت معمولی اشارے میں یہ تغیر دیکھ لینا چاہتی ہے
انکے دوسرے مجموعے میں ایک افسانہ "شیخ کریم کی نفرت"
اس افسانہ میں جو فضا تیار ہوتی ہے وہ ایک ایسے کردار کو جنم دیتی
ہے جس نے ۵۵ سال تک نفرت کا دودھ پیا ہے اور اسی کا
خون اسکی رگوں میں دوڑتا رہا ہے لیکن زندگی کے آخری لمحہ میں
زمیندار کے ایک اچھے انسانی سلوک نے ایسی قلب ماہیت کی کہ
نفرت پانی ہو کر بہہ گئی۔ یہی صورت "دو شریفوں کا مقابلہ"۔ "ملاپ"
اور "گاؤں کی لاج" میں بھی نظر آتی ہے۔ حسینی کا اخلاقی نقطۂ نظر
موقع نکال کر کہانی کو ایسا موڑ دیتا ہے کہ بگڑی ہوئی بات بن
جاتی ہے اور اس کے لئے مواد انہیں اس تصور سے ملتا ہے کہ
انسان بنیادی طور پر نیک ہے۔ دیہاتوں کے سادہ دل لوگ اپنی
جہالت اور غریبی کے باوجود اس دولت سے بہرہ ور ہیں۔ اور
موقع پڑنے پر یہ چیز فطری طور سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

حسینی انسانی فطرت میں مردانگی۔ آن بان۔ ہمدردی کا
احساس خودداری۔ غیرت۔ رواداری اور وضعداری کے قدرداں ہیں
یہی ان کے اکثر افسانوں کے موضوع ہیں۔ سوتیلے۔ عورت
آئی سی ایس۔ شیخو چچا۔ قانون باطن۔ شریف مزدور۔ دل کی آگ۔
بختیار کا نسخہ۔ پیا کی جوگن سلیاں کی دلچسپ اور متنوع مثالیں ہیں

آئی سی ایس کا ۔ جب وہ آئی سی ایس بنکر بہت دنوں کے بعد دیہات پہونچتا ہے اور تھوڑے دنوں بعد وہاں کی اصل زندگی میں گھل مل جاتا ہے اور مٹی دہن کر دوڑتا ہے سارے کام کرتا ہے تو اسکی بیوی کی نظر میں اسکی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔ یہی بات سماج کی بھینٹ میں ہے ۔ افسانہ کی ہیروئن مسٹر موہن میں مرد کی آن بان دیکھنا چاہتی ہے ۔ شیخو چچا کی وضعداری بڑے آڑے وقت میں کام آتی ہے ۔ طوائف کے اندر بسنے والی انسانی محبت آہستہ آہستہ دل کی آگ والے مولوی انوار الحق کو اس کا گرویدہ بنا دیتی ہے ۔ جل پری کی بنیاد میں بھی اسی طرح کی محبت اور شرافت نفس کی کارفرمائی ہے جو ایک طویل رومان میں بیان ہوئی ہے ۔

ہندو مسلم اتحاد اور وطن دوستی ایسے موضوعات ہیں جن کو اکثر افسانوں کا موضوع بنایا گیا ہے حسینی کے یہاں بھی مختلف شکلوں میں یہ موضوع جگہ پاتا ہے ۔ ایک ماں کے دو بچے بوڑھا بابا گانوں کی لاج ۔ اور بعض دوسرے افسانوں میں یہ مضمون بڑی دلسوزی اور دردمندی سے آیا ہے ۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علی عباس حسینی نے زندگی کو جن جن زاویوں سے دیکھا اور اسکے شعور نے انہیں جس جس طرح پرکھا اور سمجھا وہ اپنے افسانوں میں ایک ہلکی سی نصب العینیت اور جذباتیت کے ساتھ انہیں کو پیش کرتے رہے ۔ انہیں زندگی کی جو قدریں عزیز ہیں اکثر و بیشتر وہی ان کے افسانوں کا مرکزی نقطہ بنیں حالانکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ انہوں نے محض کسی واقعے کردار سے متاثر ہو کر اس کی تصویر میں زبان و بیان کی چاشنی سے رنگ بھرا ہے اور نتیجہ میں وہ چیز ہاتھ نہیں آئی ہے جس کی امید کی جاتی تھی ۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے جہاں اُن کے یہاں منصوبہ بندی کے تعمیری پہلوؤں سے دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے وہیں طویل کہانیاں لکھ کر بعض نوع کے کرداروں کو پیش کرنے کی خواہش بھی بڑھی ہے ۔ ان میں گہرے مشاہدے کے باوجود وہی رومانی رنگ جھلک پڑتا ہے جو ابتدائی دور کے بعض افسانوں میں نمایاں ہوا تھا ایک غسل خانے میں ۔ جلتی بجھتی شمعیں ۔ سیلاب کی راتیں اسکی دلچسپ مثالیں ہیں ۔ یہ افسانے ابھی کچھ ہی دنوں کے اندر لکھے گئے ہیں لیکن ان میں افسانوی عنصر نے اس نصب العینیت کو دبا لیا ہے جو ان کے اکثر افسانوں میں خاص مقام رکھتی ہے ۔ سماجی نقطۂ نظر سے ان کی تحریروں میں ایک طرح کی مثالیت حقیقت پر سایہ ڈالتی نظر آتی ہے جس سے وہ بچنا بھی نہیں چاہتے ۔

علی عباس حسینی کے فن افسانہ نگاری کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ان حقائق کو پیش نگاہ رکھنا ہی پڑیگا جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہوا ہے لیکن زبان و بیان میں لطافت اور مزاح کی ہلکی سی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ لکھنؤ کے لب و لہجہ انداز گفتگو اور شیریں بیانی کے بہت سے پہلو ان کے اسلوب کا جز بن گئے ہیں جنہیں بعض اوقات وہ لوگ پسند نہیں کرتے جو تکلف اور تصنع کے ہر رنگ سے پرہیز کرتے ہیں ۔ گذشتہ پچیس برسوں کے اندر افسانہ نویسی کے اسلوب اور تکنیک میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ اور بہت سے تجربے کیئے گئے ہیں لیکن حسینی کے افسانے آج بھی پسند کیئے اور پڑھے جاتے ہیں ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ افسانے کی بنیادی خصوصیت ان کے یہاں ضرور موجود ہے اور وہ بنیادی خصوصیت ہے زندگی کے تجربات، واقعات اور تاثرات کا دلچسپ بیان جو افسانہ کو افسانہ بناتی ہے ۔

تین باتوں کا خیال رکھیئے

(۱) اپنے پتے کی تبدیلی کی اطلاع ہر ماہ کے آخر تک دفتر میں بھیج دیا کیجئے ۔

(۲) خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ۔

(۳) جواب طلب امور کے لیئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجا کیجئے ۔

منیجر صبح نو ۔ پوسٹ بکس ۱۴۲ پٹنہ ۱

شرائط ایجنسی

(۱) پانچ پرچوں سے کم کی فرمائش نہیں پوری کی جائیگی۔

(۲) ۲۵ فیصدی کمیشن ایجنٹ صاحبان کو دیا جائیگا۔ البتہ محصول ڈاک ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

(۳) تمام فرمائشیں اور رقم ماہ کی ۲۰ تاریخ تک ہمارے پاس پہنچ جانی چاہیئے۔

(۴) پرچے کسی حال میں واپس نہیں لئے جائینگے۔

(۵) پاکستان کے ایجنٹ، خریداران اور مشتہرین حضرات حسب ذیل پتہ پر روپیہ ارسال فرمادیں اور رسید ہمارے پاس بھیج دیں۔

پاکستان روپیہ بھیجنے کا پتہ یہ ہے } ایڈیٹر رضا کار ویکلی۔ لاہور

المشتہر: منیجر صبح نو قطب الدین لین پوسٹ بکس ۱۴۲ پٹنہ ۴

نئے فنکار

مرتبہ:- ساحل مانک پوری

اس کتاب میں ہر شاعر کی دس غزلیں، نظمیں حالات زندگی اور تصویر ہوگی۔

ہم تمام نئے لکھنے والوں سے درخواست کرتے ہیں وہ اپنی پہلی فرصت میں اپنی تخلیقات وغیرہ سے نوازیں اور تفصیلات کے لئے مکتبہ سے تعلق پیدا کریں۔

پتہ:- منیجر مکتبہ آہنگ مانکپور (پرتاپ گڈھ) (یو۔پی)

ڈاکٹر اختر اورینوی

علی عبّاس حسینی کی افسانہ نگاری کا طائرانہ جائزہ

اُردو ادب کے تین روایتی سلسلے اُن ادبی منبعوں سے جا ملتے ہیں جو مغربی وسطی ایشیا اور یورپ کی ادبی وراثت سے تعلق رکھتے ہیں اردو ادب نے سب سے زیادہ عربی و فارسی مخزنِ ادب سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس کے بعد بھاشا پراکرت اور سنسکرت کے مصدر سے فیض لیا ہے، خصوصاً لسانی اعتبار سے۔ تیسرا روایتی ماخذ یورپی ادب بالخصوص انگریزی ادب ہے۔ یورپی زبان و ادب کا اثر اُردو پر پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے عہد سے ہی پڑنے لگا تھا۔ پرتگالیوں نے شہنشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت میں ہی ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر تجارت و تبلیغ کے لئے مرکز قائم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر عبد العلیم نامی کی تحقیقات کے بموجب مغربی مذہبی ڈراموں کا اثر اُسی وقت سے ہندوستانی زبان پر پڑنے لگا تھا۔ لیکن یہ مغربی اثرات انگریزی اقتدار کے دور میں اور گہرے طور پر پڑے۔ ۱۶۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ابتدائی نقوش قائم ہوئے اور اس کے بعد اردو ادب پر انگریزی اثرات گہرے طور پر پڑنے لگے۔

قصہ نگاری کی مختلف صنفیں ہیں۔ اُن میں ناول اور مختصر افسانہ دو اہم اصناف ہیں۔ اور یہ دونوں انگریزی ادب سے لی گئی ہیں۔ یوں تو سنسکرت، پراکرت، فارسی اور عربی اِن سب زبانوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ملتی ہیں۔ مثلاً حکایاتِ لقمان، طوطا کہانی بتیال پچیسی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اردو مختصر افسانے کی وضع اور قطع، تنظیم و تعمیر، تراش و خراش مخصوص ہوتی ہے۔ اس کی ٹیکنیک انگریزی ادب سے لی گئی ہے۔

اب تک کی تحقیقات سے یہی ثابت ہوا کہ اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد دہلوی تھے۔ ملاحظہ ہو اویس احمد ادیب کی کتاب لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو مختصر افسانہ نویسی کے آغاز کا سہرا کس کے سر بندھا۔ میرا خیال ہے کہ حکایات سے مختصر افسانہ نویسی تک کی منزل تدریجی طور پر طے ہوئی ہے۔ داستانی رنگ ہلکا ہوتا گیا، حقیقت ماجرائی بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ مغربی ٹیکنیک کے مطابق افسانہ طرازی ہونے لگی۔ میرے پیش نظر پندرہ روزہ "فوائد الناظرین" کے پرچے ہیں۔ جن میں ہمیں حکایت اور مختصر افسانہ کے عبوری دور کی جھلک ملتی ہے۔ یہ پندرہ روزہ رسالہ دہلی سے ماسٹر رام چندر صاحب کے اہتمام سے نکلتا تھا۔ ۱۸۴۷ء تا ۱۸۴۹ء کے نمبر میرے سامنے ہیں، ان نمبروں میں ہمیں عام مضامین، انشائیہ نما مضامین، مقالے، اداریے، مراسلے اور چھوٹے موٹے قصے ملتے ہیں۔ اِن ہی قصوں میں نئے مختصر افسانے کا خمیر اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس رسالے کے علاوہ اُس عہد میں اور بھی رسالے نکلے تھے جن کی اشاعت ملک کے مختلف مراکز سے ہوتی تھی۔

اُردو مختصر افسانہ نویسی کے دورِ اوّل میں ہمیں چند اہم فنکاروں کے نام ملتے ہیں، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، حسن عزیز جاوید وغیرہ۔ اِن سبھوں میں پریم چند کئی حیثیتوں سے ممتاز ہیں۔ اُنہوں نے اُردو افسانے سے داستانوں کا رومانی رنگ ختم کیا، اور

اُسے حقیقت و واقعیت کے قریب لائے ۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑی بات یہ کی کہ مختصر افسانے کی ٹیکنیک پر زیادہ سے زیادہ عمل کیا پریم چند کے بہترین افسانے ایسے ہیں جن میں ٹیکنیکی نقص پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانے کے سرمائے کا بڑا حصہ ٹیکنیکی طور پر خاصا کامیاب ہے ۔

اُردو میں یلدرم کی روایات کو نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری نے آگے بڑھایا اور نئے امکانات پیدا کئے ۔ یہ اردو مختصر افسانہ نویسی کا رومانی دبستان ہے ۔ مجنوں ، حجاب امتیاز علی تاج ، والدہ سراج الدین ظفر اور میرزا ادیب نے ایڈگرایلن پو کی طرح افسانوں میں فوق الفطرت کو جگہ دی ۔

پریم چند کی روایات کو آگے بڑھانے والوں میں دو نام نمایاں طور پر اُبھرتے ہیں ۔ اعظم کریوی اور علی عباس حسینی حقیقت پسندی کی روایت آگے ہی آگے بڑھتی رہی ، محمد علی رُدولوی نے اُسے نئے زاویے اور نئی جرأت عطا کی اور پھر زمانے کے انقلابی تقاضوں نے حقیقت پسندی کو دو آتشہ بناکر اور تیز کردیا ۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا غلغلہ بلند ہوا ۔ دس سالوں تک اس کی دھوم مچی رہی اور کسی نہ کسی رنگ میں ترقی پسندانہ میلانات اُردو افسانہ نگاری کی دنیا میں موجود رہیں ۔

حقیقت پسندی کی روایات نے دو اہم سمتیں اختیار کیں ۔ تنقیدی حقیقت پسندی اور نفسیاتی واقعیت ۔ تنقیدی حقیقت پسندی نے مقصدیت اور افادیت کی منزلیں طے کیں اور عموماً جمہوریت اور اشتراکیت کا نصب العین سامنے رکھا ۔ نفسیاتی واقعیت نے انسانی نفس کی حیرت ناکیوں ، پیچیدگیوں ، اُلجھاوؤں تضاد و تصادم کی ترجمانی کی ۔ کبھی کبھی نفسی تجزیہ و تحلیل کے ذریعے بھی ایک خاص قسم کی مقصدیت کو اُجاگر کیا گیا ۔

نئی اُردو افسانہ نگاری کے دونوں میلانات کی دنیا میں ہمیں سربرآوردہ فنکاروں کے نام ملتے ہیں ۔ کرشن چندر ، راجندر سنگھ بیدی ، عصمت چغتائی وغیرہ ایک طرف اور سعادت حسن منٹو ، ممتاز مفتی ، حسن عسکری ، ڈاکٹر محمد محسن اور قدرت اللہ شہاب وغیرہ دوسری طرف ۔

علی عباس حسینی صاحب میں زمانے کا ساتھ دینے کی بڑی صلاحیت ہے ۔ اُن کی فنکاری پریم چند کے دَور کا دم بھی بھرتی ہے اور ترقی پسند تحریک کی بھی دم ساز ہے ۔ علی عباس حسینی اُن بزرگوں میں شامل ہیں جن کا فن کبھی بوڑھا نہیں ہوتا ، وہ بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے ، نئے میلانات کے رنگ و آہنگ سے مطابقت پیدا کرتا ہے اور تازہ کاری کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے ۔ علی عباس حسینی کا فن موضوع اور ہیئت کی جہتوں سے ترقی پذیر رہا ہے ۔

علی عباس حسینی صاحب کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں ۔ ان تمام مجموعوں پر تبصرہ نہیں کرسکتا ۔ اس وقت میرے سامنے اُن کے دو مجموعے ہیں " آئی ۔ سی ۔ ایس " (چند افسانے) اور " میلہ گھومنی " ۔ میں ان دونوں مجموعوں کو سامنے رکھ کر علی عباس حسینی صاحب کے فن کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ " آئی ۔ سی ۔ ایس " کا ڈھنگ پریم چند کے افسانوں جیسا ہے اس افسانے میں دیہاتی زندگی کی خوبیوں کو پیش کیا گیا ہے اور شہری زندگی کی رسمیت اور فطرت سے دوری پر کڑی تنقید کی گئی ہے اس افسانے کا انجام ٹکنیکی طور پر کامیاب ہے لیکن اس کی حقیقت نگاری گہری نہیں ۔ پلاٹ میں میلوں ڈرامائیت زیادہ ہے ، زبان نہایت پاکیزہ ہے اور اسلوبِ اظہار خوشگوار ۔ اس میں ایک نفسیاتی نکتہ بیان ہوا ہے ۔ عورت بنیادی طور پر ایک ایسے مرد کو پسند کرتی ہے جس میں مردانہ اقدام و عمل کی صفتیں پائی جائیں ۔ لیکن کردار نگاری اور واقعہ نگاری کے سہارے اس نکتے کی تشکیل پلاٹ کے اندر کامیابی کے ساتھ نہیں ہوسکی اس لئے افسانے کا آخری فقرہ میکانکی سا معلوم ہوتا ہے ۔

"بیگم کی آنکھیں عجب طرح کے نور سے چمکنے لگیں وہ بولیں نہیں میں نے جو کچھ سمجھ رکھا تھا اِن سب سے کہیں بہتر چیز سے شادی کی ہے یعنی ۔ .. یعنی ایک مرد سے ۔"

آخری حصہ افسانے کے مرکزی نکتے پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے لیکن اِس کا سلسلہ افسانے کے وسطی اور ابتدائی حصّے سے نہیں ملتا

"بیلوں کی جوڑی" بھی ایک اچھا خاصا افسانہ ہے ۔ اِس افسانے کو پڑھ کر بھی پریم چند کی یاد آتی ہے ۔ اس کی فضا میں ہندوستانی دیہاتوں کا رنگ اُجاگر ہوا ہے ۔ ملاحظہ ہو :۔

"سکھو جو اپنے کھیت میں سے گھاس صاف کرتا ہوتا تھا کھرپی ہاتھ سے رکھ دیتا تھا اور دونوں ہتھیلیاں ایک دوسرے سے رگڑ کر ہاتھ کی مٹی گرا کر دنیا کے کھیت کی میڈھ پر آکر بیٹھ جاتا تھا ۔"

"اہیروں کے لڑکے گور وچھیرو گاؤں کے میدانوں میں چراتے ہوئے جب برہا گاتے ہوتے تھے تو اکثر یہ ہوتا تھا کہ درمیان ہی میں رک جاتے تھے اور سیٹھ جی کا ذکر چھڑ جاتا تھا ۔"

پریم چند کی طرح علی عباس حسینی بھی سیدھا سادہ اور انتہائی نہ طریقہ استعمال کرتے ہیں ۔ "بیلوں کی جوڑی" میں بھی ہمیں نصیحت کی بات ملتی ہے ۔ لیکن کہانی پن کا لطف بھی قائم ہے مزاح لطیف کی چاشنی بھی موجود ہے جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کا قصہ ہے ۔ افسانہ نگار نے اِس سلسلے میں بعض لوگوں کی ناہموار پن پر طنز کیا ہے ۔ سیٹھ جی جین ہیں اور جانوروں سے حسن سلوک کیلئے اپنی زمینداری کے گاؤں میں "بیلوں کی جوڑی" کا انعام مقرر کرتے ہیں ۔ سہدیو گاؤں کا ایک چالاک شخص ہے وہ انعام جیتنا چاہتا ہے ۔

"سہدیو ان کا رفیق ۔ یارِ غار ، مصاحب اور پکا دوست بن گیا ۔ وہ ہر روز کوئی زخمی پرندک ۔ کوئی مجروح کچھوا یا کوئی لنگڑا کیڑا تلاش کر کے لے آتا اور بقیہ دن سیٹھ جی کے ساتھ مرہم پٹی میں مشغول رہتا تھا ۔"

لیکن گاؤں والوں نے سیٹھ جی کے پاس سہدیو کی شکایت پہنچائی کہ یہ سب چالبازی ہے ۔ سیٹھ جی ناراض ہو گئے اور اب سہدیو کو انعام کی اُمید نہ رہی ۔ اُس نے اپنے سدھے ہوئے کتّے سے سیٹھ جی کو ایک سبق سکھایا ۔ میر کے موقع پر کتّے کو سیٹھ جی کی طرف متوجہ کر دیا ، کتّے نے سیٹھ جی کی ٹانگ پکڑ لی اور سیٹھ جی کی بھری بھری پنڈلی میں اپنے دانت چبھونے لگا ۔ سہدیو بولا :۔

"... اسے کتا کے چوٹ لگ جائی اُو چرن چھوت ہے اور ہجور اُو ہنکا لات مارت ہیں ۔"

آخر ش سیٹھ جی نے بے بسی سے کہا ۔

"گنگا قسم .... تجھی کو .... جوڑی .... دوں گا ۔

یہ سنتے ہی سہدیو نے کتّے کو لات ماری اور وہ پیں پیں کرتا دور بھاگ گیا ۔ پھر اُس نے سیٹھ جی کو گود میں اُٹھا کر اُن کی موٹر تک پہنچایا ۔ افسانے کا اختتام مزاحیہ انداز میں ہوا ہے ، لیکن فنی طور پر یہ حصہ کامیاب نہیں ۔

"بیلوں کی جوڑی" میں بھی میلوں ڈرامائیت ہے ، پلاٹ کا ارتقا میکینکی ہے ۔ عضویاتی ، فطری اور تسلی بخش نہیں پھر بھی افسانہ دل چسپ ہے ۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں افسانویت کافی ہوتی ہے ۔ وہ دل چسپی پیدا کرتے اور اُسے قائم رکھتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ حسینی کے فن میں پریم چند سے زیادہ دل چسپی پائی جاتی ہے یہ دل کشی جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے بھی پیدا کی جاتی ہے ۔ اور مزے دار واقعات کے مدد سے بھی ۔ "آئی ۔ سی ۔ ایس" والے مجموعے کی دو کہانیاں مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ "قانونِ باطن" اور "بچّیا رکھ کا نسخہ" اول الذکر افسانے میں ایک اخلاقی کشمکش کو بڑے افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ۔ کہانی کے

تدریجی ارتقا میں ڈرامائی انتظار کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اظہار کا ڈھنگ تازہ کاری کی مثال ہے۔ انسپکٹر ایاز خاں ایک صحبت خاص میں اپنا ایک تجربہ سناتے ہیں:۔

"انسپکٹر ایاز خاں نے سگرٹ کا ایک کش کھینچا اور اس کے بعد میری جانب مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولے۔ بھئی ہاں میں نے بھی بے ایمانی کی ہے لیکن زندگی بھر میں صرف ایک بار اور پھر بھی آج تک شک ہے کہ میں نے قانونِ ظاہری کی خلاف ورزی کرنے میں کہیں قانونِ باطنی پر تو عمل نہیں کیا۔"

گفتگو آگے بڑھتی ہے کہانی ابھی شروع نہیں ہوئی، کہانی کی تمہید ہے جب حیرت اور انتظار بڑھتا ہے تو انسپکٹر صاحب بڑے سہج سے کہانی شروع کرتے ہیں:۔

"اچھا بھئی تو کہے دیتا ہوں، آج سے پانچ چھ برس قبل جب میں سرحد پر تعینات تھا تو مجھے ایک دن۔ . . . . "

کہانی بڑی ہی دھیمی رفتار سے آگے بڑھتی ہے۔

"ایک دن کا واقعہ سنئے کہ ایک صاحب جن سے مجھ سے خاص اربط تھا۔۔۔۔"

اب جا کے دو دنبیوں کی چوری کا واقعہ شروع ہوتا ہے اور سرحد کے رہنے والوں کی مخصوص سیرت کو واقعیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ پورے پلاٹ میں جستجو اور انتظار قائم رہتا ہے۔ مقامی رنگ بھی اچھی طرح اُجاگر کیا گیا ہے، سرحدی قبیلوں کے ٹائپ کی کردار نگاری کی گئی ہے۔ کہانی سادہ ہے مگر مزے میں کہی گئی ہے۔ ایک جگہ اس کہانی میں مجھے جھول معلوم ہوتا ہے یہاں حقیقت کی پیش کش نہیں ہو سکی اور مشاہدے کی کمی صاف جھلکتی ہے۔ سرحدی پٹھانوں کے گھرانے کے افراد مشرقی یوپی اور بہار کے کسانوں کی سی ذہنیت کے مالک نہیں ہوتے۔ ٹکڑا نہایت بے تکا ہے:۔

"اور وہ بڑے میاں، وہ بڑی بی بی، دونوں چھوٹے بچے اور ان کا جوان بیٹا سب کے سب ہاتھ جوڑ کر میرے قدموں کی طرف جھک پڑے۔"

آزاد رو آفریدیوں اور مسعودیوں کی کمریں اور گردنیں اتنی لچک دار نہیں ہوتیں کہ وہ جھک پڑیں۔

افسانے کا اختتام اچھا خاصا ہے اور اس سے افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کا صاف پتہ چلتا ہے۔ مجرم پٹھان کو چھوڑ کر ہر چند کہ قانونِ ظاہری کی خلاف ورزی کی گئی ہے لیکن قانونِ باطن یعنی دل کے قانون کا احترام کیا گیا ہے۔

"اس کی داد دنبیوں کے مالک نے بھی اپنا ایک نہایت ہی عزیز اور قیمتی دنبہ ذبح کر کے دی۔ اور انسپکٹر صاحب کی بڑی شان سے دعوت کی۔"

"بختیار کھ کا نسخہ" ایک ہی اچھا افسانہ ہے۔ تخیلی اور طنزیہ۔ یہ افسانہ مختصر اور مکمل ہے وحدت اثر بڑی ہنرمندی سے قائم کی گئی ہے۔ افسانہ آہستہ آہستہ ارتقا کی منزلوں گزرتا ہے۔ اور ایک کامیاب انجام کو پہنچتا ہے۔ انجام بہت ہی تیکھا، پُراثر اور پائندہ ہے:۔

"تاجدار کشور ضلالت شہنشاہ عزازیل ایک بار بیمار پڑا . . . . مریض کی یہ حالت تھی کہ نقاہت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔" آخر حق خداوند تعالیٰ کے وزیر و مشیر بختیار کھ نے دوسرے طبیبوں کی ناکامیابی کے بعد ایک نسخہ تجویز کیا۔ "دنیا کے سیاہ ترین دل کی یخنی" ایک دیوزاد بھیجا گیا اور وہ اپنے خیال میں ایک سیاہ ترین دل [illegible]

بن سدو سادیوزاد بھیجا گیا۔ اس نے ایک جواری، عیاش اور لامذہب انسان کا دل کاٹ کر لا با۔ یخنی بنائی اور پلائی گئی اس سے بھی فائدہ نہ ہوا۔ آخرش بختیار کھ خود گیا اور وہ ایک سیاہ ترین دل منتخب کرکے لایا، یخنی بنی اور اس سے ابلیس کی صحت درست ہوگئی۔ "اپنے غرور کی قسم بختیار کھ تو نے مجھے پھر سے زندہ کردیا" عزازیل بولا۔ درباری پوچھنے لگے کہ آخر یہ کون سا دل تھا جس کی یخنی صحت کی موجب ہوئی۔ بختیار کھ نے بڑے پُراثر انداز میں بتایا کہ یہ ایک ایسے صاحب جبہ و عمامہ کا دل تھا جس نے قرآن کو دامِ تزویر بنا رکھا تھا اور خلق اللہ کو بہکاتا تھا۔ خلوت میں ساری خباثتوں پر عمل کرتا تھا اور ظاہر میں محافظِ اسلام بنتا تھا۔

اب اس سے زیادہ سیاہ دل کون ہوسکتا ہے؟ قرآن کے غلط معنی یہ بتاتا ہے الف کو عین کی طرح حلق سے یہ نکالتا ہے یتیم کا خون یہ چوستا ہے، بیوہ کا گلا یہ کاٹتا ہے ....."

شیطان نے ہونٹ چاٹے یخنی کا مزا اب تک موجود تھا بولا ٹھیک ہے یخنی میں جھوٹ کا نمک، مکاری کی ترشی، زنا کی خوشبو، نفس پرستی کا چٹخارہ موجود ہے۔ "آدم کا خدا ہر مذہب میں اس گروہ کی زیادتی کرے اِن لوگوں سے مجھے بڑی تقویت ہے یہ لوگ تو دنیا میں میرا ہی کام انجام دیتے ہیں۔"

یہ ہیں افسانے کے نہایت ہی طنزیہ آخری فقرے۔

علی عباس حسینی کی طبیعت میں طنز و مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور اس کا اظہار جا بجا اُن کے افسانوں میں کامیابی کے ساتھ ہوتا ہے۔

اب میں حسینی کے افسانوں کے دوسرے مجموعہ "میلہ گھومنی" کی طرف توجہ منعطف کرتا ہوں۔ حسینی نے ترقی پسند تحریک کا بھی ساتھ دیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اُن کے یہاں نفسیاتی تجزیہ کا واضح میلان بھی ملتا ہے۔ جدید اُردو افسانہ نگاری میں معاش اور جنس کی تلخ و شیریں حقیقتوں کو واشگاف کیا گیا ہے۔ کہیں یہ معاشی اور جنسی تجزیہ محض پروپگنڈہ یا لذتیت میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس اور فرائیڈ نے ہمیں زندگی کے گہرے معاشی و جنسی حقائق کو دیکھنے کی نظر اور سمجھنے کی بصیرت عطا کی ہے لیکن حقائق کو حسن کارانہ طور پر پیش کرنے کا نام فن ہے۔ محض اظہارِ حقیقت ہرگز ہنرمندی نہیں۔ حسینی نے عصری معلومات اور تحریکات سے استفادہ کیا ہے اور انہوں نے اپنے بہت سے افسانوں میں ان سے فنکارانہ طور پر فائدہ اُٹھایا ہے۔ علی عباس حسینی کی حقیقت پسندی پریم چند کی حقیقت نگاری سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پریم چند میں اوّل تو جرأتِ اظہار کی کمی ہے اور دوم یہ کہ وہ معاشرہ کے متصادم میلانات کے درمیان خواہ مخواہ مفاہمت کرانے کے درپے ہوتے ہیں۔ تیسری کھٹک یہ کہ وہ جارحانہ انداز میں جا بجا وعظ فرمانے لگتے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پریم چند کے ذخیرے میں تراشیدہ، سجل اور فنی طور پہ نفیس اور کامل افسانے نہیں ملتے۔ ان کے یہاں بہت سے افسانے فنی طور پر مکمل ہیں۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں بھی فنی عیوب ملتے ہیں لیکن اگر تناسب کا لحاظ رکھیں تو ہم کہیں گے کہ حسینی نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں۔ تاہم یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ پریم چند نے ہم سب لوگوں کی رہبری کی ہے اور اُس کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگار پریم چند کے کندھوں پر چڑھ کر ہی سربرآوردہ ہوئے ہیں۔ اگر ہم پریم چند کے افسانوں کا انتخاب کرلیں تو یہ منتخب سرمایہ اپنے معیار اور تعداد کے لحاظ سے بھی بہتوں پر بھاری ہوگا۔ پریم چند کے اچھے افسانے اُن کے کمزور افسانوں میں

گھل مل کر پھیکے پڑ گئے ہیں۔

مختصر افسانے میں کسی ایک مرکزی کردار کو اعزاز و تکمیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے یا ایک ظاہراً معمولی سے واقعہ کی اہمیت کو اُبھار کر کیا جاتا ہے زندگی کا ایک دریچہ کھولا جاتا ہے۔ افسانہ نگار قطرے کو دریا بناتا ہے ذرہ کو صحرا۔ وہ لمحے کو ابدیت میں تبدیل کر دیتا ہے یہی اُس کا فن ہے۔ علی عباس حسینی نے کرداری افسانے بھی لکھے ہیں واقعاتی بھی کیفیاتی، نفسیاتی اور تخیلی بھی "مصنف" فن کار کا ذاتی تجربہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار غیر مطمئن ہندوستانی فنکاروں کا نمونہ ہے :-

"ہندوستانی عیال دار زندگی کا جنجال اور اطمینان قلب کا عدم اسے تصنیف و تخلیق سے باز رکھتا ہے"

پورا افسانہ اسی تلخ تجربے کی روداد ہے۔ وہ سکون کی تلاش میں ہے لیکن سکون کہاں۔ مچھروں، بن بلائے مہمانوں، وحشی بچوں، اور گھامڑ بیوی، سب اُسے کام کرنے نہیں دیتے اور ان سے نجات ملی تو شرک کا ہنگامہ۔ افسانے کا آخری فقرہ نہایت تیکھا ہے اور افسانے کی ترا شیدگی کا ثبوت ہے۔

"ایسا سکوت جو چتا پر جلنے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد ہی نصیب ہو سکتا ہے"

"بی" اور "میلہ گھومنی" دونوں نہایت اچھے افسانے ہیں فنی طور پر کامیاب دونوں میں جنسی میلان کی عکاسی کی گئی ہے۔ "بی" میں نازک، دل چسپ اور غیر متوقع حالات میں دبے دبے جنسی تقاضوں کو اُبھرنے کا موقع دیا گیا ہے اور "میلہ گھومنی" میں ایک برافروختہ جنسی میلان رکھنے والا کردار پیش کیا گیا ہے اور اس پیش کش کی Sex بھی نہایت سازگار ہے۔ بی ایک واقعاتی افسانہ ہے اور میلہ گھومنی کرداری۔

"بی" کی تشکیل میلہ گھومنی سے زیادہ کامیاب ہے۔ اس میں تجزیۂ نفس بھی نہایت عمدہ طور پر کیا گیا ہے۔ لطافت سے کثافت کے ساتھ مل کر جلوہ پیدا کیا ہے۔ میلہ گھومنی میں کہانی پن سے مزا پیدا ہوتا ہے۔ بی ذرا جھینپو قسم کی لڑکی تھی :-

"ایک دفعہ کالج احاطے کے باہر اپنی چند ساتھیوں کے ساتھ نکل گئی تھی وہاں چند شامی اور چند اینگلو انڈین لڑکے دکھائی دئے۔ دوسری لڑکیاں تو جیسے انہیں پہلے ہی سے جانتی تھیں وہ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں مگر وہ لجاؤ کی طرح شرما کر پیچھے رہ گئی تھی"

وہ غیر مردوں کی صورت سے گھبراتی تھی اپنی دوست لوسی کی سالگرہ پر وہ برانڈش تنہا الہ آباد جا رہی تھی۔ لکھنؤ سے سفر شروع ہوا۔ انٹر کلاس کی جگہ سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور سیل ٹرین سے پرتاب گڈھ پہنچی۔ گاڑی تین گھنٹہ لیٹ تھی الہ آباد جانے والی گاڑی چھوٹ چکی تھی الہ آباد جانے والے بہتیرے مسافر تھے۔ اب لوگ لاریوں کی طرف ٹوٹ پڑے وہ پریشانی کے عالم میں سب کے ساتھ لاری کی طرف چل دی چھوٹے ڈبے میں بیٹھی وہ نہ تو پرتاب گڈھ میں ٹھہر سکتی تھی نہ اُسے اس بھیڑ بھڑکے میں جانا پسند تھا مگر کرتی تو کیا کرتی اُس پر سخت گھبراہٹ طاری تھی لوگ جھانک تاک رہے تھے اور وہ بیزار بیزار بیٹھی ہوئی تھی نفرت اور حقارت کی لہر نے اُسے ذرا اطمینان عطا کیا وہ پاؤڈر اور لپ اسٹک درست کر کے ناشتہ کرنے لگی ایک ہندوستانی جوڑا چھوٹے ڈبے میں داخل ہوا یہ نیا بیاہا جوڑا تھا بی اور ہندوستانی دلہن کے درمیان پھلوں کا تبادلہ ہوا ناشتہ بھی پیش کیا گیا پھر ایک اینگلو انڈین فوجی اُسی ڈبے میں داخل ہو گیا بی گھبرائی بھی مگر فوجی کی مسکراہٹ اور اس کے اقدام سے متاثر ہوتی رہی۔ وہ ڈبہ ہندوستانی جوڑے نے Reserve کر لیا تھا لیکن اس نے بی اور فوجی کو بھی میاں بیوی سمجھا اور اسی ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ بس اس خاص ماحول کی شرارت سے بی کے دل میں جنسیاتی لہریں پیدا ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ اُس کے نفس کے اندر شعلہ بھڑکنے لگا۔ فوجی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور میاں بیوی کے رشتے کو

حقیقت کا روپ دینے لگا۔ بڈی کشمکش میں گرفتار ہو گئی۔

یہ کیفیت آگے بڑھتی رہی واقعات کی رفتار توں میں اضافے ہوتے رہے اسی حال میں آدھی رات گئے یہ لوگ الہ آباد پہنچے۔ ہندوستانی جوڑا اپنی راہ لگا۔ اب بڈی اور فوجی رہ گئے اُسے لوئی کے پاس جانا تھا اور فوجی کو اپنے دوست سے ملنے کہیں جانا تھا۔ جذبے کے گداز، جنس کی پیاس، حالات کے الجھاوے اور نوجوان فوجی کے مردانہ حسن اور اقدام نے کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ بڈی اس کے ساتھ نصف شب کے لئے کسی ہوٹل میں قیام کے لئے رضامند ہو گئی۔ اور اب افسانہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

" اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے رکشے پر بیٹھ گئے۔"

'میلہ گھومنی' کا مرکزی کردار ایک ایسی خانہ بدوش آوارہ مزاج عورت کا کردار ہے جو مختلف مردوں کے ساتھ اپنی زندگی گزارتی رہی۔ علی عباس حسینی نے ایک ظریف مصاحب کے منہ سے مرکزی کردار کا یوں تعارف کرایا ہے:۔

" راویان صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کنجڑن، کنجڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

وہ سیدانی تو نہ بن سکی لیکن یکے بعد دیگرے چھنو منو دو بھائیوں سے اس کا رشتہ ہوا۔ یہ دونوں بھائی پیوندی تھے۔

" کہلاتے تھے پٹھان مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا اور ددیال سید واڑے میں۔"

چھنو منو دونوں "اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔" لیکن میلہ گھومنی نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کو چت کر دیا۔ دونوں کو میلہ گھومنی کا شوہر ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ ایک خون تھوک کر مرا دوسرا اختلاج قلب کا شکار ہوا۔ منو پہلے مرا چھنو بعد میں۔

" چھنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کنبھ کا میلہ گھومنے الہ آباد چلی گئی۔"

اس افسانے میں سماجی عرضہ بہت حقیقت پسندانہ ہے اور اس عرضہ میں کہانی کی پیشکش بڑی سادگی کے ساتھ نہایت پُر اثر طور پر ہوئی۔

" خالی گود" بھی جنسی تقاضے ہی کو پیش کرنے والا افسانہ ہے۔ بہت ہی سادہ اور معمولی سا واقعہ جس میں کوئی انوکھا پن نہیں، لیکن یہ کہانی بھی نہایت تراشیدہ اور تیکھی ہے۔ انجام بہت ہی پُر اثر۔

" مہری نے ان کے تمتماتے چہرے کو بغور دیکھا پھر مٹھی کھول کر گرم سکے گود میں ڈال لئے اور ان کی چٹ چٹ بلائیں لے کر بولی۔ بھگوان اسی طرح تمہاری کھالی گود بھر دے سیٹھانی، ملوا ہی جائے گا۔"

علی عباس حسینی کا نام اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی اور بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عصری تقاضوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔

میرے پیش نظر علی عباس حسینی کا ایک نہایت ہی تازہ بہ تازہ افسانہ ہے۔ یہ رسالہ آج کل دہلی جنوری ۱۹۶۵ء میں چھپا ہے۔ سرخی ہے "برکت" مجموعی طور پر یہ افسانہ بہت ہی اچھا ہے۔ اس میں وحدت اثر ہے تکمیل ہے اور انجام کا تیکھا پن۔ ایسا انجام جہاں پر افسانے کی سرخی کی رنگت دمک اُٹھتی ہے اور مفہوم دل نشیں ہو جاتا ہے۔ اس میں حقیقت نگاری، سماجی تنقید اور اصلاحی مقصد نمایاں ہے۔ جا بجا نہایت خوبصورت اور پُر اثر طنز پایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں ایجاز بلیغ نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

خواہ مخواہ افسانے کو طول دیا گیا ہے۔ پلاٹ کی ہیئت میں تعمیری نقص ہے۔ ماجرا پُر شکن ہے بلکہ شکن اندر شکن۔ افسانے کی بے بس حالت بہت بھدی ہے اگر اس کی فنکارانہ کتربیونت کی جائے تو یہ تراشیدہ اور سجل بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا داعظانہ لہجہ اور ... انداز بار گراں بنتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی آسام اور برما میں جہاں موسلا دھار بارش تھی وہاں گولیاں، گولیوں اور بموں کی بوچھار بھی قیامت خیز تھی ... نہ جان کی کوئی قیمت تھی نہ جسم کی، عزت و ناموس بہائے تھے اور مال اور جیبوں کی لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر سرکار کی نظروں میں اونچے سے اونچے ہو کر خطاب پر خطاب لے رہے تھے۔"

اس کے بعد غیر ضروری تفصیل شروع ہوتی ہے اور کچھ افسانہ در افسانہ کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ ذاتی باتیں بھی خواہ مخواہ آگئی ہیں۔ ایک معمولی سلونی سترہ اٹھارہ برس کی دیہاتن افسانے میں اُبھرتی ہے اور روپوش ہو جاتی ہے۔ ایک طویل بیان کے بعد افسانے کا مرکزی پلاٹ شروع ہوتا ہے۔ ویلر بک اسٹال پر ناول کی خریداری کا تذکرہ بھی ہے اور ناولوں کے بارے میں اپنی پسند اور ناپسند کا ذکر بھی ہے۔

واقعات ... سے شروع ہوتے ہیں ... میں سون پور اور بلیا وغیرہ مقامات ملتے ہیں۔ ٹرین کے ڈبے میں دو سیٹھوں کے کردار اُبھرتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں یہ سیٹھ طرح طرح کے بیوپار کیا کرتے تھے۔ مثلاً گھی کا ٹھیکہ، بُرے سے بُرے مال کی سپلائی، افسروں کو رشوت، ترقی رشوت۔ اور رشوت کی رشوت دے کر ترقی کے محل کی تعمیر بھی سیہ بازاری اور سرمایہ داری کے نظام کا قصہ ہے۔ سرمایہ داری جو سنگدل ہے جو ابلیس صفت ہے۔ افسانہ نگار کا طنز سُنئے۔

"سیٹھ جی دھندا اسی وقت تک اونچ نیچ ہوتا ہے جب تک دس پانچ روپیوں کا معاملہ ہو مگر جب ہزاروں لاکھوں کی بات چیت ہو تو کوئی بھی دھندا نیچ نہیں کہا جا سکتا۔"

ایک سیٹھ نے دوسرے موٹے سیٹھ کو سرمایہ داری کا ایک نیا نظریہ دیا۔

پھر ان دو سیٹھوں کے مکالمے کے ذریعے یہ قصہ پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح جنگ کے دوران افسروں کو رشوت دے کر نہایت ہی گندہ گھی سپلائی کر کے لاکھوں کا نفع حاصل کیا گیا۔

"اچھی سے اچھی شراب پلائی اور ایک ایک بانکی لونڈیا کا انتظام کیا اور خوش خوش گھر پلٹا۔" اس کے علاوہ صاحب کے چرن پر بیس ہزار او چڑھائے۔

افسانہ نگار نے ایک اور کارگر طنز کا نشتر لگایا ہے۔ خراب گھی فوجی بارکوں میں کھپ ہی گیا۔

"ہمارا جوان کنکر پتھر پچا لیتا ہے، گھی تو پھر گھی ہی ہے اُسے برداشت تو مرنے ہی جا رہا ہے وہ ہمارا گھی کھا کے مرے یا جاپانی گولی سے۔" ایک سیٹھ جی کا یہ خیال تھا۔

پھر افسانہ نگار ہمیں ایک درمیانی طبقے کے گھر میں لے آتا ہے جہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ہزاروں ہزار کا سامان تیار رکھا ہے۔ لوگوں کو رسم پر سینکڑوں خرچ کرنے کی فکر ہے نمائش منظور ہے ایک معمولی مدرس کو ملنے ملتے ہیں جب وہ کافی روپئے مہیا نہیں کر سکتا۔

"ہونہہ تمہاری بے برکت والی تنخواہ میں رکھا ہی کیا ہے .... وہی بندھے بندھائے گنے گنائے

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

اظہر علی فاروقی

رحیم بابا، سو بیگھے، پھولی پھپھی، اندیورٹھا، اور ناجی جیسی بلند پایہ کہانیاں لکھنے والے علی عباس حسینی صاحب ایک افسانہ نگار کے روپ میں ایک بلند تخلیق کے مالک ہیں۔ شاید ہم لوگوں نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ وہ ایک ڈرامانگار بھی ہیں اور ایک کامیاب ڈرامانگار۔

نورتن حسینی صاحب کے نو ایک بابی ڈراموں کا مجموعہ ہے جسے اگست ۱۹۴۳ء میں مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔ پہلے چھ ڈرامے تاریخی یا کہیں حد تک نیم تاریخی ہیں جو راجاؤں، بادشاہوں اور جاگیرداروں کی زندگیوں کے کسی ایک اہم حادثے سے وابستہ ہیں۔ اور تین ڈرامے معاشرتی ہیں۔

میراث :- "مہاتما بدھ کی بیوی مہارانی یشودھرا اپنے خسر مہاراج شدھودھن کے اشارے پر اپنے بارہ سالہ بیٹے راجکمار راہل کو سکھا پڑھا کر مہاتما بدھ کے پاس بھیجتی ہے کہ وہ اُن سے اپنا ترکہ ملنے کی استدعا کرے اور اگر مہاتما بدھ پس و پیش کریں تو راہل ایسی ضد کرے کہ مہاتما بدھ مہاراج پھر واپس آنے پر مجبور ہو جائیں چنانچہ وہ ایسا ہی کرتا ہے مگر نتیجہ مہاراجہ شدھودھن کی آرزو اور امید کے برعکس نکلتا ہے اور راجکمار راہل انہیں واپس لانے کے بجائے خود بھکشوؤں کی ٹولی میں داخل ہو جاتا ہے اور یہی وہ میراث ہے جو اسے مل جاتی ہے۔" ایک پرانی کہاوت ہے۔

"باپ پہ پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑم تھوڑا"

توارث کے معاملے میں حسینی صاحب اسی کے قائل معلوم ہوتے ہیں اس لیے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی یہ کہاوت بڑی حد تک حقیقت سے قریب ہے۔ راہل کے معاملے میں تو ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مگر انہوں نے اسی نظریے کے تحت ایک کہانی وراثت[1] بھی لکھی ہے۔

جذباتی :- شہزادہ کیقباد سلطان بلبن کا پوتا اور بغرا خاں کا بیٹا اپنے باپ کے خلاف باغیانہ قدم اٹھاتا ہے اور اس کی غیبت میں تختِ دہلی پر متمکن ہو کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے۔ بغرا خاں اس کی فہمائش کے لیے بنگال سے آگے بڑھتا ہے۔ بغرا کا سپہ سالار صلابت خاں ہر چند اُسے مجبور کرتا ہے کہ وہ حملہ آور ہو لیکن بغرا خاں کی شفقتِ پدری مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے صرف ڈرانے دھمکانے کا کام لے اور کشت و خون سے باز رہے۔ دونوں میں نامہ و پیام ہوتا ہے اور کیقباد بغرا خاں کو ایک صوبے دار کی حیثیت سے دربار میں حاضری کا حکم دیتا ہے چنانچہ بغرا خاں بڑی شان سے دلی سے ایسا ہی کرتا ہے۔ اور وہاں معاملہ دگرگوں ہو جاتا ہے کہ شہزادہ کیقباد اپنے باپ بغرا خاں کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے اور بغرا خاں تخت و تاج سے دست بردار ہو جاتا ہے اور آخر میں دونوں کی جذباتیت اپنے نہایت پر پہونچ جاتی ہے۔"

لالچ :- "جلال الدین فیروز خلجی شاہنشاہ دہلی اور اس کے برادر زادے اور جوشیلے علاء الدین خلجی کی زندگیوں کا ایک المناک حادثہ جو علاء الدین خلجی کے کردار پر ایک ایسا بدنما داغ اور دھبہ ہے جو سیاہی تاویلوں سے دھویا نہیں جا سکتا۔ محمود اور اختیار الدین کی غداری اور نمک حرامی کی ایک کہانی اور تاریخی حیثیت۔"

صدقہ :- "مغل تاجدار بابر شاہ جیسا فرض شناس اور انصاف پسند باپ اگر ایک وقت اپنے چہیتے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کی ایک غلطی بلکہ سنگدلی پر اُسے نظر بند کر سکتا ہے اور غیور فرزند اس سے شرمسار ہو کر سخت علیل ہو جاتا ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی محبت اور شفقت کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ باپ کی محبت جوش میں آتی ہے تو اس وقت وہ کیا کرتا ہے؟ اس کا جواب علی عباس حسینی نے تاریخی بنیادوں پر اس ڈرامے میں دیا ہے۔ گویا یہ تزکِ بابری کا آخری باب ہے۔

ہرلمک ملک مالامت سہسرام کا جاگیردار حسن خاں ایک کنیز پر فریفتہ ہے

---

[1] آج کل - دہلی - اگست ۱۹۴۴ء

جن کے دو لڑکے ہیں اور وہ چاہتی ہے کہ کسی طرح اپنے سوتیلے بیٹے فرید (نثار) سوری کی جانب سے اسکے باپ کو بدظن کرکے اُسے نکلوا دے اور جاگیر اسکے لڑکوں کے تصرف میں آجائے۔ یہ ڈراما دیوانگی محبت اور ترپ جرم کا ترجمان ہے۔"

چاند بی بی :۔ سلطانہ چاند بی بی کی مردانگی، دلیری، حب الوطنی، قومی حمیت، شیر علی دکنی سردار کی وفاداری، جتیہ خاں حبشی خواجہ سرا وزیر کی غداری اور نمک حرامی کی ایک بولتی تصویر ہے۔

دل بہلاوا :۔ مزاحیہ انداز میں ہمارے سماج خصوصیت سے طبقہ نسواں کی کاہلی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ نہ خود اپنے وقت کی قدر و قیمت سمجھتی ہیں اور نہ دوسروں کے وقت کی۔ متوسط طبقے کے ایک خاندان کی ایک خاتون سلمیٰ پھیری والے بزاز کو بلواتی ہیں۔ رحیمن بوا سے کپڑے منگواتی ہیں۔ کواڑوں کی دراز سے خود دیکھ دیکھ کر فرمائش کرتی جاتی ہیں کہ وہ تھان لا یہ تھان رکھ دو۔ وہ کپڑا اٹھاؤ یہ لے جاؤ۔ رحیمن بوا تھانوں کے تھان اٹھا لاتی ہیں۔ خاتون کپڑے دیکھ دیکھ کر رحیمن بوا سے اس طرح باتیں کر رہی ہیں گویا مشورہ کر رہی ہوں اچھا اس کپڑے میں گوٹ کیسی لگنی چاہیئے۔ اس کپڑے کی آڑی کلیاں زیب دینگی یا کھڑی۔ بزاز آواز پر آواز دے رہا ہے۔ اب قیمت پوچھی جاتی ہے جتنی وہ بتاتا ہے اسکی آدھی تہائی سلمیٰ بی بی لگاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سودا نہیں پٹتا اور سب تھان واپس چلے جاتے ہیں۔ رحیمن بوا بگڑ جاتی ہیں کہ لینا ایک نہ دینا دو۔ بیکار بٹھائے رکھا۔ بزاز ذرا ظریف الطبع ہے کہتا ہے۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ ذرا دیر کا دل بہلاوا تو ہو گیا۔"

سوانگ :۔ غالباً اس وقت (۲۸-۱۹۳۴ء) کی یادگار ہے جب مہاتما گاندھی نے اچھوت ادھار کا بڑے زوروں میں پرچار کیا تھا۔ انہیں ہریجن کا نام دیا اور انکی یہ آواز اسکولوں تک پہونچی۔ اسکاؤٹوں کے کیمپ فائروں اور اسکولوں کی دوسری تقریبوں پر اس قسم کے ڈرامے کبھی اسٹیج پر اور کبھی کھلے میدان میں دکھائے جانے لگے۔ یہ ڈراما بھی مزاحیہ ہے۔"

کیڑا :۔ "لڑکیوں کے لئے بر تلاش کرنا ایک اہم مسئلہ ہے اور یہی مسئلہ حمید خاں اور انکی بہن رابعہ کے سامنے تھا۔ بڑی بوڑھیوں کے اس بارے میں کیا خیالات ہوا کرتے تھے اور پہلے کفو اور برادری میں شادی کرنا ہی بہتر سمجھا جاتا تھا چاہے لڑکے میں کوئی عیب ہی کیوں نہ ہو۔ بانجھ عورت کو سماج میں جو حیثیت دی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ لوگ گفتگو میں سانس سند اسے برج باسن ایک کیڑے سے تشبیہ دیتی ہیں۔ وہ خود اپنے کو گندی نالی کا کیڑا سمجھتی ہیں۔ حمید خاں کی لڑکی عائشہ کی شادی ایک ایسے نوجوان سے ہو جاتی ہے جسکے بارے میں ڈاکٹر بتا چکے ہیں کہ اسکے اولاد نہ ہوگی۔ مگر رابعہ بی بی کفو اور رکھا رکھاؤ گھرانا دیکھ کر کچھ نہیں بولتیں اور رضامندی دے دیتی ہیں۔"

ان ڈراموں کے خاکوں کو سامنے رکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ڈراما نگار نے تاریخ کو صرف جنگوں اور واقعات کے سنوں کی ایک فہرست نہیں سمجھا بلکہ کچھ ایسے کردار تلاش کر لئے جن کی زندگیوں سے یہ سبق آموز حادثات جو آنے والی نسلوں کے لئے رہنما ثابت ہو سکیں۔ حب الوطنی، دیش بھگتی، نیک اطواری، خلوص اور دیانت داری وغیرہ کے جذبات انکے دلوں میں ابھر سکیں۔ غداری، احسان فراموشی، نمک حرامی اور کج روی وغیرہ سے تنفر پیدا کر سکیں۔۔۔ ایسا کرنے میں علی عباس حسینی نے حسب عادت انسان کی دکھتی رگوں کو ٹٹولا ہے۔ خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم۔ راجا ہو یا پرجا۔ مالک ہو یا مملوک جیسا کچھ انہوں نے اپنی کہانیوں میں کیا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ سخت دل دردمند بن جائیں اور دردمند دلوں میں کسک سے زیادہ ایک ایسی تڑپ اور اضطراب پیدا ہو جائے کہ وہ دوسروں کے درد میں بھی ایک کسک اور ٹیس محسوس کرنے لگیں۔ آپ میراث ڈرامے کے سامنے انکی کہانی بہو کی بیٹی اور وراثت رکھئے۔ راجکماری یشودھرا، بہو اور نسرین کے جذبات کی یکسانی کے علاوہ اس دردمندی اور ہمدردی کا اندازہ کیجئے جو کہانی کار کو بہو اور نسرین کے ساتھ رہی ہے۔

جذباتی اور صدقہ میں باپ کی ممتا کی تڑپ۔ چاند بی بی میں حب الوطنی اور قومی حمیت کی درد بھری امنگ۔ آپس کی پھوٹ، جتیہ خاں کی غداری، نمک حرامی، خود غرضی کے بدنما داغ نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ عام کہانیوں کے مانند علی عباس حسینی کے دردمند دل نے ان تاریخی شخصیتوں کی دکھتی رگیں ہی ٹٹولی ہیں اور ایسے حالات منتخب کئے ہیں جو سبق آموز اور عبرت انگیز دونوں ہی ہیں۔

معاشرتی ڈراموں میں سوانگ اور دل بہلاوا اگرچہ مزاحیہ رنگ میں ڈوبے ہیں پھر بھی ڈرامائی اثر پیدا کرنے کے لئے انہیں اپنے مخصوص پیرایۂ بیان کا سہارا لینا پڑا۔ جو قریب قریب حزنیہ ہے۔ کیڑا بظاہر حزنیہ نہیں معلوم ہوتا مگر حقیقتاً وہ بھی عائشہ کے درد بھرے جذبات کا ترجمان ہے۔

ان تینوں ڈراموں کو پیش نظر رکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ علی عباس حسینی

متوسط طبقے کے خاندانوں اور سوسائٹی کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور انکی زندگیوں کے ہر پہلو سے واقفیت حاصل کی ہے۔ رابعہ بی بی کو جب دیکھیے ڈلی کترتی رہتی ہیں۔ پاندان سامنے رکھا ہے۔ عائشہ اور سلیمہ کی بیاہ سے وابستہ چہلیں اور گیت۔ سلمی خاتون کا گوا ڑ کی درازوں سے جھانک جھانک کر کپڑے منگوانا۔ للان کی اچھوتوں سے بیزاری اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ڈرامانگار نے عورتوں کی مخصوص ذہنیتوں، انکی کمزوریوں، انکی وہمی اور شکی اعتقاد، بات کا بتنگڑ بنا دینا وغیرہ جیسی عادتوں کو بغور دیکھا ہے۔ اسکے بعد ڈراموں میں انکی حرکات سے ڈرامائی اثر پیدا کیا ہے۔

ڈراموں اور خصوصیت سے یک بابی ڈراموں میں کرداروں کی حرکات سکنات اور روشنی ایکٹنگ سے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اسکے برابر عمل اسٹیج اور اسکی سیٹنگ پیدا کرتی ہے اور تماشائیوں کے سامنے وہ پیش منظر آ جاتا ہے جو صرف لفظوں سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسٹیج سیٹنگ غیر ضروری جزئیات کو نمایاں ہونے کے لیے مرئی بنا دیتی ہے اسلیئے ڈرامانگار کو منظر پیش کرنے میں بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اور یک بابی ڈراموں میں وہ کئی کئی سین پیش کرنے سے احتیاط کرتا ہے کئی کئی منظروں میں ڈراما پیش کرنا جائز تو سمجھا جاتا ہے لیکن یک بابی ڈرامے وہی زیادہ کامیاب سمجھے جاتے ہیں جو صرف ایک منظر پر پیش کیے جائیں اسلیئے کہ ان میں اتحاد اثر قائم رہتا ہے بلکہ دیرپا ثابت ہوتا ہے۔ انگریزی میں دکنسر بیگو کا ترجمہ بشپس کینڈل اسٹک، ایچ ایچ منرو ساقی کا ڈیتھ ٹریپ، بنگلا کا دو ہولکھا ماما ہندی میں سب سے بڑا آدمی، ملیالم میں کملاکوتی بیٹے کامیاب یک بابی ڈرامے سمجھے جاتے ہیں۔ صرف اسلیئے کہ وہ ایک منظر پر ختم ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی منظر کے لیے بار بار پردہ اٹھانا اور گرانا نہیں پڑتا۔ ایسی صورت میں ڈرامانگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسٹیج ٹیکنک سے واقفیت رکھتا ہو۔ علی عباس حسینی روایاتی ٹیکنک سے واقف ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک خیال کو کئی کئی منظروں میں پیش کرنا اور پھر ہر منظر میں مختلف ساز و سامان کی فراہمی اس بات کو ظاہر کرتی ہے۔ انھیں عملی طور پر ڈرامے اسٹیج کرنے کا موقع نہیں ملا اسلیئے ان کے کئی اچھے اچھے ڈرامے مثلاً جذباتی۔ چاندنی بی وغیرہ اسٹیج پر پیش کرنا دوبھر ہے۔ خصوصاً شوقیہ ڈراما اسٹیج کرنے والوں کے لیے اور ایسے وقت میں جب اسٹیج پر صرف ایک پردے سے کام لیے جانے کا رواج رہ گیا ہو۔ کیرا کی سیٹنگ ملاحظہ فرمایئے اور دشواری کا اندازہ کیجیے۔ دو سین ایک پردے پر ایک ساتھ دکھانا کس درجہ دوبھر ہے۔

"... ایک بڑا سا کمرہ ہے جس میں دو دروازے ایک ہی سمت میں۔ ایک تو باہر آنے جانے کا دروازہ ہے دوسرا کسی دوسرے کمرے کا۔ کمرے والا دروازہ بند مگر باہر آنے جانے والا دروازہ کھلا ہے۔ ان دروازوں کے مقابل جو دیوار ہے اس میں ایک کھڑکی لگی ہے۔ یہ کھڑکی جس طرف کھلتی ہے ادھر ایک بند گلی سی ہے۔ تماشا دیکھنے والوں کی طرف کمرہ کا رخ اس طرح کھلا ہے کہ اگر کوئی گلی میں کھڑا ہو تو کمرے والے تو اسے نہ دیکھیں مگر تماشا دیکھنے والے اسے دیکھ سکیں۔ اس گلیارے میں دو کھڑکیاں ہیں، ایک تو وہی جو کمرے میں جانے کی ہے دوسری بغل والے مکان میں جس میں سلیمہ رہتی ہے۔ کمرے میں تختوں کا چوکا لگا ہے۔ کئی پلنگ ہیں اور ایک چھوٹی سی چوکی پر کئی لوٹے سلیقے سے رکھے۔ تخت پر رابعہ بیٹھی ڈلی کاٹ رہی ہے۔ سلیمہ اور عائشہ گلیارے والی کھڑکی سے کان لگائے سن رہی ہیں۔"

اسی طرح جذباتی میں بھی بار بار منظروں کی تبدیلی میں جو دشواری ہو وہ بھی ظاہر ہے۔ ایسا کرنے سے اتحاد اثر تو دب ہی جاتا ہے شوقیہ ڈراما اسٹیج کرنے والے عاجز بھی رہ جاتے ہیں۔ علی عباس حسینی کے ڈرامے اسی وجہ سے صرف ادبی بن کر رہ گئے ہیں اور انھیں بغیر خاص اہتمام کے اسٹیج کرنا دوبھر ہے۔

یک بابی ڈراموں کو خاص اہمیت حاصل ہے مکالمے افراد ڈراما کے کردار پر روشنی ڈالنے میں بیحد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور افراد کی شخصیت مرتب کرنے میں بے پناہ مدد دیتے ہیں۔ علی عباس حسینی کے مکالمے اس حیثیت سے بڑے کامیاب ہیں۔ مکالمے بڑی صاف ستھری زبان کے حامل ہیں۔ ان میں برجستگی کے ساتھ ساتھ بیحد شگفتگی بھی ہے۔

بدھ: (رانی سے) نواب تک وہ نیند سے نہیں جاگی۔

راہل: نہیں پتا جی۔ وہ تو منہ اندھیرے ہی اٹھ بیٹھی تھیں۔ نہائیں دھوئیں، مجھے اٹھایا نہلایا، کپڑے بدلے۔ آپ کی بالاجی۔

آنند: گرو مہاراج اتنا سا بچہ کیسے اتنا بھاری بوجھ سنبھال سکے گا۔

بدھ: تم ہمیشہ بھول جاتے ہو کہ ہم نے جس طریقے کو ڈھونڈھ نکالا ہے وہ بوجھ نہیں بلکہ بوجھ کو ہلکا کرنے کا ذریعہ ہے (میراث)

سلیمہ: اس عورت سے زیادہ بدقسمت کوئی نہیں جو بن بیاہی رہے۔ اور اس سے زیادہ بدنصیب کوئی نہیں جسکے کوئی بچہ نہ ہو۔ اللہ نے ہمیں اپنی برابری کا ایک موقع دیا یعنی ایک انسان پیدا کرنا۔ اگر وہ نہ ہو تو ہم

مٹی کا ڈھیر ہیں، گندی نالی کا کیڑا۔

رابعہ:- کچھ دیوانی ہوئی ہے ایکی کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ شریف گھرانوں میں لڑکیوں سے پوچھا گیا ہو۔ واہ وا! کیا خوب! عائشہ سے پوچھو جیسے ہم بھی فرنگنیں ہیں کہ نہ ذات کا پتہ نہ کھانے کا ٹھکانا۔ آنکھیں لڑاتی اپنے لیے بر ڈھونڈھتی پھریں۔ (کیبرا)

چاندبی بی ڈرامے میں خواجہ سرا جشتی جتیہ خاں وزیر حکومت کے بدن میں تو گویا بروٹس کی روح حلول کر گئی ہو۔ قیصر کے خلاف بروٹس نے جس لب لہجہ میں عوام کو ابھارا تھا بالکل اسی طرح جتیہ خاں چاندبی بی کے خلاف عوام میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔ اسکی تقریر بڑی صاف، شستہ اور شگفتہ زبان میں ہے۔ طوالت کے خیال سے ہم نمونہ نہیں پیش کرتے۔ ایسے پیارے اور شگفتہ مکالموں کے درمیان کہیں کہیں ایسے جملے کم سنوں کی طرح کھٹکتے بھی ہیں جس کی ذمہ داری اور جواب دہی آپ کاتب کی گردن پہ آسانی سے رکھ سکتے ہیں۔ اچھوت ادار (اچھوت ادھار) نام بھی رکھنے نہیں آتا۔ دربار برخواست (دربار برخاست)، صفحہ ۲۸ معجول کی اچاریاں (معجون کے مرتبان یا بو آم) ذات اقدس کے سلب میں پیدا کیا (...... صلب سے پیدا کیا)۔ قرآن شریف میں ...... من بین الصلب والترائب۔

انہیں مکالموں کے ذریعے علی عباس حسینی نے معاشرتی تصویریں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہیں۔ عورتوں کی ذہنیتوں کے بارے میں کچھ مکالمے پیش کیے جا چکے ہیں جن سے آپ عورت کی شخصیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمارے سماج میں بچے کی ولادت پر رنگیں دستور کی ایک تصویر دیکھیے۔

ماتھے کا ٹیکا دونگی دائی جو نند لے لے نند ہرجائی

دولہا بیا جنے آئے ہے سو

ہاتھوں گلاب چھڑی لے کے بنا مرا بیا جنے آیا رے

چھوٹے بابو گھوم پھر واپس آئے ہیں۔ رام دین کیا کر رہا ہے۔ گنگا قسم سچ کہتا ہوں۔ چھوٹے بابو نے ہیٹ ٹوپ اور انکی چھڑی رکھی پھر جوتے کھینچتے کھینچتے برجس کھینچ کھینچ کر اتاری۔

مجید خاں سمدھی کے روپ میں آتے ہیں رابعہ بی بی شربت بھیجتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: "تو نانی کا حق کون لے گا بھائی مجید"

علی عباس حسینی نے معاشرت کی جزئی جزئی باتوں کو بڑی خوبصورتی اور دلفریب

اعلان
گلستان ہزار رنگ

{مجموعۂ اشعار بقید عنوان}

کی

دوسری اشاعت کی تیاری کی جا رہی ہے شعرائے کرام سے التماس ہے کہ از راہ کرم اپنے کلام کا انتخاب مع اپنی مختصر سوانح کے مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں تاکہ منتخب اشعار شریک مجموعہ کیے جائیں۔

پتہ: سید بہاء الدین احمد ڈسٹرکٹ جج مظفرپور (بہار)

ماء اللحم خاص

طاقت کا خزانہ

ڈاکٹر احراز نقوی

علی عبّاس حسینی کا فن

فن۔۔ اور فنکار۔ ان دونوں لفظوں کو ہم نے بہت ہی بڑی فراخ دلی سے اب کچھ کام لینا شروع کر دیا ہے۔ الفاظ کے تصرفات میں ہم اردو والے بہت ہی بے چوہڑ واقع ہوئے ہیں۔ غلط استعمال سے بیچارا اپنی معنویت تاثیر اور معنویت کھو بیٹھتی ہے۔ الفاظ کا بھی ایسا کچھ ہی حال ہے۔ بہت سے الفاظ کو ہم نے اسی اناڑی پن میں ضائع کر کے بے اثر اور بے غیرت بنا دیئے ہیں۔ ہم نے جس کو چاہا علامہ کہہ دیا۔ جس پر طبیعت آئی اس کے سر پر شہنشاہ تغزل کا تاج دھر دیا۔ کبھی خدائے سخن کہہ ڈالا۔ کبھی رئیس النحریر کا لقب عطا کر دیا۔ اسی طرح کچھ عرصے سے اب ہم فن اور فنکار کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں فنکار بنا دیتے ہیں۔ اب جس نے ذرا پر پرزے نکالے ماشاء اللہ وہی صاحب فن بن بیٹھا۔ اب کچھ دنوں سے بعض مجلوں میں "میں اور میرا فن" کا بازیچۂ اطفال نظر آتا ہے۔ اس عنوان سے اب تو ایرا غیرا اپنے قلم سے "یاں ہم" لکھنے لگتا ہے ورلاحول ولاقوۃ فن تو خیر کیا "پھن" کا تماشہ ضرور دکھاتا ہے۔

اور کہتے ہیں جس کو فن وہ اصل میں کوئی اور چیز ہے۔ فن کو تو بعض حکیموں نے رموز قدرت کا محرم کہا ہے یا اسرار فطرت کا شناسا گردانا ہے، بڑے بڑے نقادوں کے اقوال کو نظر انداز کیجئے تو سیدھے سیدھے یہ کہہ لیجئے کہ فن فنکار کا وہ اضطراب ہے جس کو وہ اپنی انا کی تسکین کے خاطر اور نظام حیات کو خوبصورت اور احسن بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ فن کی جلا اور ابلاغ کے لیے فنکار کو مظاہر قدرت کا وجدان اور انسانی شعور کا عرفان بھی درکار ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر وہ اپنے خون جگر سے کوئی معجزہ فن کا جلوہ دکھاتا ہے اور وہی ہوتا ہے فنکار جو تہہ در تہہ انسان اور اس سے متعلق تمام فطرت کے پہلوؤں کو تسخیر کر کے ابلاغ کے مانوس راستوں سے عام کر دے۔ فنکار تو وہ ہوتا ہے جو فطرت کو ایک طرح سے متکلم بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف انسانی عقل و خرد، جذبات اور تخیل کو گوش بر آواز کرتا ہے۔ وہ زندگی کو خوبصورت اور خوب سے خوب تر بنانے کے لیے زندگی کے جملہ محرکات اور عوامل اپنی مضبوط گرفت میں لیتا ہے۔ اپنی ذات خاص کو یا یہ نہیں تو اپنے علاوہ زندگی کو ایک تمثیل اور علامت کے طور تخلیق اور تخلیق میں زندگی کی تمام اقدار کو اس طرح مرتکز کر دیتا ہے کہ ہمیں جز میں کل اور کل میں جز کا معجزہ نظر آتا ہے۔ اسی لیے ہر فنکار، شاعر یا مصنف تو ہوتا ہے مگر ہر شاعر یا مصنف فنکار نہیں ہوتا ہے۔ فن تو میر، غالب، انیس اور اقبال کا ہوتا ہے۔ ہم فنکار پریم چند، کرشن چندر، منٹو، عصمت اور ایک حد تک علی عباس حسینی کو کہیں گے۔ ہر یدا اور بکا اگر افسانہ لکھتا ہے تو یہ کیا ضروری ہے کہ وہ فنکار ہو۔ پھر چہ معنی دارد اس کا فن۔

ہاں یہ سچ ہے کہ علی عباس حسینی بڑے فنکار نہیں ہیں اور نہ انہوں نے کوئی عظیم کہانیاں لکھی ہیں۔ مگر انہیں ایک حد تک فنکار ماننے میں ہم پس و پیش نہیں کر سکتے۔ اس بحث اور تحقیق کو طول دینا اس وقت فرض ہو سکتا تھا جب ان پر بحیثیت فنکار کوئی مقالہ قلمبند کرنا ہوتا۔ مجھے تو ان کے فن کے کچھ پہلوؤں کو پیش کرنا ہے مگر فنکار کی بحث سے یہاں ایک دم اغماض برتنا اب درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اجمالاً اس حقیقت کا موقف یہ ہے کہ علی عباس حسینی بلاشبہ بڑے فنکار ہرگز نہیں، اس سے ہمیں انکار نہیں ہے مگر یہ مسلم ہے کہ انہوں نے زندگی کو ایک صحت مند نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ فن کے سلسلے میں ان کا اپنا ایک آدرش بھی ہے۔ تخلیقی عمل میں انہوں نے عصری تقاضوں کے ساتھ فکری وسعتوں کو بھی چھونے کی کوشش کی ہے۔ اور سماجی اقدار سے اخلاقی ضابطوں کے نسیجے انسانی زندگی کو سمجھا اور سنوارا ہے۔ ان کا نقطہ نظر کیا ہے؛ ان کے فنی ضوابط کیا حقیقت رکھتے ہیں؟

اسکا ذکر آ چکا ہوگا۔ یہاں یہ بحث نہیں خواہ وہ کچھ ہے مگر اس سے انکار نہیں
انکے فن کے خد و خال تو انکے یہاں ملتے ہیں جو انکی انفرادیت کے مظہر ہیں۔
علی عباس حسینی کو افسانے کا معمار ہیں یا نہیں یہ بات کسی طور پر یہ ایک ہو جاتی ہے
بہر حال انکا اپنا ایک ہنر ہے جو انہیں فنکار کہلانے کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

اب انکے فن پر گفتگو کا آغاز کرنے کے پہلے افسانہ نگاروں کے ساتھ
ان کا تعین اور انکی کہانیوں کے حدود کے ساتھ انکی ذہنی تربیت اور نشو و نما
کی نشان دہی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے تو پھر اسکا اجمال یوں کھلتا ہے۔

علی عباس حسینی پیدا ہوئے فروری ۱۸۹۷ میں۔ سب سے
پہلی کہانی انہوں نے "پژمردہ کلیاں" ۱۸-۱۷ میں لکھی مگر انکا سب سے پہلا مطبوعہ
افسانہ ۱۹۲۳ میں جبلہ پر کامل کے عنوان سے زمانہ (کانپور) میں طبع ہوا
جو بعد میں "رفیق تنہائی" نامی مجموعے میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۳۱ میں انکا سب سے پہلا
مجموعہ "رفیق تنہائی" شائع ہوا مگر اس سے پہلا ۱۹۱۹ میں ان کا ایک ناول
"سید احمد یا قسمت" کے نام سے بازار میں آ گیا تھا یا چھپ چکا تھا۔

۲۰ برس کی عمر میں افسانہ لکھنے کی ابتدا۔

۲۲ برس کی عمر میں پہلے ناول کا سلسلہ اور

۳۵ برس میں ایک افسانوں کا باقاعدہ مجموعہ اور اسکے علاوہ بے شمار
افسانے اور کئی ادبی مضامین لکھ ڈالے۔

اب ذرا انکے عہد پر توجہ فرمایئے:۔

۲۰ویں صدی کے آغاز سے انکی فکری اور فنی نظر میں کچھ سر جھونچ
پیدا ہوئی۔ ۲۰ویں صدی کے آغاز کا نام آتے ہی فوراً اسکا سیاسی اور سماجی
پس منظر ایک نظر میں گھوم جاتا ہے کیسے خون خرابے کی یہ ابتدا تھی سامراجی استعماریت
ختم کرنے کے لئے سیاسی اور سماجی دائروں میں نئے شعور اور رجحانات کے
در پیدا ہو رہے تھے۔ اقتصادی بحران نے بھی افکار کے تناؤ اور تصادم کی
مختلف انداز کی صورتیں پیدا کر دی تھیں۔ یہ صورتیں نئے رجحانات اور تحریکوں
کی شکلوں میں تبدیل ہو رہی تھیں کچھ کر گزرنے اور مٹنے کا آدرش تھا جو
سیال آتش کی طرح لحم و لہو میں گھل گیا تھا۔ قحط، بھوک مری، بے روزگاری
اور معاشی بحران کے پس منظر میں جنگ آزادی کے لئے ہندوستان آمادہ پیکار تھے

مزدور، کسان، کلرک، اور طلبا ہڑتال اور ستیہ گرہ میں مشغول تھے اور مظلوم
دیش واسیوں سے جیلیں بھری تھیں اور کوچہ و بازار شہیدوں کے خون سے
گلنار ہو رہے تھے۔

بس اسی دور میں علی عباس حسینی نے آنکھیں کھولیں۔ اور جب قلم ہاتھ میں
پکڑا تو کہانی لکھنا ہنر ٹھہرا۔ کہانی ان دنوں باقاعدہ صورت میں نئی نئی
چلی تھی۔ اخبارات اور رسائل میں خوب مقبول ہو رہی تھی۔ سنئے تر جمول اور
کئی اور قلمکاروں کی غیر معمولی دلچسپیوں سے یہ فن خوب قبول عام ہو گیا تھا
جو سچ پوچھئے تو کہانی لکھنے کا باقاعدہ سرکھا مغربی خطوط پر پریم چند
اور سجاد حیدر یلدرم اور اسکے ذرا کچھ آگے پیچھے سلطان حیدر جوش کے
افسانوں سے ترشح پا چکا تھا۔ افسانے کی دریافت نے واقعی ہماری
مجلاتی صحافت میں جدت اور تنوع پیدا کر دیا۔ ورنہ اس سے پہلے انیسویں
صدی کی مجلاتی صحافت علمی اور معلوماتی مضامین تک محدود تھی یا
پھر بالاقساط ناول نویسی کا چلن عام ہو چکا تھا۔ مختصر افسانے کے
وجود نے بالاقساط ناول نگاری کی طباعت کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا۔
حکایت، قصہ، روایت اور واقعہ نگاری کی منتق اور مزاولت ۱۹ویں صدی
میں کچھ غیر واضح اور بہت واضح ناول کے رنگ میں ملتی ہے۔ مگر مختصر افسانے کے
اجمال نے اس مزاج کو افسانے میں پیوست کر دیا۔

انگریزی زبان ہندوستان کے بورژوا طبقے کے کلب اور کوٹھی سے
نکل کر کالج اور کچہری میں پہونچ چکی تھی۔ دفتر کی مسلوں اور نصاب کے
دائروں سے نکل کر انگریزی زبان کا شعور ڈکنس، ٹھیکرے، والٹر اسکاٹ
سر وینٹس، شکسپیر اور انگریزی، امریکی اور فرانسیسی افسانوں تک
پہونچ چکا تھا۔ یہ تصور پریم چند اور یلدرم کے یہاں طبع زاد افسانوں کی
طرف مائل اور دیگر قلمکاروں کے یہاں ترجمے تک محدود رہا۔ پریم چند
اردو کے گرلن پوتھے جنہوں نے مطالعے اور ذہانت سے افسانے کے
سانچے اور تکنک کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ مواد اور مسائل انہوں نے اپنی زندگی سے
اخذ کر لیے۔ انکی زندگی کیا تھی؟ وہ تو بکھرے خود ہی ایک غریب گھرانے
سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ۲۰ویں صدی کی ابتدائی سیاست متوسط طبقے
سے نکل کر مزدور اور کسان کو اپنا موضوع بنا چکی تھی۔ پریم چند نے بغیر
چولا بدلے اپنی عصری سیاست کی حوصلہ افزائی سے عرصہ تک داری۔

* تقریباً ۶ برس بعد پژمردہ کلیاں بھی طبع ہوا جو کسی مجموعہ میں شامل نہ ہو سکا۔

نکل کر روحانی بھول بھلیوں میں ڈال دیا ہے۔ مگر اس سے قطع نظر اسی تصور نے اردو افسانے کو مشیخو بیچارہ فربادہ علی بخش کریم اور ناصر ماموں جیسے لازوال کردار دیے۔ دو افسانے کو عطا کیے ہیں۔ چنانچہ پتہ چلتا ہے کہ اس رومانی رجحان نے انہیں بجید محدود کر دیا۔ بلکہ ہیئت اور تکنیک میں بھی [illegible] پیدا کر دیا۔ ان معائب سے اگر ہم اغماض برتیں تو بلاشبہہ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اسی نے انہیں نئے راستے دیے اور فن کے نئے حلقے بھی دیے ہیں۔

رومانی بغاوت اور مزاج کے افسانے باقاعدہ حسینی کے یہاں [illegible] کی صورت میں ملتے ہیں انکے فن کا یہ میلان بھی اس فنی دور کے تابع ہے [illegible] سطور بالا میں پہلے ہی اسکا ذکر [illegible] کے حوالے سے کر چکا ہوں۔ ہمارے اہم نقادوں کا یہ خیال ہے کہ رومانوی رجحان افسانے کا [illegible] پروان چڑھا مگر میرے خیال سے جیسا اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ بات کامل طور پر درست نہیں ہے خود پریم چند کے افسانوں میں رومانوی عناصر ملتے ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ انکے [illegible] شعور پر حقیقت پسندی کا جذبہ غالب ہوتا چلا گیا۔ اور ہم نے انکے اس رجحان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا افسانہ کے ابتدائی دور [illegible] رومانوی تصور سے بھی عبارت ہے۔ حسینی بھی اپنے فن میں اس تحریک سے متاثر ہوئے ہیں اور بعض کہانیاں انکے مجموعوں میں خالص اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہیں مگر جیسے میں ایک جگہ لکھ چکا ہوں کہ اس تحریک کو محض تقلید کے طور پر انہوں نے نہیں اپنایا بلکہ اس میں تجدید کے بجائے تجدد کا [illegible] پیدا کر کے [illegible] یہ تصور انکا "بچے کی ہنسی" (رفیق تنہائی) سے لے کر "جل پری" (بارہ کہانیوں) تک ایک فنی قوس بناتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اسی جذبے نے انکے یہاں روحانیت کا وجدان بخشا ہے۔ اور انکو نقطۂ حیات کی گزرگاہوں تک لے گیا ہے۔ مگر بعض افسانے رومانوی کہر میں ڈوب کر انہیں یلدرم، نیاز اور مجنوں کی فنی سرحدوں تک بھی لے گئے ہیں۔ اس قول کی واضح مثال میں "جل پری" کو پیش کر سکتے ہیں۔

علی عباس حسینی کے یہاں رومانی تصور نے روحانی آہنگ کے ساتھ دوسرا میلان جنس اور جسم کی طرف راغب ہے۔ یہ انکے فن کی ایک الگ شاہراہ ہے۔ جو اپنے مختلف فنی مدارج سے آگے بڑھی ہے۔ "رفیق تنہائی" سے لے کر "باسی پھول" تک یہ رنگ زیادہ واضح شکل میں نظر نہیں آتا۔ کہیں کردار کی رومانیت اور کہیں روحانی اثر حسی مسائل کی حقیقتوں سے عہدہ برآ نہیں ہونے دیتا مگر پھر بھی جنس کا مسئلہ [illegible] ایک موضوع کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے [illegible] آدم کا بھل [illegible] مدیا نبولین [illegible] خاص طور پر پیش کرتے ہیں مگر "باسی پھول" کے بعد [illegible] "انتقام" "ادھ" [illegible] اور حاجی بابا کے ردپ میں [illegible] شعور کی عقدہ کشائی کی [illegible] زندگی کی [illegible] مسائل کے [illegible] سے زندگی کے کبھی ظاہری اور کبھی خفیہ پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور مجموعی طور پر [illegible] زندگی کی [illegible] اقدار پر ایمان رکھتے ہیں۔

ان معائب اور محاسن کے ساتھ علی عباس حسینی کا مرتبہ اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ بعض باتوں، معذرتوں کے بعد اور بہت سی باتوں کو درگزر کرنے کے بعد علی عباس حسینی کا فن ہمارے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اور بلاشبہہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے [illegible] فن میں [illegible] فکر کی نئی روشنیں اور فن کی نئی منزلوں کا [illegible] تجربات کیے ہیں۔ اظہار اور ابلاغ کے [illegible] بہتر کیے ہیں۔ [illegible] اور بیانیہ زبان اردو کو [illegible] اور [illegible] پیش کیا ہے۔ اور انکے فن کا یہ کمال بھی کچھ کم نہیں ہے کہ انہوں نے ایک [illegible] انسانی زندگی کو حسن سے حسین تر بنا کر [illegible] اور صلح و آشتی کے جذبات سے لبریز ایک درد مند انسان اور خوشحال معاشرے کا تصور پیش کیا ہے۔ انہیں انسانوں کی نیکیوں سے محبت ہے وہ حسن و نیکی کے [illegible] فنکار ہیں۔

ہینڈلوم کے کپڑوں پر
یونین کی طرف سے خاص رعایت
بہار اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو یونین لمیٹڈ کے امپوریم سے جو پورے
ریاست میں پھیلی ہوئی ہیں ہینڈلوم کے بنے کپڑے خریدیں اور دو روپئے یا اس سے زیادہ قیمت کے
کپڑے خرید کر حکومت سے فی روپئے ۵ پیسے چھوٹ کے علاوہ ۵ پیسے یونین کی طرف سے خاص
چھوٹ سے فائدہ اٹھائیں۔ ساتھ ہی تیار شدہ کپڑوں پر یونین کے ۲۵ فیصدی اور
حکومت کے ۵ فیصدی چھوٹ سے مستفید ہوں۔ گھٹائے گئے داموں پر کپڑے خریدنے کے لئے
اکزبیشن روڈ میں ہینڈلوم ریڈکشن اسٹال میں تشریف لائیے۔
بہار اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس۔ کوآپریٹو یونین۔
گرام { ہینڈلوم پٹنہ
اکزبیشن روڈ۔ پٹنہ
فون { ۲۲۲۹۵ ۲۳۳۷۹

اسد نذیر

حسینی کے فن کے مشترک عناصر

وہب و اکتساب سے مرکب انسانی شخصیت اپنی بقا کے لئے کچھ ضابطے مرتب کرتی ہے جو اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی دلیل ہوا کرتی ہیں۔ ان ضابطوں کی تشکیل میں موروثی، معاشرتی عوامل مدد کرتے ہیں اور کچھ شخصی نفسیات۔ اسی لئے ان کی نوعیت اجتماعی ہونے کے بعد بھی بے حد انفرادی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی بنانے کے لئے کچھ ایسے راستوں کی تلاش ضروری ہے جو شخصیت کا ساتھ دے سکیں۔ اسی لئے ان راستوں کی تلاش صرف بیرونی اور عملی زندگی میں نہیں بلکہ ذہنی زندگی میں بھی ہوا کرتی ہے۔ یہاں حاشیے پر انسانی شخصیت کے مختلف انداز کے سمجھوتوں سے بحث نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے چند اجتماعی اور انفرادی اصولوں کی تشکیل کے بعد وہ اپنے گرد و پیش کے متعلقات کو جانچتا، پرکھتا اور منتخب کرتا ہے۔ یہاں اس ذیل میں یہ بات ضرور ملحوظ توجہ رکھنی چاہیے کہ عام انسان کے ہاں تو خیر کم لیکن فنکار کے ہاں اگر ایک طرف زندگی کے تجربے اور حقیقت کے مشاہدے کی صلاحیت ہے تو دوسری طرف اس کی حساس، جذباتی شخصیت بھی ہے۔ وہ اکثر اپنی تخلیقات میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہے اور غیر منطقی اصولوں کے سہارے زندگی کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ عملی زندگی کے ناساعد حالات ان اصولوں کو متزلزل کر دیں مگر اس کی ذہنی دنیا میں یہ اصول اور ضابطے بڑی مستحکم حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارے مضمون کا واسطہ اسی ذہنی زندگی سے ہے۔ جو فنکار کی اپنی قلمرو ہے۔ اس کے ذریعے تخلیق کردہ زندگی میں ہمیں تمام دھوپ، خواب، تشنہ حسرتیں اور زندگی کو برتنے کے لئے چند مخصوص اصول تحریر کے پس پردہ نظر آنے لگتے ہیں۔ فن پارہ جو فنکار کی تخلیقی کاوش ہے ہمیں اپنے خالق کی مشترک فکری و فنی خصوصیات کا سراغ دیتی ہے۔ فن کار زندگی کے مشاہدے اور اپنی فطری نفسیات سے کردار و واقعات پھر ان کے معائب و محاسن کے ترک و انتخاب میں ایک خاص انداز برتتا ہے۔ زندگی سے یہ مخصوص اخذ و جذب دھیرے دھیرے اس کا ایسا فنی اثاثہ بن جاتا ہے جو اس کے اکثر فن پاروں میں مشترک ہے۔ اس کے یہ مشترک ذہنی و فنی عناصر فن میں کبھی براہ راست آتے ہیں اور کبھی بالواسطہ۔

فن کے دوسرے شعبوں میں تو کم لیکن صرف افسانہ و ناول نگاری میں ان کی مشترک عناصر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ فن کے سفر اور منزل کی طرف ان عناصر تغیر وجود فنی محاسن و کیفیات کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ یہاں دوسروں کی نسبت ہمیں کسی پیچیدہ تحلیل نفسی اور تجزیے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کا وجود تو زندہ حقائق کی طرح ہوتا ہے علی عباس حسینی ہوں یا اور کوئی افسانہ نگار اگر وہ فنکار ہے اور اس نے زندگی اور گرد و پیش کی دنیا سے خلوص و محبت برتا ہے۔ اس کے اسرار کو جاننے کی کوشش کی ہے تو وہ یقینی طور پر محبت و نفرت کے کچھ ذاتی اور طے شدہ اصولوں کی روشنی میں تخلیقی زندگی کو فن کے قالب میں

تخلیق فن اور تعمیر فن میں یہی نقطۂ نظر اساس بنا۔ انھوں نے ان کرداروں میں نیکی کی تلاش کی جنھیں معاشرے نے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ ان مقامات سے تلاشی خیر لیتے ہیں جو منبع شر تھے۔ ساری زندگی لوگوں اور ماحول سے محبت اور انسیت ان کا شیوہ ٹھہرا۔ ان کے افسانوں میں واقعاتی برائیاں، کرداروں کی خامیاں اور کمزوریاں علی عباس جیسے مخلص فنکار کی کوششوں سے رو بہ اصلاح ہوئیں۔ اسی لئے انھوں نے فن کے راستے جس زندگی کو پیش کیا وہ رجائیت کی طرف مائل ہے۔ انھوں نے طوائف، چور، ڈاکو، نواب اور جاگیردار جیسے کرداروں میں نیکی اور سچائی اجاگر کرنے کی کوشش کی معاشرے میں ان کا کوئی مقام اور اخلاقی حیثیت نہ تھی مگر یہ حسینی کا انداز فکر تھا جس نے ان کرداروں کو عزت اور شرافت بخشی۔

اس سلسلے میں مجھے "نوزونار" کا وہ داروغہ یاد آ رہا ہے جس کی نیکی اور انسانیت سے صرف حسینی ہی واقف تھے۔ یہ تو خیر ایک مثال تھی۔ ان کے بیسیوں افسانے ایسے ملیں گے جن میں ایسا ہر بُرے کردار حسینی صاحب کے زور قلم سے اچھے اور قابل صحبت بن جاتے ہیں۔ انسانوں اور واقعات کے سلسلے میں ان کا فلسفۂ خیر کس حد تک قائم رہتا ہے اور اس کو قائم رکھنے کے لئے ان کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں اور پھر کن کن مقامات پر ان کا یہ مخصوص طرز فکر شکست کھاتا ہے۔ ان سب باتوں کا جائزہ اور تجزیہ یہاں ممکن نہیں۔ اس لئے کہ یہ ہمارا موضوع نہیں ہاں تو کرداروں کے سلسلے میں حسینی کا یہ رویہ بڑا بندھا ٹکا اور جچا تُلا ہے اس کے ساتھ ساتھ کرداروں کے انتخاب، پھر افسانے ان کی ابتدا، ارتقا اور انتہا کے سلسلے میں بھی کئی مشترک نشان ملتے ہیں۔ کرداروں کے سلسلے میں، چند فنی خواص، ان کے مخصوص نقطۂ نظر کی دین ہیں، قصہ اور انداز فکر کی پابندی انھیں اس قسم کے کردار گڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کرداروں کے سلسلے میں ان کے سامنے چند سانچے ہیں جن میں ڈھل کر کردار نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے افسانوں میں جن میں معاملہ حسن و عشق مذکور ہے۔ چند خاص خصوصیات سے مرقع ہیرو ہیروئن ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی خوبصورتی، شرافت، نجابت اور کردار کی کاملیت تمام افسانوں میں مماثل اور مشترک نظر آئے گی۔ ناموں کے جزوی فرق کے علاوہ ان کے داخلی و خارجی خواص حسنہ میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ وہ لوگ بے حد حسین ہوں گے۔ شرافت اور اخلاق کے معیار وہی ہوں گے جو علی عباس حسینی کے متعین کردہ ہیں۔ ان کی شخصیت ہمارے سامنے ایک فنکار کا آئیڈیل بن کے ابھرے گی۔

قصہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ایسے موقعوں پر حقیقت کا احساس تحت الشعوری ہو جاتا ہے۔ شعور پر رومان پرستی اور خواب پسندی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ ہیرو کی مردانہ وجاہت سید احمد پاشا سے لے کر جلی پری کے مرکزی کردار تک یکساں ملے گی۔ اسی طرح نسائی حسن و دلکشی میں خانم سے لے کر شہزادی تک سبھی یکتا اور کامل ہیں۔ "رفیق تنہائی" کی مس زینت سے ملئے، یا "باسی پھول" کی ہیروئن صابرہ سے، اخلاقی اقدار کی پختگی، حسن کی جلوہ ریزی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

جیسا کہ اوپر کہیں عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کے کرداروں کے کچھ سانچے ہیں جن میں ڈھل کر کردار تشکیل پاتے ہیں۔ مثلاً شہری زندگی سے متعلق اکثر افسانوں میں کردار کچھ اصول اور ٹھوس اقدار کے علم بردار ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار وہ کردار انھیں کی شکست و ریخت سے تکمیل پاتے ہیں۔ یہاں ایک بات ضمناً یہ عرض کرتا چلوں کہ حسینی صاحب کو اقدار اور بے لچک اصولوں سے محبت نہیں وہ انھیں اچھا نہیں جانتے۔ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسے شکست دیں۔ انسان کو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بلند تو دیکھنا چاہتے ہیں، مگر اصول و اقدار میں جکڑا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

"کچھ ہنسی نہیں ہے" کے موسوی صاحب عورتوں سے نفرت کرتے ہیں مگر حسینی صاحب انھیں عورت سے عشق کرا کے ہی چھوڑتے ہیں۔ "جھوٹ" کے ڈاکٹر محمود کو جھوٹ اور بھوت پریت سے سخت چڑ ہے۔ "جذب کامل" میں کملا اگر مرد و عورت کی محبت کو فریب اور سراب جانتی ہے تو "عورت والے" میاں منصور عورت کے حسن ہی سے منکر۔ اسی طرح "نبرد عشق" میں مس بہار اور پروفیسر رعنا عورت اور مرد کی محبت کو خاطر میں نہیں لاتے، افسانہ "بیوی" میں ڈاکٹر منور عورتوں سے متنفر ہیں مگر سب کے اصول ٹوٹتے ہیں۔

گاؤں سے متعلق اکثر افسانوں میں ایک آدھ مقدمہ باز کردار ہمارے سامنے ضرور آتا ہے ۔ ہمارے گاؤں کے ٹھاکر اجیت سنگھ اور چندو میاں، "میلہ گھومنی" کے رشید خاں، "دو شریفوں کے مقابلے" کے میر امجد علی اور اسی طرح بہت سے دوسرے (کہ یہ سب ٹائپ کردار ہیں) مقدمہ بازی ہی کو بیکاری کا مشغلہ سمجھتے ہیں ۔ ان سب کا کہانی میں عمل بھی تقریباً مشترک ہوتا ہے ۔ یعنی بدی سے نیکی کی طرف سفر ۔ اصل میں ان کی مقدمہ بازی حسینی کی نظروں میں مستحسن نہیں ۔ مقدمہ بازی انسانیت کی دشمن ہے ۔ اسی لئے انسانیت اور انسان کو حسینی کے ان افسانوں میں فتح حاصل ہوتی ہے جس عہد اور جس طبقے سے یہ کردار متعلق ہیں وہاں مقدمہ بازی بیکار اور بے مقصد لوگوں کا واحد مقصد اور مشغلہ ہوا کرتی تھی ۔ ظاہر ہے کہ حسینی جیسے باشعور فن کار کو یہ کیوں پسند آتا ۔

افسانوں میں ان کے چند من پسند کردار بھی ہیں ۔ یہ ایسے کردار ہیں جن کی زندگی سے انھیں بہت دلچسپی ہے ۔ صرف اسی زندگی سے نہیں جس سے ہم آپ متعارف ہوتے ہیں بلکہ اس کے داخلی محرکات سے بھی انھیں دلچسپی ہے ۔ ان انسانوں کو افسانے میں جذب کرنے کے بھی کچھ اصول ہیں جو مختلف کرداروں پر مختلف انداز سے ناگز ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر طوائف، ڈاکو، اور بدمعاشوں کے سلسلے میں ان کا رویہ ہمیشہ بے حد رحمدلانہ ہوتا ہے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کی خوبیوں کو اس طرح اجاگر کریں کہ اس کی خامیوں کی پردہ پوشی ہو سکے ۔ وہ معاشرتی محرکات کا تجزیہ کرنے کے بجائے اندر کے نیک انسان کو ظاہر کر دینا چاہتے ہیں ۔ ان مواقع پر وہ کچھ یہ تاثر دیتے ہیں کہ جیسے معاشرہ ان کرداروں سے غلط بنیادوں پر نفرت کر رہا ہے یہ واقعی قابل نفرت نہیں ہیں ۔ ان میں بھی انسانی خوبیاں ہیں ان کے ہاں بھی اخلاق اور انسانیت کی کچھ اقدار ہیں ۔ وہ اپنے قارئین کو ان سے محبت کرنا سکھاتے ہیں ۔ مولوی صاحبان کی ٹھوس مذہبی اور اخلاقی اقدار سے حسینی صاحب کو چڑ ہے ۔ وہ جان جان کر اپنے افسانوں میں ان کو شکست دیتے ہیں ۔ جیسے انھیں بتاتے ہیں کہ جو کچھ تم نے انسان کو پرکھنے اور دنیا کو جانچنے کے لئے وضع کر رکھے ہیں وہ بے حقیقت ہیں ۔ انسان کو سمجھنا ہے تو اس سے قریب آ کر اس سے محبت کرنا سیکھو ۔ بظاہر عاصی اور گنہ گار انسانوں سے حسینی نے اپنے افسانوں میں مولویوں سے محبت کراتی ہے ۔

زمیندار اور کسان کے بارے میں حسینی کا رویہ خاصا متوازن ہے ۔ وہ ان کے مسائل کو بے حد انفرادی سطح پر (ہمارا گاؤں مستثنیٰ ہے) پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی بعض اپنی مشترک مصلحتیں اور منفعتیں ہیں ۔ اسی لئے زمیندار اور کسان کا تصادم شاذ ہی حسینی کے افسانوں کا موضوع بن سکا ۔ کسانوں اور زمینداروں کی زندگیوں کو (الگ الگ) افسانوں میں اس طرح جذب کیا کہ ان کے بے حد داخلی مسائل ہمارے سامنے آئے ۔ آپس کے خاندانی موروثی جھگڑے، مقدمے بازیاں، گھریلو لڑائیاں اور اسی قسم کی چھوٹی موٹی خوشیوں اور دکھوں کا ذکر ہے ۔ زندگی کے اہم اور زیادہ قوی مسئلے سے اغماض صرف اس لئے کہ وہ زندگی کے تلخ حقائق کو سامنے لانا نہیں چاہتے وہ شخص جس کا نصب العین یہ ہو کہ :-

"آج کی دنیا میں نہ فرشتے ہوتے ہیں نہ مجسم شیطان ۔ پاجی سے پاجی آدمی میں شرافت کی جھلک ہوتی ہے ۔" ("باسی پھول" سے ایک اقتباس)

کس طرح ایک زمیندار اور جاگیردار کو صرف پاجی کے روپ میں پیش کر سکتا تھا ۔ یہاں پھر استثنائی مثالیں ذہن میں آنے لگتی ہیں جہاں وہ حقیقت سے بے انتہا قریب ہوئے ہیں ۔ مگر یہ افسانے جیسا کہ پہلے عرض کیا یہ بہت ہی تھوڑے ہیں

علی عباس حسینی اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی میں جس طرح داخل ہوئے وہ ان کے معاصرین اور اولین سے مختلف تھا صلح جوئی ذاتی شرافت اور زندگی کا رجائی تصور ان کے افسانوں کی مشترک فنی تحریک ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ علی عباس حسینی کا کسی مکتبۂ فکر سے تعلق نہ تھا ۔ انھوں نے بارہا یہ اعلان کیا کہ :-

"قدامت پرستی و حقیقت پسندی کے تصادم اور شور میں اکثر انسانیت کی شیریں آواز ڈوب جاتی ہے
میں اسی کے گن گانا چاہتا ہوں۔" (ہمارا گاؤں)

اور انھوں نے اس انسانیت کے گن گانے کے لئے چند اصول بنائے جن کا ضمناً ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان اصولوں کے پس پردہ معاشرتی و نفسیاتی محرکات کے علاوہ چار عناصر اور بھی کام کر رہے تھے اور ان سب کے اشتراک سے ان کے فن میں وہ توازن آیا جو ان کے ابتدائی معاصرین کی قسمت میں نہ تھا۔ انگریزی ادب، سجاد حیدر، پریم چند اور ترقی پسند تحریک۔ مگر ان میں سے وہ کسی ایک کے نہیں ہو گئے۔ اخذ و انتخاب کی یہاں بھی ٹھہری۔ پریم چند سے متاثر ضرور ہوئے مگر افسانوں میں زندگی کے ساتھ ساتھ معاملہ بازیاں بہت مختلف رہیں "کیا کیا جائے" "کہیں ایسا نہ ہو جائے" "امتحان قدرت" اور "خوش قسمت لڑکا" جیسے افسانے لکھ کر بھی انھوں نے خود کو ترقی پسندوں میں شامل نہیں کیا۔

انگریزی ادب سے بہت زیادہ قربت نے ان کے فن کو متاثر تو ضرور کیا۔ مگر اس کا اظہار براہ راست کبھی نہ کیا جا سکا۔ دیکھا جائے تو مربوط اور مسلسل انداز سے ان میں سے ایک بھی حسینی کے فن پر اثر انداز نہیں ہوا۔ مگر ان سب کے اشتراک سے کہیں کہیں براہ راست کہیں بلا واسطہ ان کا فن متاثر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان سب سے مجموعتاً متاثر ہونا حسینی کا مشترک فنی رجحان ہے۔

کرداروں اور ماحول کے بعد اگر کہیں مشترک عناصر کی تلاش کی جا سکتی ہے تو وہ افسانے کے واقعاتی عمل میں کہانیوں اور پلاٹ پر گرفت کا عموماً یہ طریقہ ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں یا واقعات کی صداقت اور نیکی کو ہر برائی پر نصرت دیتے رہتے ہیں۔ فرشتہ خصلتی، نیک طبعی اور خیر کی تلاش اور جستجو سے ان کے اکثر افسانے متاثر ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک ہی انداز کے آغاز و انجام کا فنی تصور حقیقی سے زیادہ ادرائی ہے۔ مگر پھر ان کی پیہم اور مخلصانہ کوشش اسے حقیقت سے قریب بھی لے آتی ہیں۔ طربیہ انجام کی خاطر وہ یہ کرتے ہیں کہ کہانی کے اس پہلو کو ہمیشہ کمزور رکھتے ہیں جسے انھیں شکست دیتی ہے۔ بعض اوقات جزوی غلط فہمی اور ناسمجھی سے وہ اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔

اس مطلب براری کے لئے دو چیزوں سے اپنے افسانوں میں بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کہانی کو مرضی اور منشا کے مطابق انجام تک پہنچانے کے سلسلے میں "بیماری" اور "آگ" ان کی بہت مدد کرتی ہے۔ میں اپنی تائید میں طوالت کے ڈر سے چند ہی افسانوں کی مثال پیش کروں گا۔ جن میں انھوں نے اپنی کہانیوں کی شکست و ریخت، ان کی تعمیر اور پلاننگ میں انھیں کی مدد سے کی ہے۔ مگر اس سے پہلے ان کے دو ناولوں کا بھی ذکر کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ "سید احمد پاشا" میں، ہیرو کی بیماری اس کو ہیروئن سے قریب لے آتی ہے۔ خانم کی غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر خانم بچھڑ جاتی ہے تو یہ "آگ" کا اعجاز ہے کہ وہ دونوں پھر ملتے ہیں۔ خانم کی حویلی میں آگ لگ جاتی ہے اور سید احمد پاشا آگ میں کود کر اسے بچاتے ہیں۔ دوسرے ناول "شاید کہ بہار آئی" میں کہانی جب بھی نیا موڑ لیتی ہے اس کا سبب بیماری بنتی ہے۔ اسی طرح افسانوں میں۔

"شیخو چچا" کی انسانیت کا راز ہیرو پر اس وقت کھلتا ہے جب وہ بیمار پڑتا ہے۔

"دو شریفوں کے مقابلے" میں میر صاحب پر بہاری کی شرافت کا راز صرف اپنی لڑکی کی بیماری اور موت کے بعد کھلتا ہے۔

"پیا کی جوگن" کا سارا افسانوی عمل بیماری پر محیط ہے۔

"سماج کی بھینٹ" کی ابتدا اور انتہا بیماری ہی بیماری ہے۔

"شیخ کریم کی نفرت" میں بھی بیماری ہی آڑے آتی ہے۔

"دل کی آگ" میں مولوی صاحب پر طوائف کی پرخلوص انسان دوستی کا راز بیماری کے دوران افشا ہوتا ہے۔

اسی طرح آگ لگنے کا عمل بھی بحد عام اور کہانی کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ ان کا افسانہ "رفیق تنہائی" پڑھئے تو

اس کا سارا تاثر ایک "آگ کے سانحے" میں محدود ہے۔ بہو کی ہنسی میں بھی ہیروئن کا آگ میں جلنا افسانے کا ایسا اتفاقی المیہ ہے جس پر سارے افسانے کی اساس ہے۔

"حاجی بابا" میں آگ ہی تو افسانے میں جان ڈالتی ہے۔

"دل کی آگ" میں یاد کیجئے کہ مولوی انوار الحق کو نئی زندگی بخشنے والی وہ آگ ہی تو تھی جس میں کود کر انھوں نے مشتری کی جان بچائی۔

"تو نمک" میں بھی آگ کا واقعہ پلاٹ کا اہم ترین نقطۂ گریز ہے۔

اس ذیل ایسی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مگر طوالت مانع ہے۔ یہ تمام افسانے جن کا مرکز پلاٹ "آگ" اور "بیاری" ہے۔ واقعاتی نقطۂ نظر سے بے حد اہم اور موثر ہیں۔ یہاں یہ سوال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ وہ کیا نفسیاتی وجوہ ہیں جن کی بنا پر وہ ان دو عناصر سے بے انتہا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فن کار کا اس سلسلے میں لاشعور تجزیہ ہمارے موضوع کو مطلوب نہیں۔ پھر بھی اشارتاً عرض ہے کہ تخلیقی ذہن ایک خاص سطح پر پہنچ کر روایتی اور عادت پرست ہوجاتا ہے۔ ایک ہی انداز کے مسلسل ذہنی عمل سے یقینی طور پر کچھ سانچے بن جاتے ہیں انداز تحریر بھی دہرے میں آتا ہے۔ مرغوب الفاظ کی تکرار کی بھی۔ یہی نفسیاتی وجہ ہے۔ چند خاص واقعات کی تکرار کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ افسانہ برائے افسانہ ہو جب تخلیق ٹھہرے گو حسینی کے یہاں یہ کیفیت کم ہی وقوع پذیر ہوئی ہے۔

علی عباس حسینی کے یہاں افسانوں کی باقاعدہ "پلاننگ" ہے۔ وہ فنی اصولوں کے بے حد قائل ہیں وہ کسی "موڈ" کے تحت نہیں لکھتے۔ مختصر افسانہ یونہی نہیں ختم ہوجاتا۔ تکنیکی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ربط اور تسلسل ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے ان کے تمام افسانوں کا ہیئتی مزاج یکساں ہے۔ کہانی کے لوازمات کا خاص خیال اور پھر موضوعات سے ان کی پوری ہم آہنگی ان کے اکثر افسانوں میں مشترک ہے۔

عشق و محبت اور جنسی میلانات کے سلسلے میں حسینی کا رویہ ایک مخصوص مسلک کا نمائندہ ہے۔ ان کے یہاں کے محبت کے اظہار اور جنسی محرکات کے بیان میں کچھ شریفانہ فاصلے ہیں کچھ حدود ہیں جن سے آگے نہیں بڑھتے۔ "باسی پھول" میں صابرہ اور ہیرو کے محبت کے مناظر اور منازل، "کچھ ہنسی نہیں" میں مس زینت اور دلال کی محبت، "جذب کامل" میں کملا اور ہیرو کی محبت۔ "بزدعشق" میں مس بہار اور پروفیسر رضا کا عشق۔ ناول "سید احمد پاشا" میں سید احمد پاشا اور خانم کا عشق ماورایت کے اعتبار سے یکساں اور مشترک ہے۔ جذبے کی وفاداری، خلوص اور دیانت کے سلسلے میں سبھی کرداروں کا نفسیات ایک ہے۔ ان کی محبت میں جارحانہ اور حیوانی پن قطعی نہیں ہے۔ عشق کی دھیمی دھیمی آگ میں سلگتے رہنے کے سوا ان کا اور کوئی کام نہیں۔ عشق کا یہ ماورائی انداز ایک خاص تہذیبی تربیت کا نتیجہ ہے

ان کے افسانے یا تو گاؤں سے متعلق ہیں یا شہر سے (ظاہر ہے اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے) اس سلسلے میں ان کا تمام افسانوں میں ایک مخصوص اور مشترک رویہ ہے۔ گاؤں سے متعلق جتنے بھی افسانے ہیں ان میں منظر نگاری ہے اتنا جب کہ شہر سے متعلق افسانوں میں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ بعض افسانوں میں تو کئی کئی صفحات اسی تمہید میں گذرتے ہیں۔ گاؤں کے گرد اور مٹی سے لے کر افسانوں تک کا حال بے حد جذبات نگاری سے بیان کرتے ہیں جب کہ شہری زندگی اور اس کے ماحول سے وہ ذرا بھی انس کا اظہار نہیں کرتے۔

مشاہدے کے فنی اظہار کی یہ مشترک خصوصیت آپ کو بلاتفریق ہر جگہ نظر آئے گی۔

———

میں علی عبّاس حسینی کے افسانے کیوں پڑھتا ہوں؟

ایک افسانہ خواں کے قلم سے

افسانوں کے اس گھنے جنگل میں جہاں بد مذاقی کی تاریک رات اپنی سیاہ لٹیں کھولے ہے. علی عباس حسینی کا سلیقۂ فن ایک قندیلِ رہبانی سے کم نہیں، جو ہر بھٹکنے والے ادیب کو تقریباً نصف صدی سے روشنی دکھلا دکھلا کر اپنی طرف بلا رہا ہے۔ دیکھنے والے دیکھیں یا نہ دیکھیں قصور روشنی کا نہیں، قصور ان آنکھوں کا ہے جو دن کے اُجالے میں آفتاب کے وجود سے بھی انکار کر جاتی ہیں۔ وہ آنکھیں جو رات کے اندھیرے میں ہر غول بیابانی کو چراغِ ہدایت سمجھ کر لوجتی آئی ہوں وہ اس قندیلِ رہبانی کی پکار کیا سُن سکتی تھیں۔ نتیجہ وہی ہوا اور ہو رہا ہے جس کی توضیح پرنسپل اجتبیٰ رضوی اپنے مخصوص انداز میں یوں فرماتے ہیں ؎

انسان کو دل ملا مگر کیا　　　اندھے کے ہاتھ میں دیا ہے

بلاشبہ اندھوں کی محفل میں دیا شب روز جل جل کر اپنا فرض ادا کئے جا رہا ہے۔ بجھا جا رہا ہے، اپنی روشنی کم کئے جا رہا ہے، اور زبانِ حال سے اپنا ماتم آپ کر رہا ہے ؎

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی　　　تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

مبارک باد کے مستحق ہیں صبح نو کے مدیر! علی مولانا وفا ملک پوری جن کے احساس فرض نے اُن کے نام سے ایک مخصوص نمبر نکال کر پہلی مرتبہ اس بجھتے ہوئے چراغ میں تیل کی چند بوندیں ٹپکانے کی ضرورت محسوس کی ورنہ ؏

گذرتی ہے جو شمع بزم پر پروانے کیا جانیں

اُردو میں شاید مختصر افسانہ نویسی کی داغ بیل مغربی نہج پر بیسویں صدی کے آغاز میں پڑی لیکن ابتدا ہی میں یہ ادبی تحریک تغزل پسندی کے ہاتھوں "رومانیت" کے بھنور میں آ پھنسی، اگر پریم چند کے مضبوط دست و بازو ؏

دستِ غیب آمد و بر سینۂ نامحرم زد

کا مصداق بن کر اسے اس بھنور سے نہ نکالتے تو رنگ و بو کے اس سیلاب میں یہ بیڑا ہمیشہ کے لئے غرق ہوا تھا لیکن بدنصیبی اس حال میں بھی اس کے شاملِ حال رہی جس کے ہاتھ نے اسے ایک تلاطم سے نکالا وہ اس کی سرپرستی کے لئے بہت دنوں باقی نہ رہا اور ہماری ادبی دنیا میں مغرب پرستی کی ایسی آندھی چلی کہ ہمارے نوخیز ادیب اس کے تیز و تند جھونکوں میں اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ خذ ما صفا دع ما کدر کا حکیمانہ اصول کسی حال میں ان کے پیشِ نظر نہ رہ سکا اور کیونکر رہتا جبکہ ذہنی غلامی کی گرفت ہماری گردنوں میں سیاسی غلامی سے زیادہ سنگین ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کے ہر گوشے میں مغربیوں کی تقلید، ہماری ایمانِ محکم بن چکی تھی تو ادب اور شاعری اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ تقلید اصولاً کوئی بری چیز نہیں، لیکن جب مقلد اس سلسلے میں بالکل اپنی آنکھیں

بند کرلینا ہے تو یہی تقلید گمراہی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ہم نے بھی ہر تیز رو کو خضر سمجھ کر اپنی دونوں آنکھیں بند کرلیں نتیجہ سوائے "سرابِ تشنہ لبی" اور کیا ہوسکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ تہذیب کے تمام گوشوں میں مغربی کی رفتار ترقی پسندانہ ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ارتقائی راہ میں اس کا ہر اقدام صحیح ہو۔ کم از کم ناول اور افسانوں کے سلسلے میں تو اس کی گرم رفتاری اپنی تمام ندرت پسندیوں کے ساتھ غلط قدم اٹھا بیٹھی ہے۔ غلط چال چل رہی ہے۔ ایسی غلط چال جو ان دونوں اصناف کو اپنی علتِ غائی سے دور لئے جا رہی ہے۔

کہانی کو جنم دیا ہماری ایک ضرورت نے۔ اس لئے کسی کہانی کو پرکھنے سے پہلے یہ دیکھنا لازمی ہے کہ وہ کہاں تک ہماری اس ضرورت کو پورا کررہی ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ طویل داستانیں ہوں یا مختصر کہانیاں، ہمیں تھوڑی دیر کے لئے گرد و باد کی اس دنیا سے تلخیوں اور نامرادیوں کے اس ہنگامہ زار سے نکال کر ہمارے تھکے دماغوں اور تھکی ہوئی روحوں کے لئے ایک گوشۂ قرار مہیا کرتی ہیں۔ یہی ہے وہ ہماری ضرورت کہانی کو جس نے ایجاد کیا۔ یہی ہے وہ ہماری ضرورت جو آج بھی ناموافق حالات کے صبر آزما لمحوں میں بے اختیار کسی ایسی کتاب کی طرف بڑھ جاتی ہے جو اسے تھوڑی دیر کے لئے اپنے اندر گم کرسکے۔ ظاہر ہے کہ ہماری یہ ضرورت کما حقہ طربیہ کہانیوں ہی سے پوری ہوسکتی ہے جو ہمیں تلخیوں اور ترشیوں کی اس تجربہ گاہ میں شیرینیوں کا مزہ چکھا کر تھوڑی دیر کے لئے رجائی بنا دیں اور حالات نے زندگی بسر کرنے کا جو حوصلہ ہم سے چھین لیا اسے چند لمحوں کے لئے واپس دلا دیں۔ لیکن ایک انسان کے نقطۂ نگاہ کا قطعی رجائی ہونا اس کے لئے عملی زندگی میں خطرناک بھی ہوسکتا ہے، اس لئے ضرورت محسوس کی گئی اس کے سامنے ایسی کہانیاں بھی کہی جائیں جو اعتبارات کی دنیا سے اس کا رشتہ ٹوٹنے نہ دیں جہاں زندگی کی شادکامیوں اور شادمانیوں سے اس کو متعارف کیا گیا ہے وہاں ان پر آشوبیوں اور ہولناکیوں کا بھی ہمیں تعارف کرایا جائے جن سے زندگی کی شاہراہ پر بہر حال دو چار ہونا ہے۔ اسی احساس ضرورت نے ہماری کہانیوں میں المیہ عناصر داخل کئے۔ ٹریجیڈی کا آغاز اسی احساس کا منطقی نتیجہ ہے۔

اسی سلسلے میں جب ہمارا نقطۂ نگاہ ہمارے تمدنی اور عمرانی تقاضوں کے ماتحت افادی ہوا تو کہانی کاروں نے اپنے اس فرض کو بھی محسوس کیا کہ ایک دلچسپ کہانی سناتے ہوئے ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے سننے والوں کو زندگی کے جملہ نشیب و فراز سے آگاہ کر کے کارزارِ حیات کا ایک کامیاب مجاہد بنائیں۔ انسانی ذہن "روحانیت" اور "رومانیت" کے خیالستان سے نکل کر جوں جوں مادہ پرست ہوتا گیا اس مادی ضروریات کے تقاضے جوں جوں بڑھتے گئے مقصدی کہانیوں کی اہمیت بھی مسلم ہوتی گئی لیکن یہ راستہ ایک کہانی کار اور ایک داستان گو کے لئے پل صراط کا راستہ ہے جس میں ذرا بھی اس کے قلم نے لغزش کی تو پل کے دونوں طرف آگ کا دریا اس کے لئے آغوش کشا ہے۔ جو سلیقہ شعار ہیں جن کی دائیں اور بائیں آنکھ دونوں کھلی ہوئی ہے وہ تو اس بال سی باریک راہ سے بہ سلامت گذر جاتے ہیں لیکن دونوں آنکھوں میں جن کی ایک آنکھ بھی بند ہوتی یعنی جن کے ذہنوں پر افسانویت یا مقصدیت کسی ایک کا بھی زیادہ غلبہ ہوتا ہے تو وہ اپنا ادبی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے گرتے ہیں اور منہ کے بل گرتے ہیں۔ اور مجھے علی عباس حسینی سے اسی لئے عقیدت ہے کہ میں نے اس صراطِ عظیم مستقیم پہ انہیں کبھی لڑھکتے یا لڑکھڑاتے نہیں دیکھا ہے۔

ایک افسانہ نگار کا سب سے بڑا سلیقہ یہ ہے کہ وہ کہانی پن اور مقصد دونوں میں ایک رچاؤ پیدا کرسکے لیکن بدقسمتی سے ہوتا یہ ہے کہ تبلیغ مقصد کا مخلصانہ جوش افسانوں سے افسانہ پن چھین لیتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی مقصودِ اصلی جس کے لئے یہ پاپڑ بیلے گئے ہیں خطرے میں آجاتا ہے یعنی پڑھنے والا افسانہ نگار کی تبلیغی سرگرمیوں سے اکتا کر کتاب ہاتھوں سے پٹک دیتا، اور مبلغ کا یہ شاہکار تبلیغ ایک سورہ فاتحہ کا مستحق ہو کر ردی کی ٹوکری سے بنئے کی دکان تک پہونچ جاتا ہے۔ اور اس کے اوراق پریشاں کی

یہ درگت غالب کی زبان سے اپنے خالقِ فن پر اس طرح تنقید کرتی ہے ؎

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

کسی ذہنی کاوش کا یہ عبرتناک انجام یعنی اوراق افسانہ کی یہ پراگندگی نتیجہ ہیں شاید ایک ذہنی ابتری کا۔ یہ ذہنی ابتری نہ ہوتی تو مجموعہ خیال یوں فرد فرد ہو کر شکرا اور "مسالوں" کی پڑیاؤں کے کام نہ آتا۔

اس میں شک نہیں کہ ہر لکھنے والے کو اپنا مقصد عزیز ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے افسانہ نگاروں کو اطلاع دینی ہے کہ ہر لکھنے والوں کے ساتھ پڑھنے والوں کا بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔ آپ کے مقصد اور اس کے مقصد میں جب تک مفاہمت نہ ہو ناول ہو یا افسانے کامیاب نہیں کہے جا سکتے۔ یہی وہ کامیابی کا راز ہے جسے ہمارے نوجوان ادیبوں کو علی عباس حسینی سے سیکھنا چاہئے۔ رومانی تحریک سے وہ بھی متاثر ہوئے ہیں، وقت کے تقاضوں نے مقصدیت کی طرف ان کو بھی جھکایا ہے۔ نفسیات کی گتھیوں میں اُلجھنے کا شوق اُن کو بھی ہے لیکن ہر حال میں ان کی عمرانیت اور عرفانیت میں "رومانیت" اور "رجعائیت" میں ایک اعتدال ملتا ہے ایک مفاہمت ملتی ہے۔ ان کی ظرافت تین اور نفاست حسین ہوتی ہے وہ خود بے وقوف بن کر ہمیں ہنساتے نہیں بلکہ ہمیں عقلمند بنا کر ہمیں رُلاتے ہیں۔ وہ گنہگار کا تعارف ہم سے اس انداز میں نہیں کراتے کہ ہمیں اس سے ہمدردی کی جگہ نفرت ہو جائے۔ وہ گناہوں کی پیش کش اس "خوش سلیقگی" سے نہیں کرتے ہیں کہ ہمیں ان کی طرف سے نفرت کی جگہ رغبت پیدا ہو جائے۔ اسی کا نام مذاقِ سلیم ہے، جس کی تشریح حافظ شیرازی یوں فرماتے ہیں ع

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

جدید افسانہ نگاری کی ایک اور بدعت جو بحیثیت قاری ہمارے لئے سوہانِ روح ہے وہ افسانوں میں انشاپردازی کی بہتات ہے۔ انشائے لطیف ہو یا افسانے دونوں اپنی جگہ ایک مستقل فن ہیں۔ دونوں کا شعور ذوقی، دونوں کے رجحانات اور دونوں کے تقاضے اپنی جگہ ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ لیکن ان کا قلم کون پکڑے جو افسانہ نگاری اور انشائیہ نگاری کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ نوخیزوں کا ذکر نہیں مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بعض مشہور اور مسلّم افسانہ نگار بھی بنیادی طور پر انشاپرداز ہیں اور اُردو کی ازلی بدنصیبی سے شاید اُن کی انشاپردازی کو اپنی ادبی لطافتوں کی جلوہ نمائی کے لئے سوائے افسانوں کے کوئی اور "زنگار" نہ مل سکا۔ مجبوراً انہوں نے غریب افسانے ہی کو اپنے ناز انشا نگاری کے لئے تختۂ مشق بنایا۔ یہ اور بات ہے اس فنِ معصوم کی ہر کراہ اُن کی ہر جنبشِ قلم سے یہ کہتی رہی کہ ع

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اس خونِ دو عالم کے سلسلے میں فلسفے اور نفسیات کا خون سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ جو انشاپردازی اور افسانہ نگاری کے نام پر بہایا جا رہا ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک دَور ایسا بھی آیا جب کہ بگڑے شاعر کو مرثیہ گو کہا جاتا تھا۔ لیکن آج ہر بگڑا انشاپرداز یا تو افسانہ نویس بن جاتا ہے یا تنقید نگار۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

ان ادبی خالقین کو جن کا وجود احسن الخالقین کی خالقیت پر ایک مودب تنقید ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ "تالیف نسخہ ہائے وفا" کرتے ہوئے نسخے کے تمام اجزا کی ماہیت پر غور کر لیا کریں ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے ادبی معجون پر کوئی میرے جیسا دل جلا "بوڑھی ہانڈی" کی پھبتی نہ کہہ دے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے حسینی صاحب کی کہانیاں بے نمک کی اُبلی کھچڑی

سہی لیکن "بوڑھی باندی" نہیں۔ انشاپردازی کے لحاظ سے ادبیت کا اعتدال پسندانہ مزاج اور انداز بیان کا سلجھاؤ پریم چند کی وہ میراث ہے جو علی عباس حسینی تک پہونچ کر اب سہیل عظیم آبادی تک پہونچ رہی ہے۔ میں فلسفی نہیں ادیب نہیں، تنقید نگار نہیں، افسانہ نویس نہیں ایک دوم درجے کا افسانہ بیں ہوں جو صرف اپنی ذہنی تھکن اور روحانی کلفتوں کو دُور کرنے کے لئے افسانے پڑھا کرتا ہے۔ حاشا اپنی ذہانت کا امتحان دینے کی غرض سے افسانہ نہیں پڑھتا لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے نئیں پرست افسانہ نگار زبردستی ہماری ذہانت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ جیمس جوائس جیسے سنکی فلسفیوں نے ہر اُلجھے ہوئے ذہن کو غالباً یہ دانشمندانہ مشورہ دیا ہے کہ جو داستان یا کہانی کہو اس انداز سے کہو کہ ہر پڑھنے والا تمہارے انداز بیان کی ژولیدگی میں گم ہو جائے اور تم سے کچھ طلب نہ کرے کیونکہ اس کے مطالبات تمہارے اُلجھے ہوئے ذہن کے بس کی بات نہیں۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ مسائل حیات کا احساس ہے نہ مختلف قسم کے افسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو گننے کا انہیں موقعہ ملا ہے وہ افسانہ اگر لکھیں گے بھی تو اپنے ذہن کی طرح اُلجھا ہوا جس کی گتھیوں کو سلجھانا ایک دوم درجے کے قاری کا کام نہیں جو افسانہ کو کچھ سمجھنے اور کچھ محسوس کرنے کے لئے پڑھتا ہے۔ آسمانوں کے یہ مسافر ہمیں زمین کا حال کیا بتائیں گے، جن کا "انداز بیان" شانہ زلف الہام "نہیں مستقل زلف الہام ہے اور جن کی رفتار قلم "جنبش بال جبریل" نہیں جنبش بال ہما "ہے جو بلندی کی طرف صعود کرتی جاتی ہے اور اپنے تعاقب کرنے والوں سے پکار پکار کر کہتی جاتی ہے ؎

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجو

سایہ ہمچو دود بالای رود از بال ما

ہمارے جیسے قاری سادہ لوح تو پریم چند، سدرشن، راج رہبر، اختر اورینوی اور علی عباس حسینی ہی کو پڑھ کر خوش ہو لیتے ہیں

علی عباس حسینی اگرچہ بڑی حد تک اس دَور کے افسانہ نگار ہیں جب کہ رنگ و بو کا سیلاب افسانہ نگاری کے گرد اپنے گھیرے ڈال رہا تھا لیکن انہوں نے اپنے دامن کو زیادہ بھیگنے نہ دیا۔ وہ ہمیں اگرچہ کہانی سناتے سناتے کبھی کبھی ہمیں فلسفہ پڑھانے لگتے ہیں لیکن ان کا فلسفہ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اس لئے ہم اُن سے بہت کچھ سیکھ بھی لیتے ہیں۔ وہ بھی اپنی کہانیوں میں گاہے گاہے ایسی اجنبی شخصیتوں سے ہماری ملاقات کراتے ہیں جن کی مثال ہمارے معاشرے میں کم نظر آتی ہے۔ لیکن ہم انہیں پہچان لیتے ہیں کہ وہ اسی کرۂ ارض کے باشندے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی کہانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں اور بعض عظیم فنکاروں کی تخلیقات کا سرورق ہی دیکھ کر دور بھاگتے ہیں کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہم سے ایسے افراد کا تعارف کرائیں گے جو مریخ وعطارد کی مخلوق تو ہو، اس کرۂ ارض کی مخلوق نہ ہوگی۔ اور ہم جیسے کندہ ناتراش نہ ان کی زبان سمجھیں گے نہ ان کے حرکات وسکنات کو پہچانیں گے۔

پروفیسر حسینی کے افسانوں میں ایک خصوصیت اور نمایاں ہے وہ جن کرداروں سے ہماری ملاقات کراتے ہیں۔ ان کے متعلق سب کچھ ہمیں بتلا دیتے ہیں کچھ باتیں چبا چبا کر گھونٹ نہیں جاتے۔ مثلاً اگر ہیرو اور سائڈ ہیرو سے ملاقات کراتے ہیں تو ہمیں بتلا دیتے ہیں کہ ان دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ دونوں دوست ہیں یا باپ بیٹے ہیں، چچا بھتیجے ہیں یا صرف بھائی بھائی۔ ایسے مواقع پر ان کی ابہام پرستی ہماری ذہانت کا امتحان نہیں لیتی۔ ستم ہے کہ ہمارے کچھ عزیزان با توقیر اپنی کہانیوں میں تفصیل یہ آئیں گے تو یہاں تک بتائیں گے کہ ان کا ہیرو جب ایک شخص سے ملنے گیا ہے تو دوران گفتگو میں اس کے سگریٹ کی راکھ کچھ ایش ٹرے میں گری کچھ میز اور کچھ اس کے ذرات اُس کی نیم خاکی پتلون پر جس کی مُہری پر ایک ننھا سا داغ سبز روشنائی کا تھا لیکن یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھیں گے کہ دونوں میں کیا تعلق ہے، کیا رشتہ ہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت ضروری باتوں کو سمجھنے کی

ذمہ داری ہماری ذہانت اور واقعات کی رفتار کے سپرد کریں گے اور واقعات کی رفتار بھی انہیں کے ذہن کی طرح کچھ اس طرح ٹیڑھی اور ترچھی ہوگی کہ

ع پوچھی زمیں کی تو کہی آسمان کی

مجھے اس موقع پر اپنے عظیم نقادوں سے یہ پوچھنا ہے کہ شاعری میں خصوصیت کے ساتھ غزل میں ابہام بڑی حد تک فن سمجھا جاتا ہے لیکن افسانہ نگاری میں یہ کس حد تک جائز ہے؟ آخر ادب کی شریعت میں اس کے کچھ حدود و ممنوعہ ہیں یا نہیں؟ افسوس کہ جس ملک میں کلیم الدین احمد، آل احمد سرور اور احتشام حسین جیسے نقاد ہوں وہاں کے افسانہ نگاروں کی مطلق العنانی زمان و مکان کے جملہ قیود سے بے نیاز ہو کر زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائے۔ ہمارا ہر بڑا نقاد غریب شاعروں ہی کی جان کا لاگو ہے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کو ان کے عہد میں مکمل سوراج حاصل ہے۔ سب جگر و جوش ہی کی جان کے لاگو ہیں قرۃ العین کی مزاج پرسی کوئی نہیں کرتا۔ کرشن چندر سے مخاطب ہونے کی جرأت کسی میں نہیں۔ ان حالات کے پیش نظر اگر کوئی دل جلا شاعر یہ شعر پڑھے تو ہمارے نقاد کیا جواب دیں گے؟

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کہانی کو کسی معین نتیجے تک پہنچائے بغیر ختم کر دینے کی وبا اب فیشن بنتی جا رہی ہے ان ابہام پسندوں کو ان کے قارئین کے نفسیات کون بتلائے اُن سے کون یہ کہے کہ ہر کہانی کا پڑھنے والا کہانی شروع کرتے ہی کہانی کے افراد سے دلچسپی لینے لگتا ہے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ اُس کی ذہنی وابستگی ہو جاتی ہے۔ یہ ذہنی وابستگی نفرت کی شکل میں ہو یا محبت کی شکل میں ہو، اُن اشخاص کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی اور خصوصیت کے ساتھ واقعات کے سلسلے میں ایک نتیجہ خیز انتہا تک پہونچنا چاہتی ہے۔ احسان ہے علی عباس حسینی کا ہم افسانہ خوانوں پر کہ ان سلسلوں میں اُن کی ندرت پسندی ہماری ذہانت کا مضحکہ نہیں اُڑاتی اور واقعات کا جو سلسلہ شروع کرتی ہے تو اسے ایک نتیجہ خیز انتہا تک پہونچا دیتی ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ممکن ہے کہ میرے اس مضمون کے پڑھنے والوں میں کوئی صاحب میرے اس جذبۂ عقیدت پر جو مجھے علی عباس حسینی سے ہے عشق کی تہمت لگائیں۔ اس لئے میں پہلے ہی سے انہیں یہ یقین دلا دیتا ہوں کہ میں اس الزام کو بھی ایک رُوعِ تسلیم کے ساتھ قبول کروں گا ؎

ہمہ شہر پر زخوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم یک بیں نہ کند بکس نگاہے

بقیہ: ممتاز چچا صـــ سے آگے

روسی زبان سے ذرا مانوس ہونا چاہتے ہیں۔ ممتاز چچا میں تازگی و سادگی آج بھی ویسی ہی تھی۔

اپنی ان دونوں ملاقاتوں میں سے کسی میں بھی انہوں نے اپنے ادیب اور لیکھک ہونے کا کوئی ذکر نہ کیا، حکومت کی طرف سے کیا قدر دانی ہوئی کچھ نہ بتایا۔ اس دوسری ملاقات میں چلتے وقت صرف اتنا فرمایا کہ اپنے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کو یاد دلا دینا کہ ہم نے اپنی ایک کتاب انہیں تبصرہ کے لئے بھیجی ہے۔ (یہ کتاب تاریخ ناول نگاری میں بڑا اونچا مقام رکھتی ہے)

یہ ہیں میرے ممتاز چچا جن کو آپ حسینی صاحب یا علی عباس حسینی صاحب کے نام سے جانتے ہیں ←

جمیل مظہری

"علی عبّاس حسینی کا قرض، ہماری سیرت اور شاعری پر"

عزیزی وفا صاحب، دعا و سلام

علی عباس حسینی نمبر کے لئے میں آپ کو اب تک کچھ دے نہ سکا اور اس سلسلہ میں آپ کے تقاضوں کا شدّت کے ساتھ میری بے بضاعتی کا احساس بھی اسی رفتار کے ساتھ بڑھتا رہا اور میں نے قلم اٹھا اٹھا کر رکھ رکھ دیا۔ سوچتا تھا کہ اگر لکھوں تو کیا لکھوں تنقید میرے بس کی بات نہیں اور یوں بھی تو جس مجموعے میں احتشام اور رضوی اور احتشام حسین جیسے عظیم نقادوں کے مقالے شامل ہوں وہاں میری خامہ فرسائی کی کیا جگہ ہو سکتی ہے اب رہا آپ کے ہیرو کی گھریلو زندگی تو اس سلسلے میں ایک حد تک کچھ لکھ سکتا تھا لیکن آپ نے برادرزادہ محمد مہدی کا مضمون دکھلا کر یہ حوصلہ بھی مجھ سے چھین لیا۔ اور میں نے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنا اعتراف معذوری آپ کے سامنے پیش کر کے خاموش ہو جاؤں یہی سوچ رہا تھا کہ دفعتاً ذہن کی تاریکی سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور مجھے یاد آیا کہ برادر مکرّم علی عباس حسینی کے افسانے عالم شباب میں بڑی حد تک میری سیرت اور ادبیت پر اثر انداز ہوئے تھے۔ کیوں نہ دیانت داری کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کر کے اس قرض سے سبکدوش ہو جاؤں جو آپ نے بہرحال مجھ پر عائد کر دیا۔ آپ میری اس کوشش کو احساس کمتری کہہ لیجئے لیکن میں تو اسے غروری کہوں گا کیونکہ جو غرور حالات کی ناموافقت سے احساس کمتری کی کمین گاہ میں چھپ جاتا ہے وہ کبھی کبھی اپنے کو زندہ رکھنے کے لئے حق گوئی کا سہارا بھی لے لیتا ہے۔ میری اس حق گوئی کو بھی اسی قسم کی پیداوار سمجھئے۔

برادرم عباس حسینی صاحب نے جس وقت افسانہ لکھنا شروع کیا اس وقت میرا ذہنی شعور بچپن کے دھندلکوں سے نکل کر جوانی کے اُجالے سے روشناس ہو رہا تھا۔ وہ تمام سفلی جذبات جو ایک نوجوان کو انسانیت کے معیار سے گرا کر حیوانیت کے غار میں لے جاتے ہیں ایک ایک کر کے مجھ پر قابو پاتے جا رہے تھے۔ رنگ و بو کی ہر موج میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں ان کے گرداب میں اپنے کو بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن افسانہ خوانی کا ذوق میرے آڑے آیا۔ کہانیوں اور ناولوں نے مجھے خود شناسی سکھائی اور خود شناسی کے ساتھ ان تمام جذبوں کی ماہیت کا تعارف بھی مجھ سے کرایا جو مجھ سے زندگی کے ہر قدم پر اپنا خراج مانگ رہے تھے۔ اسی افسانہ خوانی کے سلسلے میں پریم چند اور پریم چند کے بعد علی عباس حسینی سے میری ملاقات ہوئی اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے کردار کو بنانے اور میری سیرت کو نکھارنے میں علی عباس حسینی کا حصّہ پریم چند سے کسی طرح کم نہیں۔

علی عباس حسینی نے عشق اور دوستی کے بلند ترین معیاروں سے مجھے متعارف کرایا۔ علی عباس حسینی نے مجھے بتلایا کہ اگرچہ اخلاق اور اخلاص کی بنیاد خود غرضی ہے پھر بھی وہ فریق مخالف کو زیر کرنے کا ایک مؤثر حربہ ہے۔ علی عباس حسینی نے مجھے بتایا کہ احسان انتقام سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اس کا تجربہ کیا اور انہیں کے طفیل یہ لذت حاصل کی۔ ان کے افسانوں کے کردار میں شیخ کریم ہوں یا بہاری بنیا، میر نذر حسین ہوں یا چھیدا کسان ہر ایک نے خواہش انتقام کی گرفت کو

میرے اندر ڈھیلا کیا اور ایثار و احسان کے ذوق لطیف سے آگاہی دی۔ ایک افسانہ نگار کی سب سے بڑی کامیابی غالباً یہی ہے کہ وہ کسی انسان کو جسے بقول غالبؔ انساں ہونا میسر نہیں انسان بنا دے۔ اس نقطۂ نظر سے میں علی عباس حسینی کو ایک ممتاز ترین افسانہ نگار سمجھتا ہوں جن کی ہر کہانی کم و بیش اس اخلاقی شعور کو جو حالات کی ناسازگاری سے اگر مرتا نہیں تو کم از کم ایک گہری نیند ضرور سو جاتا ہے بڑے سلیقے سے جگاتی ہیں تھپک تھپک کر جگاتی ہیں، جھنجھوڑتی نہیں، جھنجھوڑ کر جگانے کا طریقہ انہیں پسند نہیں، شاید اس طریق عمل سے انہیں شاد عظیم آبادی نے بیزار کیا ؎

یہ دوستی تمہیں ایسوں کا کام ہے واعظ
کہ جب کسی کو جگانے لگے جھنجھوڑ دیا

غالباً ہمارے بھائی صاحب کو مولوی سے جو اتنی شدید نفرت ہے اس کی نفسیاتی بنیاد بھی غالباً یہی ہے۔ مولوی سونے والوں کو جگاتے نہیں جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ علی عباس حسینی کو بحیثیت افسانہ نگار ہر قسم اور ہر نوع کے گنہگاروں سے ہمدردی ہوتی ہے۔ اور نہیں ہوتی ہے تو خلق رسول کے ان امانت داروں سے جن کی تصویر حالی نے یوں کھینچی ہے ؎

کبھی خوک اور سگ ہیں اس کو بناتے　　کبھی مارنے کو عصا ہیں اٹھاتے
ستوں سیم بد زور ہیں آپ دیں کے　　نمونہ ہیں خلق رسول امیں کے

غالباً اس اظہار خیال میں کوئی مبالغہ نہ ہو کہ پیغمبروں میں حضرت عیسیٰ اور ادیبوں میں اناطول فرانس، ٹالسٹائی، پریم چند اور علی عباس حسینی وہ بزرگوار ہیں جن کو گنہگار سے اتنی ہی ہمدردی ہوتی ہے جتنی ایک طبیب یا تیماردار کو اپنے بیمار سے ہوتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے گنہگار سے نفرت نہ کرنے کا سبق اگرچہ حضرت عیسیٰ اور امام زین العابدین سے ملا۔ لیکن اس سبق پر عمل کرنے کا شوق انہیں افسانہ نگاروں نے دلایا۔ انہیں کے افسانوں نے مجھے سکھایا کہ نفرت بہرحال ایک بری چیز ہے اگر برائی سے بھی کی جائے جب بھی بھلائی نہیں بن سکتی۔ غالب نے مجھے محبت کرنے سے بچایا۔ اور اس جذبہ کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کر کے مجھ پر ثابت کیا کہ اس کی حقیقت ایک خواہش نفسانی سے زیادہ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح نفرت کی بیماری سے بڑی حد تک انہیں مصنفین نے مجھے نجات دلائی اور علی عباس حسینی میری اس شفایابی میں برابر کے شریک ہیں۔ صرف اسی اخلاقی مرض سے نہیں بلکہ کتنے اور اخلاقی امراض تھے جن سے شفایابی میں علی عباس حسینی کے افسانوں نے میرے نفس مرض کے ساتھ تریاق کا کام کیا لیکن میرے ان امراض اخلاقی میں غصہ اور غصہ میں تلخ گوئی ایک ایسا مرض ہے جس سے مجھے آج تک شفا نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ میری اس کمزوری نے مجھے میرے بہت سے چاہنے والوں کو ضائع کرایا۔ کاش میرے یہ برادر بزرگ ایک افسانہ کی شکل میں کوئی نسخہ اپنے اس برادر خورد کے لئے بھی لکھتے کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ اس قسم کا ہر سبق ان کے قلم کی زبان سے ایک ایسا معجون شفا ثابت ہوتا ہے جو ہمارے جیسے اخلاقی مریضوں کے لئے تیر بہدف ہے کیا کہا جائے ان کی اس قدرت قلمکاری کو کہ ان کے افسانے کے بہت سارے کردار میرے جانے بوجھے ہوئے تھے۔ ان کے واقعات افسانوں میں قلمبند ہونے سے پہلے میرے کانوں تک پہونچ چکے تھے لیکن طبیعت نے ان کا کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا تھا مگر علی عباس حسینی صاحب نے جب انہیں واقعات کو اپنی مخصوص افسانوی زبان میں بیان کیا تو انداز بیان کی تاثیر میرے لئے ایک نسخۂ شفا بن گئی۔ شاید ادب کا جادو اسی کو کہتے ہیں اور میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جب سے نبوت کا سلسلہ منقطع ہوا ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں کے نفس امارہ کے اصلاح کی ذمہ داری ادیبوں ہی کے سر ڈال دی ہے لیکن ساتویں صدی کے بعد آج تک ہمارے کتنے ادیبوں نے اس ذمہ داری کو پہچانا۔ یہ بجائے خود ایک سوال ہے۔ جس کا جواب ہماری تاریخ ادب کو دینا چاہئے۔ اب رہا ان کے انشائے لطیف سے خاطر خواہ فائدہ

اُٹھانے کا مسئلہ تو مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کے سلجھے ہوئے اندازِ بیان سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ادبی مشق کے دوران میں میری ملاقات ان سے اس وقت ہوئی جب کہ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری مجھے ایک غلط راستے پر لگا چکے تھے اور میں اس راستے پر اتنا آگے بڑھ آیا تھا کہ وہاں سے واپس پلٹنا میرے لئے ناممکن تھا۔ لیکن میری شاعری بہرحال ان کی قرضدار ہے۔ اب آپ حیرت سے پوچھیں گے کہ کس طرح قرض دار ہے کیونکہ وہ کتنے ہی بڑے ادیب کیوں نہ ہوں لیکن اُن کے فن میں میری شاعری کی کیا جگہ ہو سکتی ہے۔ جب کہ شاید عمر بھر میں انھوں نے ایک مصرعہ موزوں نہ کیا ہوگا۔ تو میرے عزیز ان کے اندر ایک بڑا سلیقہ یہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی فلسفیانہ فکر اور بڑے سے بڑے شاعرانہ خیال کو حسن بیان کی جملہ لطافتوں کے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں میں نظربند کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شاعر ان جملوں کو عروض کی پابندی میں جکڑ دے تو وہ حافظ کا ایک بہترین شعر یا عمر خیام کی ایک بہترین رباعی بن سکتے ہیں۔ اور میں نے یہی کیا ان کے کتنے ہی گرانقدر خیالات اور ترکیبوں کو غزل کے سانچے میں ڈھال کر ایک شعر بنا دیا اور چوری کے ساتھ سینہ زوری یہ کہ خود اُنہیں سے داد لی، ع

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

افسوس کہ "فکرِ جمیل" اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے ورنہ میں چند اشعار نقل کر کے اپنی چوری کا پردہ خود ہی فاش کرتا۔ میری دیانتداری کا تقاضہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو لیکن کیا کیا جائے کہ میرے حافظہ کی خرابی میری شرم رکھنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ دیکھئے وفا صاحب "دروغ گو را حافظہ نباشد" کی مثل مجھ پر صادق نہ سمجھئے گا کیونکہ میں جھوٹ نہیں واقعی سچ بول رہا ہوں۔ لیجئے اپنی ایک چوری یاد آہی گئی۔

"بختیارک کا نسخہ" علی عباس حسینی کا مشہور افسانہ ہے۔ اور میری طنزیہ نظم "تعزیت" اُسی کا ایک اُترا ہوا چربہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بختیارک کے نسخے میں شیطان بیمار پڑتا ہے اور میری نظم میں شیطان کی اکلوتی بیٹی دولت بسترِ مرگ پر دراز ہے بختیارک کے نسخہ میں شیطان ایک مولوی کے خونِ جگر کی یخنی پی کر شفایاب ہو جاتا ہے لیکن "تعزیت" میں مریضہ کی ماں تنہا ہی ہر چند اُسے معجونِ سیاست کھلاتی ہے۔ مذہب مریضہ کی بالیں پر تسبیح پڑھ پڑھ کر دم کرتا ہے پھر بھی مریضہ شفایاب نہیں ہوتی۔ شیطان بیٹی کی موت پر پچھاڑیں کھاتا ہے اور شاعر اس کو یہ کہہ کر صبر دلاتا ہے۔

بیٹی نہ سہی زندہ لیکن مذہب پالک بیٹا ہے
اظہارِ سعادت مندی میں کیا یہ اس سے کچھ ہیٹا ہے

اس نظم کے کچھ بنیادی خیال اور اندازِ بیان کی بہت سی ترکیبیں بختیارک کے نسخے سے ماخوذ ہیں۔

زیادہ والسلام

آپ کا

جمیل مظہری

علی عباس حسینی نمبر

ملتے ہی اس کی رسید اور اپنے تاثرات سے بھی ضرور مطلع کریں

حبیب احمد صدیقی

حسینی کی سخن سنجی و افسانہ گری

میں علی عباس حسینی صاحب کے نام اور انکی شہرت سے تو بہت عرصہ سے واقف تھا مگر اب سے سات آٹھ سال پہلے تک خود ان سے تعارف نہ تھا۔ ہر چند حسینی صاحب شاعر نہیں اور انکے سلسلہ میں شاعری اور مشاعروں کا ذکر کرنا بظاہر بے ربط سی بات ہے لیکن چونکہ انہیں کی بدولت میں ان سے روشناس ہوا اسلئے انکا ذکر کچھ ایسا بے جا بھی نہ ہوگا۔

میں جب کبھی مشاعروں میں شریک ہوتا ہوں تو ایک ناآسودگی کا احساس لے کر واپس آتا ہوں جو اشعار مشاعروں میں سننے میں آتے ہیں ان میں سے عموماً بہت کم دل یا دماغ کو تشفی کا باعث ہوتے ہیں۔ مشاعروں میں زیادہ تعداد ایسے سامعین کی ہوتی ہے جو سینما یا تھیٹر کی طرح مشاعرے میں بھی وقتی تفریح کا سامان ڈھونڈھتے ہیں۔ چنانچہ اکثر ایسے ہی شاعر پسند کیے جاتے ہیں جو یہ سامان فراہم کر سکیں۔ اس تفریح پسندی نے شاعروں میں ایک ایسے طبقے کو وجود بخشا ہے جس کی شاعری بس مشاعروں کے پنڈال تک ہی شاعری ہے۔ اس تفریح پسندی نے صنف نازک میں بھی شاعر ڈھونڈھ نکالے ہیں اور اب مشاعروں کی کامیابی کے لیے ان کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس بیان سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میرے نزدیک کوئی اچھا اور بڑا شاعر مشاعروں میں مقبول ہی نہیں ہو سکتا جگر صاحب ابھی چند سال پہلے تک مشاعروں کے نہایت مقبول شاعر تھے۔ انکی شاعرانہ عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور بھی بہت سے اچھے شاعر ہیں جو مشاعروں میں مقبول ہیں۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشاعروں میں زیادہ تر ایسے شاعروں کی مانگ ہے جو تفریح پسند سامعین سے خراج تحسین حاصل کر سکیں۔ ایسے شاعروں کا کلام سننے کے بعد مشاعروں سے ناآسودگی کا احساس لے کر واپس آنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مجھے مشاعروں کی افادیت سے انکار نہیں۔ اردو کی ترویج میں مشاعروں کی اہمیت ہے۔ اور آج کل یہی کیا کم ہے کہ اردو شعر سننے کے لیے لوگ آئیں چاہے تفریح کی غرض ہی سے آئیں لیکن جہاں سستی شاعری کے دل دادہ زیادہ ہوں وہاں گرانقدر شاعری کی تخلیق کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اچھی شاعری کی تخلیق کے لیے اچھا ماحول بھی چاہیئے۔ جہاں برے بھلے کو پرکھنے والوں اور اچھے کلام کو سراہنے والوں کی کمی نہ ہو۔ شاید اسی غرض سے خواجہ میر درد اور میر تقی میر اپنے گھروں پر ہی نشستیں کرتے تھے جہاں اہل ذوق و صاحب نظر شریک ہوتے اور شعر کہنے والے اس خیال سے کہ شعر ایک سخت کسوٹی پر کسے جائینگے نہایت احتیاط سے کہتے اور اپنی عرق ریزی سے ادب عالیہ میں بیش قیمت اضافہ کرتے۔

میں نے ان برگزیدہ ہستیوں کی اس مستحسن روایت کو پھر سے رواج دینے کا تہیہ کیا اور کانپور میں (جہاں میں ۱۹۴۴ میں گورکھپور سے تبدیل ہو کر آیا تھا) چند احباب کو ماہانہ نشستیں

کرنے پر آمادہ کیا۔ ان میں وہی شعرا اور سامعین شریک ہوتے جن کو مدعو کیا جاتا اور مدعو کرتے وقت انکی شاعرانہ استعداد اور ذوق سخن پیش نظر رہتا۔ یہ نشستیں کان پور کے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ کان پور کے بعد کئی اور جگہوں کے سات آٹھ سال کے قیام کے بعد حسینی لکھنؤ پہونچے تو وہاں بھی چند احباب نے بیڑہ اٹھایا اور ۱۹۵۶ء میں ان مخصوص نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور انکو ایسی کامیابی نصیب ہوئی کہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند صاحب اور چند دیگر وزرا (حافظ محمد ابراہیم و سید علی ظہیر صاحبان) اور جسٹس آنند نرائن ملا وغیرہ نے بھی اپنے یہاں یہ نشستیں منعقد کیں۔

علی عباس حسینی صاحب اپنی ملازمت سے ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہو کر اپنے وطن موضع پارہ ضلع غازی پور سے دامن بچا کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ ہم کو تو ایسے صاحب نظر جوہر شناسوں کی ضرورت ہی تھی انہیں مدعو کیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ تھی میری انکی ملاقات کی تقریب۔

حسینی صاحب کی عمر کا یہ اڑسٹھواں سال ہے۔ لیکن دیکھنے میں باسٹھ تریسٹھ کے معلوم ہوتے ہیں۔ غالب نے "بالا بلندے" کو "تہ قبائے" کے گن گائے ہیں۔ حسینی صاحب بھی بالا بلند ہونے کے اعتبار سے ستائش کے مستحق ہیں۔ رہا قبائے کوتاہ کا معاملہ تو یہ تو دراصل ایک اضافی صفت ہے اصل چیز تو بالا بلند ہونا ہے۔ حسینی صاحب کے گورے گورے رنگ اور مسکراتے ہوئے چہرے پر انکی چھوٹی سی داڑھی بہت زیب دیتی ہے۔ وہ بہت دھیمے دھیمے گفتگو کرتے ہیں جب کبھی کسی علمی بحث پر بات چھڑ جاتی ہے تو بہت جچی تلی رائے دیتے ہیں یہی حال انکی سخن سنجی کا ہے۔ یوں تو انہوں نے عمر بھر نثر نگاری کی ہے مگر انکا شاعری کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے انہوں نے اردو شاعری پر اعتراضات کے جواب میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ یہ وہی کر سکتا تھا جسکو اردو شاعری پر پورا عبور حاصل ہو اور جو اس کی خوبیوں کا کما حقہ راز داں ہو۔

حسینی صاحب ۴۰۔۴۵ سال سے افسانے۔ ناول ڈرامے وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ ان کو اپنے افسانوں کے سب سے پہلے مجموعہ (رفیق تنہائی) پر ہی جو ۱۹۳۱ء میں شایع ہوا تھا ہندوستانی اکاڈمی کی طرف سے اول انعام ملا تھا۔ کسی کو اسکی پہلی ہی تصنیف پر انعام مل جانا ایسا ہی یاد رکھنے کے لائق کارنامہ ہے جیسا کہ کرکٹ ٹسٹ کی پہلی اننگ میں پہلی ہی بار کھیل کر سنچوری بنانا۔ ایسے سنچوری بنانے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جب بھی کوئی ٹسٹ کھیلا جاتا ہے تو انکا ذکر عزت و فخر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پہلی تصنیف پر اول انعام پانے والے حسینی صاحب بھی افسانہ نگاری کی دنیا میں ایسی ہی عزت و فخر سے یاد کئے جانے کے مستحق ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ یاد کئے جائیں گے۔ اس انعام کے علاوہ تین چار انعامات انکو اور مل چکے ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست

انکو افسانہ نگاری سے فطری لگاؤ ہے۔ وہ ابھی پڑھ ہی رہے تھے اور بی اے پاس بھی نہیں کیا تھا کہ انکی طبیعت نے انہیں افسانہ لکھنے پر مجبور کیا۔ یہ افسانہ "پژمردہ کلیاں" تھا جو لکھنے کے کئی سال بعد شایع ہوا۔ حسینی صاحب کے افسانوں میں موضوع کے اعتبار سے بہت تنوع ہے لیکن جس موضوع سے انہیں خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے وہ دیہاتیوں اور غریبوں کی زندگی ہے۔ جسے انہوں نے طرح طرح سے پیش کیا ہے جس افسانے کے نام پر انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کا نام رکھا ہے وہ ایک ایسے شخص سے متعلق ہے جو بالکل بے یار و مددگار ہے جو ایک خستہ پھوس کے جھونپڑے میں رہتا ہے جو بمشکل دو دو چار آنے کما کر اپنا پیٹ پالتا ہے اور جو پالا ہوا ایک کتے کو جلنے سے بچانے کی کوشش میں خود جل کر مر جاتا ہے۔ اس مجموعہ کے بقیہ آٹھ افسانوں میں سے اور تین بھی ایسے ہی لوگوں سے متعلق ہیں۔ ایک اور مجموعہ کے تیرہ افسانوں میں سے سات غریبوں اور دیہاتیوں سے متعلق ہیں۔ وہ دیہات کے کچے مکانوں، کچی سڑکوں، لہلہاتے کھیتوں اور کھلی فضا میں بہت دلکشی پاتے ہیں۔ اور اس کا بار بار ذکر کرتے ہیں اس سے ان کے طبعی رجحان کا اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

غریبوں سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ حسینی صاحب انسانی مساوات کے

بھی بہت بڑے حامی ہیں۔ وہ انسان کو انسانی معیار پر جانچنے کے قائل ہیں نہ کہ ذات پات نسل و خون اور دولت افلاس کی کسوٹی پر۔ ان کا ابتدائی دور ایک افسانہ ہے "گونگا ہری"۔ ہری سنگ تراشوں کی نیچی ذات میں پیدا ہوا تھا وہ گاؤں کے زمیندار کے نزدیک ایک نہایت ہی حقیر مخلوق تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ اس شودر کے بیٹے نے ان کی بیٹی کا مجسمہ تراشا ہے تو آپے سے باہر ہو گئے اور ہری کو پٹوا کر گاؤں سے نکال دیا۔ ہری اپنی خداداد لیاقت کی وجہ سے جو اسے سنگ تراشی میں حاصل تھی دنیا کے بہترین صنم تراشوں میں گنا جانے لگا۔ اور بالآخر زمیندار کی بیٹی نے اسکے پاؤں چھو کر اسے اپنا پتی بنایا۔ حسینی صاحب نے اس افسانے کے علاوہ اور افسانوں میں بھی ذات پات، نسل و خون اور دولت و افلاس کی بنا پر بنائی ہوئی دیواروں کو توڑ کر انسان کا انسان سے رشتہ جوڑا ہے۔ انہوں نے زندگی کا حکیمانہ نقطہ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ انسان کو شریف و رذیل کے خانوں میں محض اس وجہ سے بانٹنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے کہ ایک دولت مند کے اور دوسرا مفلس کے یہاں پیدا ہوا ہے۔ یا ایک کی رگوں میں غزنوی کا خون ہے اور دوسرے کی رگوں میں ایاز کا۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت نوحؑ جیسے برگزیدہ نبی کی اولاد بدترین خلائق تھی۔ اور آذر جیسے منکر خدا کے گھر میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیدا ہوئے۔ ظاہر ہوا کہ شرافت و سعادت کا انحصار خاندانی زندگی کے بجائے انفرادی کردار پر ہے۔ "نئی ہمسائی" میں انہوں نے اس بات کو نہایت دلآویز پیرایہ میں واضح کیا ہے۔

حسینی صاحب کے نفسیاتی تجزیے فلسفیانہ ہوتے ہیں انسانی کمزوریوں پر جو تقاضائے بشریت عام طور پر پائی جاتی ہیں وہ پردہ نہیں ڈالتے بلکہ انکو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ انسان میں فرشتوں کے صفات ڈھونڈھنے کے قائل نہیں زندگی کی دلکشی میں لغزشوں اور کمزوریوں کا بڑا حصہ ہے لغزش تو ابن آدم کی میراث ہے لیکن لغزش کی حدیں ہیں۔ لغزش کے نام پر سفاکی جائز نہیں ٹھہر سکتی۔ جب انگریزوں فرانسیسیوں اور عزرائیلیوں نے مل کر مصر کو اس جرم پر بمباری کا نشانہ بنایا کہ مصری اپنے ملک کی بڑی نہر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے تھے تو حسینی صاحب اس بہیمیت کو لغزش سمجھ کر درگذر کرنے پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ انہوں نے "اے یہ قابیلی نسلے" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھ کر اس شقاوت کی مذمت کی جو خون ناحق بہانے میں دکھائی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ حسینی صاحب حکیمانہ نظر کے ساتھ درد مند دل بھی رکھتے ہیں جہاں وہ انسان سے محبت کرنے کی تلقین کرتے ہیں وہیں انسانی درندوں کو قابل نفرین بھی سمجھتے ہیں انکا فلسفہ حیات نہایت صحتمند ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے حسینی صاحب کے افسانے خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) زمین نم تھی۔ سبزہ بھیگا ہوا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور سامنے یاہی مائل دھندلے دھندلے کھیت تھے معلوم ہوتا تھا ہم خود نہیں جا رہے ہیں بلکہ فضا کی موسیقیت ہمیں اپنے نہ تھکنے والے دھارے میں بہلائے لئے جا رہی ہے ...... آفتاب کے اچھالے ہوئے گلال نے مشرقی افق کے دامن کو رنگ دیا۔ سبز ورتا ہی چیزوں پر کبھی ہلکی سرخی دوڑ گئی۔ کہرے میں چمکتی چمک پیدا ہوئی۔"

(۲) ... پھر پھول کے سے ہاتھ پاؤں سوکھے پانی کی طرح اکڑ گئے۔ جسم میں اس طرح کی حرکت ہوئی جیسے خزاں دیدہ پتیوں میں نسیم کے جھونکے سے ہوتی ہے۔ ایک منٹ بعد حباب دریا سے ہم آغوش ہو گیا۔ گلاب کی بوند روش ہوا پر کہیں سے کہیں جا پہونچی۔ اور اشہب زمانہ کی اڑائی ہوئی گرد کا ذرہ خاک نشین ہو گیا۔"

(۳) ... غرور و نخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی۔ محبت کی یہ باقاعدہ پسپائی نہ تھی بلکہ وہ سراسیمگی کی بھگدڑ تھی جو ہندوستان کی قسمت میں اکثر موقعوں پر مقدر رہی ہے۔ مادیت کے سامنے اکثر روحانیت یوں ہی بھاگ نکلتی ہے۔ تاریکی اسی طرح آفتاب کو زرد رو بنا کر چھپا دیتی ہے۔ کالی راتوں سے چاندنی رات اسی طرح فرار کر جاتی ہے سیاہ دراز زلفیں اسی طرح افشاں کی سنہلی لکیر کو ڈھک لیتی ہیں

ۂ لاسکتے تھے۔ اس منزل پر پہنچ کر عموماً ایسے ادیب تخلیقی کم اور تالیفی کام زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ ان کی گذشتہ شہرت کے پیش نظر
ر لوگ اور دیگر سرکاری و نیم سرکاری ادارے ان سے تعلیمی کتابیں لکھوانے یا ادبی تاریخیں مرتب کرانے کا کام لینے لگتے ہیں۔ اور ہمارے
ہمارے ادیب بھی اسی کو غنیمت جان کر قبول کر لیتے ہیں۔ تو ۱۹۵۹ء میں جب اُن سے پہلی بار ملا تو بے حد خوش ہوا۔ جلسے کے دوران میں
بار ان کی طرف خاص عقیدت سے دیکھا۔ غالباً اس میں میری دیرینہ عقیدت سے کہیں زیادہ ان کی پرکشش شخصیت کا بھی ہاتھ تھا ——
قامت، اکہرا بدن، سانولا رنگ اور ٹوپی، شیروانی و پاجامے کے علاوہ چہرے پر ایک خاص انداز سے ترشی ہوئی سفید داڑھی جو ان کے
لے رنگ کی وجہ سے ہی اور زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ انہوں نے میرے تئیں جس خلوص اور شفقت کا اظہار کیا وہ میں کبھی بھول نہیں
میرا خیال ہے لکھنے والوں کے 'پرانا' ہو جانے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ایک خاص منزل پر آ کر اپنے بعد کے لکھنے والوں سے
بھی پسندیدگی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ جب تک وہ اپنی تخلیقی قوت کے زعم میں مبتلا رہتے ہیں کسی نئے لکھنے والے کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے
کی تحریریں کبھی نہیں پڑھتے۔ ملاقات ہونے پر بھی ملنے سے گھبراتے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ میں حسینی صاحب سے
وقت ملا جب وہ اپنے ادبی سفر سے حاصل کی ہوئی املاک پر بیٹھے سستاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ تعلیم کی ذمہ داریوں سے بھی
سبکدوش ہو چکے تھے۔ اپنے شائع شدہ اور غیر شائع شدہ افسانوں کی ترتیب میں لگے رہتے تھے۔ اور صرف ایسے رسالوں میں لکھتے تھے
ن سے معاوضہ وصول ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد وہ ایک دو بار ہماری ادبی مجلس میں تشریف لائے۔ لیکن کوئی کہانی نہیں سنائی۔ اپنے دلکش رک رک کر باتیں
نے والے انداز میں دوسروں کی تخلیقات پر اظہار خیال کیا۔ باتیں کرتے ہوئے مسکراتے رہنا بھی ان کی ایک خوبی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے
کی کڑی سے کڑی تنقید بھی کسی کو بری نہیں لگتی تھی۔ اور جب اپنی تعریف سنتے ہیں تو منہ بند کر کے اس طرح ہولے ہولے ہنستے ہیں جیسے
بند برتن میں گھنگھرو بج رہے ہوں۔

ایک بار میں ان سے گھر پر ملنے گیا۔ لکھنؤ کے ایک پرانے علاقہ وزیر گنج میں تھانے کے پیچھے غوث گنج کے لکھوری اینٹوں
بے شمار گرے پڑے اور پرشکوہ و مضبوط مکانوں کے سلسلے میں وہ رہتے ہیں۔ اُس ماحول میں سے گزر کر جاتے ہوئے حسینی صاحب
قدامت اور قناعت کا شدید احساس ہوا۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں وہ رتن ناتھ سرشار یا سجاد حیدر یلدرم کے دنوں کا
ھنؤ نہیں ہے۔ پرانے لکھنؤ کے بعض کھنڈروں پر اور اس کے آس پاس میلوں پھیلے ہوئے وسیع علاقے پر ایک نیا لکھنؤ تعمیر ہو چکا ہے
نئے لکھنؤ میں رہنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دن کا بیشتر وقت نئی فضا میں گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن حسینی صاحب
بھی تک اُسی بوسیدہ ماحول میں رہ رہے ہیں۔ ان کا باہر کا کمرہ سخت سیلن زدہ ہے اور نیم تاریکی میں ڈوبا رہتا ہے۔ صوفوں اور کرسیوں میں بھی
یہ قدیم وضعداری جھلکتی ہے۔ ایسی وضعداری جسے دیکھ کر جی ڈوبنے لگے! وہ مجھے اوپر کے کمرے میں لے گئے۔ جہاں وہ
بیشتر وقت گزارتے ہیں۔ اُس وقت وہ ریڈیو پر کرکٹ کی کمنٹری سن رہے تھے۔ لہٰذا مجھے بھی سننے کی دعوت دی۔

کرکٹ سے ان کا اتنا گہرا لگاؤ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ وہ اپنے زمانے کے ایک مقبول ترین کھیل میں اتنی
دلچسپی رکھتے ہیں۔ کسی کھلاڑی کے چوکا یا چھکا مار دینے پر ہنسنے لگتے تھے۔ اُس وقت اُن کا چہرہ بھی مسرت سے چمک اُٹھتا۔ کرکٹ
کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کرتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ خود کبھی کرکٹ نہیں کھیلے، کبھی کوئی میچ بھی نہیں دیکھا لیکن صرف کمنٹری سن کر
اخبارات میں اس کھیل کی روداد پڑھ پڑھ کر ہی اس کے متعلق حیرت ناک حد تک معلومات جمع کر چکے ہیں۔ مثلاً انہوں نے مجھے دینکے
[illegible] کا تذکرہ کرتے ہوئے

اُن کے چہرے کی رگیں اس طرح تن گئیں جیسے وہ خود بھی کینچہ مَر، لنڈوال، ہال، ڈیوڈسن، ٹرومین، مانکڈ یا فضل محمود کی قسم کے کوئی بولر ہوں! اُن کی ایسی جذباتیت کے پیچھے مجھے ان کی زندگی بھر کی کڑی جدوجہد کی جھلک نظر آئی جو وہ معاشی اور ادبی محاذ پر کرتے رہے تھے۔ اپنی ادبی تحریروں سے انہوں نے اپنے کتنے ساتھیوں کو کئی موقعوں پر 'کلین بول' کر دیا تھا۔ اور اپنی شاندار بیٹنگ کے سامنے کبھی کسی بولر کی پیش نہ چلنے دی تھی۔ میلہ گھومنی، باسی پھول، رفیقِ تنہائی نام کے مجموعے اور افسانے یقیناً ناقابلِ فراموش یا قابلِ ذکر سنچریوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کھیل کود سے اُن کا اتنا گہرا انہماک دیکھ کر مجھے بار بار مشہور ناول نگار ہمنگوے یاد آتا رہا۔ جو بے حد خطرناک قسم کے کھیلوں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ کئی بار محاذِ جنگ پر چلے جانے میں بھی اُس نے دریغ نہیں کیا تھا۔ حسینی صاحب کے سامنے بھی جنگ ایسے کئی سخت صبر آزما مرحلے آئے۔ بلاشبہ کئی بار آئے۔ اس برِصغیر میں فرقہ واریت کا بھوت کسی بھی بڑے سے بڑے جنگی بھوت سے کم طاقت ور نہیں ہے۔ اس خطے میں رہنے والے ہم لوگوں نے ابھی تک کوئی باقاعدہ جنگ تو نہیں دیکھی ہے لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جنگی دیو جب دو یا دو سے زیادہ ملکوں میں تباہی مچا چکتا ہے تو اُس کے بعد وہاں دوستی، امن اور آشتی کی فضا بھی دوبارہ قائم ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مالی، معاشی، تجارتی اور تہذیبی رشتے تک پھر سے استوار ہونے لگتے ہیں۔ لیکن فرقہ واریت کا بھوت اتنے سخت قسم کے زہر میں بجھے ہوئے تیر چھوڑتا ہے کہ آنے والی نسلیں تک ایک دوسرے کا کبھی منہ دیکھنے کی روادار نہیں ہوتیں۔ علی عباس حسینی اس خطرناک بھوت کے ساتھ ہمیشہ سے نبرد آزما رہے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ کام اُس آدمی کے لئے زیادہ آسان ہے جو نارمل حالات میں پرورش پاتا ہے۔ جس کے ماحول میں فرقہ واریت نام کی کوئی چڑیا بھی کبھی اُڑ کر نہیں آتی ہے۔ لیکن جس ماحول میں ہمیشہ تنگ نظری، مذہبی عفریت، باہمی منافرت اور گندی سیاست کا ذکر چھڑا رہتا ہو وہاں رہ کر اگر کوئی شخص بڑے متوازن انداز سے سوچتا اور لکھتا اور بولتا ہے تو وہ انسان یقیناً ایک بڑا انسان ہے۔ حسینی صاحب کو میں نے ایسا ہی پایا۔ ان کی زندگی کی ان تمام دشوار گزار منزلوں کا مجھے اندازہ ہے، جنھیں انہوں نے بڑی بہادری اور ہمت سے سر کیا ہے۔

حسینی صاحب سے گھر پر ملنے سے مجھے ایک اور بات کا بھی انکشاف ہوا۔ ایک بہت ہی عجیب بات کا۔ وہ جاسوسی ناولوں کے بڑے رسیا ہیں۔ اتنے بڑے رسیا کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور یقین بھی نہیں کر سکتے کہ جس شخص نے ہمیشہ بڑی سنجیدگی سے لکھا جو کچھ لکھا زندگی کے قریب ہو کر لکھا اور بہت ہی صحت مند لکھا۔ اپنے معاشرے کی بہتر سے بہتر انداز میں عکاسی کی وہی شخص اپنے معمول کا کچھ وقت جاسوسی اور سنسنی خیز کتابیں پڑھنے میں صرف کیا کرتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی بہت ہی نیک شخص روزانہ چھپ چھپ کر شراب پیتا ہو، بھنگ پیتا ہو، گانجہ یا افیم کا نشہ کرتا ہو!

میں نے جاسوسی کتابوں کو کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ ایسی کتابیں پڑھنے والے بھی مجھے بے خدا سے معلوم ہوتے ہیں۔ جن پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

حسینی صاحب کا جی صرف علمی اور ادبی کتابیں پڑھنے میں کیوں نہیں لگتا۔ وہ انگریزی کی جاسوسی اور دہشت ناک فلمیں دیکھنے کے عادی کیوں ہیں؟ میں نے اُن سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔ نہ ہی مجھے قائل کر سکے کہ میں بھی ویسا ہی شغل اختیار کر لیتا۔ انہوں نے ایسی نشیلی کتابیں پڑھ کر یا فلمیں دیکھ کر کیا خود کبھی اسی قسم کی تحریریں لکھنے کی کوشش کیوں نہیں کی ہوگی؟ ان کی ادبی حیثیت اس قدر مسلّم اور مستحکم ہو چکی ہے تو کیا وہ اب کوئی ایسی چیز لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ جو ان کے سارے ادبی کیریئر کو خطرے میں ڈال دے! لیکن جب میں نے علی جواد زیدی کے ایک مضمون میں حسینی صاحب کے بارے میں یہ پڑھا کہ

وہ اکثر اپنے مسودات دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ لوگ نہ صرف اپنے نام جملہ حقوق محفوظ کرا لیتے ہیں بلکہ اُن مسودات کو اپنے نام سے شائع بھی کرا لیتے ہیں، تو کس بات پر یقین کرے کو میرا جی چاہا کہ وہ چوری چھپے جاسوسی ناول ضرور لکھتے ہوں گے جو اُن کے اپنے نام کی بجائے کسی دوسرے کے ہی نام سے شائع ہو رہے ہوں گے۔

بہت عرصہ ہوا میں نے حسینی صاحب کو ایک کہانی سنائی تھی۔ مالک اُسے سن کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کیوں؟ کیا واقعی میری کہانی اتنی متاثر کرنے والی تھی (جیسا کہ اُنہوں نے کہا تھا) یا اُس سے اُن کی جذباتیت کا پتہ چلتا ہے؟ بعض لوگ سچ مچ اس قدر جذباتی ہوتے ہیں کہ ذرا سے واقعے سے متاثر ہو کر اُن کا گلا رندھ جاتا ہے، آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ یہ بات میں نے راجندر سنگھ بیدی میں بھی دیکھی ہے کہ کہانی سنتے سنتے وہ آبدیدہ سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہانی اتنی جذباتی نہیں تھی، جس قدر علی عباس حسینی خود نظر آئے۔ اس سے اُن کے خلوص، شخصیت کی سادگی اور اُن کے اندر کے گداز کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا شخص ہر کہیں معمولی سی بات پر اسی طرح تڑپ اُٹھتا ہوگا۔ وہ تنہائی میں بھی اسی طرح روتا ہوگا۔

حسینی صاحب کے ساتھ ایک شب افسانہ میں شریک ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ انہوں نے صدارت بھی کی تھی اور افسانہ بھی سنایا تھا ان کے علاوہ ہم افسانہ نگار لوگ تعداد میں قریباً دس تھے۔ افسانہ تو اطمینان سے خود ہی پڑھنے کی چیز ہوتا ہے۔ اس کے جملوں کا، وقفوں کا اور سٹاپ کا بھی ایک خاص اثر ہوتا ہے جو قاری پڑھتے وقت قبول کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر افسانہ سنانے پر بھی اس قدر کامیاب ثابت ہو جیسا کہ پڑھنے سے اچھا لگتا ہے۔ ہم سب کے افسانے جیسا سمجھتا ہوں محض احتراماً خاموشی سے سنے گئے تھے۔ ہر افسانے کے بعد جو تالیاں بجائی گئی تھیں وہ بھی برائے احترام ہی تھیں۔ لیکن جب حسینی صاحب نے اپنا افسانہ 'مردے' سنایا تو انہیں ایک ایک جملے پر بے ساختہ داد ملی تالیاں بھی بجیں اور واہ واہ کا شور بھی بلند ہوا۔ میرے عزیز دوست اور نوجوان نقاد محمود ہاشمی نے ایک بار کہا تھا۔ علی عباس حسینی بنیادی طور پر داستان گو ہیں۔ میں نے اُن کے ساتھ اتفاق نہیں کیا تھا۔ اُس روز حسینی صاحب کو افسانہ سناتے اور داد وصول کرتے ہوئے دیکھا تو یقین کرنا پڑا کہ وہ ہمارے عہد کے بہت بڑے داستان گو ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر اور امرت لعل ناگر کو تو میں کئی بار ایک خاص انداز سے کہانیاں سناتے دیکھ چکا ہوں لیکن اُنہیں بھی اتنا کامیاب کبھی نہیں دیکھا، جس قدر حسینی صاحب کو۔ اُسی وقت مجھے یہ بھی خیال آیا تھا کہ اگر 'شب افسانہ' کی یہ بدعت چل نکلی تو ہمارے افسانہ نگار محض داد پانے کی خاطر ہی اپنے افسانوں کے لئے خاص طور پر ایک شاعرانہ تحریر اختیار کرنے لگیں گے۔ اور گا کر پڑھنے والے مشاعروں کی طرح ہمیشہ ایک خاص لب و لہجہ کی ریاضت کرنے پھریں گے۔ یقین کیجئے 'مردے' افسانہ میں پہلے بھی 'نقوش' میں پڑھ چکا تھا لیکن اُس وقت اس سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا جتنا خود حسینی صاحب کی زبان سے سُن کر۔

دو تین سال گذرے حسینی صاحب نے ایک طویل افسانہ لکھنؤ کے سیلاب پر لکھا تھا۔ عنوان تھا 'سیلاب کی راتیں' جو ہندوستان و پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت ماہنامہ 'شمع' دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اس کے ذریعے یہ افسانہ لاکھوں پڑھنے والوں تک پہنچا۔ اس کا موضوع محض سیلاب ہی نہیں تھا بلکہ جنس بھی تھا۔ تعجب ہوا حسینی صاحب جیسے معمر اور سنجیدہ ادیب کے قلم سے ایسا 'ذائقہ' کا افسانہ کیونکر نکلا۔ ابھی حال ہی میں ان کا ایک اور افسانہ "مُردوں کا حمام" شائع ہوا ہے۔ جس کا اصلی عنوان "ایک غسل خانے میں سب ننگے" تھا۔ لیکن رسالے کے نا سمجھ ایڈیٹر نے غسل خانہ اور حمام کو ہم معنی لفظ سمجھا۔ حالانکہ غسل خانہ اُردو میں مُردوں کے نہلانے کے لئے ہی وقف ہوتا ہے اور حمام زندہ لوگوں کے لئے۔ اِس افسانے میں حسینی صاحب نے غسل خانے کے ننگے لوگوں کو پیش کیا ہے۔ جسے پڑھ کر پھر وہی خیال اُبھرتا ہے کہ انہوں نے یکایک نوجوانوں کا سا انداز کیوں اختیار کر لیا ہے۔ عموماً نوجوان ادیب ہی ایسی چٹ پٹی تحریریں لکھا کرتے ہیں۔ حالانکہ عبداللہ حسین، قرۃ العین حیدر

اور شوکت صدیقی جیسے نوجوانوں نے 'اداس نسلیں'، 'آگ کا دریا' اور 'خدا کی بستی' وغیرہ سنجیدہ ناول لکھ کر خاصی بزرگی بھی دکھائی ہے۔ پریم چند کے بعد اُردو میں ضخیم اور سنجیدہ ناول کی سخت کمی رہی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے میں مذکورہ بالا ناول نگار کامیاب ہوئے ہیں، لیکن علی عباس حسینی جیسے صاحب طرز اور صاحب فکر ادیبوں سے یہ توقع رکھنا بھی عبث نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے وسیع تجربے کی بنا پر اُردو کو 'جنگ اور امن' جیسے عظیم ناول بھی دے سکتے ہیں۔ ایسے بڑے ناول کے لکھنے کے لئے یقیناً بہت لمبی فرصت چاہئے۔ سالہا سال کی فرصت سروس سے ریٹائر ہو جانے کے بعد حسینی صاحب کے پاس فرصت ہی فرصت ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا انہیں ٹیکسٹ بکیں ریڈیو کے فیچر اور ڈرامے، تحقیقی، علمی اور تنقیدی کتابیں بھی لکھنی پڑ جاتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے ایک ہزار سے زائد صفحات کی "تاریخ ناول نویسی" مکمل کی ہے۔ جسے شائع کرنے کے خیال سے ہر ناشر کو دل کا دورہ پڑنے لگتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا حسینی صاحب غیر متوقع طور پر تھوڑی سی فرصت نکال کر غریب خانے پر تشریف لے آئے۔ میں گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ ملیؔ اسٹوری کی چار سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہانپ گئے۔ میری غیر حاضری کا علم ہوا تو مجھے میری بیوی اور بچوں کے سامنے بزرگوں کے سے خاص انداز میں کوسا بھی۔ اور شاید مجھے 'گھُمّو' بھی کہا۔ واپس جانے سے پہلے اپنا نام بھی بتا گئے۔ میں گھر لوٹا تو میری چھوٹی بچی نے دیکھتے ہی فوراً کہا "آپ کے علی یا با حسینی آئے تھے۔" اُسے علی عباس حسینی نام اسی طرح یاد رہ گیا تھا۔ وہ اب بھی انھیں اسی نام سے یاد کرتی ہے اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں علی بابا حسینی کتنا پیارا نام ہے۔ جانا پہچانا۔ لیکن وہ چالیس چور کون سے ہو سکتے ہیں۔؟ جن پر اُنہوں نے بالآخر فتح پائی تھی۔ پھر غور کرتا ہوں تو حسینی صاحب کے ساتھ چپکے ہوئے چالیس کیا چالیس سے بھی زیادہ 'سردرد' نظر آتے ہیں۔ درآت تخلیقی ادب کے علاوہ کئی دوسرے لکھنے کے کام سر پر لے لینا، سردرد نہیں تو اور کیا ہے؟ ترجمہ، جاسوسی ادب، ریڈیو فیچر، ریڈیو کی ملازمت کے لئے جدوجہد، فلموں کی کہانیاں، معاوضے کی خاطر ہلکے پھلکے افسانے، مختلف قسم کی ادبی، نیم ادبی، سماجی، مذہبی، قومی اور یادگاریں قائم کرنے والی کمیٹیوں کی چیئرمین شپ یا رکنیت غرض کس کس کا ذکر کیا جائے۔ ایسا لگتا ہے علی بابا حسینی نے جو بے اندازہ شہرت، قدر و منزلت اور ادبی و قومی خدمت کے اونچے ڈھیر پر کھڑے ہیں۔ جلدی سے 'کھل جا سم سم' کہہ کر سکون اور عافیت کی طرف کھلنے والا دروازہ نہ کھول لیا تو اُن کے چالیس سردرد ان کو بے طرح گھیر لیں گے اور پھر کوئی چاہنے پر بھی ان کی مدد نہیں کر سکے گا۔

باقی، علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری کا طائرانہ جائزہ

تین سو روپلی "

" ارے اسی محمد واحد کو دیکھو۔ آٹھواں پاس ہے۔ تنخواہ کہنے کو باون روپیہ ماہوار پاتا ہے مگر
ہُن برستا ہے ہُن ...... اس کو کہتے ہیں برکت بیٹا۔"
"میں نے رشوت کی نئی تعبیر ماں کے منہ سے سنی ہے ..."

علی عباس حسینی کا یہ تازہ ترین افسانہ اور کامیاب ہوتا اگر وہ اس کی تنظیمی تراشیدگی کا خیال رکھتے اور بے جا طوالت سے کام نہ لیتے۔

بہرحال علی عباس حسینی کا اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک اونچا مقام ہے۔ وہ اپنی کامیابیوں اور ناکامیابیوں کے درمیان بلندی پر چڑھتے رہے ہیں اور وہ اس اونچائی پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے وہ نہایت نمایاں طور نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی

علی عبّاس حسینی کے افسانوں میں فطرت کا استعمال

ادب اور فطرت میں ایک گہرا تعلق ہے۔ ادیب اظہارِ خیال کے لئے قدم قدم پر فطرت کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرت سے گریز بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ فطرت کا ایک جزو ہے۔ ممکن ہے کہ آج یہ بات ہمارے ذہن میں واضح نہ ہو کہ انسان ابتدائے آفرینش میں فطرت ہی کا ایک جزو تھا کیونکہ انسان اپنی ہیئت اور شکل و شباہت کے اعتبار سے فطرت کی دیگر اشیاء سے کافی مختلف ہو چکا ہے تاہم اگر ہم کرۂ ارض کی آفرینش سے انسانی تہذیب کے آغاز تک کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت ہماری آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہے کہ انسان فطرت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس نکتہ کو BURTON PETER THOM نے اپنی تصنیف "DUST TO LIFE" میں نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور خاک سے حیات تک کی مختلف منزلوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اسکے علاوہ "NATURE AND MAN" کے مصنف PAUL WEISS کے اس قول میں بھی کافی صداقت ہے کہ انسان اپنی آفرینش میں حیوان سے قریب ہے اگرچہ وہ نوع میں اس سے مختلف ہے۔ مگر نوع میں مختلف ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل سے اسکا تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ دراصل آج بھی انسانوں اور فطرت میں مختلف باتوں میں ہم آہنگی موجود ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ ادیب ادب کی تخلیق کے وقت بار بار اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب کی کوئی شاخ فطرت کے استعمال سے گریز نہیں کر سکتی ہے۔ ادب کے ہر موڑ پر فطرت کسی نہ کسی شکل میں جھلک اٹھتی ہے۔ اور اظہار و بیان میں حسن اور رعنائی پیدا کر کے صفحۂ قرطاس پر قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیتی ہے۔ اور شاعری تو خاص طور سے فطرت کے پرتو سے "فروغ پذیر" ہوتی ہے۔ شاعری میں فطرت کس طرح مختلف رنگ روپ لے کر ابھرتی ہے اسکی بحث ہڈسن نے اپنی مشہور تصنیف AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF LITERATURE میں ON THE TREATMENT OF NATURE IN POETRY. کے عنوان سے کی ہے۔ اس کے علاوہ JOSEPH WARREN BEACH کی تصنیف THE CONCEPT OF NATURE IN NINETEENTH CENTURY ENGLISH POETRY. میں بھی اسی قسم کی بحث ملتی ہے۔ بہرحال شاعری میں فطرت بہت گہرائی کے ساتھ داخل ہے مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ نثر فطرت کے جلووں سے محروم ہے۔ دراصل نثر میں بھی ہم کو جابجا فطرت کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ EDMUND BLUNDEN نے اپنی تصنیف NATURE IN ENGLISH LITERATURE میں شعراء کے علاوہ چند نثر نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کے یہاں فطرت کے اثرات نمایاں ہیں اس سلسلہ میں جیفری، ٹیلر، میری رابرٹس

ہیری مئنفورڈ۔ چارلس واٹرٹن۔ ایڈورڈ نیومین۔ ٹامس ہڈ اور
ایڈورڈ ڈکنسن وغیرہ کا نام اس نے پیش کیا ہے۔ بہرحال یہ ممکن
نہیں ہے کہ نثر فطرت کی رنگینیوں سے عاری ہو۔ چنانچہ ہم انشائیہ
ناول۔ ڈراما اور افسانے میں فطرت کی دھوپ چھاؤں دیکھ سکتے
ہیں۔ اردو کے افسانوں میں بھی فطرت اپنے رخ سے نقاب
الٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہاں ہم کو اس بات کو تسلیم ہی کرنا ہوگا کہ اردو کے
افسانہ نگار فطرت سے کم و بیش متاثر ہوئے ہیں۔ مگر جن افسانہ
نگاروں پر انگریزی کی رومانوی تحریک کا گہرا اثر ہے۔ انھوں نے
فطرت سے زیادہ فائدہ حاصل کیا ہے۔ دراصل انگریزی کے
رومانوی شعرا کا خاص موضوع فطرت ہی رہا ہے۔ ورڈس ورتھ
کالرج۔ ساوتھے۔ اسکاٹ۔ بائرن۔ شیلی۔ کیٹس۔ ٹامس مور۔ کیمپ بل
لینڈر اور ٹامس ہڈ وغیرہ کی شاعری میں فطرت کسی نہ کسی رنگ
میں جلوہ طراز ہے۔ جب انگریزی ادب کا اثر اردو ادب پر پڑا تو
اردو کے ادیب بھی فطرت سے حظ حاصل کرنے لگے۔ شعرا کے
علاوہ افسانہ نگاروں نے بھی فطرت کے عارض و گیسو سے کھیلنا
شروع کر دیا۔ خاص طور سے سجاد حیدر یلدرم۔ قاضی عبدالغفار
نیاز فتحپوری اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں فطرت کی
رعنائیاں زیادہ بے نقاب نظر آتی ہیں۔

یہاں اس امر کا انکشاف ضروری ہے کہ علی عباس حسینی کے
افسانوں میں مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کی طرح فطرت کی فراوانی
نظر نہیں آتی ہے اسکا خاص سبب یہ ہے کہ علی عباس حسینی انگریزی
کی رومانوی تحریک سے متاثر نہیں ہیں بلکہ وہ اس تحریک سے متاثر
ہیں جس کے علمبردار پریم چند تھے۔ انھوں نے وہی ڈگر اختیار کی
ہے جس پر اس سے قبل پریم چند چل چکے ہیں۔ پریم چند کے یہاں
جو صداقت پسندی اور حقیقت نگاری ملتی ہے اسی کی جھلک
ہم کو علی عباس حسینی کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔

پریم چند کا خاص موضوع دیہات کا مطالعہ ہے۔ پریم چند نے
اپنے افسانوں میں اپنے مشاہدہ کا ثبوت دیا ہے۔ چونکہ وہ
بنارس کے ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے اسلئے انکو دیہات
کی کھلی ہوئی فضا کا جائزہ لینے کا کافی موقع ملا۔ علی عباس حسین
بھی غازی پور کے ایک گاؤں پیارہ میں پیدا ہوئے اسلئے
انکا بھی تعلق دیہات سے ہے۔ اسی بنا پر ان کو بھی دیہاتی ماحو
اور فضا کے مطالعہ کا موقع ملتا رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علی عباس حسینی دیہات کے
مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسکے باوجود ان کا خاص موضو
دیہات کے فطری مناظر کی عکاسی نہیں ہے بلکہ انکا اصل موضو
دیہات کے سماج کی عکاسی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی توجہ کا
اصل مرکز گاؤں ہے لیکن چونکہ گاؤں میں فطری مناظ
ہر چہار طرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں اسلئے علی عباس حسینی کے
آئینہ میں ان فطری مناظر کا بھی عکس پڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے
بہرحال حسینی کے افسانوں میں فطرت کی محض ضمنی حیثیت ہے
انکے یہاں فطرت بذات خود اہم نہیں ہے بلکہ افسانہ کی مختلف
ارتقائی منزلوں میں ہم کو اسکی ہلکی سی جھلک نظر آجاتی ہے۔

اگر ہم علی عباس حسینی کے مختلف افسانوں کا جائزہ لیں
ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ اگرچہ انکے یہاں فطرت کا استعما
محض ضمنی ہے۔ تاہم انکے افسانوں میں فطرت کے مختلف پہ
موجود ہیں۔ اور انہوں نے مختلف مواقع پر فطرت سے مدد لی
ان میں سب سے زیادہ روشن پہلو فطرت کی مصوری کا
علی عباس حسینی نے اپنے مختلف افسانوں میں فطرت کا نق
ایک مصور کی حیثیت سے کھینچ دیا ہے۔ چونکہ انہوں نے دیہ
مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اسلئے انکی تمام تصویر
مشاہدہ کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں کھینچی گئی ہیں۔ یہی وجہ
انکے بیانات پر ابہام کا کہرا نہیں چھایا ہوا ہے بلکہ ہر تصو
نہایت واضح، صاف اور روشن نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ ا
افسانہ کھیت میں برسات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے

" پانی برسنا شروع ہو گیا۔ اب چادر گرنے لگی۔۔۔
مینڈکوں نے غیں غیں غرغر کرنا شروع کیا۔ لونڈوں نے

لقاریاں ماریں کیچڑ اچھالی اور گانے ایک دوسرے کا پیچھا کرتے
نکل گئے۔ دونچا برسنے لگا۔ بوندیں اتنی اتنی بڑی تھیں کہ جسم
چوٹ لگتی تھی۔ گانوں بھر راستوں میں گھٹنوں گھٹنوں تک
بھر گیا۔" (میلہ گھومنی صفحہ ۱۲۷)

برسات کے اس بیان میں مشاہدات کی جھلکیاں موجود ہیں
لی عباس حسینی کی اس منظر کشی پر تصنع کا پردہ نہیں پڑا ہوا ہے
لہ ہر تصویر جانی بوجھی دیکھی بھالی معلوم ہوتی ہے جن لوگوں کا
تعلق دیہات سے ہے وہ اس بیان کی صداقت کو محسوس
سکتے ہیں ہندوستان کے گاؤں کی صحیح برسات ہے۔

"لاٹھی پوجا" افسانے میں علی عباس حسینی نے دیہات میں
کی شدت کا ذکر کیا ہے۔

"ہریا لاٹھی پر ٹیک لگائے آم کے باغ میں کھڑی تھی چار
چکے تھے مگر اب تک لوں چل رہی تھی ۔۔۔ کھیتوں میں سے
سیاہی مائل لہریں اٹھتی اور باغ کی طرف دوڑتی دکھائی دیتی
دلکے ان جھونکوں سے باغ کی جھاڑیوں اور سوکھی لمبی گھاس
میں پھنسے ہوئے انکے ہوئے خشک پتے کھڑکھڑاتے تھے۔"
(ہمارا گانوں صفحہ ۷۵)

اس بیان میں بھی علی عباس حسینی نے ذاتی مشاہدہ سے
کام لیا ہے۔ انہوں نے گانوں میں لو کے اثرات خود دیکھے ہیں
اسی لیے انہوں نے کھیتوں میں سے سیاہی مائل لہر کا اٹھنا محسوس
کیا ہے اس قسم کی منظر کشی بغیر مشاہدہ ممکن نہیں ہے

علی عباس حسینی عمیق مشاہدہ کے عادی ہیں اسلئے انکی
تصویر میں صداقت اور اصلیت کے جلوے نظر آتے ہیں۔
یہی نہیں کہ وہ صرف گانوں کے مناظر کی صحیح تصویر کھینچ سکتے ہیں
بلکہ جب کبھی وہ پہاڑی مناظر کی عکاسی کرتے ہیں تو اس میں
بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانہ "جذب کامل" میں
نینی تال کا ایک منظر پیش کرتے ہیں۔

"سامنے ہمالیہ کی سر بہ فلک چوٹیاں تھیں انکے رنگ برنگ کے
سر کہیں کاہی، کہیں سبز، کہیں دھانی، کہیں پیلے، جابجا سرمگیں

اور نیلگوں، ان پر اونچے اونچے ہرے بھرے درخت، ان درختوں کے
درمیان سپید چمکدار پتلی سڑکیں اور ان سڑکوں پر تماشائیوں
اور سیر کرنے والوں کا ہجوم غرض عجیب دل فریب منظر تھا۔
شام ہونے کو تھی۔ آفتاب ڈوب رہا تھا اسکی زرد شعاعیں
جدا ہوتے ہوئے کبھی پتھروں کو چومتیں، کبھی درخت کے پتوں کو
ہاتھ ملتے دیکھکر ان سے ملتیں۔ کبھی دھوئیں کے سے ابر کے
ننھے ننھے ٹکڑوں کے تعاقب سے گھبرا کر کبھی غار میں روپوش
ہوجاتیں لیکن کافر کالے بادل انکے پیچھے ڈھب پڑے تھے
کہیں بھی ان بے چاریوں کو دم لینے کا موقع نہ دیتے تھے۔
بالآخر عاجز آکر کرنوں نے جھیل میں پناہ لی اور چادر آب
اوڑھ لی۔" (رفیق تنہائی۔ صفحہ ۳۰)

مندرجہ بالا عبارت سے علی عباس حسینی کا عمیق
مشاہدہ ظاہر ہوتا ہے انہوں نے جس انداز سے پتھروں کے
مختلف رنگوں کا ذکر کیا ہے اور جس انداز سے سورج کے ڈوبنے کا
منظر پیش کیا ہے اس قسم کے مصوری مشاہدہ کے بعد ہی پیش
کی جاسکتی ہے۔ علی عباس حسینی منظر کشی کے وقت ورڈس ورتھ
کی طرح اپنے موضوع پر نظر جما کر (STEADILY FIXED
UPON HIS OBJECT) دیکھنے کے عادی ہیں۔ اسی لیے
وہ جزئیات نگاری میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

علی عباس حسینی نے فطرت کی مختلف اشیاء کو نہایت
غور سے دیکھا ہے۔ انہوں نے پرندوں کا بھی مطالعہ بنظر غائر
کیا ہے۔ "بھولی بہنی" افسانے میں انہوں نے چڑیوں کے
حرکات و سکنات کا جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"دو گھنٹے بعد ایک چھوٹی سی چڑیا آکر قریب والی شاخ پر
بیٹھی۔ تھوڑی دیر گردن ٹیڑھی کرکے اسے جھانک جھانک کر دیکھتی
رہی، پر کھجا کھجا کر سوچا کی۔ پھر ہمت کرکے پھدک کر اسی کے جسم پر
آرہی سینے پر اور بغلوں میں اپنے لیے غذا تلاش کرتی رہی۔
کوئی چیز نہ ملی۔ کھلتا ہوا اور بند ہوتا ہوا منہ دکھائی دیا۔
اور قریب آئی۔ شاید اس گڑھے میں کچھ ملے۔ لعاب دہن

ہونٹوں کے کناروں میں بھرا تھا۔ پتلی سی چونچ سے ذرا سا اٹھا کر چکھا، اچھا معلوم ہوا۔ لالچ بڑھا۔ جسارت کرکے ٹھوڑی پر آرہی۔ سوتے ہوئے انسان کے جسم پر ناخن کی خراش لگی۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں چڑیا تو اڑ گئی لیکن یہ اٹھ بیٹھا۔"

(رفیق تنہائی صفحہ ۶۴)

مل راج کے ساتھ جس طرح چڑیا اٹکھیلیاں کرتی رہی۔ یہ چڑیوں کی عین فطرت کے مطابق ہے۔ گرچہ اس قسم کا چڑیوں کا عمیق مطالعہ اردو ادب میں نیا نہیں ہے اسکے باوجود ہمارے یہاں اس قسم کی مثالیں بہت کافی نہیں ملتی ہیں۔ پرندوں کا مطالعہ اردو ادب کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔ بہرحال احمد علی شوق قدوائی نے اپنی نظم "چڑیاں" میں اسی قسم کے عمیق مطالعے کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی "چڑیا چڑے کی کہانی" میں چڑیوں کے عادات خصائل کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ علی عباس حسینی نے بھی اپنے افسانے میں چڑیوں کے حرکات و سکنات کو بغور دیکھا ہے اور انکے خصائل کی صحیح اور مکمل عکاسی کی ہے۔

چڑیوں کے علاوہ علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں کیڑوں مکوڑوں کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اردو ادب میں کیڑوں مکوڑوں کے مطالعہ کی زیادہ اہمیت نہیں ہے مگر یورپ میں اس قسم کے مطالعہ سے دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے اور انگریزی میں (ENTOMOLOGY) ایک باقاعدہ مضمون کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ لفٹننٹ کرنل سی ایچ لی نے اس موضوع پر "شکار" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے اور کیڑوں مکوڑوں کے متعلق کافی مفید معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ اردو میں اس قسم کے مطالعہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے مگر علی عباس حسینی نے کیڑوں مکوڑوں کے مطالعہ کی طرف توجہ کی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے تار بابو میں چیونٹیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

انہوں (تار بابو) نے دو جاندار پال رکھے تھے۔ ایک تو انکے کوارٹر کے ایک سوراخ میں چیونٹیوں کی ایک فوج تھی۔ انہوں نے ان کا نام "سیوک دل" رکھا تھا۔ وہ صبح و شام دونوں وقت تھوڑا سا آٹا، چاول یا شکر ان کے بل کے قریب ڈال دیتے تھے۔ پھر ان چیونٹیوں کی سرگرمی دیکھنے لگتے تھے۔ وہ بے تابی سے ان چیزوں کی طرف دوڑتیں۔ ایک ایک دانے پر تین تین چار چار لپٹ جاتیں پھر انکو بیلتی، ٹھیلتی، ڈھکیلتی، لڑھکاتی اپنے اپنے بل میں لے جاتیں۔"

(رفیق تنہائی صد ۲۷۰)

علی عباس حسینی نے مندرجہ بالا عبارت میں چیونٹیوں کی سرگرمی کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اس عکاسی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے چیونٹیوں کا مطالعہ براہ راست کیا ہے۔ انکا علم ذاتی ہے کتابی نہیں ہے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

اسی افسانے میں علی عباس حسینی نے ایک مکڑی کی شکل و شباہت اور اسکی عادت و خصلت کی تصویر کشی کی ہے۔

"کاہی جسم پر بنائی پتلی کالی لکیریں بھلی معلوم ہوتیں۔ ان (تار بابو) کی صورت دیکھ کر خوف سے سمٹ کر جالے کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ وہ اس طرح بے حس بنی تھی کہ جان پڑتا تھا کہ بالکل بے جان ہے ...... اس نے اپنے ننھے ننھے پاؤں پیٹ سے نکالے ذرا مٹکتی ہوئی چال چلی۔

(رفیق تنہائی صفحہ ۲۷۲)

علی عباس حسینی کی تیز نگاہوں نے مکڑی کے کاہی رنگ کو دیکھ لیا۔ انہوں نے یہ بھی دریافت کر لیا کہ اسکے جسم پر کالی لکیریں ہوتی ہیں انکو اسکا بھی علم ہے کہ مکڑی انسان کی صورت دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اور اپنے جالے میں سمٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر جب وہ چلنا چاہتی ہے تو اپنے پیٹ سے ننھے ننھے پاؤں نکالتی ہے۔ اس قسم کا مطالعہ اردو ادب میں عام نہیں ہے۔ علی عباس حسینی کے افسانے فطرت کو سمجھنے میں بڑی حد تک ہماری مدد کرتے ہیں۔

علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں فطرت کو بہ حیثیت پس منظر بھی استعمال کیا ہے۔ اردو ادب میں فطرت کا بطور پس منظر استعمال بہت عام ہے۔ اردو شاعری میں

خاص طور سے فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا جاتا ہے۔

اردو افسانوں میں بھی فطرت پس منظر کا کام کرتی ہے۔ علی عباس حسینی نے اپنے افسانے "سونیکھا" میں فطرت کو اسی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس افسانے میں برسات کا منظر پیش کرتے ہیں۔

"برسات کا زمانہ تھا۔ ابر کے ٹکڑے ہوا کے کندھوں پر سوار اڑے چلے جا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہر درخت سبز پوش تھا۔ ہر کھیت سبزے سے ڈھکا تھا۔ بڑے بڑے میدان زمردیں ہو رہے تھے۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آنند سنگھ منہ سے گنگناتے ادھر ادھر نظر ڈالتے موٹر سائیکل آہستہ رفتار سے لئے جا رہے تھے کہ شیوپور کی طرف سے دو سو آدمی کاندھوں پر لاٹھیاں رکھے ہل بیل لئے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔"

(رفیق تنہائی صفحہ ۷۷-۷۸)

دراصل علی عباس حسینی آنند سنگھ اور شیوپور کے لوگوں کا تصادم دکھانا چاہتے تھے مگر اس واقعہ کو اور زیادہ موثر بنانے کے لئے انہوں نے برسات کے زمانے کی مصوری کر دی ہے۔ انکا اصل مقصد برسات کے زمانے کی مصوری نہیں ہے۔ لیکن اسکے باوجود انہوں نے برسات کا صحیح نقشہ نہایت سادہ اور واضح انداز میں کھینچ دیا ہے۔ انکی اس عبارت کے پڑھنے سے اصل برسات کا لطف آنے لگتا ہے۔

علی عباس حسینی نے فطرت کا بطور پس منظر استعمال اپنے افسانہ "بوڑھا اور بالا" میں بھی کیا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے سردی کے موسم کی عکاسی کی ہے۔ جاڑوں کی ایک تاریک رات تھی جب بھمن اپنے دوست گوبری سنار کے بیٹے کھلاون کی طرف تیزی سے جا رہا تھا اس موسم کی منظر کشی کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"دسمبر کا مہینہ تھا۔ اندھیری رات تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں لوگ لحافوں اور کمبلوں میں گٹھری بنے پڑے تھے۔ مگر یہ ستر برس کا بڈھا لکڑی ٹیکتا ہوا جوان عاشق کی طرح کوچۂ محبوب کی طرف چلا۔"

(رفیق تنہائی صفحہ ۷۴)

یہاں علی عباس حسینی نے فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے اسکے ساتھ ہی اپنے بیان میں تضاد کی بھی کیفیت پیدا کر دی ہے یعنی بھمن ستر برس کا بڈھا تھا تاہم جاڑوں کی اس اندھیری اور ابر آلود رات میں وہ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے جا رہا تھا۔ اس تضاد نے بیان میں کافی زور پیدا کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب فطرت کا استعمال بہ حیثیت پس منظر اظہار تضاد کے لئے کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بیان میں ایک گہری تاثراتی فضا پیدا ہو جاتی ہے حسینی اس راز سے آگاہ اور باخبر ہیں۔

علی عباس حسینی کے افسانوں سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ فطرت انسان سے ہمدردی رکھتی ہے۔ دراصل جب انسان مادی دنیا سے اکتا جاتا ہے تو وہ فطرت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ رومانوی دور کے انگریزی شعراء نے اکثر فطرت کی چھاؤں میں اطمینان کی سانس لی ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد انگلینڈ پر مادیت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ اس مادیت سے فرار ہو کر یہ شعراء فطرت کی حسین چھاؤں میں سکون قلب حاصل کرتے تھے۔ اردو شاعری میں بھی فراریت کا یہ رجحان موجود ہے چونکہ فرار اور گریز ادب کا ایک دلچسپ رجحان ہے اسلئے ہمارے افسانوں میں بھی اس رجحان کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں چنانچہ علی عباس حسینی کے یہاں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ ان کے افسانے "بھولی بھٹنی" میں اسکی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مل راج جب اپنی بیوی کے طعنوں سے گھبرا کر گھر سے بھاگتا ہے تو وہ جنگل کی طرف رخ کرتا ہے اور فطری مناظر سے سکون دل حاصل کرتا ہے۔ علی عباس حسینی مل راج کے دل کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں۔

"دیہاتی زندگی فطرت و قدرت کے مناظر کو اپنوں سے زیادہ عزیز بنا دیتی ہے۔ لہلہاتے کھیتوں، جھومتے درختوں، چھلکتے تالابوں اور بہتے ہوئے نالوں میں کیا نہیں۔ جوانی کی امنگیں بھی ہیں، معشوق کی مست خرامی بھی۔ مدبھرے

اس عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مفلسی
پہ فطرت خود بھی پشیمان ہوئی جارہی تھی۔ دراصل حب انسان
اور فطرت آفرینش میں ایک ہی جوہر سے ہیں تو دونوں کے
جذبات میں ہم آہنگی ہونا ضروری ہے۔

اہل بصیرت کو فطرت کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں مگر
فطرت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو اسکا حسن ہے۔ ہیگل کو بھی
فطرت میں حسن نظر آتا ہے اور وہ تسلیم کرتا ہے کہ پہلا حسن فطرت کا
حسن ہے۔ اس حسن سے سب سے زیادہ رومانوی دور کے
انگریزی شعرا محظوظ ہوئے ہیں۔ خصوصاً کیٹس تو حسن فطرت کا
پرستار ہی نظر آتا ہے۔ اردو شاعری اور اردو افسانوں میں بھی
فطرت کے حسن کی عکاسی کی گئی ہے۔ علی عباس حسینی کے یہاں
بھی کہیں کہیں حسن فطرت کے جلوے نظر آتے ہیں اگرچہ ان کی
تعداد کم ہے۔ وہ جھولا افسانے میں فطرت کی عکاسی مندرجہ
ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:-

"ڈوبتا ہوا سورج کچھ ایسی چمک دمک دکھا رہا تھا اور اسکی
سنہری کرنیں دھان کی ہری ہری کیاریوں میں یوں پڑی ہوئی
تڑپ رہی تھیں کہ جی لوٹ پوٹ ہوا جاتا تھا۔"

(رفیق تنہائی صفحہ ۱۷۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عروس فطرت کے لب و رخسار
بہت دلکش ہیں مگر جب وہ غصہ کے عالم میں ہوتی ہے تو اس کا
چہرہ بہت غضبناک ہو جاتا ہے۔ آندھی، طوفان، لو، اور
تاریکی وغیرہ اسکی غصہ آلود جبین کی مختلف شکنیں ہیں۔
ان شکنوں کو ادیبوں نے محسوس کیا ہے انگریزی شاعر بائرن
فطرت کے اس پہلو کو زیادہ واضح کرتا ہے۔ اردو شاعری میں
جوش ملیح آبادی فطرت کے غیظ و غضب کا مطالعہ کرتے ہیں
علی عباس حسینی نے بھی اپنے ایک افسانے بیگار میں فطرت کے
غصہ کی عکاسی کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ہوا کے تیز جھونکے دونوں گورکنوں کے جسم میں تیر کی
طرح پیوست ہو رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ سوکھے
پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور پوری فضا ایسی بھیانک تھی کہ رونگٹے
کھڑے ہو جاتے تھے۔"

(میلہ گھومنی صفحہ ۲۶۹)

یہاں رات کے بھیانک چہرہ کی عکاسی موثر انداز میں
کی گئی ہے اس موقع پر فضا اس وجہ سے اور بھی بھیانک ہو گئی ہے کیونکہ
گورکن زمیندار کی قبر کھود رہے ہیں۔

فطرت پر انسانی نغمات کا بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ حضرت داؤدؑ
جب زبور سالحن کے ساتھ پڑھتے تھے تو فطرت کے مختلف افراد جھوم
اٹھتے تھے۔ اہل عرب کی حدی خوانی سے اونٹوں پر مستی کا عالم
طاری ہو جاتا تھا اسکے علاوہ یہ بات ہمارے تجربہ کے اندر ہے کہ
ہرن نغمہ سن کر اپنی وحشت بھول جاتے ہیں، سانپ جب تک گیت
سنتا رہتا ہے ایذا رسانی سے باز رہتا ہے۔ بھیڑیا بھی گیت سے
متاثر ہو کر حملہ کرنے کا خیال ترک کر دیتا ہے۔ بہرحال انسانی نغمات
کا اثر فطرت پر کچھ نہ کچھ ضرور پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے شعراً
اور نثر نگار دونوں واقف ہیں۔

علی عباس حسینی نے بھی اپنے افسانہ جھولا میں اس
حقیقت کا انکشاف کیا ہے انہوں نے بتایا ہے کہ رادھا اپنی سہیلی
کے ساتھ ایک گیت گا رہی تھی اور اسکے گیت سے فطرت
متاثر ہو رہی تھی۔

"وہی اکیلی نہیں گاتی تھی اسکا رواں رواں گا رہا تھا۔
یوں گا رہا تھا کہ پیپل کے پیڑ پر چہکنے والی چڑیاں چپ ہو گئی تھیں۔
اور آم کے پتوں میں چھپی ہوئی کوئلیں اپنی کوک بھول گئی تھیں۔"

(رفیق تنہائی صفحہ ۱۷۹)

ادب میں فطرت کے استعمال کا ایک یہ بھی طریقہ ہو سکتا
ہے کہ قدرتی مناظر سے تشبیہات و استعارات کو حاصل کیا جائے۔
دنیا کے ہر ادب میں ادیبوں نے قدرت کے خزانے سے تشبیہات و
استعارات کے موتی حاصل کیے ہیں۔ ہومر اور ورجل کے
اسلوب میں یہ عنصر کافی نمایاں ہے۔ انگریزی ادب کا دامن ان
عناصر سے مالا مال ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے شعرا نے بھی

کا سے کبھی میں اور عاشق کا ہر وقت رستے والا دلی ناسور بھی۔ ہاں حسرت دیکھنے والی نظر چاہیئے سو وہ مل راج کے پاس موجود تھی۔"

(رفیق تنہائی صفحہ ۶۲)

علی عباس حسینی نے اس افسانے میں آگے چل کر اور زیادہ واضح انداز میں فطرت کے ہمدردانہ رویہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مل راج اپنا غم بھلانے کے لئے ایک برگد کے درخت پر چڑھ جاتا ہے اور ایک چوڑی شاخ پر لیٹ جاتا ہے۔ اس کو کس قدر سکون حاصل ہوتا ہے، اسکا بیان حسینی کی زبان سے سنیئے۔

" ملشفی برگد کا درخت تھا جو کیوں کی طرح جٹا لٹکائے ہوئے ہے ...... پھر بڑھ وہ تھام کر اوپر چڑھ گیا اور ایک چوڑی شاخ پر سیدھا لیٹ گیا۔ جان پڑا جیسے دل پر کسی نے پھایا رکھ دیا پیڑ پر نہ لیٹا تھا۔ ماں کی گود میں تھا۔ وہی سکھ، وہی چین، وہی ٹھنڈک۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دیر تک روتا رہا کیا پھر وہیں تھک کر سو رہا۔"

(رفیق تنہائی ص۱۲۶)

حقیقت یہ ہے کہ غم زدہ دل کو فطرت کی گود میں اتنا ہی سکون حاصل ہوتا ہے جتنا ماں کی گود میں۔ علی عباس حسینی نے مل راج کے دلی جذبات کی صحیح عکاسی کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت انسان سے مصیبت کے وقت ہمدردی کا اظہار کرتی ہے مگر بعض اوقات وہ انسان کے زخم دل پر نمک پاشی بھی کرتی ہے۔ درحقیقت ادب میں یہ نظریہ بالکل نیا نہیں ہے تاہم دور جدید میں سائنس کے مطالعہ نے اس نظریہ کو اور زیادہ پختہ کر دیا ہے۔ سائنس کے مطالعے نے یہ بات انسان پر واضح کر دی ہے کہ فطرت اگرچہ ایک عظیم ماں (GREAT MOTHER) کی حیثیت رکھتی ہے تاہم وہ کبھی کبھی انسان سے بے اعتنائی برتتی ہے۔ اس رجحان کی جھلک خاص طور سے انگریزی شاعر ٹینی سن کے یہاں زیادہ نمایاں ہے اور اردو ادب میں بھی سائنس کے ان اثرات کا پرتو نظر آتا ہے۔ اردو شاعری اور اردو افسانوں میں جا بجا اسکی مثالیں ملتی ہیں۔ علی عباس حسینی نے بھی اپنے افسانوں میں فطرت کی بے رخی کو محسوس کیا ہے۔ جذب کامل افسانے میں مزملار کو جب محبت میں شکست ہو جاتی ہے تو وہ سکون قلب حاصل کرنے کے لیئے ایک باغ میں جاتا ہے مگر فطرت کے افراد اس سے ہمدردی کرنے کے بجائے اس پر طعنہ زنی کرتے ہیں چنانچہ وہ کہتا ہے۔

" جب کبھی تفریح کرتا باغ میں آ جاتا ہوں تو سنبل موافقانہ سر ہلاتی ہے۔ نرگس چشمک کرتی ہے۔ غنچے مسکراتے ہیں۔ پھول ہنستے ہیں۔ بلبلیں طعنہ زنی کرتی ہیں۔"

(رفیق تنہائی صفحہ ۳۸)

علی عباس حسینی نے اس موقع پر جذباتی مغالطہ (PATHETIC FALLACY) کی ایک حسین مثال پیش کر دی ہے۔ سنبل، نرگس، غنچہ، پھول اور بلبل کا رویہ مزدار کو غیر ہمدردانہ نظر آتا ہے۔ مگر یہ اسکا داخلی نقطہ نظر ہے۔ چونکہ مزدار بذات خود شکست خوردہ ہونے کے باعث مغموم ہے اسلیئے وہ محسوس کرتا ہے کہ باغ کی مختلف اشیا اس کے غم محبت کا مذاق اڑاتی ہیں۔

علی عباس حسینی نے جذباتی مغالطے کے علاوہ دیگر انداز سے بھی فطرت کا داخلی تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانہ "شکاریات کا" میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ جب انسان اپنی جگہ پر شرمندہ ہوتا ہے تو اسکو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکے جذبات کے رنگ میں ساری فطرت ڈوبی ہوئی ہے۔ احمد اور انکے دو ساتھی ہندوستان کی مفلسی پر بحث کر رہے تھے جہاں حاملہ عورتیں روزی کی خاطر خودکشی پر مجبور ہیں۔ ان تینوں نے اس تلخ حقیقت کو بری طرح محسوس کیا اس احساس کا اثر فطرت پر بھی پڑا۔ چنانچہ علی عباس حسینی لکھتے ہیں۔

" دھوپ تیز ہو گئی۔ زمین سوکھی جا رہی تھی۔ درخت اور سبزے سے شادابی غائب ہو رہی تھی اور گاؤں کے قریب مطلع پر غبار سا چھایا ہوا تھا۔

(باسی پھول صفحہ ۱۹۶)

فطرت کے گلشن سے تشبیہات و استعارات کی کلیاں چنی ہیں۔ افسانہ نگار بھی اپنی نثر میں حسن، قوت اور حرارت پیدا کرنے کے لیے فطرت سے تشبیہات و استعارات حاصل کرتے ہیں۔ اسکی مثالیں علی عباس حسینی کے یہاں بھی مل سکتی ہیں۔

علی عباس حسینی تشبیہات و استعارات کے لیے فطرت کی نازک اور حسین چیزوں کو منتخب کرتے ہیں۔ اس طرح سے انکے افسانوں میں لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے افسانے بھولی کھلنی میں منورما کے حسن کی تعریف کرتے ہیں۔

"چندرما کی طرح چمکتا ہوا چہرہ۔ ان میں سیاہ بڑی بڑی آنکھیں جیسے کنول میں بھونرا۔ چیدن کی کلیاں اور ملائم بانہیں۔ نازک پتلی کمر جیسے پھول کے نیچے ٹہنی۔ ٹانگیں کیلے کے تنوں کی طرح سڈول اور خوش نما۔ ان سب پر آفت سیاہ گھنے بڑے بڑے بال۔ کمر سے نیچے تک چوٹی ویسی ہی لٹکتی تھی جیسے چندن کی شاخ میں ناگن۔ پھر اداؤں میں پھاگن کی مدہوشی اور چیت کی جگر سوزی لگھ ملیا بھی تھی اور ساون کی گھٹائیں بھی۔

(رفیق تنہائی صفحہ ۵۸)

اس عبارت میں نزاکت، لطافت، رنگینی اور دلکشی موجود ہے۔ اسکے علاوہ علی عباس حسینی نے تشبیہات کے لیے فطرت کی جن اشیا کا انتخاب کیا ہے وہ سب ہمارے مشاہدہ کے اندر ہیں۔ اسکا سبب یہ ہے کہ ساری چیزیں ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ چاند، کنول، بھونرا، چیدن، پھول کی ٹہنی، اور کیلا وغیرہ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ پھاگن اور چیت کے مہینوں سے بھی ہم واقف ہیں۔ جب ان اشیاء سے انسانی خصوصیات کو تشبیہ دی جاتی ہے تو ہماری تخئیل کے سامنے اصل فطری مناظر رقص کرنے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی علی عباس حسینی حسن کی تعریف میں صرف استعارات سے کام لیتے ہیں۔ ان استعارات کا ماخذ بھی فطرت ہی کا سینہ ہوتا ہے۔ افسانہ گونگا ھری میں اندرا بچپن کی گلی سے نکل کر شباب کے محل میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسکا ذکر علی عباس حسینی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

کلی پھول بن گئی تھی۔ ہلال بدر کامل ہوگیا تھا۔ صبح کا شجر فی آفتاب اب مہر نصف النہار تھا۔

(باسی پھول صفحہ ۶۹)

مندرجہ بالا سطور میں علی عباس حسینی کی منظر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انکے افسانوں میں مناظر قدرت کے مختلف روپ ملتے ہیں۔ انہوں نے فطرت کی مصوری بھی کی ہے۔ انکے یہاں فطرت کا بطور پس منظر استعمال بھی ملتا ہے۔ انہوں نے انسان سے فطرت کی ہمدردی کا بھی اظہار کیا ہے۔ انکے یہاں فطرت کی بے اعتنائی کا بھی تصور ملتا ہے۔ انہوں نے فطرت کا مختلف انداز سے تجزیہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے فطرت کے حسین اور بدنما خدوخال بھی پیش کیے ہیں۔ انہوں نے انسانی نغمات کا اثر بھی فطرت پر دکھایا ہے۔ غرضکہ فطرت کے مختلف پہلو ہم کو علی عباس حسینی کے افسانوں میں نظر آجاتے ہیں۔ تلاش و تجسس کو جاری رکھیں تو دیگر پہلو بھی انکے یہاں مل سکتے ہیں۔ لیکن علی عباس حسینی کی منظر نگاری میں ایک عنصر کی کمی نظر آتی ہے۔ انکے یہاں فطرت سے والہانہ عشق اور حسیاتی محبت (SENSUMS LOVE) کا جذبہ بہت کم ملتا ہے۔ وہ جذبہ جو کیٹس کی شاعری کی جان ہے اس قسم کا جذبہ اردو کے چند افسانہ نگاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مثلاً نیاز فتحپوری نے اپنے مختلف افسانوں میں حسن فطرت کا ذکر اس انداز سے کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حسن فطرت میں غرق ہو جانا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک افسانہ "ایک مصور فرشتہ" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے چاندنی رات کا منظر کھینچا ہے۔

"ایک شب کا واقعہ ہے وادی قاف میں سفید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفانی عریانی بپا تھا۔ فرط تقطر سے پنکھڑیاں بیتاب و مشتق ہو گئی تھیں۔ چاند چادر سیمیں پھیلا کر اس میں اتر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ بس کر رہ گئی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی

زنجیریں ہیں اور حباب گھنگھروکے دانے جو مہک کے
سبک و نازک پاؤں سے فرش آب پر ہنگامہ رقص
نکل کر رہ گئے ہیں۔ کرۂ آب یا دشت نیلوفر میں جو کلی
کہیں کھل کر رہ گئی تھی اور اسکے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا
تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ناہید فلک کا بت کسی شوالہ میں
رکھا ہوا ہے"۔ (نگارستان صفہ ۱۱)

اس عبارت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نیاز فتحپوری جو
بقول مجنوں گورکھپوری "زبان کے ساحر ہیں"۔ فطرت کے حسن سے
والہانہ محبت کرتے ہیں اور اس محبت کا اظہار بھی انہوں نے
ساحرانہ زبان میں کیا ہے۔

فطرت سے والہانہ محبت کا یہی جذبہ حجاب امتیاز علی کے
افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے
"صنوبر کے سایے" میں کئی افسانے اس قسم کے ہیں جو فطرت سے
حیاتی محبت کے جذبہ کو بے نقاب کرتے خصوصًا "صنوبر کے سایے"
اور "طلوع و غروب" افسانوں میں فطرت سے محبت کا جذبہ کافی
ابھر آیا ہے یہاں انکے افسانے "طلوع و غروب" سے ایک اقتباس
پیش کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے چاندنی رات کی منظر کشی کی ہے

"وہ نہایت ہی رومانوی رات تھی گرم ایشیا کی ایک
فسوں انگیز رات۔ نیلے آسمان پر ماہ مئی کا چاند دم بخود تھا
ہواؤں میں درختوں کے شور کا شبہ سمندر نیند میں بہک رہا
تھا زرد لیموں کے درختوں پر گرم موسم کی بلبل رہ رہ کر درد دل
بیان کر رہی تھی۔ ساحل پر ایسی ہوش ربا چاندنی کو دیکھکر
جل پریاں بھی اپنی داستان عشق کو تازہ کر رہی ہونگی
ایسے وقت میں میں نوجوان شہزادے کو ایک عربی وضع کے
رنگین اور جالی دار دریچے میں لے آئی جس کے نیچے ایک
فوارے کا پانی وارفتگی کے عالم میں ابل رہا تھا"

(صنوبر کے سایے صہ۱۹۲-۱۹۳)

ایک تو چاندنی رات کا منظر پھر حجاب امتیاز علی کے قلم کی
سحر طرازی: ذکر اس پریوش کا اور پھر بیان اپنا" کے مصداق ہے

حجاب امتیاز علی کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود
چاندنی رات کا ایک جزو بن جانے کے خواہشمند ہیں۔

جس قسم کی منظر نگاری کے نمونے ابھی پیش کیے گئے ہیں
اس قسم کی منظر نگاری علی عباس حسینی کے یہاں نہیں ملتی ہے۔
علی عباس حسینی اپنے ایک افسانہ تار بابو میں چاندنی رات کا
ایک منظر پیش کرتے ہیں اسکو بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"چلتے وقت گرمیوں کی چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی،
معلوم ہوتا تھا ہر چیز دودھ میں نہائی کھڑی ہے۔ ایسا آنند آیا کہ
تھالی مال گاڑی میں جلدی سے رکھ کر باہر کھاٹ پر آکر لیٹ
رہے اور چاند سے آنکھیں لڑاتے لڑاتے سوگئے اور رات بھر
رادھا اور کرشن کی لیلا کے خواب دیکھتے رہے۔

(رفیق تنہائی۔ صہ۲۷۵)

ان تینوں اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نیاز
فتحپوری اور حجاب امتیاز علی کے یہاں چاندنی رات کا بیان
جس والہانہ انداز میں ملتا ہے وہ انداز علی عباس حسینی کے
یہاں موجود نہیں ہے۔ علی عباس حسینی کی منظر نگاری کی نوعیت
جداگانہ ہے۔ انکے یہاں فطرت کی اہمیت زیادہ نہیں ہے بلکہ
مقصدیت انکے افسانوں کی روح ہے۔ نیاز فتحپوری اور حجاب
امتیاز علی انگریزی کی رومانوی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔
اسلیئے انکے افسانوں میں فطرت بہت اہم ہیں۔ یہ فطرت سے
محبت ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اسکی پرستش بھی کرتے ہیں۔ اس
سجدہ ریزی سے وہ کیٹس کے آستانہ تک پہونچ جاتے ہیں۔
مگر علی عباس حسینی کے افسانوں پر فطرت حاوی نہیں ہے بلکہ
انکے مقصد کے تابع ہے۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں منظر نگاری اسی قسم کی
ملتی ہے جیسی پریم چند کے افسانوں میں۔ دراصل علی عباس حسینی
پریم چند کے صحیح مقلد ہیں۔ سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب"
میں صحیح لکھا ہے کہ "علی عباس حسینی کا فن پریم چند کے
باغ کا پھول ہے"۔ غالبًا منظر نگاری کے اعتبار سے بھی حسینی

پریم چند سے بہت قریب ہیں مثلاً علی عباس حسینی نے اپنے افسانے **سو بیگھہ** میں اس انداز سے ضمنی طور پر برسات کا نقشہ کھینچا ہے جس طرح پریم چند نے اپنے افسانے نئی بیوی میں برسات کی منظر کشی کی ہے۔ علی عباس حسینی کی منظر نگاری اعظم کریوی کی منظر نگاری سے بھی ملتی جلتی ہے۔ اعظم کریوی نے بھی اپنے افسانہ **کنول** میں بھادوں کے مہینے کا ذکر نہایت سادہ اور موثر انداز میں کیا ہے۔ منظر کشی کا یہی انداز ہم کو سدرشن کے یہاں بھی ملتا ہے۔ سدرشن نے اپنے افسانے **اعجاز محبت** کی ابتدائی سطور میں گرمی اور لو کا بیان جس انداز سے کیا ہے یہی انداز بیان ہم کو علی عباس حسینی کے افسانے **لاٹھی پوجا** کی تمہید میں ملتا ہے۔

در اصل پریم چند، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، اور سدرشن ایک ہی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ ان سارے افسانہ نگاروں کا مقصد سماج کی اصلاح ہے۔ یہ افسانہ نگار نہایت صداقت اور خلوص کے ساتھ سماجی اور معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں مگر ضمنی طور پر انکے یہاں مناظر فدرت کی بھی جھلک آجاتی ہے۔

بہر حال علی عباس حسینی کی منظر نگاری صداقت اور حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ منظر نگاری انکے مقاصد کی تکمیل میں مدد کرتی ہے۔ اگرچہ انکے یہاں منظر نگاری کی حیثیت بالکل ضمنی ہے تاہم انکی منظر نگاری میں مشاہدات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انکے افسانے کا ہر منظر انکے مشاہدے کا رہین منت ہے اسلیئے انکی منظر نگاری میں تصنع کا دھندلکا نہیں ملتا ہے بلکہ ہر گوشہ میں صداقت کی دھوپ چمکتی نظر آتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علی عباس حسینی کی منظر نگاری میں فطرت سے حیاتی محبت کی کمی محسوس ہوتی ہے مگر یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ حسینی نے فطرت کو خاص اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اس موقع پر اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم انکے نقطۂ نظر سے ہم آہنگی پیدا کریں اسکے بعد انکی منظر نگاری کا تجزیہ کریں۔ اس ہم آہنگی کے بعد انکی منظر نگاری کامیاب نظر آتی ہے۔

موقر تبصرہ

حسینی صاحب میرے سابقہ معاصرین میں ہیں مگر میرے موجودہ معاصروں کی صف اول میں بھی وہ اول نظر آتے ہیں۔ ان کی تخلیقات ادب میں ایک ایسی خیر معمولی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے کہ ہر لفظ "گویا" "یا انجاست" کی صدا دیتا ہے۔ جانتا ہوں کہ میرے لکھے ہوئے یہ فقرات ان کی قابلیت اور علمی اہلیت کا ہزارواں حصہ بھی ظاہر نہ کر سکیں گے۔

حسینی صاحب فضل و کمال میں جو بھی مرتبہ رکھتے ہوں مجھے اس میں عبور نہیں اور میری ہیچمدانی سے بالاتر بھی ہے۔ مگر اُن کے اخلاقی محاسن سے زندگی میں دوچار بار سابقہ پڑا تو وہ مجمع اخلاق و مکارم نظر آئے۔ اب یہ انکی فطرت کا تقاضہ ہو یا ان کے علم و فضل کا کرشمہ، ع

"نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمین"

کہاں میرا ایسا دور افتادہ اور گوشہ گیر فقیر، کہاں وہ جو سرمایہ داران فضل و کمال میں بھی ممتاز۔ ذرا بھی تکلف نہیں، خوش گوئی، خندہ پیشانی، انکساری اور دلجوئی ان کے قدم چومتے نظر آئیں۔ دیگر انسانی صفات میں بھی انھیں اکثر پر قدرت حاصل ہے۔

"حسینی نمبر" اپنی کامیابی کا خود ضامن ہے۔ ادارہ "صبح نو" قابل مبارکباد ہے۔

تاچیز
افقر موہانی عفی عنہ

ادارۂ جام، ۱۴ لاٹوش روڈ
لکھنؤ
۳ / نومبر ۱۹۶۴ء

علی عبّاس حسینی ——— ایک ممتاز فنکار

پریم چند نے ایک بڑے پتے کی بات کہی "ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا پڑے گا"

ٹیگور نے کہا "کہانی ایک ایسے حسین جھوٹ کی تعمیر ہے جس میں صرف سچائی ملے"

بے گناہ ڈریفس کو جب سزائے قید ہوئی تو "امیلی زولا" چیخ اٹھا "انصاف آج افسانہ بن گیا۔"

امیلی زولا کے ایک مخالف نے طنز کیا "تمہارے جھوٹے افسانوں میں تو انصاف ملتا ہے"

زولا نے جواب دیا "تم پہلی بار سچ بولے"

اور رشید احمد صدیقی نے فرمایا "ہندوستان کے تمام مضمون نگاروں کا طرز بیان، مضمون کی ابتدا و انتہا ایک ہی سی ہے۔"

〰〰 ⁘ 〰〰

حسن کا معیار، کہانی کا پلاٹ، جاگیردارانہ انصاف، سب بے بنیاد سب غلط، سب جھوٹ۔

لیکن جہاں "معیار حسن" بدلا کہ کہانی میں زندگی۔ جھوٹ میں سچائی اور انصاف میں ہٹ دھرمی نظر آئی۔

اور اگر رشید احمد صدیقی پر ایمان لایا جائے تو پھر معیار حسن کو کون بدلے، حسین جھوٹ کی عمارت میں سچائی کیسے رہے، امیلی زولا کی چیخ کون سنے خود رشید احمد صدیقی کو کون پڑھے اسلئے وہ بھی جھوٹ!

علی عباس حسینی نے جب جھوٹ کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت سچ بولنا یا تو جھوٹوں کا کام تھا یا دیوانوں کا۔ انگریز کا راج، کالج کی پروفیسری، آنکھیں بہت کچھ دیکھتیں، کان بہت کچھ سنتے۔ دل کہتا "سچ بول" عقل کہتی "فاقے کرنا پڑینگے۔ جیل جانا پڑے گا!" دل اور عقل نے مل کر فیصلہ کیا "جھوٹ لکھ اور سچ پیش کر" کیا ڈپلومیٹک فیصلہ تھا۔

علی عباس حسینی نے فیصلہ قبول کر لیا اور افسانے لکھنا شروع کر دیئے۔ ان کا پہلا افسانہ کون تھا یہ معلوم نہیں۔ ان کا آخری افسانہ کون ہوگا اس سے غرض نہیں۔ میں نے تو ان کا پہلا افسانہ ۱۹۳۰ء میں رسالہ عالمگیر کے سالانہ باخاص نمبر میں پڑھا تھا۔ رسالہ میں بہت سے افسانے اور خاکے تھے۔ جاسوسی، ہولناک، رومانی، طنزیہ، مزاحیہ رنگ برنگ کے افسانے اور خاکے۔ جہاں تک یاد آتا ہے اس میں ملا رموزی، حامد حسن قادری، ناکارہ حیدرآبادی، ایم اسلم، ظفر قریشی، شفیع اجمیری، حسن برنی، شوکت تھانوی، حسن عزیز جاوید۔ اور علی عباس حسینی سبھی تھے۔ بات پرانی ہوگئی۔ نہ وہ افسانے یاد رہے اور نہ انکے پلاٹ۔ لیکن دو افسانے کرداروں سمیت مجھے اب تک یاد ہیں۔ کرداروں کی گفتگو بھی اگر لفظ بہ لفظ نہیں تو ملتی جلتی ضرور یاد ہے۔ ایک حسن عزیز جاوید کا "کیف نغمہ" اور دوسرا علی عباس حسینی کا "عدالت"۔

جو نام اوپر گنائے ان میں سے کچھ تو اللہ کو پیارے ہوگئے اور

بہتوں کی "تخلیقیں" ادب کو پیاری ہو گئیں لیکن ایک ضدی نے ان میں سے کوئی درجہ قبول نہیں کیا۔ علی عباس حسینی!

ہاں تو بات تھی عدالت کی۔ آپ خدانخواستہ کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن خدا کے فضل و کرم سے مجھے یہ سعادت کئی بار نصیب ہو چکی ہے۔ قسم ہے رب عظیم کی مجسٹریٹ کی بھی کیا شان ہوتی ہے" نہ صفائی کے گواہوں کی سنتے ہیں نہ مدعا علیہ کے وکلا کی بس پولیس کا بیان آیت قرآنی (افسانہ عدالت)

اس افسانے کے اور کردار تو نام بنام یاد نہیں آتے لیکن ایک تھی بدلیا جولاہن

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

مرادوں کے دن ہوں یا نہ ہوں لیکن جوانی کی راتیں ضرور تھیں اور دوسرے تھے میاں شوکت حسین کسی کالج کے تعلیم یافتہ، حسین و خوبرو، چوڑے چکلے اور حسن مردانہ کی آبرو اور سب سے بڑی صفت یہ کہ ایک بڑے زمیندار کے اکلوتے بیٹے جنہیں اپنے آبا و اجداد سے وراثتہً یہ حق پہونچا تھا کہ اپنی رعایا سے بیگار لینے کے علاوہ انکی بہو بیٹیاں بھی استعمال میں لائیں۔ چنانچہ میاں شوکت حسین نے بھی بدلیا جولاہن کی جوان راتوں میں داخل ہونے کی بہت سی کوششیں کیں لیکن وہ کمبخت پھندے میں نہ آئی۔ زمیندار کے صاحب زادے تو اس گھمنڈ میں تھے کہ دھنیے جولاہوں کی بہو بیٹیاں ان کا جیب خرچ ہیں۔ اور بدلیا کو تو فخر کرنا چاہیئے تھا کہ ایک زمیندار کے بیٹے یعنی آئندہ ہونے والے زمیندار کی نظر انتخاب اس پر پڑی ہے اور اسلیئے اُسے ہاتھ باندھے انکے شبستاں میں داخل ہو جانا چاہیئے تھا لیکن بدلیا اپنی ابھرتی ہوئی مخمور جوانی کے باوجود عفت و عصمت کی موہوم قدروں کی پرستار تھی اور کسی ناجائز رشتے کے لیئے تیار نہ تھی۔ رہا نی جتنی دور نظر آئے پیاس اتنی ہی بڑھتی ہے۔ میاں شوکت حسین کے حلق ہوس میں کانٹے پڑنے لگے۔ بدلیا نے شرط نکاح پیش کی۔ زمیندار کا بیٹا اور ایک جولاہن سے بیاہ! آسمان نہ پھٹ پڑتا لیکن جوانی جب نیندیں حرام کرنے پر آتی ہے تو جولاہن اور سیدانی میں تمیز نہیں کرتی۔ اور ہوس کا جنگل جب پھیلتا ہے تو لالہ آسے یا گوریا، دونوں برابر۔ چنانچہ شوکت حسین کی ہوس اور بدلیا کی جوانی نے خفیہ نکاح کا سہارا لیا۔ نتیجہ ایک لڑکا۔

پیاس بجھ گئی تو کنوئیں کو کون یاد رکھے۔ شوکت حسین کے ذہن سے بدلیا محو ہو گئی۔ لیکن بدلیا ایک دن حاملہ حالت میں زمیندارنی کے گھر پہونچی۔ زمیندارنی صاحبہ تختوں کے چوکے یا پلنگ پر بیٹھی ہوئی شاید ڈلی کتر رہی تھیں۔ پوچھا "کیسے آئی بدلیا؟" بدلیا کا منہ فق کیسے کہے کہ ایک جائز بہو کی حیثیت اور حق لے کر آئی ہے۔ دانتوں پسینہ آ گیا۔ نوکرانیاں اور ماما‌ئیں چیخیں "تجھے بیگم صاحب کے سامنے آتے شرم نہیں آئی؟ شوکت میاں کو خراب کیا اور کالا منہ لے کر آئی ان کی ماں کے پاس" وغیرہ وغیرہ۔ زمیندارنی بھی برس پڑیں۔ "قطامہ۔ بیسوا۔ میرے بچے کو خراب کیا؟ بدلیا میں عورت جاگی۔ اس کا حق جاگا۔ احساس حق نے جرأت دی تلملا کر بولی۔ "انہیں بلا یئے۔ ان سے پوچھ لیجئے۔ میں ان کی بیاہتا اور آپ کی بہو ہوں۔ اللہ رسول گواہ ہے!" زمیندارنی کا چہرہ آگ بھبوکا ہو گیا۔ "نکال دو اس مال زادی کو"

اور وہ مال زادی نکال دی گئی۔ دھکے دیکر نکالی گئی۔ ٹھوکریں مار کر نکالی گئی اور اس طرح نکالی گئی کہ وہ صرف زمیندارنی کے یہاں سے ہی نہیں بلکہ اپنے گھر اور گاؤں سے بھی نکالی گئی۔

میاں شوکت حسین زمیندار اور ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ ایوان عدالت میں بیٹھ کر انصاف بانٹنے لگے۔ انکی دھوم دھڑکے سے شادی بھی ہو گئی اور اس شادی سے ایک لڑکے کے باپ بھی بن گئے۔ لیکن ایک دن اس لڑکے کو کوئی چرا لے گیا۔ اس واقعہ کو بھی پندرہ بیس سال بیت گئے۔ شوکت حسین بہ حیثیت مجسٹریٹ ایک سخت گیر و سخت مزاج حاکم تھے۔ ایک دن ایک غریب عورت نے خبر دی کہ گاؤں میں ایک جگہ سیندھ لگنے والی ہے۔ یہ مجرم کو گرفتار کرنے کے لیئے خود تیار ہو کر عورت کے ساتھ ہو لیئے۔ راستے کے سناٹے اور تاریکی میں دیکھا کہ کوئی شخص سیندھ لگا رہا ہے۔ انہوں نے ڈانٹا اور مجرم کو جا پکڑا۔

جیب سے ہتھکڑی نکالی اور پہنا دی۔ عورت بولی "تو پہچانو اپنے کھوئے ہوئے سپوت کو"

شوکت حسین نے سپوت کو تو نہیں پہچانا لیکن بدلیا کو پہچان لیا۔ کچھ دیر دونوں میں بحث ہوئی۔ انہوں نے بدلیا کو پستول کا نشانہ بنا دیا اور مجرم کی ہتھکڑیاں کھول کر کہا۔

"بھاگ جا یہاں سے!"

مجرم تو بھاگ گیا لیکن بھلے گئے بھلے گئے پستول کی ایک اور گولی چلنے کی آواز سنی۔ مدعی و مدعا علیہ کائنات کی سب سے بڑی عدالت کے سامنے حاضر تھے۔

~~~ ⁝ ~~~

افسانہ عدالت کا کسی قدر طویل اختصار میں نے اسلیئے پیش نہیں کیا کہ وہ علی عباس کا بہترین افسانہ تھا۔ انکا "آئی سی ایس" جو شاید عالمگیر ۱۹۳۱ کے خاص نمبر میں شایع ہوا تھا عدالت کے مقابلہ میں اپنے کرداروں اور ماحول کو زیادہ اجاگر کرتا ہے۔ اس افسانے کا اختصار تو صرف اسلیئے پیش کیا کہ یہ علی عباس حسینی کا پہلا افسانہ تھا جس سے میں متاثر ہوا۔ اس میں ہمیں وہ سانچہ مل جاتا ہے جو مصنف کی قوت مشاہدہ، قدرت زبان و بیان اور ذہن و فکر کی ان گہرائیوں کی غمازی کرتا ہے جو بعد کو "آئی سی ایس" "جھبو کا ہیرو" "میلہ گھومنی" اور "باسی پھول" جیسے عظیم افسانوں میں ایک ارتقائی کیفیت لیئے ہوئے نظر آتی ہیں۔

~~~ ⁝ ~~~

علی عباس حسینی کوئی خاص پیغام لے کر نہیں آئے اور نہ انہوں نے کبھی دنیائے افسانہ میں پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ وہ متواتر بدلتی ہوئی ادبی فضا سے بھی نہ متاثر ہوئے نہ مرعوب۔ انہوں نے پڑھنے والوں کی مانگ سے مجبور ہو کر یا ناقدانہ واہ واہ کے لیئے اپنا مقصد و انداز قلم نہیں بدلا۔ ان کی دنیا بہت وسیع نہ سہی لیکن جتنی بھی ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا ہے۔ ان کی دنیا میں سیکڑوں مفلسوں، فاقہ زدوں، بیماروں، اہیروں، چماروں، جولاہوں اور انکی بوسیدہ کٹیاؤں کے درمیان کہیں کوئی زمیندار نظر آتا ہے اور اسکی بڑی سی حویلی بھی ملتی ہے۔ وہ زمیندار اور اسکے حواریوں کے کردار کو بڑے کھٹکے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اور مفلس و فاقہ کش، نادار و بیمار، جولاہے اور چمار گڑگڑاتے ناک رگڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب افسانہ ختم ہو جاتا ہے تو کوئی بدیا جولاہن۔ کوئی سکھوا۔ کوئی ملگوا۔ کوئی بنجارن، کوئی چنو منو یاد رہ جاتے ہیں۔ اور زمینداروں کے بارے میں صرف اتنا یاد رہ جاتا ہے کہ:۔

"زمینداری اور انصاف سے باپ بیٹے کا بیر ہے"

علی عباس ایک حساس ماحول کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے اس ماحول کے دل کی دھڑکنیں صرف سنی ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کی ہیں۔ مائیکل اینجلو کی سنگ تراشی و مصوری کی طرح انکا دائرہ قلم کا مرکز بھی شعوری یا تحت الشعوری طور پر متعین ہو چکا ہے زمیندار کا ظلم، رعایا کی مصیبت۔

اپنے بہت سے ہم عصر افسانہ نویسوں سے وہ ایک لحاظ سے ممتاز ہیں۔ وہ دوسروں کی طرح چارلس ڈکنس۔ ٹامس ہارڈی۔ اناطول فرانس۔ میکسیم گورکی۔ موپساں۔ ٹالسٹائی۔ ترگنیف یا چیخوف وغیرہ کے رہین طرزِ خیال نہیں۔ ان کا طرز اپنا ہے۔ ان کے افسانوں کا ماحول اور انکے کردار خالص ہندوستانی ہیں۔ ان کے افسانے ہندوستانی معیشت کے ایک بڑے گھناؤنے رخ پر طنزِ لطیف کا کام کرتے ہیں اور وہ رخ ہے عام زمیندارانہ ذہنیت کا!

میں نے اردو اور انگریزی اور بنگلہ کے کم و بیش دو ڈھائی سو افسانے پڑھ ڈالے ہیں اسے خود ستائی نہ سمجھیئے۔ میں افسانے سبق حاصل کرنے کے لیئے نہیں پڑھتا۔ تفریح اور وقت کاٹنے کے لیئے پڑھتا ہوں۔ لیکن جو افسانے خود بخود سبق دے دیں۔ ذہن پر پڑے ہوئے کہروں کو صاف کر دیں۔ راہی کو ایک نئے موڑ سے آشنا کر دیں۔ نظروں کو دور سے ایک نئی منزل دکھا دیں۔ حسن کی رائج قدروں اور قدروں کے معیار کو بدل ڈالیں۔ جہاں کمزور مظلومیت میں قوی اور قوی رعونت میں کمزور نظر آنے لگیں

سوزوکی تاکیشی - لکچرار شعبۂ اردو
ٹوکیو یونیورسٹی آف فارین اسٹڈیز

رفیق تنہائی پر چند تاثرات

برصغیر پاک و ہند میں اردو کے عمدہ افسانہ نویسوں کی کوئی کمی نہیں ہے مگر ان میں علی عباس حسینی کا درجہ نمایاں طور پر بلند ہے۔ ویسے تو انہوں نے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ ان میں کچھ افسانے رسالوں میں ہیں اور کچھ تین مجموعوں باسی پھول، میلہ گھومنی اور "رفیق تنہائی" کی صورت میں میری نظر سے گذرے ہیں۔ ان میں سے ہر افسانے میں اپنی خوبی اور خصوصیت موجود ہے پھر بھی مجھے رفیق تنہائی، طمانچہ، بہو کی ہنسی، بڑھا اور بالا اور ایک ماں کے دو بچے یہ پانچ افسانے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ خاص طور پر "رفیق تنہائی" کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ یہ اردو افسانے کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

رفیق تنہائی کوئی بارہ صفحے کا چھوٹا سا افسانہ ہے پھر بھی اسکا پلاٹ نہایت ہی دلکش اور مکمل معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنے کو تو غریب قربان میاں کے المناک واقعہ کی داستان ہے مگر مصنف نے اس میں جس مہارت سے کام لیا ہے وہ بے مثل ہے۔ حسینی صاحب کے افسانوں میں جو خصوصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ انکی عمدہ سیرت نگاری ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے کردار کو بعض خصوصیات یا کسی ایک اہم خصوصیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔ یہاں قربان میاں کو جو صورت اور سیرت عطا کی گئی ہے وہ اس افسانے کو کامیاب بنانے کا باعث بن گئی ہے۔

رفیق تنہائی میں قربان میاں کے نفسیاتی ارتقا کی تمام منزلیں ایسے عمدہ طور سے بیان کی گئی ہیں کہ پڑھنے والے درد کی کسک اور تڑپ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یوں تو انکے افسانے کا سب سے بڑا راز انکا درد سے بھرا ہوا دل بتایا جاتا ہے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انکے افسانے لوگوں کو حسرت و غم کے عالم میں پہنچاتے ہیں

انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے درد و غم، رنج و حسرت کی داستان سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اس قسم کا افسانہ لوگوں کے دل پر گہرا اثر ڈالے اور لوگ اس افسانہ کے لکھنے والے کے تصور یا نظریہ حیات سے متفق ہو جائیں یعنی میرا مطلب ہے کہ رفیق تنہائی کو پڑھ کر لوگوں کا دل درد و غم سے ضرور بھر آتا ہے۔ اور وہ قربان میاں کے المناک واقعہ پر ہمدردی محسوس کرنے لگتے ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ قارئین حسینی صاحب کے قنوطیت پسند خیالات سے بھی اتفاق کریں۔ ناامیدی انسان کو سست اور پست ہمت بنا دیتی ہے اور اسکو کسی عملی جنبش کی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ جب یہ دریافت کیا جائے کہ افسانہ نویس افسانہ کیوں لکھتے ہیں۔ یعنی اپنے افسانے کو کس منشا کی بنا پر تصنیف کرتے ہیں تو اس اہم سوال کا جواب کئی طرح دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں سماج کی اصلاح بھی کچھ نہ کچھ ضرور مقصود ہوتی ہے۔ یوں تو افسانے میں زندگی کے ایک خاص واقعہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اسکو بطور نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے ہم اپنی عقل، سمجھ، ماحول اور تجربہ کے مطابق کوئی نہ کوئی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

اردو افسانے کے ارتقا میں سماجی اصلاح کا یہ اہم مقصد قریب قریب ہر افسانہ نگار کے یہاں نمایاں نظر آتا ہے۔ بعض افسانے اس مقصد کو سامنے رکھ کر ہی لکھے گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ افسانے میں جان اور کشش بالکل ختم ہو گئی۔ کچھ بھی ہو افسانہ پند و نصیحت کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس میں معاشرتی اصلاح مقصود کیوں نہ ہو پھر بھی اسکو افسانہ نویسی کے فن اور اصول قائم رکھنے کی کوشش تو کم سے کم درکار ہے۔

اب حسینی صاحب کے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو عام طور پر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانوں میں زندگی کے ہر پہلو پر بات کچھ زیادہ پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً بھولی بھنسی بیگمیں (جو کہ اپنے افسانوں میں دو بہن۔ عمدہ افسانے ملے جلتے ہیں) کے انجام دیکھیے رفیق تنہائی کا انجام ملاحظہ فرمائیے کہ فرمان میاں اپنے رفیق تنہائی کے ساتھ جل کر مر جاتا ہے۔ میں اس حقیقت سے انکار کرنے والا نہیں ہوں کہ اس افسانے میں مصنف نے نفسیات پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور اس میں شروع سے آخر تک فرمان میاں کے ذہنی ارتقا کی ہر منزل اپنے مخصوص طریقے سے بیان کی ہے۔ اس لحاظ سے اگر مصنف کو فنوطیت پسند قرار دینے کے ساتھ ماہر نفسیات بھی کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ البتہ میرا خیال غلط ہو سکتا ہے۔ اگر علی عباس خود اس بات پر ذاتی خیال کا اظہار فرمائینگے تو بڑی عنایت ہوگی کہ انہوں نے رفیق تنہائی کس خیال کی بنا پر تصنیف کیا ہے اور اس میں کیا کہنا چاہا تھا یعنی انکا منشا کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ رفیق تنہائی سے مراد وہ کتے کا پلا ہے جسکو فرمان میاں اپنی پڑلی جھونپڑی سے اٹھا کے لے آیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرمان میاں کی حقیقی رفیق تنہائی نانی کے گھر کی چار دیواریں تھیں جن سے وہ باتیں کر سکتا تھا شکایات سن سکتا اور لپٹ کر رو بھی سکتا تھا۔ انکے مقابلے میں کتے کے پلے کو رقیب کا درجہ حاصل تھا۔

کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ علی عباس حسینی کے کئی عمدہ افسانوں میں رفیق تنہائی کا نام سر فہرست لکھے جانے کے قابل ہے۔ حسینی صاحب نے اپنے جن افسانوں کی بنا پر اپنی زندگی ہی میں کلاسیکی حیثیت حاصل کر لی ہے ان میں سے ایک رفیق تنہائی بھی ہے۔

وفا ملک پوری کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ

شاہراہِ وفا

قیمت صرف ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- مکتبہ صبح نو - پوسٹ بکس ۴۲ - پٹنہ ۴

ایک معاشرتی

اور

اصلاحی ناول

جذبۂ دل

جسے

معین شاہد نے لکھا

اور شمع بک ڈپو نئی دہلی نے چھاپا۔

جذبۂ دل

قیمت : چھ روپے

شمع بک ڈپو

آصف علی روڈ، نئی دہلی

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

حسینی صاحب اور ان کا نظریۂ فن

حسینی صاحب اپنے افسانوں کے ایک مجموعہ "ہمارا گاؤں" میں اپنا بیان "مسور طبیعت" کی وجہ سے نہیں بلکہ "احوال واقعی" کے طور پر لکھا ہے۔ اس بیان میں انہوں نے آرٹ اور آرٹسٹ کے متعلق چند باتیں بڑے پتے کی بتائی ہیں۔ اگرچہ انکا یہ بیان انتہائی مختصر ہے لیکن اس اختصار میں انہوں نے اپنے نظریہ فن کو بڑی خوبی سے ظاہر کر دیا ہے۔ جس سے حسینی صاحب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔ وہ لکھتے ہیں:-

"میں نے ایک مصور کی طرح جو کچھ دیکھا اسکی مرقع کشی کر دی ہاں کبھی کبھی دکھتی رگوں پر بھی انگلیاں رکھ دی ہیں اور کہیں کہیں مداوا کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ لیکن میں آرٹ کو پروپیگنڈا بنانے کا قائل نہیں اور نہ افسانہ نگار کی جگہ سیاسی لیڈر بننے کا خواہشمند۔ میں تو اس طرح کے انسان بنانا چاہتا ہوں، جو "بیوقوف" والے "نصراؤ" تھے یا "نور و نار" والی "ذکیہ"۔

قدامت پرستی و ترقی پسندی کے تصادم اور شور میں اکثر انسانیت کی شیریں آواز دب جاتی ہے۔ میں اسی کے گن گانا چاہتا ہوں۔ خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔ خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔

یار ہے وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بمبئی یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء　　علی عباس حسینی

حسینی صاحب کے یہ چند الفاظ افسانہ اور افسانہ نگار کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار کو مصور سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مصور کا کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ دیکھے اسکی تصویر ہو بہو کھینچ دے۔ لیکن افسانہ نگار صرف مصور ہی نہیں ہوا کرتا وہ مصور سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ مصور محسوسات کی ہو بہو تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ انسانی خیالات و جذبات اسکے احاطۂ فن میں نہیں۔ گویا افسانہ نگار کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مرقع کشی کے ساتھ ساتھ احساسات و جذبات کی بھی تصویر کھینچنے میں کمال رکھتا ہو۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ مخصوص مادی حقیقت کی مصوری کے مقابلے میں کسی ذہن کی مصوری نہایت دشوار گزار اور خار دار وادی ہے۔ لیکن باکمال افسانہ نگار کے لیے یہ خار دار وادی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

سماج کی دکھتی رگیں پہچاننا اور انکے علاج کی طرف ہلکے ہلکے اشارے کرنا ایک اچھے افسانہ نگار کا فرض ہے۔ حسینی صاحب نے اپنے افسانوں میں جس خوبی کے ساتھ یہ فرض ادا کیا ہے اور سماج کی دکھتی رگوں کو پہچان کر جس دلسوزی کے ساتھ علاج تجویز کیا ہے اس نے انہیں تمام افسانہ نگاروں میں ممتاز و منفرد بنا دیا ہے۔ انکے ہلکے ہلکے اشارے بیمار اور گم کردہ راہ سماج کے لیے منارۂ نور ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اسکی روشنی میں اپنے دلوں کی تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکو اپنی بیماری کی ہلاکت خیزی اور اسکی اصل وجہ معلوم ہو جاتی ہے وہ اسکو دور کرنے کی جد و جہد شروع کر دیتا ہے

حسینی صاحب ایک ماہر نباض اور حاذق طبیب کی طرح مریض کا علاج فطری طور پر کرتے ہیں۔ انکی ہمدردی و محبت، انکی انسان دوستی، زبان و بیان کی شیرینی مریض کے لیے مسیحائی کا کام کرتی ہے۔ اسکے دل کو قوت اور روح کو بالیدگی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہر افسانہ میں مسیحائی کا یہ اعجاز پایا جاتا ہے۔ اور یہ اعجاز بغیر وسیع تجربے اور گہرے مشاہدے کے ناممکن ہے۔ جب تک افسانہ نگار اپنے ماحول سے پوری طرح واقف نہیں ہوتا، زمانے کے رجحانات اور تقاضوں سے باخبر نہیں رہتا، سماج کے احساسات و خیالات کا غائر نظر سے مطالعہ نہیں کرتا، حیات انسانی کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اس وقت تک اسے اپنے فن پر عبور حاصل نہیں ہو سکتا لیکن فن پر عبور حاصل ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ فن کے اظہار پر دسترس ہونا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر اسکے پاس الفاظ کا ایسا خزانہ نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کے خیالات و احساسات، واقعات و واردات کا بخوبی اظہار کر سکے تو اسکے سارے تجربات و مشاہدات گونگے کا خواب بن جاتے ہیں اسلیے اسکو مطالعۂ فطرت و انسانیت کے ساتھ ساتھ مطالعۂ ادب کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ادب خود اسکے ملک، اسکی زبان ہی کا نہ ہو بلکہ دوسرے ممالک اور دوسری زبانوں کا بھی ہونا چاہیئے۔ وسعت مطالعہ سے فکر و نظر میں بلندی آتی ہے۔ اظہار خیالات میں ندرت و کشش پیدا ہوتی ہے۔ وسعت مطالعہ کے بعد افسانہ نگار کو بیان کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہو۔ زبان کی شیرینی بہت کچھ لہجے کی ادائیگی پر منحصر ہوتی ہے الفاظ کتنے ہی نرم، ملائم، اور رسیلے ہوں لیکن اگر لہجہ میں ان الفاظ کی ادائیگی کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ بے اثر ہو جاتے ہیں۔ حسینی صاحب کے یہاں زبان و بیان کی ہم آہنگی موجود ہے۔ یہ صفت کچھ تو خداداد ہے اور کچھ انکی معلمی کی وجہ سے۔ خداداد اسلیے کہ وہ بچپن ہی سے افسانہ نگاری کے کوچے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کا پہلا افسانہ پژمردہ کلیاں بہت کچھ انکے دلی جذبات کی غمازی اور انکے مستقبل کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں۔ اس افسانہ کو پڑھ کر ہی دیدہ وروں نے سمجھ لیا تھا کہ پژمردہ کلیوں کا مالی ایک نہ ایک دن انہیں شگفتہ و شاداب اور

پر بہار پھول گلستان ادب میں لگائے گا جن کی خوشبو اور رنگت سے ساری ادبی فضا رنگین و معطر ہو جائیگی۔ معلمی نے انہیں غور و فکر کرنے کی عادت ڈالی۔ ہر بات کو صاف صاف سمجھا کر کہنے کا خوگر بنایا۔ ذہن انسانی کو سمجھنے کا موقع ملا۔ جس سے انہیں نفسیاتی تجزیہ کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اسلیئے وہ جو بات کہتے ہیں سوچ سمجھ کر، جچی تلی بات کہتے ہیں۔ اور اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی زبان میں بڑی ٹھاٹھ اور بیان میں بڑی گھلاوٹ ہے۔ زبان و بیان کی یہ خوبی انہیں بلا شرکت غیرے خسرو اقلیم ادب (افسانہ کی حد تک ہی سہی) بنا دیتی ہے۔

ظاہر ہے جو فن کار ان خصوصیات کا حامل ہو وہ کسی پروپگنڈے کو کس طرح جائز سمجھ سکتا ہے۔ جس نے اپنے خون جگر سے ادب کو اعجاز بخشا ہو وہ ادب کو پروپگنڈے کے بدنام کوچے میں داخل ہونے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ اسکے نزدیک آرٹ آرٹ ہے پروپگنڈا پروپگنڈا۔ بہترین آرٹ پروپگنڈے کا محتاج نہیں۔ اور جب آرٹ پروپگنڈے کا سہارا لیتا ہے تو وہ آرٹ نہیں رہتا بلکہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے جدید نظریات اور غلط رجحانات نے آرٹ کا مطلب یہی سمجھ لیا ہے کہ وہ بغیر پروپگنڈے کے نہ قائم رہ سکتا ہے نہ ترقی کر سکتا ہے اس جذبہ میں بغیر کسی محنت و مشقت کے سستی شہرت حاصل کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ ترقی پسندی کا مطلب ادبی گمراہی کبھی نہیں ہو سکتا۔ علم و فن کے لیے مقرر کارہے ملبوس فرنگ نہیں۔ یہ مقرر بڑی محنت سے حاصل ہوتا ہے لیکن شہرت کے بھوکے فنکار اپنا اور اپنے فن کا پروپگنڈا کرنے کے لیے غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے کو بڑی آسانی کے ساتھ خود ہضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے سیاسی نظریات کو ادب میں پیش کرنے اور قارئین کو اپنا ہم خیال بنانے کو پہلا فرض سمجھتے ہیں۔ کبھی ادب اور زندگی کا نام نہاد نعرہ لگا کر کبھی ترقی پسندی اور روشن خیالی کے پردے میں کبھی قدامت پرستی کے خلاف زہر اگلنے میں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی خاص نظریہ کے تحت کچھ لکھا جائے گا اور اس نظریہ کو

عوام پر جبریہ نافذ کرنے کی کوشش کی جائیگی تو اذہان میں وسعت اور ہمہ گیری کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ اسکی اہمیت و افادیت محدود ہو جاتی ہے۔ وہ کسی ایک طبقہ، ایک جماعت کے خیالات کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ اسکی انسانیت کسی "ازم" کے تلے دب جاتی ہے اسکی انسان دوستی کا جنازہ نکل جاتا ہے اور اس میں نہیں جانبدارانہ خیالات و جذبات کو جگہ ملتی ہے جن میں ادبیت کم اور پروپیگنڈا زیادہ ہوتا ہے۔ جس میں فنکار کا خلوص رخصت ہو جاتا ہے اور وہ ایک ادیب کے بجائے پروپیگنڈسٹ بن جاتا ہے۔

موجودہ دور میں پروپیگنڈا اور سیاست لازم و ملزوم ہیں اور اسی لیے حسینی صاحب نے سیاسی لیڈر بننے سے اجتناب کیا ہے گویا سیاسی لیڈر انکے نزدیک ایک افسانہ نگار سے کمتر حیثیت رکھتا ہے۔ یا وہ جانتے ہیں کہ افسانہ نگار تب تک افسانہ نگار ہے صرف افسانوں سے مطلب رکھے سیاست سے نہیں۔ یا افسانہ نگاروں کو اپنے افسانوں میں سیاست کی انسانیت کش اور پرپیچ راہوں سے پرہیز کرنا چاہیئے مطلب کچھ بھی ہو۔ ان کا یہ عزم بہت مبارک اور قابل فخر ہے۔ اور انہوں نے یہ فیصلہ بڑے گہرے مشاہدے اور وسیع تجربے کی بنا پر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زمانہ کے حالات و انقلابات، عصری رجحانات اور تقاضوں کو کھلی آنکھ سے دیکھا کھلے دماغ سے سمجھا اور بہت غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ہر جدید نظریہ ہر جدید خیال خواہ وہ کتنا ہی عوامی اور بین الاقوامی ہو قابل عمل نہیں ہوتا اور نہ اسکی پیروی کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔

انہیں دو عملی پسند نہیں ہے وہ دورخی پالیسی کے بھی سخت خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر نئی چیز جو چمکتی ہو سونا نہیں ہوا کرتی۔ انہیں اسکا بھی تجربہ ہے کہ قدیم و جدید کی کشمکش و کشاکش میں انسانیت کی شیریں و دلکش آواز بے اثر ہو جاتی ہے۔ وہ آئین نو سے ڈرتے نہیں ہیں اور نہ طرز کہن پر سختی سے قائم رہنے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ پہلے کوہ و صحرا میں وہ جاذبیت، وہ وسعت و بلندی باقی نہیں رہی اسلیئے دیوانوں کے لیئے نئے کوہ و صحرا کی ضرورت ہے لیکن وہ قدامت کو بے ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ روایت سے بغاوت کرنے کو منع نہیں کرتے مگر روایت کی اہمیت پر بھی یقین رکھتے ہیں اسلیئے وہ افسانہ نگاری میں کسی سیاسی میل کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ افسانہ نگاری ہنسی کھیل نہیں۔ افسانوں (کہانیوں) نے انسانوں کی ارتقائی منزلیں طے کرنے میں سب سے زیادہ رہنمائی کی ہے۔ حیات انسانی اور افسانوں کا تعلق جسم و جان کا تعلق ہے۔ زندگی کے حقائق کو جس خوبی کے ساتھ افسانوں نے بیان کیا ہے وہ کسی اور صنف سے ممکن نہ ہوسکا۔ انسانی زندگی جن جن راہوں سے ہو کر گذری ہے یا آئندہ گذریگی، اس نے جن جن نظریات کو اپنایا ہے یا اپنائے گی، اس نے جن جن طریقوں سے دنیا کو سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی ہے یا آئندہ کرے گی ایک افسانہ نگار کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے۔

ستارہ شناس نہیں لیکن مردم شناس ضرور ہو۔ وہ [illegible] اور اسکے متعلقات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا حیات [illegible] کوئی گوشہ اس سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ اسکی نگاہوں میں کرن مکان کے جلوے بھی ہوتے ہیں اور اسکے دل میں سارے جہان کا درد بھی اسلیئے اگر کوئی افسانہ نگار صرف ایک نظریہ کی تبلیغ کرتا ہے صرف ایک ازم ISM پر زور دیتا ہے۔ صرف اپنا اور اپنے فن کو مشتہر کرنے کی جائز و ناجائز کوشش کرتا ہے تو وہ کچھ اور ہو تو ہو افسانہ نگار یقیناً نہیں۔

اسی طرح جو شخص اپنے افسانوں میں سیاست کا کھیل کھیلنے اپنے سیاسی نظریات کو استوار کرنے کی کوشش کرے۔ اپنے سیاسی عقائد اور خیالات کو افسانوں کی شکل میں پیش کرکے پڑھنے والوں کو اپنا ہم خیال اور ہم مشرب بنانے کو اولین فرض سمجھے وہ افسانہ نگار سے زیادہ سیاسی لیڈر ہے اسکا صحیح مقام سیاست ہے افسانہ نہیں۔ اس زاویۂ نگاہ سے اگر اردو کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو اردو کے بیشتر افسانے سیاسی بنی فسٹو اور

افسانہ نگار سیاسی بیدار نظر آئینگے۔ اور حسینی صاحب کی اس نتیجہ طلبی کے ساتھ ساتھ حقیقت و صداقت بھی پائی جائیگی۔

حسینی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں تو اس طرح کے انسان نا چاہتا ہوں جیسے شوہر والے ناصر ماموں تھے یا نور و نار الی ذکیہ۔"

افسانہ کا انسان سے اور فرشتہ سے بہتر کردار ہوا افسانہ س طرح انسانیت کو فرشتوں سے بھی زیادہ بلند اور محترم بنا دیتا ہے سکا عملی نمونہ بھی پیش کرچکا ہے ناصر ماموں حسینی صاحب کے ردیک بہترین انسان ہیں اسلئے انکا دل ہمدردی و محبت خلوص و پیار کا خزانہ و منبع ہے ناصر ماموں زمیندار ہوتے ہوئے بھی ظلم و استحصال کا پیکر نہیں انہوں نے اپنے اسامیوں کے دلوں پر راج کیا۔ وہ انسان انسان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ وہ

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

عمل کرتے تھے۔ وہ ایک عام انسان کی طرح زندگی بسر کرتے تھے ان کی یہی خوبی تھی کہ بوڑھے بچے مرد عورت چھوٹے بڑے اپنے پرائے غریب امیر سب انکی عزت کرتے تھے سب ان کو ایک شفیق بزرگ اور سچا ہمدرد سمجھتے تھے عجز و انکسار سب کا دل لینا سب کو اپنے برابر سمجھنا بلکہ اپنے سے بہتر سمجھنا انکی فطرت تھی

حسینی صاحب نے یہ نمونہ صرف افسانے ہی میں پیش کیا ہے بلکہ وہ خود اس کے جیتے جاگتے نمونہ ہیں ان سے مل کر جو سکون قلب میسر ہوتا ہے جو روح کو بالیدگی اور دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے اسکا اندازہ ان سے ملاقات کرنے والوں کو بخوبی ہے۔ انکا اعلیٰ اخلاق لوگوں کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ ایک دفعہ ملنے کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک شریف انسان سے ملا ہے انکی اخلاقی شخصیت کا عکس ناصر ماموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے ناصر ماموں میں کچھ خامیاں ہوں آخر وہ بھی انسان تھے۔ انسان خطا و نسیان کا مرکب ہوتا ہے اسلئے وہ کیسے اس سے بری ہوسکتے ہیں۔ لیکن چند معمولی خامیوں سے انسانی عظمت پر حرف نہیں آسکتا۔ اسی طرح حسینی صاحب نے عورتوں کے لیے بھی ایک مثالی عورت ذکیہ پیش کی ہے۔ جو اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور جس نے اپنے باپ کی دل و جان سے خدمت کی۔ جب تک اسکی شادی نہیں ہوئی وہ ایک سلیقہ مند فرماں بردار سنجیدہ اور ہوشمند لڑکی رہی۔ شادی ہو جانے کے بعد اس نے اپنے شوہر کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس نے اپنی ہر خوشی شوہر کی خوشی پر قربان کردیا۔ اسکی نظر میں اسکا شوہر بدکردار اور شرابی ہوتے ہوئے بھی قابل احترام ہے۔ اس نے دکھ درد کو جھیلے لیکن زبان سے اف نہ کی ہمیشہ اپنے شوہر کیلئے دلی دعائیں کرتی رہی۔ اس نے اپنی جان دے دی لیکن شوہر پر کسی قسم کا نہ تو الزام لگایا نہ کبھی اسکے خلاف حرف شکایت زبان سے نکالا۔ ہوسکتا ہے کہ اس روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانہ میں اتنی زیادہ شوہر پرستی قابل قبول نہ ہو اور ایسی بیوی جہالت و بے وقوفی کا پتلا سمجھی جائے۔ لیکن حسینی صاحب جس معاشرہ کے ساختہ و پرداختہ ہیں اور جس ماحول میں انہوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی ہے اس میں شوہر پرستی عیب نہیں ہے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذکیہ کا صبر و ضبط انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ برے کو برا نہ کہنا کہاں کی انسانیت ہے لیکن اس قسم کی خامیوں سے حسینی صاحب کے نظریہ انسانیت پر حرف نہیں آتا۔

آخر میں حسینی صاحب نے قدامت پرستی و ترقی پسندی کے تصادم میں انسانیت کی شیریں آواز کے دب جانے پر افسوس کیا ہے۔ قدیم و جدید کی کشمکش نئی نہیں ہے ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ہوشمند قدامت سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی قدیم روایات کا احترام کرتے ہوئے جدید روایات کو اپناتے ہیں۔ حسینی صاحب کا یہی مسلک ہے۔ برخلاف اسکے اپنے کو ترقی یافتہ سمجھنے والے افسانہ نگار قدامت کا مذاق روشن خیالی کے نام پر اڑاتے ہیں۔ وہ سماج کی بیماریوں کا علاج اس طرح کرتے ہیں کہ

(بقیہ صفحہ ۱۵۰ پر)

شبنم حسن نونہروی

حسینی صاحب کا فن اور شخصیت

کسی بھی فنکار کے سلسلہ میں اسکی ذاتی اور خلقی صلاحیتوں کے علاوہ یہ بات بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ وہ کس عہد میں پیدا ہو اور اس عہد کے حصہ میں کیا آیا ہے۔ سابقہ رہا ہے کیونکہ کسی عہد میں بھی پیدا ہونے والے نظریات، سوانح، واقعات اور تعبیرات شخصیت کو نہ صرف ایک مخصوص راہ پر لگاتے ہیں بلکہ فنکاری کے لیے خام مواد کا بھی کام دیتے ہیں۔ فنکاری دراصل شخصیت اور ماحول کے جدلیاتی روابط اور امتیازی عمل و ردعمل کا بے ساختہ مظہر ہے جس کا ادراک خاموش مگر تیز وجدان و شعور کی مدد سے ہی ممکن ہے۔ شخصیت اور ماحول کے روابط قطعی ہونے کے باوجود دنیائے تنقید کا عقدہ لاینحل یا حیران کن معمہ ہیں۔ جس پر قرنوں سے غور و فکر جاری ہے مگر ہنوز روزِ اول ہی معلوم ہوتا ہے۔ غالبًا ابھی صدیوں تک یہ کہنا ممکن نہ ہو سکے گا کہ شخصیت اور اسکے عہد کے دائرے کہاں اور کب ایک دوسرے کے متوازی ہوتے ہیں۔ اور کیونکر اور کس مقدار میں ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں۔

فنکار کے سلسلہ میں جب بھی ماحول، عہد یا عصر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو کبھی کبھی اس سے مراد خالص خارجی یا موضوعی حقیقت نہیں ہوتی ہے اسلئے کہ خارجی حقیقت اگر تمام عوامل کو نظر انداز کر کے کارفرمائی کی مستقل ماہیت کی حامل فرض کر لی جائے تو نہایت ہی غلط اور پریشان کن نتائج ظاہر ہونے لگیں گے۔ اسلئے کہ ایسی صورت میں یا تو کسی مخصوص عہد میں فنکاروں کی غیر معمولی کثرت ہو جانی چاہیئے یا پھر سرے سے انکا وجود ہی نہ ہونا چاہیئے۔ دراصل ایک ہی عہد میں اور یکساں قسم کی تربیت حاصل کرنے والوں میں بعض کا فنکار بننا اور بعض کا نہ بن سکنا یہ یاد کرانے کے لیے کافی ہے کہ شخصی ادراک اور شعور عہد کی بنیادی اہمیت ہے اور اسلئے جہاں تک ادب یا فنکاری کے سمجھنے اور پرکھنے کا تعلق ہے حقیقت کو معروض و موضوع کا مشترک فرض کرنا ضروری ہے۔

حسینی صاحب کی فنکاری کے بنیادی عوامل بھی معروض و موضوعی روابط کے درمیان تلاش کیے جا سکتے ہیں اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کو کس طرح اور کس قدر محسوس کیا۔ اور اسکے ورثہ سے کس قدر فائدہ اٹھایا۔ حسینی صاحب نے جس زمانہ میں ہوش سنبھالا اسے تغیر پذیر ہندوستان کا ایک ایسا عہد کہا جا سکتا ہے جو ابھی اپنے نقطۂ عروج سے قابل لحاظ حد تک پیچھے تھا چنانچہ حسینی صاحب کی فنکاری بھی ارتقا پذیر ہندوستانی زندگی کے نقش قدم پر چلتی رہی اور خود اپنے نقطۂ عروج پر اس وقت پہونچی جبکہ آزادی سے پہلے والے ارتقاء نے اسے نقطۂ عروج کو چھوا۔

زندگی سے حسینی صاحب کو جو سبق ملا وہ بڑا پیچیدہ زرخیز تھا۔ انہوں نے ایک ایسے اوسط درجے کے گھر لینے میں آنکھ

کھولی جب کا دا ہنا ہاتھ علم اور بایاں زمینداری تھی۔ انکی ابتدائی نشو ونما قصباتی زندگی کے سادہ مگر مسائل سے معمور ماحول میں ہوئی۔ انکے ذہن کے ابتدائی نقوش اسی ماحول کے ابھارے ہوئے ہیں جو آج کل کے ترقی پذیر ہندوستان میں بھی کسی کبھی دوسرے ماحول کے مقابل میں ہندوستانی معیشت و زندگی میں زیادہ اہمیت رکھتاہے۔ علمی گھرانے میں آنکھ کھولنے کے باوجود وہ کبھی مسند پر نہیں بیٹھے اور زمیندار کے فرزند ہونے کے بعد بھی دروازہ پر بیٹھ کے زمیندارانہ شان و شوکت کی نمائش میں انہوں نے دلچسپی نہیں لی بلکہ شروع ہی سے وہ عوامی و قصباتی زندگی کے مشاہد شریک بن گئے۔ انہوں نے میلے ٹھیلے بھی دیکھے۔ چوپال کے دارالعوام میں بحث و مباحثے کیے۔ دیہات کے تہواروں میں بھی حصہ لیا رسوم اور تہوار کا ہر پہلو سے مشاہدہ کیا غرض یہ کہ زندگی کے اس ڈھلوان میدان کے ایک ایک گوشہ کا جائزہ لیا جس کا ایک سرا جاگیرداری سے شروع ہوکر دوسرا کھیت کے مزدور پر ختم ہوتا تھا۔ ابھی غالباً انکی اسکول کی زندگی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ اور وہ تعلیم کے سلسلہ میں لکھنؤ چلے آئے یہی وہ عہد تھا کہ جب وہ اپنے گرد و پیش کی زندگی کا زیادہ شعوری اور معنی خیز مشاہدہ کرنے کی استعداد پیدا کر چکے تھے لکھنؤ آکر انہیں زندگی کے اس تفاوت اور خلیج کا زیادہ احساس ہوا جسے نسبتہً مختصر پیمانہ پر انہوں نے اپنے وطن میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا زیادہ نتیجہ خیز زمانہ لکھنؤ میں گذارا اور پھر معلمی کے مشغلہ کو اپنے مستقبل کی قیمت بنا دیا۔ یہ سارے مراحل انکے بالیدگی اختیار کرنے والے ذہن و شخصیت میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اگرچہ ان کا تذکرہ اس محل پر نہایت ہی اختصار بلکہ نا تمام عنوان سے ہورہا ہے۔ پھر بھی انکی زندگی کے اس مجمل خاکہ سے انکے فن کو گرفت میں لانا بھی حد تک ممکن ہے۔

متذکرہ بالا خاکہ انکی شخصیت کے ارتقا کے مختلف مراحل کو میکانیکی طور پر ظاہر کرتا ہے لہذا اسکے ساتھ ہی ساتھ اس نظریاتی ارتقا اور فکری انقلاب کا بھی مختصر سا جائزہ ضروری ہے جس نے ہندوستان کے عام ذہن کے ساتھ فنکاروں کو متاثر کیا۔ جس عہد میں حسینی صاحب کا شعور بیدار ہوا اسکے افق پر سرسید اور انکے رفقا کی لائی ہوئی تبدیلیاں اور اصلاحات حاوی تھے۔ یہ اصلاحات ہندوستان کے عام سماجی و سیاسی پس منظر کا نہایت اہم جزو ہیں۔ دراصل بیسویں صدی کے آغاز میں جو ہندوستان گیر تبدیلیاں نمودار ہورہی تھیں انکا اثر اردو کے ادیبوں پر زیادہ تر سرسید کے تحریکات کے واسطہ (MEDIUM) سے ہوا۔ یا یوں کہا جائے کہ یہ تبدیلیاں سرسید کے تحریکات میں چھن کر (FITTER) فنکاروں کی شخصیت کا جزو بن رہی تھیں۔ اسی عہد میں ادب اور اس کی تنقید کو شبلی نے نئی ہیئت (FORM) اور حالی نے نیا موضوع یا مواد دیا۔ اردو ادب کے نئے رجحانات کے سلسلہ میں حالی، شبلی، آزاد، نذیر احمد اور اس عہد کے دوسرے نثر ادیب ہیولی اور صورت کے ایسی اہمیت رکھتے ہیں۔ حسینی صاحب کی فنکاری کا جس زمانہ میں آغاز ہوا اس وقت سر سید کے تحریکات کے ادبی پہلو کی نمائندگی انہیں مصنفین کے ذریعہ ہورہی تھی جنہوں نے مل جل کر مقصدی ادب اور تنقید کے نئے شعور کی داغ بیل ڈالی اور اس طرح اس عہد کے تقریباً سب ہی اردو ادیبوں کو بالواسطہ یا بلا واسطہ متاثر کیا۔

اسی عہد میں اقبال کی شاعری نے اردو ادب کے ذہنی پس منظر میں دور رس اور نتائج آفریں انقلاب پیدا کیا۔ اقبال کی حیثیت حقیقتہً شبلی و حالی کے نقطۂ عروج کی ایسی ہے مگر وہ حالی و شبلی سے مربوط ہونے کے باوجود کافی مختلف ہیں۔ ان میں اور شبلی میں اتنا ہی فرق ہے کہ جتنا فلسفۂ جمالیات اور سماجی سائنس میں۔ ان میں اور حالی میں بھی اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ مد و جزر اسلام اور طلوع اسلام میں۔ اقبال نے سرمایہ اور محنت کی کشمکش پر فلسفیانہ گہرائی اور جمالیاتی احساس کے ساتھ نظر ڈالی اور خود اصطلاحاً ترقی پسند نہ ہونے کے باوجود آئندہ چل کر ادب کے ترقی پسند دور کے ایک روپوش تاسیسی عامل کا فرض انجام دیا۔

حسینی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز اسی شخصی اور ذہنی

ماحول میں ہوا جس کی ایک مجمل تشریح متذکرہ بالا سطور میں کی گئی ہے۔ انہوں نے ادب کے مختلف پہلوؤں پر طبع آزمائی کی۔ اس لیے کہ جو وسیع ورثہ انہوں نے حاصل کیا تھا اسکی خاطر خواہ فنکارانہ نمود ادب کے کسی ایک ہی تنہا منظر میں ممکن نہیں تھی۔ انہوں نے ناول ڈرامے اور افسانے بھی لکھے فن تنقید پر مستقل کتابیں اور کثیر تعداد میں مضامین بھی لکھے اسکے علاوہ خاکے رپورتاژ بھی بکثرت لکھے اور سنجیدہ ادب کے علاوہ طنز و مزاح کا بھی گراں قدر ذخیرہ فراہم کیا۔ انکے میلانات کا یہ تنوع اور ادبی رجحانات کی رنگا رنگی اس پہلودار ذہنی تربیت اور پرکیف ذاتی استعداد کی غماز ہے جسکا ارتقا ہندوستان کے ایک نہایت ہی فکر انگیز دور میں ہوا۔ مگر اصناف کے اس تنوع اور رنگا رنگی کے باوجود انکے یہاں فکر و نظر کا ایک استوار اشتراک ملتا ہے جس کی وجہ سے جسمانی و ہیئتی فرق کے باوجود ان کے فن کی روح یکساں نظر آتی ہے۔ اور بیرونی انواع کے تفاوت کے باوجود عقیدہ اور فکر کی وحدت جلوہ گر معلوم ہوتی ہے۔

انکی تمام ہی تحریروں میں مشاہدہ اور ادراک کی وہ سادگی اور بے ریائی نظر آتی ہے جسے حسن ہدایت کے فطری اثر کا نتیجہ کہنا چاہیئے۔ عوامی اور سماجی مسائل سے وہ گہرا ربط ملتا ہے جو حقیقی زندگی کی بنیادوں کے بالغ النظر مطالعہ کا ثمرہ ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی داعیہ کی تلخیوں سے پاک وہ خوشگوار کارفرمائی ملتی ہے جسے علم کے پیشہ اور شعور ادب و زندگی کا نتیجہ خیز حاصل سمجھنا چاہیئے۔ اور ان سب کے علاوہ ذہنی پختگی اور سماجی فلسفہ کا ایک ارتقا پذیر تسلسل ملتا ہے جو انکے ادبی ماحصل کو رفتار زندگی سے ہم آہنگ بنانے میں مدد دیتا ہے۔

ہمہ گیری کے باوجود حسینی صاحب کا اصل فن افسانہ نویسی اور ناول نگاری ہے۔ اسی میدان میں انہوں نے اپنے کو زیادہ مصروف رکھا اور انکی فنکاری کا یہی پہلو انکی شہرت کا زیادہ ذمہ دار ہے۔

انکی ناولوں اور افسانوں میں خصوصیت کے ساتھ اس زرخیز تربیت اور رجحانات کے نتائج دکھائی دیتے ہیں جس سے انکا واسطہ انکے ابتدائی اور تکوینی عہد میں رہا ہے۔ حسینی صاحب کی افسانہ نگاری کا عہد اس وقت شروع ہوا جبکہ پریم چند نہ صرف پیش رو بن چکے تھے بلکہ اپنے افسانوں اور ناولوں سے ادب کو ایک نیا موڑ دے چکے تھے۔ ۱۹۲۰ء اور اسکے لگ بھگ افسانہ نگاری شروع کرنے والا شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو جسے پریم چند نے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر نہ کیا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حسینی صاحب پریم چند سے کافی متاثر ہیں مگر ان میں اور پریم چند میں کافی فرق بھی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کی مدد سے بہت سے ایسے عوامی اور بنیادی مسائل کھل کر ذہین طبقہ کے سامنے آئے جو اہم ہونے کے باوجود افسانہ نگاری یا ناول نویسی کا موضوع نہ بنے تھے۔ روایت کے فقدان کی وجہ سے ان مسائل کے لیے تڑپ رکھنے کے باوجود بہت سے ادیبوں کا احساس مقید سا تھا۔ پریم چند کے افسانوں سے ایک نئی روایت اور نئے انقلاب کا ساتھ ساتھ ظہور ہوا۔ جس نے ایک نسبتہً مختصر عرصہ میں اردو افسانہ نویسی کو کم و کیف سے مالا مال کر دیا۔ پریم چند کے موضوعات اور نقطۂ نظر میں فطری طور پر حسینی صاحب کے متجسس ذہن کے لیے دلچسپیوں کے بڑے سامان تھے اور اس ضمن میں بھی پریم چند کے سماجی نقطۂ نظر نے حسینی صاحب کو بالخصوص متاثر کیا۔ حسینی صاحب نے پریم چند کی طرح وسیع اور دیو قامت ناول نہیں لکھے مگر انہیں ان ادیبوں میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے کہ جنہوں نے پریم چند کی افسانوی روایت کو زیادہ سے زیادہ ادبی بنایا۔ پریم چند کے افسانوں میں بہت کچھ ہونے کے بعد بھی ادبیت کی کمی ہے۔ اس معاملہ میں حسینی صاحب پریم چند پر فوقیت رکھتے ہیں۔ وہ افسانہ یا ناول کے سلسلہ میں ایسی زبان استعمال کرنے کے قائل نہیں ہیں جس کی سب سے بڑی خصوصیت نفس مطلب کو بس ادا کر دینا ہو۔ وہ افسانہ و قصہ میں ٹکنیکی، فی الفن مقصد اور موضوع کے ساتھ ساتھ شائستہ ادبی رنگ آمیزی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک ضروری ہے اسلیئے کہ ناول یا افسانے محض مسائل و مشاہدات

ہوتے ہیں۔ ان کا ادب و فن کی ایک مستقل صنف ہیں۔ اس زاویہ سے اگر
دیکھا جائے تو فوراً متعلقہ نقطۂ نظر ٹیگور سے قریب آ جاتا ہے
گرچہ ان کا تعلق اس مادیت اور تمثیلی خیالات سے بالکل نہیں ہے
جو ٹیگور کی امتیازی خصوصیت ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہی
جا سکتی ہے کہ حسینی صاحب کے افسانے شعوری اور لاشعوری طور
میں پریم چند اور ٹیگور کے اثرات کے حامل ہیں۔

حسینی صاحب کی افسانہ نگاری پر انگریزی ادب کے اثرات
بھی واضح شکل میں ملتے ہیں۔ انگریزی FICTION کے متعلق
ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ بلکہ انکے معاصرین میں شاید ہی کوئی ایسا
ہو جس نے انگریزی ناولوں اور افسانوں کا اتنا وسیع اور گہرا
مطالعہ کیا ہو۔ یہ مطالعہ خود انکی افسانہ نگاری کے لئے بہت مفید
ثابت ہوا اور اسی پر فنی اور تکنیکی خامیاں جو آج کل کے اچھے
بھلے افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہیں حسینی صاحب کے یہاں
نہیں دکھائی دیتیں۔ انگریزی ناول نگاری اور افسانہ نویسی کے
باشعور مطالعے نے حسینی صاحب کو دوہرے فائدے پہونچائے۔ ایک
طرف تو خود انکے فن میں پختگی، پائیدگی اور مواد و ہیئت کے محاسن
پیدا کئے اور دوسری طرف ناول کے متعلق انکے تنقیدی شعور کو
نہ صرف بیدار کیا بلکہ باعمل بنایا جس کا نتیجہ انکی کتاب ناول کی تاریخ و
تنقید ہے جو نہ صرف انکے صاف ستھرے تنقیدی مذاق اور جستجو
تفتیش کی لگن کو ظاہر کرتی ہے بلکہ اب بھی اپنے موضوع پر بہت اہم
دستاویز سمجھی جاتی ہے۔

حسینی صاحب پر انگریزی ناول و افسانہ نگاری کے اثرات سے
یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا کہ وہ انگریزی ادب کے نقال ہیں۔ سارے
اثرات کے باوجود انکے فن میں انفرادی توانائی ہے۔ ذہن کی آزاد
کارکردگی ہے اور ذاتی فکر و نظر کی جلوہ گری ہے۔ انگریزی ادب سے
انکا استفادہ فنی اور ٹکنیکی ہے۔ روح کے اعتبار سے وہ اور ان کا ادب
مشرقی ہیں جن میں مشرق اور بالخصوص ہندوستان کے مسائل کردار
اور مجموعی فضا کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

حسینی صاحب کے افسانوں میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی
چیز وہ خلوص اور سچائی ہے جو انکے مشاہدہ اور فنی برتاؤ پر
حاوی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نگاری قصہ گڑھنے اور واقعہ
تصنیف کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس لیے یہ فن بڑی
چابکدستی اور مہارت کا مطالبہ کرتا ہے۔ فرضی واقعات میں
زندگی کے اصلی خط و خال کا احساس کرانا اور من گھڑت بیانات کی
سچی تصویریں پیش کرنا اور مجموعی طور پر افسانہ کو حقیقت بنانا
بڑا نازک فن ہے۔ حسینی صاحب اس مرحلہ کو شاطرانہ تدابیر سے
نہیں بلکہ سچائی کی پرجوش سادگی اور خلوص کی سب سے واضح
خصوصیت کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ اور اسی لیے وہ اپنے متعلق
لکھیں یا دوسروں کے متعلق کچھ اظہار خیال کریں۔ ہر حال میں سچا
تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ
انکی افسانہ نگاری میں کبھی کسی ایسے موضوع سے سابقہ نہیں
پڑتا ہے جس کا حقیقی زندگی سے صحت مند ربط نہ ہو اور نہ ایسے
کردار ملتے ہیں جو محض پرواز خیال کا نتیجہ ہوں۔

ان کے افسانوں میں بیشتر وہی فضا ملتی ہے جو مشرقی یوپی کے
متوسط گھرانوں میں عام طور سے دکھائی دیتی ہے زیادہ تر انہیں
مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جو اس خطہ کی مجموعی زندگی میں ہر
تیز بین مشاہد کو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر انکے یہاں کمال یہ ہے کہ
وہ ایک خطہ سے ایک مشت غبار اٹھاتے ہیں اور اپنے فن سے
دھرتی کے ہر تابناک ذرہ کی تڑپ اس میں پیدا کر لیتے ہیں اور
اس طرح انکے افسانوں میں مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ آفاقی
روح بھی دکھائی دیتی ہے

وی پی واپس کرنا
اپنے علمی و ادبی ادارہ کو نقصان پہونچانے کے علاوہ
غریب اُردو کو بلاجرم سزا دینے کے مترادف ہے

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

آئینۂ خیال

۱۵/۱، جواہر نگر، سری نگر کشمیر
۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء

عبداللہ حالی صاحب   تسلیم

۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں علی عباس حسینی صاحب نے مجھے چند خط لکھے تھے اب تک ان کا نیاز حاصل نہ ہو سکا ہے۔ میں نے "صبح نو" کے علی عباس حسینی نمبر کے لئے ان مکاتیب سے ایک انٹرویو مرتب کیا ہے۔ میرے یہ تمام سوالات اُن کی خدمت میں کبھی نہیں گئے، لیکن ان کا ہر جواب ناچیز تک پہنچا ہے۔ اُمید ہے ان کے خیالات آپ اس تاریخی شمارہ میں محفوظ کر لیں گے۔ جواب کا ہر لفظ حسینی صاحب کا ہے، میں نے صرف ان کے خیالات کو مرتب کر دیا ہے۔ ان سے علی عباس حسینی صاحب کی زندگی، شخصیت اور ان کے بعض رجحانات کو سمجھنے میں یقیناً مدد ملے گی۔ یہ خط مرتب کرتے ہوئے بار بار حسینی صاحب کی شفقت اور محبت یاد آ رہی ہے۔

مخلص
شکیل الرحمٰن

شکیل الرحمٰن: حسینی صاحب، اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ فرمائیے۔

علی عباس حسینی: شکیل صاحب، میرے اجداد نے فیروز تغلق کے زمانے میں غازی پور کا شہر بسایا اور ان کی اولاد نے ضلع کے جنگلوں کو کاٹ کر پانچ گاؤں بسائے جن میں حسینی سادات اب بھی موجود ہیں۔ میں بچپن ہی سے "پرجا" کی شادی بیاہ میں شریک ہوتا اور ان کے تیج تہوار میں حصہ لیتا۔ چنانچہ آپ میرے افسانوں میں اس طرح کی تفصیلات پریم چند سے کہیں زیادہ پائیں گے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں بی اے اور سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں ال۔ ٹی کر کے سرکاری اسکول میں مدرسی کر لی۔ اسی حالت میں تاریخ میں ایم اے بھی کیا۔ چونتیس ۳۴ سال محکمۂ تعلیمات میں جھک مارنے کے بعد سنہ ۱۹۵۴ء میں پرنسپلی کے عہدے سے ریٹائر ہو گیا، اب صرف لکھنا پڑھنا شغل ہی نہیں جینے کا سہارا بھی ہے۔

شکیل الرحمٰن: آپ کی تصنیفات آج بھی مقبول ہیں، کیا میں ان کی تعداد معلوم کر سکتا ہوں؟

علی عباس حسینی: تصنیفات سولہ سترہ ہیں ۔ افسانوں کے مجموعے سات ہیں، ناول میں نے صرف دو لکھے ہیں ۔ مگر یقیناً دوم درجے آگے کی چیزیں نہیں ہیں ۔ افسانوں کی مجموعی تعداد تقریباً دو سو ہوگی، "رفیق تنہائی" "آئی سی ایس" "کچھ ہنسی نہیں ہے، باسی پھول، میلہ گھومنی، ہمارا گاؤں، اُلجھے دھاگے" افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ہندی میں بھی دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، "پھولوں کی چھڑی" اور "گائے اماں" "سرسید احمد پاشا" اور "شاید کہ بہار آئی" یہ دو ناول ہیں ۔ ہندی میں بھی ایک ناول شائع ہوا ہے "کومل انگری"۔ معلوم نہیں ۔ آپ کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں،

شکیل الرحمن: آپ نے غالباً کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں ۔

علی عباس حسینی: جی ہاں، اسکول اور کالج کے طلباء کے لئے ایک ایکٹ کے نو ڈرامے لکھے ہیں ۔ "نورتن" میں یہ سب شامل ہیں حکیم بانا (زٹیوں کا بادشاہ) میں جو مزاح ہے اس سے آپ کو میرے مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ آدمی ہر لمحہ سنجیدہ نہیں رہ سکتا۔ ناول کی تاریخ و تنقید کا آپ نے ضرور مطالعہ کیا ہوگا ۔

شکیل الرحمن: ادب اور سیاست کے رشتے پر آپ نے غور کیا ہوگا - آپ کے تجربے نئی نسل کی رہنمائی کریں گے، میرا خیال ہے کہ آپ ادب کو سیاست کا پابند بنانا نہیں چاہتے ۔

علی عباس حسینی: آپ کا خیال درست ہے، میں ادب اور فن کو سیاست کا پابند بنانا نہیں چاہتا، ادب کے آپ اپنے اقدار ہیں ادب کا کام جلال و جمال انسانیت کا فروغ دینا ہے ۔ انسانیت ہر "ازم" سے بالاتر شے ہے اور فن کا کام اسی انسانیت کو بہتر سے بہتر اور حسین سے حسین صورتوں میں پیش کرنا، اسے اجاگر کرتے رہنا اور روشن سے روشن تر بناتے رہنا ہے، میں مصنف کے قلم پر ہر طرح کے سیاسی احتساب کو انسانیت دشمنی کے مترادف سمجھتا ہوں، لیکن میں اخلاقی احتساب کا ضرور قائل ہوں، اس لئے کہ عریانی و فحاشی عیب جوئی ہے اور عیب جوئی و عیب نمائی خواہ فرد کی ہو یا جماعت کی کوئی مستحسن چیز نہیں

شکیل الرحمن: جب ادب، سیاست اور عریاں نگاری کی بات آگئی ہے تو میں "انگارے" کے بارے میں آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہوں گا ۔ کیا آپ بھی اسے ایک روایت یا Tradition سمجھتے ہیں ؟ کیا یہ "کارنامہ" کسی تاریخی تقاضے کی دین ہے ؟

شکیل صاحب، "صبح نو" پٹنہ کے کسی شمارہ میں "انگارے" پر آپ کی تنقید پڑھی تھی، آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ناقدین میں سے جن حضرات نے ان کہانیوں میں جیمس جوائس کی تحریرات کے اثرات کا سراغ لگایا ہے وہ اس سے واقف نہیں، اتفاق یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ مجموعہ نکلا تھا میں لکھنؤ میں گورنمنٹ جوبلی کالج میں معلم کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس کے سب لکھنے والوں سے ایک "سینیر" کی حیثیت سے روشناس بھی تھا ۔
میں نے تقریباً انہیں خیالات کا اظہار کیا تھا جو آپ نے ظاہر فرمائے ہیں ۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے مصنفوں کی ذہنیتوں کے آئینہ دار ہیں، یہ سب حضرات فرائیڈ کی تعلیمات کے زیر اثر ہر طرح کی اخلاقی پابندی کو "احتساب بیجا" کا نام دے کر اسے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، اس سلسلے میں عریانی اور فحش گوئی ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی "حقیقت نگاری" تھی ...... بات کہنے کے اسی

عدم سلیقے نے اس کتاب کو سرکاری طور پر ضبط بھی کرا دیا تھا۔

شکیل الرحمن: آپ کے افسانوں میں نفسیاتی مطالعہ بھی ہے اور مرکزی تاثر بھی۔ آپ کے یہاں جو نفسیاتی باریکیاں ملتی ہیں ان سے دنیا کے بعض بڑے فنکاروں کی یاد آ جاتی ہے، کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ آپ کن بڑے فنکاروں سے زیادہ متاثر ہیں؟

علی عباس حسینی: سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، آثار مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۰ء میں اپنے متعلق آپ کا مضمون دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ تعجب اس امر کا کہ اب بھی کچھ حضرات ایسے ہیں جو میرے جیسے غیر معروف مصنف کے افسانے پڑھ لیتے ہیں، مسرت اس پر کہ باوجود ذاتی طور پر متعارف نہ ہونے کے آپ نے فن میں وہ قدریں ڈھونڈیں جو میں خاموشی سے اس میں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اتنے اچھے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ شکیل صاحب، آپ کا خیال درست ہے، میرے افسانوں میں کوئی چیز خاص طور پر نمایاں پائیں گے تو وہ نفسیاتی مطالعہ ہے اور مرکزی تاثر، دنیا کے عظیم ترین لکھنے والوں میں سے جنھوں نے مجھے اس ضمن میں خاص طور پر متاثر کیا ہے وہ ہیں ڈکنس، ورڈز، ہارڈی، گالزوردی، موپاساں، وکٹر ہیوگو، پراؤسٹ، فلابیر، رومیں رولاں، اناطول فرانس، ٹامس مین، لارنس، ٹالسٹائی، چیخوف، برل بک اور فاکز۔

شکیل الرحمن: اردو کے فن کاروں میں آپ کن لوگوں سے زیادہ متاثر ہیں؟

علی عباس حسینی: اردو کے ناول نویسوں میں سے جو مجھے خاص طور پر پسند ہیں، وہ ہیں رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا، سرشار اس کی شوخی اور چرب زبانی کے لئے۔ اور رسوا سادگی اور گہرائی کے لئے۔

شکیل الرحمن: افسانہ نویسی میں پریم چند تو آپ کے پیش رو ہیں، ان کے فن کا اثر تو غالباً سب سے زیادہ ہے۔

علی عباس حسینی: افسانہ نویسی میں پریم چند یقیناً میرے پیش رو تھے۔ انہیں کی کہانیاں دیکھ کر مجھے اردو میں کہانی لکھنے کا شوق ہوا، میں اپنے زعم باطل میں ان سے زیادہ اور بہتر طور پر دیہاتی زندگی پیش کرنے کا حق رکھتا تھا، عنفوان شباب کی وہ غلط فہمیاں مدت ہوئی اب زائل ہو گئیں، اور جب کہ پینسٹھ کی حدود میں پہنچ گیا ہوں یہ سختی سے محسوس کرتا ہوں کہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا وہ نہ کر سکا۔ آپ نے پریم چند کے افسانوں پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے، آپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ پریم چند کی روایت کیا ہے اور ان کے اثرات کس حد تک ہیں، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ نے پریم چند کے فن کی ادبی قدروں پر بحث کی ہے۔ میرے نزدیک پریم چند ایک بہت بڑے افسانہ نویس تھے لیکن وہ اتنے بڑے ناول نویس ہرگز نہ تھے، وہ دنیا کے عظیم ترین ناول نویسوں کی صف اول میں جگہ نہیں پا سکے۔

شکیل الرحمن: بہت بہت شکریہ حسینی صاحب، یہ قیمتی لمحات کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

علی عباس حسینی: اگر آپ کبھی لکھنؤ تشریف لائیں تو مجھے شرف ملاقات بخشیں۔

شکیل الرحمن: دیکھئے خدا کب ملاتا ہے، یوں آپ سے "ملنے" اور "تبادلۂ خیال" کرنے کی بڑی خواہش ہے، خدا حافظ۔

شمیم حنفی

اظہار شخصیت، فن اور فن کار

(۱)

اعلیٰ ادب ایک ماہر فن کی زندگی کا خون ہوتا ہے ——————— ملٹن

تحریر میں صداقت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مصنف وہی بات لکھے
جو اس کی نظروں کے سامنے ہو یا اس کے تجربات کے اندر ہو ——————— رسکن

تخلیق ادب کا ذمہ دار ادیب کی نسل، ماحول اور عصری رجحانات کا مرکب ہے۔ ——————— ٹینی

ذاتی تجربات جو تخلیقی جوہر کو بروئے کار لاتے ہیں ادب میں سب سے اہم ہیں ——————— فرائڈ

مادّے کی دھندلی پرچھائیں کے بغیر حقیر سے حقیر افسانے کی تخلیق ممکن نہیں ——————— احتشام حسین

غرض کہ ادب کے جانے کتنے نباض یہ اور ایسی ہی باتیں کہہ چکے ہیں۔ لیکن ابھی ڈیڑھ دو برس پہلے کی بات ہے۔ نرالا جینتی کے موقعے پر الٰہ آباد میں ہندی کے مشہور ادیب ڈاکٹر پربھاکر ماچوے نے ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ادب کوئی جامد شے نہیں جسے کسی اصول کے پیمانے سے ناپ لیا جائے۔ سننے والوں میں بیشتر ہندی کے ادبا تھے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے پروفیسر، طالب علم، سیاسی لیڈر جو ادبی جلسوں میں شرکت بھی ایک سیاسی مصلحت سمجھتے ہیں، اور کچھ عام لوگ۔ مقرر کے سامنے والی نشستوں میں سے ایک پر اساذی احتشام صاحب (پروفیسر سید احتشام حسین) بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریر ختم ہونے کے بعد جب سبھی اٹھے تو میں احتشام صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ اور رات کے اندھیروں میں لحہ بہ لحہ ضم ہوتی ہوئی اس شام کو چہل قدمی کرتے ہوئے میں احتشام صاحب پر اس تقریر کے ردعمل کو ٹٹولتا رہا۔ اس وقت میرا ذہن بری طرح اس مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ آخر کسی ادبی تخلیق کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے تو کس طرح؟ کیا محض خیالی گھوڑے دوڑائے جائیں یا عقلی گدڑوں سے کام لیا جائے۔ کپڑا ناپنے کے لئے ایک گز کی اور زمین کی پیمائش کے لئے فیتے یا جریب کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب نہ تو زمین کا ایک ٹکڑا ہے اور نہ کپڑے کا ایک تھان۔ لیکن بہر حال زمین ہی کی چیز ہے۔ ہوا میں معلق شے نہیں۔ اور جب سے یہ دنیا بنی ہے یہ کام دنیا والوں کا ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنی ایک الگ دنیا بنائیں۔ جس میں ان کی آرزوؤں، خوابوں، ذہنی و فکری صلاحیتوں، عمل اور جذبے کی کارفرمائیوں کا عکس نظر آئے۔ ادیب، مصور شاعر، سنگ تراش اور موسیقار۔ ان سبھوں نے اپنے اپنے طور پر یہ فرض انجام دیا ہے۔ اپنی شخصیت، اپنے احساسات، اپنی زندگی کے سانحات اور واقعات کی عکاسی کا جذبہ ہی وہ جذبہ ہے جس نے انسانی شعور کی تاریخ مرتب کی ہے اور زمانے کی بساط پر وہ نقوش چھوڑے ہیں جن میں آج بھی لحہ تخلیق کی تازگی اور قوت کارفرما نظر آتی ہے۔ جذبے اور احساس کی ہر تخلیق کے پیچھے فن کار کے دل کی دھڑکنیں

سنائی دیتی ہیں۔ فن کار کی سماجی ذمہ داریاں، مادّی مشکلات اور اقتصادی پیچیدگیاں مختلف علوم و فنون کے راستے ہمیشہ اپنے طور پر تبدیل کرتی رہیں لیکن اس کے باوجود فن کار کی اپنی شخصیت کا رنگ خواہ وہ کتنا ہی بھدا ہو یا حسین بالعموم اپنی اصلی چمک دمک اور حقیقی خدوخال کے ساتھ اس کے فن پاروں میں جھانکتا نظر آتا ہے۔

دوسرے فن کاروں کی طرح شعر و ادب کی تخلیق کرنے والوں نے بھی ہر دور میں اپنی شخصیت کے اظہار کے راستے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ اس خیال کی صداقت اس واقعے میں دیکھی جا سکتی ہے کہ ادب کا ایک ذہین طالب علم کسی شعر کو سن کر، یہ نہ جانتے ہوئے کہ اس کا خالق کون ہے، اُسے اُسی شعر کی فضاؤں میں تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن اب اسے کیا کیا جائے کہ کسی ایسے ویسے نے نہیں بلکہ ایلیٹ (T.S. Eliot) جیسے ذہین ادیب نے ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ یہ بات کہی کہ :۔

> "ادب یا فن جذبات کا اخراج نہیں بلکہ جذبات سے گریز ہے، شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے۔ جتنا زیادہ ایک فن کار مکمل ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا نفس عاشہ یا اس کا اثر پذیر ذہن اس کے تخلیقی ذہن سے مکمل طور پر جدا ہوگا۔"

یعنی مثال کے طور پر کسی مرض کی تشخیص کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مریض کی نبض ٹٹولی جائے۔ ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) نے اس شخصیت کش نظریے کی تردید اس طرح کی ہے کہ :۔

> "کردار کیریکٹر (Character) کا تضاد ہے اور ادیب کی ذات اس کی عملی شخصیت سے مختلف ہوتی ہے۔"

یہ نظریہ بہت عام ہے اور خود کرشن چندر جیسے باشعور فن کار کے الفاظ ہیں :۔

> "ایک ادیب کی شخصیت (اس کی ظاہری شخصیت نہیں بلکہ) اس کی تصنیف، اس کا قلم اور اس کا خیال ہے۔ اس کی وہ ساری خواہشیں، آرزوئیں، حسرتیں اور یادیں، وہ خواب وہ آنسو اور وہ تبسم ہیں جنھیں اس نے دانہ دانہ کر کے زندگی کی فضاؤں میں چنا ہے اور اپنی کہانیوں میں پڑھنے والوں کی تفریح کے لئے بکھیر دیا ہے۔ یہی تو اس کا عمل ہے اور یہی اس کا صحیح کام !"

یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن اس پر غور کرتے ہوئے یہ بات بھی اپنے ذہن میں رکھنی چاہئے کہ شخصیت کی تعمیر کردار کی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ تاریخی شعور، بین الاقوامی حالات، تصورات اور شخصیت کی انفرادیت، یہ تینوں چیزیں ایک وحدت کی شکل میں ادب میں نمودار ہوتی ہیں۔ ان تینوں میں توازن ہونا بڑے ادیب کے لئے لازمی ہے اور ان میں سے کسی بھی ایک کی کمی سے فن کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے بعض اوقات بادی النظر میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی فن کار کی شخصیت بالکل متضاد شکل میں اس کے فن پاروں میں نمایاں ہوتی ہے مثلاً ریاض نے شراب چکھی بھی نہیں اور عمر بھر ساغر و مینا کی باتیں کرتے رہے اور اسٹی ونسن (Stevenson) ایک دائم المریض ہونے کے باوجود زندگی کے آخری لمحوں تک یاس و محرومی، کم ہمتی یا پست حوصلگی۔ شوپنہار (Schopenhauer) اور ہارڈی (Hardy) کی یاس زندگی کا مذاق اڑاتا رہا۔ لیکن علم النفس کی روشنی میں یہ تضاد بھی عین فطرت کے مطابق ہے۔ سزائے نفس (Self-punishment) نفسیات کی ایک اہم اصطلاح ہے جس کی رو سے ایک بدکردار ادیب محض اپنے اعمال کے انتقام کے لئے اپنے قلم کو اخلاقی راستوں پر گامزن کر دیتا ہے اور عملی طور پر وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس کا شعور سمت مخالف میں جا کر اس کے لئے تلافی اور

توازن کا سامان پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کی قوتِ عمل جب حقیقت کی دنیا میں شکستہ پا ہو جاتی ہے اس وقت اس کا شعور اپنا رخ تبدیل کر کے تخیل کی راہوں پر چل نکلتا ہے اور خوابِ عمل کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔ لیکن وہاں بھی صرف راستے بدلتے ہیں۔ احساسِ شکست یا جذبۂ انتقام کی زنجیر پنے دونوں سرے فکر و عمل سے جوڑ کر ان میں ایک ربط اور تسلسل پیدا کر دیتی ہے۔ یہ شخصیت بظاہر دوہری ہوتی ہے لیکن بنیادی طور پر ایک ہوتی ہے اور یہی اکائی بڑے فن کاروں کے نظریات و احساسات، ذہن و شعور اور تصورِ حیات کی تشکیل متعین کرتی ہے۔

اس موقع پر ایک اور بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ ایک ہی جذبۂ عمل کی دو مختلف صورتوں میں بھی واضح ہو سکتا ہے۔ یہ صورتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف یا بعض حالات میں ایک دوسرے کی متضاد بھی ہو سکتی ہیں۔ کسی مغربی شاعر کے الفاظ میں ——

And each man kills the thing he loves
By each let this be heard.
The Coward does it with a kiss
The brave man with a sword

بظاہر یہ بات سادا معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں چھپی ہوئی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اسے شعری صداقت (Poetic Reality) بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ہی خیال کے عمل کا یہ اختلاف انسانی نفسیات کے ایک پیچیدہ زاویے کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ زاویہ ٹیڑھا بھی ہو سکتا ہے اور گمراہ کن بھی لیکن اس کی جیتی جاگتی مثالیں اردو افسانے میں ہمیں مختلف افسانہ نگاروں کے اسلوب ان کے موضوعات کے انتخاب اور ان کے برتاؤ (Treatment) میں مل جائیں گی۔

اس پس منظر کی روشنی میں جب ہم اردو افسانے پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی منزلوں سے لے کر آج تک اردو افسانہ کسی نہ کسی شکل میں روحِ عصر کے ساتھ ساتھ متعلقہ فن کار کے اُن انفرادی تجربات، احساسات، نظریات اور جذبات و تصورات کا نمائندہ بھی رہا ہے۔ جن کے مرکب سے اس کی شخصیت کا خاکہ بنتا ہے۔ شخصیت کا یہی عکس اسے عصری رجحانات کے ساتھ بھی اور اس سے ایک الگ جگہ پر بھی کھڑا کر دیتا ہے۔ بعض افسانہ نویسوں نے روحِ عصر کو اپنی شخصیت میں اس طرح جذب کر لیا کہ وہ اپنے عہد کے مختلف رجحانات کی زندہ اور عملی حقیقت بن کر ہمارے سامنے آئے اور بعض نے اپنے آپ کو اس سے اس طرح الگ رکھا کہ وہ اپنا دامن بچاتے ہی رہ گئے اور زمانہ ان سے آگے نکل گیا۔ "انا" کا غلط تصور ادیب کی آنکھیں باہر کی دنیا کی جانب سے بند کر دیتا ہے۔ اس کی شخصیت کی طرح اس کی تخلیقات کا دائرہ بھی محدود ہو کر رہ جاتا ہے چنانچہ ہم اُسے کسی بھی بڑے ادب کے زمرے میں شمار نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ عظیم ادب (بلکہ عظیم ادب کا شعری حصہ) بڑی حد تک انفرادی جذبات و تجربات کا حامل ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں آفاقی قدروں (آفاقی قدریں بڑی مشتبہ اصطلاح ہے۔ یہاں میرا مطلب ان اقدار سے نہیں ہے جنھیں کوئی فردِ واحد محض اپنی "انا کی کجلی" میں رہ کر تسلیم کرتا ہے بلکہ وہ اقدار جنھیں ایک زمانے کے ہوشمند ذہن جغرافیائی حد بندیوں سے بے نیاز ہو کر تسلیم کر سکتے ہوں) اور تاریخی شعور کی آمیزش بھی ضروری ہے۔ ادیب کی شخصیت محض ایک آلہ ہوتی ہے اس فن کو سمجھنے کا۔ میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) کے الفاظ میں "فن ایک حیات ہے جسے مصنف کے مزاج کے توسط سے سمجھا جا سکتا ہے۔" یعنی وہی نبض دیکھ کر مرض کی تشخیص والی بات ہوئی۔ اب اگر (مصنف کے مزاج یا شخصیت کا) یہ آلہ مضبوط ہوا اور متناسب ہوا تو اس کے ذریعہ تصویریں بھی صاف اور واضح نظر آئیں گی اور اگر اس میں کمزوریاں ہوئیں تو ہر لکیر دھندلی دکھائی دے گی۔

ایک افسانہ نگار کے دماغ اور قاری کے ذہن کے درمیان ایک رابطے کا قائم ہونا ضروری ہے۔ زندگی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے ماحول ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے اور یہ تبدیلی افسانہ نگار کے تجربات پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ تجربات کی زندگی ہی اسے ماحول سے ہم آہنگ کرتی ہے، اور اردو افسانے کو "ادب لطیف یا انشائے لطیف" کی بھول بھلیاں سے نکال کر ہمارے بعد کے افسانوں کی زندہ حقیقت تک یا کرشن چندر کو "طلسم خیال" کے جال سے نکال کر "کالو بھنگی" تک پہونچاتی ہے لیکن انتقاد کی یہ آواز وہی سن سکتے ہیں جن کا ذہن ہر جذبے اور تحریک کے مادی اسباب کو ڈھونڈ نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جو خارجی حالات سے بے خبر محض اپنی داخلیت کے تانوں بانوں میں نہ الجھے ہوں۔ جو ادب کو محض ذہنی عیاشی کا ایک وسیلہ نہ سمجھتے ہوں بلکہ اس کے پردوں کے پیچھے روز ازل سے ہونے والی کسی بھی قسم کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی استحصال کے خلاف انسانی جدوجہد کے سائے بھی دیکھ سکتے ہوں اور جو کارزار حیات میں کودکر طوفانوں کو دیکھ سکتے ہوں اور زندگی کے تجربات سے اپنے فکر و خیال کی جھولیاں بھر سکتے ہوں۔

(۲)

ایک بڑی محترم، بزرگ اور اہم ادبی شخصیت نے ایک دن بڑی جھلاہٹ (شفقت آمیز) کے ساتھ مجھ سے یہ کہا کہ "بھئی تم ہمیشہ ادب اور زندگی کے چکر میں کیوں پڑے رہتے ہو۔ یہ دونوں چیزیں دو متوازی لکیریں ہیں، ایک دوسرے سے بالکل الگ اور بالکل مختلف جن کا کوئی نقطۂ اتصال نہیں اور جن میں کوئی ربط نہیں۔ اگر اس طرح زندگی کے پیچھے پڑے رہے تو ادب کو Appreciate کرنے کی صلاحیت تم میں لاکھ برس نہ پیدا ہو سکے گی۔"

ان کا ارشاد میں نے بڑے ضبط و صبر کے ساتھ سنا تھا اور بظاہر مطمئن ہو کر اثبات میں سر بھی ہلا دیا تھا لیکن آج جب میں حسینی صاحب پر یہ مضمون لکھنے کے لئے بیٹھا تو ذہنی رو پھر بہک گئی اور میں کسی طرح یہ نہ کر سکا کہ ان پر قلم اٹھاتے وقت ان سے پہلے کے افسانوی سرمائے کو ان کے عہد کے ہندوستان کو کسی ادبی تخلیق کے مطالعے اور تجزیے کے لئے معینہ اصولوں کو (ان سے اختلاف کے باوجود) نظر انداز کر بیٹھوں چنانچہ میں نے اس مضمون کی ابتدا کے لئے جو پس منظر تیار کیا ہے وہ بظاہر اس مضمون سے غیر متعلق نظر آنے کے باوجود میرے نزدیک میرے تجزیے کی پہلی منزل ہے۔

یوں کہنے کو تو اردو افسانے کی بنیاد اسی دن پڑ گئی تھی جب محمد حسین آزاد نے "نیرنگ خیال" کی ابتدا کی۔ لیکن اپنی موجودہ ہیئت میں اردو افسانے کی تاریخ پریم چند سے شروع ہوتی ہے پریم چند کے ساتھ ساتھ سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری وغیرہ نے بھی افسانے لکھے لیکن جوش کے یہاں مغربی تہذیب سے پرہیز جس نے چھوا چھوت کی کیفیت اختیار کر لی تھی اور یلدرم و نیاز کے یہاں رومانیت کے جذباتی تصور اور سگوریت کے غلط اثرات نے اتنا گہرا رنگ اختیار کر لیا کہ نہ وہ اپنے افسانوں کو ابھار سکے اور نہ ہی اپنی انفرادی شخصیت کو۔ پریم چند پہلے افسانہ نگار ہیں جو ایک بھاری بھرکم شخصیت بن کر افسانے کے افق پر نمودار ہوئے۔ یہ وہ عہد تھا جب زندگی کی پرانی اور نئی قدروں کے درمیان خلیج دن بہ دن وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ روایت اور جدت کے تصادم کی رفتار تیز ہو گئی تھی، برطانوی تسلط کے خلاف سارے ہندوستان میں ایک شور برپا تھا اور ہندوستانیوں کے فکر و عمل میں بغاوت کی چنگاریاں سلگ اٹھی تھیں اس وقت بقول فراق ؂

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں

والی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ خاک وطن کا ذرہ ذرہ جاگ رہا تھا اور ایوان اقتدار کے دروازوں پر انقلاب کے سائے دستک دے رہے تھے پھر بھی مستثنیات ہر جگہ ہوتے ہیں چنانچہ اس عالم میں بھی جوش، یلدرم اور نیاز اپنی اپنی جگہ پر بجد پرکشش، بیحد تابناک اور بیحد خوبصورت نظر آنے کے

باوجود جذبات کے رتھ پر بیٹھ کر اپنی خیالی دنیاؤں اور سرزمین خواب (Utopia & Wonderland) کے چکر لگا رہے تھے۔

لیکن تاریخ ہمیشہ خطرناک حد تک انصاف پسند رہی ہے۔ آخر میں ہوا یہی کہ افسانہ نگاروں کی صف میں پریم چند سب سے زیادہ ابھر کر اور نمایاں ہو کر سامنے آئے اور جدید اردو افسانے نے ان کے نتائج افکار کو اپنے ماضی کا سب سے جاندار، قیمتی اور قابل احترام سرمایہ سمجھا۔ ابھی ترقی پسند تحریک باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی لیکن ترقی پسندی کی لہریں جو زندگی اور اس کے ارتقا سے عبارت ہیں اور جن کے نشانات سیاسی نظام کے پروردہ شعور کے تجربات میں بھی نظر آ جاتے ہیں، اس دور میں کسی قدر شدید ہو گئی تھیں اور ان لہروں کی ابھرتے ہر کان دھرنے والوں میں علی عباس حسینی بھی تھے۔

علی عباس حسینی کا پہلا افسانہ ۱۹۲۵ء کے "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا۔ انھیں اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے انگریزی ادب سے بڑا گہرا شغف تھا بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر حضرت مسعود صاحب قبلہ (پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب) اس طرف توجہ نہ دلاتے تو شاید وہ انگریزی کے صحافی بن جاتے اور اردو میں افسانہ پردازی کا خیال بھی دل میں نہ آتا۔ زمانہ تعلیم میں اگر کوئی شوق تھا تو بس یہی کہ وہ انگریزوں کی طرح انگریزی بولیں اور لکھیں۔ لیکن مسعود صاحب کے یہ کہنے پر کہ "میاں گھر کا دیا پہلے جلاؤ۔ مسجد میں چراغ جلانے والے بہت ہیں۔"

حسینی نے افسانہ نویسی کے ساتھ اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ انگریزی ادب کے وسیع مطالعے نے جہاں ان سے بعد میں ناول کی تاریخ و تنقید پر ایک قابل قدر کتاب لکھوائی وہیں یہ بھی ہوا کہ انگریزی افسانوں اور ناولوں کا سمندر کھنگال کر ان کی نظر میں گہرائی اور فکر میں وسعت بھی آ چلی کیونکہ ہمارے یہاں داستانوں یا ناولوں کا سرمایہ بہت کچھ ہونے کے باوجود ایسا نہیں تھا کہ نئے اذہان کی تشفی کر سکتا۔ انگریزی زبان سے بہت اچھی واقفیت نے انھیں اپنی زبان میں بھی اظہار خیال و واقعہ کے نئے نئے طریقوں، الفاظ کے انتخاب اور در و بست کے سلیقے، کردار نگاری اور منظر کشی کے فنی اسلوب اور ایک ترقی یافتہ اور متمدن قوم کی زندگی اور اس کی رنگا رنگیوں سے روشناس کرایا۔ اور اس لحاظ سے وہ مجھے پریم چند سے زیادہ خوش نصیب نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے یہاں انتہائی فنی بصیرت، شعور کی پاکیزگی اور فکری عظمت کے باوجود مطالعے کی کمی کی وجہ سے کبھی کبھی قدرے تنگ سامانی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اپنی محدود دنیا کو بھی اپنے قلم کی بے مثل قوتوں سے کہیں کہیں اتنا بلند کر دیا ہے کہ فرشتوں کے پر بھی تھک جاتے ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں یا ناولوں میں فضا کی جو یکسانیت اور یک رنگی نظر آتی ہے وہ کبھی کبھی قاری کو تھکا دیتی ہے۔ اور مجھے تو بعض اوقات بڑی شدید ذہنی ناآسودگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" اور واقعہ بھی یہ ہے کہ انھوں نے حسن کا معیار بدلا اور ان کے اس اقدام میں اس عہد کے اکثر ذی شعور اور حساس ادیبوں نے، جن میں حسینی بھی پیش پیش تھے، ان کا ساتھ دیا۔ "اب ادیبوں کو اپنی نظروں کے سامنے گلاب کی نرم و نازک پنکھڑی دیکھ کر کسی ماہ وش کا خوبصورت چہرہ ہی یاد نہیں آتا تھا بلکہ کیلے کے پھٹے ہوئے پتے کو دیکھ کر کسی بھکارن کی ساری بھی یاد آ جاتی تھی۔" جس میں لگے ہوئے درد، افلاس، بے بسی اور لاچاری کے پیوند ذہن پر کچوکے لگاتے تھے۔ لیکن پریم چند کی ٹریجڈی یہ رہی کہ اپنی زندگی کے کسی بھی شعوری لمحے میں وہ زمینداروں کے مظالم پر افسردہ و مشتعل ہونے کے باوجود دنیا گیردارانہ نظام کی برکتوں کے اعتراف، راجپوتوں کی شجاعت اور دلیری کے بار بار دہرائے ہوئے واقعات، گوند کی طرح چپکی ہوئی روایات کے احترام اور ایک صحت مند لیکن محدود مثال پرستی کے شدید جذبات سے اپنے آپ کو الگ نہ کر سکے۔ ان کی دنیا ایک دائرے میں گھر کر رہ گئی۔ اور یہ بات ہے کہ انھوں نے اس دنیا کو ہمالیہ کی بلندی اور اتھاہ سمندر کی گہرائی عطا کی اور ان کی قابل احترام بے باکی،

جرأت اظہار، روشن ضمیری، سچائی، خلوص، صداقت اور محبت سے پیار، زندگی کے ایک خوبصورت نظریے اور مستقبل کے ایک بحید تابناک تصور نے دوسروں کے لئے ایک مینارۂ نور کا کام دیا اور جن لوگوں نے زیادہ سے زیادہ ذہانت اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ اس روشنی سے اکتساب فیض کیا اور اسے اپنے لئے مشعل راہ بنایا ان میں علی عباس حسینی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

پریم چند سرکاری ملازم تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی جرأت اظہار سے اقتدار کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو سکتی ہیں انھوں نے اپنے اصلی نام دھنپت رائے سے لکھنے کے بجائے پریم چند کا لقب اختیار کیا۔ انھوں نے اپنا نام بدل دیا لیکن کام کی نوعیت وہی رہی جو اس وقت تھی جب ان کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" شائع ہوا تھا اور تاج برطانیہ کے معزز غلاموں نے اس سے انقلاب اور بغاوت کے بھبکے اٹھتے دیکھ کر اسے جبر و استبداد کے آتشکدے میں ڈال دیا تھا۔ حسینی بھی سرکاری ملازم تھے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۴ء تک یعنی چونتیس برس وہ سرکاری مدارس میں معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ زندگی کے اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں :—

"دو دو طرح کے احتساب تھے۔ ایک تو سرکاری غلامی کا۔ دوسرے نابالغ ذہنوں کی مدرسی کا۔ پھر دس برس بحیثیت ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل کے کئی ہزار بچوں کے کردار و سیرت کی تشکیل کا بھی ذمہ دار رہا۔ ظاہر ہے کہ کبھی کھل کر نہ لکھ سکا۔"

غرض کہ پریم چند نے سرکاری ملازمت کی نزاکتوں کے پیش نظر اپنا نام بدل دیا اور کام حسب دستور جاری رکھا۔ حسینی نے جو راستہ اختیار کیا وہ پریم چند کے راستے سے زیادہ پیچیدہ، مشکل اور دقت طلب تھا۔ اپنے آپ کو کسی فرضی نام کے غلاف میں چھپائے بغیر انھوں نے اپنے افکار کے چراغ روشن کئے۔ ان کی ادبی زندگی کم و بیش چالیس برس کے وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی ہے اور جب ہم اس کینوس پر نظر ڈالتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ احتساب کی کمندوں سے خود کو بچاتے ہوئے انھوں نے جس فنی بصیرت اور بصارت کا ثبوت دیا وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ کہیں بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ ان کی آواز خوف کے دھندلکوں میں کھو گئی ہو۔ ان کا قلم ہمیشہ اپنی منزل کے سراغ میں گامزن نظر آتا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو نیاز کی طرح یا مجنوں کی طرح یا سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش کی طرح اپنے تصورات کی باگ دوسری طرف موڑ دیتے اور واقعہ یہ ہے کہ زبان و بیان پر انھیں جو فنکارانہ عبور حاصل ہے اس کے پیش نظر وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔ وہ بڑی آسانی سے خواب اور حسن، رنگ اور نکہت، کیف اور رومان اور شاعرانہ جذبات کی قوس قزح میں خود کو کھو کر اپنے تخلیقی کرب کی تشفی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ ادب کا ایک صحت مند نظریہ رکھتے تھے جس کی صحت پر انھیں کامل اعتماد تھا۔ خود اپنے الفاظ میں انھوں نے "اہل بصیرت کے لئے بہت کچھ اپنے معاشرے اور سماجی زندگی کے متعلق لکھا ہے۔" (ایک خط کا اقتباس) انھوں نے ہندوستان کی سماجی زندگی کے شاید ہی کسی پہلو کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش نہ کی ہو۔ برسوں پرانی روایات کے تانے بانے، توہمات اور معتقدات، انسانی فطرت کے گوناگوں تصورات، مختلف سماجی، معاشی اور معاشرتی پیچیدگیوں سے ابھرنے والے احساسات، ان سب پر حسینی نے قلم اٹھایا ہے۔ بعض اوقات انھوں نے زندگی کے بہت چھوٹے چھوٹے واقعات اور معمولی باتوں پر بھی کہانی کی ایک خوبصورت عمارت کھڑی کر دی ہے لیکن ایسے واقعات کے بیان میں بھی ان کے قلم کی بوقلمونی بڑی دلکشی پیدا کر دیتی ہے اور اس کا سبب ان کے افسانوں میں نظر آنے والا زبان اور اسلوب کا وہ رچا ہوا احساس ہے جو بیشتر اچھے افسانہ نگاروں کے یہاں نظر نہیں آتا۔ پوپ (Pope) نے اسلوب کو خیال کا لباس اور کارلائل (carlyle) نے اسے کسی مصنف کا جامہ نہیں بلکہ جلد کہا ہے جسے اتارا نہ جا سکے۔ حسینی صاحب کا اسلوب ان کے خیال کا بہترین لباس ہے اور ان کے موضوع سے اتنا ہم آہنگ ہوتا ہے کہ ان دونوں کو

ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نیومین (Newman) کا خیال ہے کہ عام مصنف زیادہ تر اپنے عہد کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مگر ذہین ادیب اپنی ضرورت کے مطابق اپنے خاص انداز میں قدیم الفاظ بھی استعمال کرتا ہے۔ حسینی کی کہانیوں میں زبان کی یہ جلوہ سامانی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ زبان و بیان کے پردوں میں کبھی کبھی انھوں نے ایسی باتیں بھی کہہ ڈالی ہیں جو ان کے نہاں خانۂ دل میں شعلے کی طرح بھڑک رہی تھیں اور جن کی تپش ارباب اقتدار کی خواب گاہوں کے زرنگار پردوں تک پہونچ سکتی تھیں لیکن محض اپنی فنی چابکدستی کی وجہ سے وہ کہیں گرفت میں نہ آ سکے۔

یہ بھی ہے کہ حسینی کی آواز کبھی بھی ایک مخصوص سطح سے ابھرنے نہیں پاتی اور جذبات اپنی جگہ پر خاصے تیکھے ہوتے ہوئے بھی کبھی شدت کی منزل تک نہیں پہونچتے۔ انھوں نے ہر جگہ اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ " ادب بہترین پروپیگنڈا ہو سکتا ہے لیکن پروپیگنڈا ہرگز ادب نہیں ہو سکتا۔" ادب کا ایک مثبت تصور رکھنے کے باوجود وہ ترقی پسندوں کے ساتھ زیادہ دور تک نہیں چل سکے۔ بلکہ اپنے ایک دوست کی اطلاع کے مطابق حسینی ترقی پسندوں کو شاید پسند بھی نہیں کرتے گو کہ ان کی ناپسندیدگی کبھی بھی قید اظہار میں نہیں آئی۔ اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ بیشتر ترقی پسند ادیبوں کے یہاں جذبات میں شعلوں کی جو تڑپ، احساسات میں جو شدت اور اظہار و بیان میں تلوار کی دھار جیسی جو تیزی نظر آتی ہے اس سے حسینی کا مزاج شاید زیادہ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا اور ان کی خواہش یا کوشش کے باوجود نہیں ہو سکتا تھا یا اگر بفرضِ محال ہو بھی جاتا تو وہ خود اپنے اس رویہ پر اعتدال کے پہرے بٹھا دیتے کیونکہ جس ماحول میں ان کی ذہنی نشو و نما ہوئی اس کے تقاضے بھی یہی تھے کہ وہ لاک (Locke) کے درمیانہ راستے (Way of Compromise) کو اختیار کرتے۔ ماضی کی چند روایات سے لگاؤ، نسلی امتیازات کا احساس، انگریزی زبان و ادب سے گہری وابستگی ہونے کے باوجود ایک مولوی گھرانے کا وارث ہونے کی وجہ سے زندگی اور تصور زندگی کی ایک مخصوص شکل سے جذباتی رشتے اور معلمانہ زندگی کا لازمی ردّ عمل پھر ان سب سے زیادہ اہم سرکاری ملازمت کا مسئلہ جس سے بے نیازی برتنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا، ان تمام چیزوں نے مل جل کر ان پر چند پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ لیکن ان پابندیوں نے انھیں ایک فائدہ بھی پہونچایا، ان کی وجہ سے وہ وقت کے عام سیلاب میں بہہ نہ سکے بلکہ ان کی انفرادیت نکھرتی گئی۔ وہ حدود کے اندر رہ کر بھی اپنی بات میں وسعت سے زیادہ گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس لئے ان کی آواز ہوا کے تند و تیز جھونکوں کی طرح تھپیڑے نہیں لگاتی، چنگاری کو شعلہ نہیں بناتی بلکہ قاری کے احساس کے دروازوں پر دستک دے کر یا جذبات کے تاروں کو مرتعش کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ میانہ روی حسینی کے فن پر کسی مخصوص مکتب فکر یا ادبی ادارے کی مہر نہیں ثبت کرتی۔ وہ ہر ایک کو مطمئن کر دیتے ہیں۔ مولوی اور ملحد، سرمایہ دار اور مزدور، گاندھی وادی اور مارکسی، مسلمان اور غیر مسلم، رجعت پسند اور ترقی پسند کوئی بھی ان سے شاکی نہیں کیونکہ وہ نہ تو خدا کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور نہ روحانیت کا مذاق اڑاتے ہیں، انقلاب کے بلند آہنگ نعرے لگاتے ہیں نہ معاشی استحصال کی تائید کرتے ہیں، اسلام پر نکتہ چینی کرتے ہیں نہ دوسرے مذاہب، عقائد و نظریات کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح وہ بیک وقت صوفی مومن اور اشتراکی مسلم نظر آتے ہیں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ اس ہجوم اعتدال میں ان کی انفرادیت یا 'انا' ضم ہو کر رہ گئی ہو۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں ان کے پورے فن پر ادب کے ایک روشن تصور کا عکس ہے جس میں ان کے مخصوص لب و لہجے نے ایک انفرادی شان پیدا کر دی ہے اور اس انفرادی شان کو ہم ان کا شناختی کارڈ کہہ سکتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ شاید اسی افتاد طبع کے باعث حسینی کا نام اردو افسانے کے افق پر کسی برقی لہر کی طرح نہیں کوندا۔ نہیں ہوا کہ ایک افسانہ لکھ کر وہ اچانک پڑھنے والوں کو جھنجھوڑ دیتے یا سناٹے میں چیخ کی کسی لہر کی طرح پوری فضا کو [illegible] رہتے ہوئے

ایکبارگی سب کو متوجہ کرلیتے اور دوسری صبح جب دنیا آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی تو ایک نیا افسانہ نگار اپنی بے پناہ عشوہ طرازیوں کے ساتھ ادبی دنیا کو زیر و زبر کرتا ہوا نظر آجاتا ۔ انھوں نے دھیرے دھیرے اپنی جگہ بنائی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی دھیمی لیکن واضح آواز اسی کی متقاضی بھی تھی کہ اُسے غور سے سُن کر اور سوچ سمجھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاتی ۔ یہی وجہ ہے کہ ارتقاء کی منزلیں طے کرنے کے بعد آج وہ شہرت کے جس مقام پر نظر آتے ہیں وہ اپنی جگہ مستقل اور اٹل ہے جو اخبار کی کسی سنسنی خیز خبر کی طرح چند گھڑیاں گذر جانے کے بعد فرسودہ یا out of date نہیں ہو سکتا ۔

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے ۔ کرشن چندر کے چند ایسے افسانوں کو ذہن میں رکھ کر جو بظاہر عیش پسند امراء یا جنسی بھوک کے شکار نوجوانوں کے اعصاب پر تھپکیاں دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ، ایک صاحب نے کرشن چندر ہی سے سوال کیا کہ آپ کے افسانوں میں آج کل جنسیت کیوں غالب آتی جا رہی ہے ؟ کرشن چندر نے انھیں دو ٹوک جواب دیا ۔ " سٹھیا گیا ہوں ! " اور اس کے بعد گفتگو آگے نہیں بڑھ سکی کیونکہ کرشن چندر کے سیدھے سادے جواب نے بحث کے امکانات ہی ختم کر دئیے تھے ۔

ادھر علی عباس حسینی نے بھی دو ایسی کہانیاں لکھی ہیں جنھوں نے ادبی حلقوں میں خاصا شور برپا کیا ۔ ایک " سیلاب کی راتیں " اور دوسری " ایک غسل خانے میں ۔ ! " جو فاضل مدیر کی جدت طبع کے باعث " مردوں کا حمام " کے عنوان سے شائع ہوئی ۔ حسینی تخیلی جست لگانے کی عادی نہیں ہیں اس لئے " سیلاب کی راتیں " لکھنے سے پہلے انھوں نے گذشتہ سیلاب میں بڑی لگن کے ساتھ لکھنؤ کے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کیا ۔ ان علاقوں میں ڈوبتی ابھرتی زندگی کو غور سے دیکھا ، مختلف کرداروں سے باتیں کیں ، ان کے نوٹس تیار کئے اور اس کے بعد کہانی لکھی ۔ " ایک غسل خانے میں ۔ ! " (یا مردوں کا حمام) میں غسالوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جن کی رگوں میں سرد بے جان لاشوں کو دیکھ کر زندگی کی حرارت اور توانائی آتی ہے ۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ دونوں موضوعات بہت اہم اور وسیع ہیں ۔ حسینی نے انھیں ایک خاص نقطۂ نظر سے برتا ہے ۔ یہ دونوں کہانیاں ان کی زندگی کے دورِ آزادی سے بہری مراد سرکاری ملازمت کی قید سے آزادی ہے جس کے بعد خود انھیں کے الفاظ میں " ان کے قلم میں شوخی زیادہ آگئی ہے " اول الذکر کہانی میں انھوں نے ایک فنکار کی غیر شعوری عظمت فن دکھائی ہے اور دوسری میں دو ایسے کردار پیش کئے ہیں جن میں سے ایک شروع سے آخر تک مفعول (Passive) ہے ، جسے اس کے ماحول اور تربیت نے ایسا بنا دیا ہے اور جو ایک مرد ہونے کے باوجود دوسرے مرد کی آغوش گرم کرتے کرتے خود اتنا ناکارہ ہو چکا ہے کہ اپنی بیوی کے سامنے ، جو دوسرا اہم کردار ہے اور اپنے ماحول سے لڑتی ہے اور اس پر فتح پاکر اپنے بیٹوں کے لئے ایک نئی دنیا بناتی ہے ۔ سپر ڈال دیتا ہے اور اس کے اشاروں پر ناچنے لگتا ہے ۔ دونوں کہانیوں میں ایسے متعدد موقعے آئے ہیں جن کی تفصیلات کے ساحل پر کھڑا ہو کر پڑھنے والا حیرت اور استعجاب کی نظروں سے بار بار حسینی کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی کبھی تو اُسے یہ شک بھی ہونے لگتا ہے کہ یہ وہی حسینی ہیں یا کوئی اور ۔ یوں ان دونوں کہانیوں سے پہلے بھی انھوں نے جنس کو موضوع بنایا تھا لیکن ان کے قلم میں جذبات کی سرگوشیاں تو کانوں تک پہونچتی تھیں لیکن جذبات کا شور نہیں سنائی دیتا تھا کیونکہ اس وقت تک وہ چند مصلحتوں کے پیش نظر پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتے تھے ۔ ان دونوں کہانیوں میں ایسی کوئی حد فاصل نظر نہیں آتی ۔ گو کہ میں نے جب ان پر گفتگو کرتے وقت ان سے یہی بات کہی تو انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ ان کہانیوں کو لکھتے وقت بھی وہ یہ نہیں بھول سکے تھے کہ یہ کہانیاں ہزارہا نوجوانوں کے علاوہ خود ان کی لڑکیاں اور لڑکے بھی پڑھیں گے اس لئے عریانی یا برہنگی (Nudeness) پر انھوں نے پردے ڈال دئیے ہیں ۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انھوں نے بیشتر نازک موقعوں پر بڑی فنی چابکدستی اور بصیرت کا ثبوت دیا ہے ۔ پھر بھی بعض جزئیات کی تفصیل دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ

کہیں کہیں ان کے قلم کی شوخی کا رنگ اتنا گہرا ہوگیا ہے کہ نگاہوں کو کھٹکتا ہے ۔ ایک بار کہانیوں میں "گالی" کے الفاظ کے استعمال سے متعلق میرے ایک سوال کے جواب میں کرشن چندر نے کہا تھا کہ اگر کہانی میں کوئی ایسی منزل آجائے جہاں شدت احساس کو پڑھنے والے کے ذہن میں منتقل کرنے کے لئے لکھنے والے کو کسی ایسے لفظ کا سہارا لینا پڑے جیسا کہ انھوں نے "مہالکشمی کا پل" میں طوطے کی زبان ایک مکالمہ ادا کراتے ہوئے مجبوراً کیا ہے تو یہ چیز اپنی جگہ پر قابل گرفت نہ ہوگی "سیلاب کی راتیں" اور "ایک غسل خانے میں" ! "

ان دونوں کہانیوں میں بھی ایسی منزلیں آئی ہیں جہاں حسینی نے کسی حد سے زیادہ شوخ لفظ کا سہارا تو نہیں لیا لیکن اکثر اوقات "نیم عریانی" میں "برہنگی" سے زیادہ کشش ہوتی ہے اور خود یہ میرا دماغی فتور ہو بہرحال مجھے کہیں کہیں یہ احساس ہوا ہے کہ یہ دونوں کہانیاں ذہنی اور معاشی ناآسودگی کے ساتھ ساتھ جنسی ناآسودگی کے اس دور میں اعصاب کے لئے کسی قدر غذائے تسکین مہیا کرتی ہیں ۔

لیکن اپنے اس پہلو سے قطع نظر حسینی نے ان دونوں کہانیوں میں کردار نگاری، کرداروں کی نفسیاتی کش مکش کی عکاسی، اس کش مکش سے پیدا شدہ نتائج کی مصوری جس فنکارانہ عظمت کے ساتھ کی ہے وہ پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی بہرحال یہ دونوں کہانیاں حسینی کی افسانوی زندگی کے ایک موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔ ان کے لئے یہ تجربے نئے نہیں لیکن انوکھے ضرور ہیں اور ہم توقع کرتے ہیں کہ یہ تجربات ان کے یہاں آئندہ بہتر سے بہتر شکلوں میں رونما ہوں گے ۔

(۳)

اب سے بارہ تیرہ برس پہلے کی بات ہے جب میں نے پہلے پہل حسینی صاحب کا افسانہ "آئی ۔ سی ۔ ایس" پڑھا تھا جو ہائی اسکول کے نصاب میں شامل تھا ۔ اپنی ذہنی کم مائگی اور فرومایہ شعور کے باوجود اس وقت مجھے یہ افسانہ بے حد پسند آیا تھا اور آج جب اس واقعے کو ایک زمانہ گذر چکا ہے مجھے اس افسانے کے کرداروں کے نام اور کم و بیش ساری تفصیلات اچھی طرح یاد ہیں ۔ یہ واقعہ حسینی صاحب سے غائبانہ تعارف کی پہلی منزل تھی ۔ اس کے بعد سے میں برابر ان کے افسانے پڑھتا رہا لیکن ملاقات کی سعادت گذشتہ اگست کی ایک صبح کو نصیب ہوئی ۔

لکھنؤ میں محلہ وزیر گنج کے تھانے سے متصل ایک گلی غوث گنج کی بھری پُری آبادی کو سڑک سے ملاتی ہے ۔ اس گلی میں کچھ آگے بڑھنے پر پرانی وضع کا ایک دو منزلہ مکان نظر آتا ہے جس میں حسینی صاحب رہتے ہیں ۔

..یوں اس صبح سے دو ہی روز قبل شادی کی ایک تقریب میں میں نے پہلی بار حسینی صاحب کو دور سے دیکھا تھا ۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، گورا چٹا سرخی مائل رنگ، مضبوط اور صحت مند جسم، اچھی خاصی عمر کے باوجود چہرے پر تابناکی اور آنکھوں میں ایک خاص چمک کے ساتھ ساتھ جسم پر ڈھیلی ڈھالی شیروانی، ٹوپی، چوڑی مہری کا پائجامہ اور ہاتھ میں دبی ہوئی چھڑی ۔ یہ سب مل جل کر حسینی صاحب کی شخصیت کو خاصا بارعب بناتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے اور اگر پہلے سے حسینی صاحب کے چند افسانے ذہن میں ہوں تو غیر شعوری طور پر انھیں دیکھنے کے بعد فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں جن صحت مند اقدار کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی توقع بھی بجا طور پر ان جیسے صحت مند اور توانا انسان سے کی جا سکتی ہے !

جب میں حسینی صاحب کے یہاں پہنچا اس وقت میرے ساتھ میرے ایک دوست شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر سید محمود الحسن رضوی بھی تھے ۔ مجھے باہر چھوڑ کر وہ حسینی صاحب کو اطلاع دینے کے لئے گھر میں چلے گئے ۔ ادھیڑ عمر کے ایک ملازم نے نشست گاہ کا دروازہ کھولا اور لکھنؤ کے روایتی عجز و انکسار کے ساتھ ہونٹوں پر خفیف سا جھینپا جھینپا تبسم اور کچھ نیم واضح الفاظ میں سلام کرنے کے بعد جھاڑن سے کرسیوں کی گرد صاف کرنے لگا ۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جو پرانی وضع کے صوفے، چند ایزی چیرس، ایک چوڑی میز اور

الماریوں پر لٹکتے ہوئے، پرانے پردوں سے کافی بھرا پڑا نظر آرہا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت حسینی صاحب غالباً اوپری منزل کے کسی کمرے میں کسی خط کا جواب لکھ رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد خود تشریف لائے بالکل سیدھے سادے، سفید کرتے اور پائجامے میں ملبوس جس سے وہی سادگی نمایاں تھی جو ان کی کہانیوں یا مجموعوں کے عنوانات میں نظر آتی ہے۔ متین لیکن متبسم خلوص کے ساتھ حسینی صاحب ملے اور بیٹھ گئے۔ میں نے صبح صبح حاضر ہونے پر معذرت کرنی چاہی لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کرتا، خود حسینی صاحب مصروفیت کے باعث چند منٹ بعد تشریف لانے کی وجہ معذرت آمیز انداز میں بیان فرمانے لگے۔

اتنے میں کوئی فون آگیا اور وہ یہ کہتے ہوئے کہ "آپ سگریٹ یا پان سے شوق کیجئے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں بڑے غور سے ان کے حرکات و سکنات (movements) کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے مزاج کی سادگی اور شفقت آمیز لیکن متین بے تکلفی نے پہلی ہی ملاقات میں میری ساری جھجک ختم کردی تھی چنانچہ جب وہ دوبارہ تشریف لائے تو میں نے بڑے آزادانہ طور پر ان سے باتیں شروع کردیں۔ چند رسمی لیکن ضروری باتوں کے باوجود میں نے اصل موضوع چھیڑ دیا اور حسینی صاحب اپنی کہانیوں پر اظہار خیال فرمانے لگے۔ اپنے آپ کو موضوع بناتے ہوئے، نہ تو ان کی باتوں میں بے وجہ عجز و انکسار کی جھلک تھی اور نہ ہی کسی قسم کی خودستائی کا شائبہ نظر آرہا تھا۔ بات ان کی کہانی "برسات کی راتیں" سے شروع ہوئی۔ دوران گفتگو میں انھوں نے اچانک رک کر کہا "ادھر میں نے ایک اس سے بھی تیز چیز لکھی ہے کہئے تو سناؤں؟"

میں نے اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھا کہ حسینی صاحب کی زبان سے ان کی کوئی کہانی سنوں۔ اور حسینی صاحب مجھے مشتاق دیکھ کر اپنی تازہ کہانی "ایک غسل خانے میں۔۔۔!" سنانے لگے جو میں نے اس وقت تک نہیں پڑھی تھی۔ یوں واقعہ یہ ہے کہ میں افسانہ سننے سے ہمیشہ بچتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں اشعار یا تنقید و تقریر کا لطف تو سن کر اٹھایا جاسکتا ہے لیکن افسانے سننا عام طور سے کوئی بڑا خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا۔ اکثر پڑھنے والے کی آواز کہانی کے نشیب و فراز، مکالموں کی دھوپ چھاؤں اور واقعات کی رفتار اور ان کے نقطۂ عروج کو سننے والے کے ذہن میں اس طرح منتقل کرنے سے قاصر رہتی ہے جس کا تجربہ اسے آزادانہ طور پر وہی کہانی پڑھتے ہوئے ہوسکتا ہے۔ کہانیاں پڑھتے وقت پڑھنے والا کہانی کے کرداروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے اور تصور کی آنکھوں سے کہانی کی فضا اور واقعات کے رنگ و آہنگ کو جیتی جاگتی شکل میں دیکھنے لگتا ہے۔ کہانیاں سنتے وقت اکثر سنانے والے کی آواز اور اس کا لب و لہجہ سننے والے اور کہانی کے کردار و واقعات کے درمیان ایک دیوار بن جاتا ہے لیکن حسینی صاحب کے پڑھنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ میں یا محمود صاحب یا آفتاب اختر صاحب (سید اختر علی تلہری صاحب کے صاحبزادے جو میں آگئے تھے) غرض کہ ہم میں سے کسی نے بھی ایک لمحے کی اکتاہٹ نہیں محسوس کی۔ حسینی صاحب کی آواز کہانی کی مختلف منزلوں کے ساتھ ساتھ، کرداروں کی حرکت و عمل کے ساتھ ساتھ واقعات کی حرارت یا خنکی کے ساتھ ساتھ، ان سے پوری مطابقت رکھتے ہوئے، اپنا سفر طے کررہی تھی۔ کہانی کی پوری فضا اور کردار جیتی جاگتی شکلوں میں ہمارے سامنے آگئے تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ حسینی صاحب ایک اچھے افسانہ خواں بھی ہیں۔

خاصی طویل کہانی تھی۔ ہم لوگ بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔ آخر میں میں نے بہت دھیرے سے سوال کیا۔

"آپ نے ایسی کہانیاں پہلے کیوں نہیں لکھیں؟"

میرا سوال سن کر حسینی صاحب کے چہرے پر خفیف سی الجھن کے آثار پیدا ہوئے اور انھوں نے فوراً جواب دیا:۔

آپ یہ تو سوچئے کہ میں اس وقت آزاد کہاں تھا۔ میرے ساتھ چند مجبوریاں تھیں۔ خیر۔ لیکن "سیلاب کی راتیں" اور "ایک غسل خانے میں۔۔۔!" یہ دونوں کہانیاں بہت کھل کر لکھنے کے باوجود میں نے یہ بات اپنے پیش نظر رکھی ہے کہ میری لڑکیاں

لڑکے اور شاگرد سبھی انھیں پڑھیں گے اس لئے میرا قلم کہیں بھی بہکا نہیں ہے۔"

میں نے اس مسئلے کو آگے نہیں بڑھایا اور ہم لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ مجھے اسی دن لکھنؤ سے رخصت ہونا تھا، اس لئے اپنی خواہش کے باوجود زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکا۔ لیکن ہم لوگ جتنی دیر وہاں رہے حسینی صاحب اس انداز میں باتیں کرتے رہے گویا نو عمر طلباء کے بجائے اپنے دوستوں سے مخاطب ہوں۔ ان کے لہجے کی شفقت آمیز سنجیدگی اپنی جگہ پر تھی لیکن یہ سنجیدگی ان کی شخصیت اور ہم لوگوں کے درمیان حائل نہیں ہوئی اور وہ نہ صرف یہ کہ خود بولتے رہے بلکہ ہماری باتیں بھی بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ سنیں۔ میں نے لکھنؤ کے دوسرے سفر میں ان کی خدمت میں دوبارہ حاضری کا وعدہ کیا اور ان سے اجازت لے کر ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اسی شام کو میں اپنے وطن سلطان پور چلا گیا۔ الہ آباد آ کر میں نے انھیں خط لکھے۔ حسینی صاحب نے فوراً جواب دیا۔ مجھے چند دنوں کے لئے ان کے مجموعے "میلہ گھومنی" کی ضرورت تھی جو الہ آباد میں دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ میرے خط کے جواب میں انھوں نے بڑی سادگی سے لکھا:-

"چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ میری سولہ سترہ تصنیفات میں سے مشکل سے دو تین کا کوئی نسخہ میرے گھر میں ہوگا!"

اور مجھے یاد آیا کہ ان کی کنبہ پروری، روایتی وضعداری اور دوست نوازی نے اکثر اوقات ان کے گھر کو اچھے خاصے ہاسٹل اور ریستوراں میں تبدیل کر دیا ہے۔ دوستوں کے جا و بے جا ناز کا بار وہ ہمیشہ بڑی خوشی سے اٹھاتے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی چیزیں بھلا ان کے پاس محفوظ کیسے رہ سکتی ہیں۔

یوں میں نے حسینی صاحب کو بہت قریب سے نہیں دیکھا لیکن ان کی کہانیوں کے پیچ و خم میں انھیں برابر دیکھتا اور سمجھتا رہا ہوں اور جب بھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہی احساس ہوتا ہے کہ ان کا ادبی قد بھی بلند ہے اور انسانی قد بھی اور یہ دونوں صفتیں بیک وقت کم ہی لوگوں کے ہاتھ آتی ہیں۔ اتنے کم لوگ کہ انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔!

وقت کی پابندی، انسانی زندگی کا ایک بہترین جزو ہے

ملازمت، تجارت، زراعت اور عبادت کے علاوہ وقت مقررہ پر ہر کام کو انجام دینے کیلئے آپ کو اگر صحیح وقت بتانے والی گھڑی کی ضرورت ہے تو...

آزاد واچ کمپنی

پٹنہ مارکٹ نمبر ۶۳

میں تشریف لائیں جہاں ہر قسم کی گھڑیاں کفایت اور مناسب داموں پر گارنٹی کے ساتھ دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی گھڑیوں کے اوریجنل پرزے اور گارنٹی کے ساتھ مرمت بھی ہوتی ہے۔

صرف آزمائش شرط ہے!

صالحہ عابد حسین

کہانی کار۔ علی عباس حسینی

لڑکپن میں کسی فنکار سے ملنے کی کتنی تمنا ہوتی ہے اور اسے دیکھ کر دل میں کیا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے یہ صرف وہی سمجھ سکتا ہے جسے کسی فن سے محبت اور اس فن کے ماہر سے عقیدت ہو۔

میں بچپن ہی سے کہانیوں کی دلدادہ تھی اور افسانہ نگاروں کی عقیدت مند۔ حروف شناسی کے فوراً بعد ہی کہانیاں پڑھنے کی کوشش شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شد بد اسی زمانے میں آگئی۔ کہانیوں کی کمی نہ تھی۔ بچوں کی ننھی منی کہانیوں سے لے کر فسانۂ آزاد کی ضخیم جلدیں تک گھر میں موجود تھیں۔ عورتوں کے رسالوں میں چھپی نستعلیق اور اصلاحی کہانیاں اور عورتوں کے لکھے ناول اس وقت شریف گھرانوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے اور میں ان سب کو چاٹ چکی تھی۔ مگر منشی پریم چند کی کہانیاں پڑھ کر جو کیفیت پیدا ہوتی اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ خدا جانے دل میں چھپے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھیں جن کی میٹھی کسک دیر تک باقی رہتی۔ کہانی سننے اور پڑھنے کا شوق جانے کیسے کہانی لکھنے کا شوق بن گیا۔ اور یہ دونوں شوق عمر کے ساتھ ساتھ بجائے گھٹنے کے بڑھتے ہی گئے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو پریم چند کا نام دنیائے ادب میں کافی مشہور ہو چکا تھا۔ فضا میں پریم چند کا ڈنکا بج ہی رہا تھا کہ کچھ اور افسانہ نگاروں نے صاحبانِ ذوق کو چونکا دیا اور دیکھتے دیکھتے وہ مطلع ادب پر تابناک تاروں کی طرح دمک اٹھے۔ علی عباس حسینی کا نام ان میں سب سے زیادہ روشن تھا۔

حسینی صاحب کے افسانے بھی میں بڑے شوق سے پڑھتی۔ سیاہی کا پھول، رفیقِ تنہائی، اور آئی سی ایس میرے بڑے پسندیدہ افسانے تھے۔ انکی کہانیاں پڑھ پڑھ کر ان سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ بچپن اور نوجوانی میں خدا جانے کیوں ذہن یہ فرض کر لیتا ہے کہ فنکار کسی نرالی شخصیت اور انوکھے مزاج و انداز کا آدمی ہوتا ہے جو ہر وقت بس اپنے میں ڈوبا رہتا اور بس اُسی کے بارے میں سوچتا، بولتا اور سنتا ہے (ہمارے اکثر فنکار اسکا التزام بھی کیا کرتے ہیں نا) میرے ذہن میں بھی اپنے محبوب ادیبوں کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔ پریم چند سے ملنا تو نصیب ہی نہ ہوا مگر حسینی صاحب سے بھی برسوں بعد جب عمر اور شعور پختہ ہو چکے تھے ملاقات ہو سکی۔ ان میں اپنے فن کا اشتہار دینے والا کوئی انداز نہ تھا۔ وہ سیدھے سادے، خوش مزاج، ملنسار ایک انسان نظر آئے۔ جو قدیم و جدید تہذیب کی شرافت و وضعداری کا نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں وہ ادیبوں، شاعروں، فن کاروں والی چونکا دینے والی ادا کہاں ہے! وہ ایک سگے بھائی کی سی محبت و شفقت سے ملتے ہیں۔ بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن میں سب سے کم جو موضوع زیرِ بحث آتا ہے وہ ادب و شعر ہے۔ انہیں خواہ مخواہ ادب اور فن پر باتیں کر کے دوسروں کو مرعوب کرنے کا شوق نہیں۔ اپنی یا دوسروں کی کہانیوں کے تذکرے اور تبصرے سے زیادہ شوق سے تو وہ خوش ذائقہ کھانوں، انکے پکانے کی ترکیبوں اور کھانے کے شوقین لوگوں کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ وہ کہانیاں جو دن رات انکے ذہن میں گونجتی رہتی ہیں، وہ کردار جو انکے دماغ میں نشو و نما پاتے رہتے ہیں بے وجہ ہر کسی کے سامنے وہ ان کو بے پردہ کرنا شاید پسند نہیں کرتے۔ اگر نو عمری کے زمانے میں ان سے ملی ہوتی تو شاید بہت مایوسی ہوتی کہ یہ کیسا ادیب ہے جو فن کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ مگر اب جانتی ہوں کہ بڑے فنکار کی پہچان زیادہ اچھی طرح یوں بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے حلیے اور حرکتوں سے اپنا اشتہار دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتا بلکہ ہمارا آپکا سا سیدھا سادہ انسان نظر آتا ہے۔

علی عباس حسینی بھی دیکھنے میں بڑے سیدھے سادے شریف پان کے رسیا، اچھے کھانوں کا ذوق اور شوق رکھنے والے خوش مزاج آدمی نظر آتے ہیں۔ سرسری ملاقات میں دیکھنے والا سمجھے کہ انہیں کبھی ادب سے ذوق

بڑی نہیں شاید مگر یہ حسینی کا خاص روپ ہے کہ فنکار نے اپنے فن میں چھپا رہنا ہے ایسے عشق و محبت کی شدت جس کی پرستاری نظر کی باریکی مشاہدہ کی گہرائی معاشی شعور کا احساس ایک بہتر اور بہتر دنیا کی تعمیر کی لگن اور درد دل کا اندازہ کرنا ہو (اصلی حسینی کا روپ دیکھنا) چاہتے ہیں تو انکی وہ سینکڑوں کہانیاں پڑھیے جو تقریباً پچاس سال سے وہ لکھ رہے ہیں جو متعدد مجموعوں کی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہیں اور رسالوں اور اخباروں میں بھی بکھری پڑی ہیں۔

حسینی صاحب نے ہر دور میں کہانیاں لکھی ہیں نوجوانی میں بھی جب رومان کا جنون دل و دماغ پر غلبہ پا رہا ہے اور بقول شخصے ہر خوبصورت میں کامل حسن اور ہر عاشق مزاج میں کامل عشق کا جلوہ نظر آتا ہے متوسط عمر میں بھی جب زندگی اپنے اصلی رنگ و روپ میں نظر آتی اور زیادہ سچائی اور توازن سے پیش کی جا سکتی ہے اور اب پختہ عمر میں بھی جب ان کا قلم آزاد ہندوستان کا رنگ و روپ دکھا رہا ہے اور نئے ہندوستان کی تعمیر کا مقدس کام کرنے کا فرض ادا کر رہا ہے۔

انکی ابتدائی کہانیاں جو زیادہ تر ابتدائی دور کی لکھی ہوئی ہیں بہت جذباتی ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر سادگی اور حقیقت رکھتی ہیں۔ ان رومانی کہانیوں میں متوسط شریف گھرانوں کے لڑکی لڑکوں کی ڈھکی چھپی محبت کی داستانیں بھی ہیں۔ ادنیٰ طبقے کی نڈر، بے باک اور زیادہ صحت مند الفت کی کہانیاں بھی۔ زمینداروں اور رئیسوں کی ہوسناکیاں بھی ہیں اور انکی شکار عورتوں کی خودداری اور ٹھکرائی محبت کے رد عمل بھی۔ اور تعلیم یافتہ نوجوان راجاؤں اور رانیوں کے عشق کی داستانیں بھی۔ ان میں شدت جذبات ہے۔ تخیل کی کارفرمائیاں ہیں۔ افلاطونی محبت بھی ہے اور دل میں اتر جانے والی سچی الفت کی جھلکیاں بھی۔ اور کبھی محبت کا نفرت میں بدلتا ہوا روپ بھی

حسینی صاحب کا قلم فوٹوگرافر کا کیمرہ نہیں مصور کا وہ قلم ہے جو حقیقت اور تصور کو سمو کر فنکار کے سانچے میں ڈھال کر کہانی کو کہیں زیادہ دلکش اور پر اثر بنا سکتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہمیں کچلے ہوئے پس ماندہ طبقے کی زندگی کی تصویریں بھی ملتی ہیں۔ کھوکھلے ہوئے زمیندارانہ نظام کے بخیے بھی انہوں نے بڑی بے دردی سے ادھیڑے ہیں اور گرتی ہوئی سامراجی دیواروں کی عکاسی بھی کی ہے۔ انہوں نے متوسط گھرانوں کی بہو بیٹیوں کی زندگیاں اور انکی صفات بھی اجاگر کی ہیں۔ اور مزدوروں، چماروں اور طوائفوں اور مدیا تنبولن جیسی آزاد عورت کی تصویر کشائی بھی انکا مشاہدہ اتنا گہرا اور نظر اتنی باریک ہے کہ ہر طبقے اور ماحول کی عکاسی وہ بڑی خوبی سے کر سکتے ہیں لیکن سب سے زیادہ خوبی سے وہ اس دیہاتی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہیں جہاں انہوں نے بچپن اور جوانی کے دلکش ایام بتائے ہیں۔

پریم چند کی طرح حسینی کا فن بھی مانگے تانگے کا اجالا نہیں وہ آرٹ برائے آرٹ کی بحث میں نہیں پڑتے بلکہ یہ جانتے ہوئے کہ ہر سچا آرٹ آرٹ پہلے ہوتا ہے اور کچھ اور بعد میں۔ جیتی جاگتی زندگیاں اپنے فن میں سمو کر آرٹ برائے زندگی کی ان کہے تفسیر کر دیتے ہیں۔ وہ تکنیک وغیرہ کی الجھنوں میں بھی نہیں الجھے ان کا مقصد مغربی کہانیوں کی تکنیک اسلوب اور انداز کو اپنا کر ہمارے مفلس اردو افسانے کو مالا مال کرنا نہیں بلکہ فن کے وہ نمونے پیش کرتے ہیں جو ان کے دل کی اپج اور ذہن کی جدت کے مرہون منت ہوں۔ سادہ دلنشین انداز بیان جس میں پرکاری خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور سلیس اور بامحاورہ زبان جس میں دیہاتی زبان اور ٹھیٹ بولی کی چاشنی عجب کشش پیدا کر دیتی ہے انکی خصوصیت ہے وہ قاری کو اس طرح مرعوب کرنا نہیں چاہتے کہ وہ بیچارا افسانہ نگار کی قابلیت، ذہانت اور فنی مہارت کے جال میں پھنس کر شدید احساس کمتری کا شکار ہو جائے اور یہ سوچتا رہے کہ جانے اس عظیم فنکار نے کیا لکھا ہے۔ جو اس بیچارے کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ انکی کہانیاں آپ کی قابلیت کو پرکھنے اور دماغ کو ناپنے کی بجائے دل سے اپیل کرتی ہیں۔ انکی اکثر کہانیاں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور فن کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ وہ ذہن و دماغ کی کھڑکیاں کھولنے سے پہلے دل کے تاروں کو چھیڑ دے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا حسینی صاحب کی بعض رومانی کہانیاں بے حد جذباتی ہیں۔ سو بیگھے زمین۔ جذبۂ کامل۔ باسی پھول وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ رومانی تخیل کا رنگ روپ نظر آتا ہے۔ حسن کی ایک جھلک عاشق کو دیوانہ بنا سکتی ہے۔ محبوب بے مثال حسن کا مجسم نمونہ ہوتا ہے۔ عشق کی آبرو عاشق کو اپنی جان اور شاید محبوب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

آج کے زمانہ میں جب نئی صنعتی تہذیب اور مغربی اثرات کی بدولت محبت اور ہوس میں کچھ زیادہ امتیاز نہیں رہا۔ جب عشق کا مقصد سکس کی تسکین رہ گیا بقول کم نظروں کے اس "افلاطونی عشق" کی کہانیاں غیر فطری بھی جانے لگیں۔

شاید حسینی صاحب نے جس مشرقی تہذیب میں آنکھ کھولی اور شریف متوسط گھرانوں کی جس زندگی کو دیکھا اور سنا اس میں ایسے عشق کی مثالیں ملتی تھیں جب بچپن میں ایک نظر میں محبوب اور حبیب دل دماغ پر چھا جاتے تھے (جس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اکثر ملنے اور دیکھنے کے مواقع ملتے ہی نہ تھے) اور اس پاک محبت کی یاد کو دل کے خزانے میں محفوظ رکھ کر عمریں اس پیاری یاد کے سہارے گذار دی جاتی تھیں۔ جب محبت کا مفہوم جنسی تسکین سے الگ سمجھا جاتا تھا اور دیکھنے والی آنکھ ہو تو اس بدنصیب مٹی ہوئی پرانی تہذیب میں اب بھی ایسی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مجھے ان کی رومانی کہانیوں میں یاتری پھول بہت پسند ہے۔ اس میں بیوہ کی شادی کا مسئلہ ضمناً آگیا ہے مگر اس خوبی سے کہ کہیں کہانی کے تبلیغی ہونے کا گمان نہیں ہوتا اگر ہیرو کی محبت کی گرمی، شدت اور پائیداری دل پر اثر ڈالتی ہے تو دوسری طرف ہیروئن کی معصومیت بے لوث خلوص اور انتہا پسندی دل میں چبھ جاتی ہے۔ یہ سوچئے کہ صرف ایک دو بار دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لینے ہی سے اتنی گہری اور پائیدار محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ کچھ ماحول کے اثرات کچھ زیادہ جذبہ و کشش اور سب سے زیادہ فنکار کے تخیل کی کارفرمائیاں ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں۔

دیہاتی زندگی کو انہوں نے شہری زندگی سے زیادہ قریب سے دیکھا سمجھا اور پرکھا ہے۔ اور نچلے طبقے کی زندگی کی تصویر کشی وہ اونچے اور تعلیم یافتہ گھرانوں سے زیادہ کامیابی سے کر سکتے ہیں۔ مثلاً آئی سی ایس اور عورت یوں تو بڑی دلکش کہانیاں ہیں جو پڑھے لکھے لوگوں کو بہت پسند آتی ہیں لیکن اصلیت کا وہ رنگ روپ اور حقیقت کی وہ بھرپور جھلک ان میں نہیں جو مثلاً گالوں کی لہر۔ ناکھی پوجا۔ یا جھولا میں نظر آتی ہے۔۔۔ دیہات سے متعلق انہوں نے بہت سی اور کہانیاں لکھی ہیں۔ ہمارا گاؤں، بیوتو سنگھی، بوڑھا اور بالا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سنی سنائی کہانیاں ہیں نہ کتابی علم پہ بنی، اور فلمیں دیکھی نقلی دیہاتی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی داستانیں ہیں بلکہ آپ ان میں اودھ اور یوپی کے دیہات کی منہ بولتی تصویریں دیکھ سکتے ہیں ان کے کرداروں میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی اور دونوں ہی اپنے اندر کشش اور رچاؤ رکھتے ہیں۔

حسینی صاحب کے ہاں بھی اصلاحی جذبہ موجود ہے لیکن وہ ان کے فن پر غالب نہیں آتا (یہاں حال کے لکھے کچھ افسانوں پر جو نئے ہندوستان کی تعمیر و بہبود کے جذبے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں اور اس میں تبلیغی رنگ فن پر کبھی کبھی غالب آجاتا ہے) بلکہ یہ تیر میٹھا اس میں جا مسنی یا آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ وعظ و نصیحت کے دفتر کھول کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ کسی سماجی برائی، کسی سیاسی خرابی، کسی اخلاقی یا تہذیبی خامی کی طرف اشارہ کر کے اس کی جھلک دکھا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ سوچنے اور اس خرابی کو دور کرنے کی ذمہ داری آپ پر چھوڑ دیتے ہیں ایک ماں کے دو بچے۔ بہو کی ہنسی خوش قسمت لڑکا۔ عدالت اور حق نمک ان کے ایسے ہی کامیاب افسانے ہیں۔

عورت کا درجہ حسینی کے یہاں بہت بلند ہے۔ ماں بہن بیٹی اور بیوی کسی کے بھی روپ میں آئے اکثر قربانی و ایثار کی پتلی، وفا کی دیوی بن کر آتی ہے جو خار زار کو گلزار بنا سکتی ہے۔ جو صحرا میں گلاب کھلا سکتی ہے، جو بھٹکوں کو راہ پر لانے کا جادو جانتی ہے۔ تورونا اور بیوی میں اسی کا یہ روپ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ بے باک۔ ہرجائی اور بے وفا عورت بھی ان کی کہانیوں میں آتی ہے مگر یہاں بھی فنکار کا خلوص اُسے ناانصافی کا شکار ہونے سے بچا لیتا ہے وہ اس بے راہ روی اور بدکاری کو یا انسانی فطرت کی کمزوری یا سماجی خرابیوں کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ عایا، تنبولن اور اس قسم کی بیزار اور کہانیوں میں انھوں نے عام اخلاقی روش سے ہٹ کر عورت کا ایک روپ دکھایا ہے جس میں وہ اچھائی برائی کے چکر میں پھنسنے کی جگہ پر اثر انداز میں اس قسم کی عورت کو آپ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے جو آوارہ و ہرجائی ہوتے ہوئے بھی محبت کا ایسا شدید جذبہ دل میں رکھتی ہے جو محبوب کی خاطر ہر قربانی، ہر بدنامی، ہر برائی کو جھیل سکتا ہے اب یہ پڑھنے والے کی مرضی اور ظرف پر ہے اُسے سنگسار کرے یا معاف کر دے۔

طوائف کی کہانیاں کس فنکار نے نہیں لکھیں۔ حسینی صاحب کیوں اس بدنام و بدنصیب طبقے کو نظر انداز کرتے۔ نئی ہمسائی میں انھوں نے ایک طوائف زادی کی عالی ظرفی، ایثار و خدمت اور کٹر ملازاہد خشک تعلیم یافتہ شریف زادے میاں بیوی کی تنگ دلی اور تعصب کو بڑی خوبی کے ساتھ ٹکرایا ہے اور جس طرح یہ کہانی انجام کو پہونچتی ہے وہ بڑا ہی پر اثر اور دل کش ہے۔

عمر کے ساتھ ساتھ حسینی صاحب کا رنگ کچھ بدل رہا ہے جہاں فن میں

بختگی اور رچاؤ زیادہ ہو رہا ہے وہاں انداز بیان میں بے باکی اور عریانیت کچھ بڑھ رہی ہے۔ رومانی جذباتیت اور شدت پسندی کم ہوتی جا رہی ہے اور حقیقت کے نقش و نگار زیادہ ابھرتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک بات پر مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ نوجوان جوشیلے حسینی کا قلم رومانی اور جذباتی کہانیوں میں بھی ضبط و توازن قائم رکھتا تھا وہ لطیف جذبات و کیفیات کو اشاروں میں بیان کرنے کا گر جانتا اور اسکے حسن سے آگاہ تھا۔ باشعور پختہ کار حسینی کا قلم کبھی کبھی بے باکی کے حد سے آگے بڑھ کر عریانی تک پہونچ جاتا ہے ایسی عریانی کو نئے دور کے بے باک افسانہ نگار تک چونک اٹھتے ہونگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انکے بیان کی قدرت، مشاہدہ کی گہرائی، انداز بیان کا حسن اور فن پر مہارت انکی کہانیوں کو ایک نئی زندگی بخش رہی ہے۔ مگر یہ عریانی بے باکی انکی شخصیت پر کچھ زیب نہیں دیتی۔

حسینی صاحب کے کردار پہلے بھی بڑے جان دار ہوتے تھے مگر اب تو ان میں اور بھی زندگی بھر گئی ہے جن کے دکھ سکھ میں ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ جن کی بے راہ روی پر غصہ کر سکتے ہیں اور جن کی معصومیت پر پیار آتا ہے جس کے ساتھ ہنس سکتے ہیں اور رو سکتے ہیں۔

حسینی صاحب نے اردو زبان و ادب کو اپنے افسانوں کے ذریعے بہت کچھ دیا ہے خدا انکو تندرست و سلامت رکھے۔ اور ابھی وہ بہت دن تک اردو ادب کو انہیں دلکش اور پر اثر کہانیوں سے سجاتے رہیں۔

بقیہ: حسینی صاحب اور ان کا نظریۂ فن

بیماری اور زیادہ مہلک و متعدی ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک مفلسی اور غربت ہی سب برائیوں کی جڑ ہے۔ امارت اور سرمایہ داری محرکات گناہ اور گناہ آلود ہوتے ہوئے بھی قابل پذیرائی ہے۔ سوسائٹی میں اسکی قدر و منزلت ہے۔ وہ ادب و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے شرافت و اخلاق کا وہ پیکر سمجھی جاتی ہے۔ دولت اور دولت کے بل بوتے پر حاصل کی جانے والی شرافت سرمایہ دار کے گناہوں کو ڈھک دیتی ہے وہ مجرم ہوتے ہوئے بھی معزز و محترم اور غریب کا معمولی جرم بھی قابل گردن زدنی۔ اکبر نے شاید اسی لئے کہا تھا ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

حسینی صاحب افسانوں کے ذریعہ سے اس کشمکش و کشاکش میں دبی ہوئی انسانیت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت افسانہ نگار کا خاص مقصد بھی یہی ہے کہ وہ انسانیت کی ترقی اور بقا میں کوشاں ہے۔ افسانہ اور زندگی، زندگی اور افسانہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ان میں امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ من و تو کا یہ امتیاز افسانہ نگار کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ حسینی صاحب کے افسانوں میں یہ امتیاز نہ ہونے کے برابر ہے۔ انکی پرخلوص شخصیت ہر افسانہ میں جلوہ گر ہے۔ ان کی انسانی دوستی کا جذبہ ایک ایک لفظ میں موجود ہے۔ وہ اپنے دل کی گہرائی اور جذبہ کی پوری صداقت کے ساتھ افسانہ لکھتے ہیں۔ انکا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ انکے افکار و خیالات میں ہم آہنگی ہے۔ وہ اپنے خون جگر سے فن میں اعجاز پیدا کرتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی جستجو انکا مسلک، اور ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی پر انکا عمل۔ انکی زبان میں تاثیر اور بیان میں جادو ہے۔ انہوں نے اپنی بات کے نہ سمجھنے کا شکوہ کیا ہے لیکن یہ انکا شک ہے انکی بات ہر کوئی سمجھتا ہے۔ انکی تقریر اور تحریر دونوں میں بڑی لذت ہے اور اسلئے کہ لوگوں کے دلوں کی بات بڑی خوبی سے وہ اپنی زبان سے ادا کر دیتے ہیں۔ جگ بیتی کو آپ بیتی اور آپ بیتی کو جگ بیتی بنا لینے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ اور اسی فن نے انہیں اس دور کا سب سے زیادہ محترم اور محبوب فنکار بنا دیا ہے۔

لذیذ ـــ تازہ ـــ اور ـــ سستی ـــ غذا
بہترین سروسنگ .... نفیس مینو .... ذائقہ دار مٹھائیاں
رحمانیہ ہوٹل
سبزی باغ ۔ پٹنہ نمبر ۴
ایک دفعہ تشریف لاکر آزما دیکھئے

عبد المغنی

علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری

اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں پریم چند ایک سنگ میل ہی نہیں، راہ نما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے قدیم داستانوں اور قصوں کو ختم کر کے مختصر افسانے کی اصطلاحی معنوں میں داغ بیل ڈالی۔ اس عبور کی وجہ سے ان کی کیفیت ایک سنگم کی بھی ہوگئی ہے، جہاں قدیم اور جدید کے دھارے آکر مل جاتے ہیں اور ایک گنگا جمنی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ پریم چند کا اصل اجتہاد یہ ہے کہ انہوں نے افسانے کی ہیئت بدل دی اور اسے ایک جدید وضع عطا کی۔ داستان کے طول اور قصے کی تکلف کی جگہ ایک مختصر اور متناسب سانچہ ایجاد کیا۔ اس سانچے میں ڈھالنے کے لئے قدرے نیا مواد بھی وہ لائے، فوق فطری اور مثالی کردار و واقعات کی بجائے طبعی اور عملی کردار و واقعات پر زور دیا، اسی طرح انفرادی تفریحات کے مقابلے میں سماجی مسائل کو ترجیح دی۔ لیکن شاید ماضی سے براہ راست قربت کے سبب، وہ بنیادی سادگی، معصومیت اور عمومیت باقی رہ گئی جو قدیم کہانیوں کی امتیازی خصوصیت تھی۔ یہ حقیقت ایک اعتبار سے پریم چند کی مضبوطی ہے اور یہی دوسرے اعتبار سے ان کی کمزوری بھی ہے، اور مضبوطی یا کمزوری، بہرحال یہ ایک قدرتی صورت حال ہے، اور غالباً پسندیدہ و مفید بھی۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو قدیم سے جدید کی طرف ارتقا میں وہ بے ساختگی اور لچک نہیں آتی جس کا ہونا ضروری تھا۔ بہرحال یہ خوش گوار گنگا جمنی کیفیت ایک پورے اسکول کی خاصیت بن گئی، جس کو تاریخ ادب میں پریم چند اسکول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سدرشن اور اعظم کریوی کے ساتھ علی عباس حسینی اسی اسکول کے ایک ممتاز فرد ہیں۔

فرق یہ ہے کہ سدرشن اور اعظم کریوی کے برخلاف، غالباً اپنے شخصی ماحول کے سبب، علی عباس حسینی نے شہر کے رنگ و بو پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ لیکن یہ شہریت بہرحال پریم چند کے چوکھٹے کے اندر ہے، اس معنی میں کہ یہاں تمدن کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کا تجزیہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہے، بلکہ نئی نئی شہری زندگی کے صرف تماشوں کو نقش بند کیا گیا ہے۔ اس طرح علی عباس دراصل پریم چند کی اُس مہم کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں جو ہندوستانی تہذیب اور اُردو افسانے کی تاریخ نے ان کے ذمے کی تھی۔ جس وقت پریم چند نے لکھنا شروع کیا، اردو افسانے کی تو ابتدا تھی ہی، ہندوستانی تمدن کی جدید ہیئت کا بھی آغاز ہی تھا۔ مغرب کی سائنسی ایجادات اور مشینی اختراعات اور ان سب کے نتیجے میں صنعتی نظام نے ہندوستان کی زمین میں جڑ پکڑنا شروع کیا تھا۔ اس صورتِ حال کا عکس دوسرے تہذیبی مظاہر کے ساتھ ادب پر بھی پڑنے لگا تھا تازگی، حیرانی، تجسس اور تجربے کی ایک پُراسرار اور دلچسپ فضا گردوپیش پر طاری تھی۔ ہندوستان اپنے دیہاتوں اور کھیتوں کی سادگی اور شہروں اور اداروں کی سنجیدگی کو چھوڑ کر بسوں، ٹرینوں، پارکوں، ہوٹلوں، کارخانوں اور کالجوں کی پیچیدگیوں اور تفریحوں کی طرف لپک رہا تھا۔ صدیوں کی اخلاقی قدریں فنا ہو رہی تھیں اور نت نئے مادی مسایل آنکھیں دکھا رہے تھے۔

گرچہ پریم چند اور ان کے پیرووں کو معاملے کی گہرائیوں کا کوئی واضح، مکمل اور منظم شعور نہیں تھا، مگر تنور میں رہنے کے سبب حالات کی آنچوں سے ان کے دماغ بھی گرم تھے اور لامحالہ یہ تپش ان کی تخلیقات میں بھی کسی نہ کسی درجے اور شکل میں منتقل ہو رہی تھی۔ پریم چند اسکول پر

وہ مجموعی طور پر کا اثر کچھ اس قسم کا تھا جیسے کوئی شخص کافی دیر تک گراں خوابی کے بعد گرد و پیش کے شور و غل سے چونک اٹھا ہو اور نیم خوابیدہ حالت میں آنکھیں ملتا ہوا نئی صبح کی کرنوں اور ان کی روشنی میں جھلکنے والے مناظر کو دیدۂ حیرت سے دیکھ رہا ہو۔ یہی چونکی اور کچھ گھبرائی ہوئی کیفیت علی عباس کے ان افسانوں میں بھی ہے جن کا موضوع نئی شہری زندگی اور اس کے احساسات ہیں۔ افسانہ نگار کو حالات کی سنجیدگی کا پورا شعور نہیں اور ان کی سطحی چہل پہل میں اسے ایک لطف ملتا ہے۔ مغرب و مشرق کی کشمکش سے تہذیب کی جو ایک نئی قماش بن رہی ہے، اس کے حادثات میں علی عباس کے کرداروں کو تفریح کا وہی مزا ملتا ہے جو رتن ناتھ سرشار کے میاں آزاد کو کبھی ملا کرتا تھا۔

مثال کے طور پر ... ایک اینگلو انڈین لڑکی ہے جو بس کے ایک سفر کے دوران ایک اینگلو انڈین لڑکے کے ساتھ بہت بے ڈھب طریقے پر وابستہ ہو جاتی ہے۔ "حسن رہ گذر" میں ایک بزرگوار ٹرین کے ایک سفر میں راستے بھر ایک نامعلوم محبوبہ کے ساتھ گلچھرے اڑاتے نظر آتے ہیں اور شدتِ شوق یا انہماک کے عالم میں "غیر" کی موجودگی کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں، پھر محبوبہ بھی ایسی شوخ و شنگ کہ بزرگوار کے ساتھ خوش فعلیاں کرتے ہوئے غریب افسانہ نگار کے ساتھ بھی اشارے ہی اشارے میں چہلیں کرتی چلی جاتی ہے۔ "میلہ گھومنی" ایک میلے سے دوسرے میلے تک اپنے عاشقوں اور شوہروں میں اضافے پر اضافے کیے چلی جاتی ہے۔ "پھیرے دار" میں ایک شوہر نامدار اپنی محبوبہ بیوی کے سایۂ محض ہو کر رہ گئے ہیں، وہ بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جیسا کہ محترمہ ایک درس گاہ سے روزی کما کر لاتی ہیں۔ چنانچہ خاتون ان حضرت کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتی ہیں جیسا کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت کو اپنی مردانگی کا احساس ہوتا ہے اور آپ لڑکیوں کی طرح چھپ کر افسانہ نگاری شروع کر دیتے ہیں۔ اور روپے پیسے کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہو جاتے ہیں بلکہ اچھا خاصا سرمایہ جمع کر لیتے ہیں۔ ایک روز اس آنکھ مچولی کا انکشاف بڑے رومانی انداز میں ہو جاتا ہے۔ "ولی عہد بہادر" تھیٹر کے ایک ایکٹر پر اس کو کوئی بری جوان سمجھ کر عاشق ہو جاتے ہیں، فراق کے صدمے سہتے ہیں، مصاحبوں کو چہ میگوئیوں کا موقع دیتے ہیں، یہاں تک کہ گرہ سے ایک بڑی رقم بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ تب کھلتا ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ "کلی" کا بہنوئی سالی پر عاشق ہو جاتا ہے اور بالآخر بیوی کو کھو کر اس کو پا لیتا ہے، مگر پا لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ کلی پہلے ہی پھول بن چکی ہے۔

علی عباس کی افسانہ نگاری کی اسی رو سے منسلک ایک دوسری لہر بھی ہے۔ ایک طرف تو وہ نئے تمدن کی مضحکہ خیزیوں کے پر لطف خاکے کھینچتے ہیں اور دوسری طرف پرانی تہذیب کے زوال آمادہ پہلوؤں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مذہبی زہد کے پردے میں جنسی آلودگیوں کا سراغ وہ اسی طرح لگاتے ہیں جیسے ان کے زمانے کے "ترقی پسند"۔ اس سراغ رسانی کے محرکات کچھ تو دہی فطرت پسندی اور حقیقت پرستی کے نعرے ہوں گے، مگر بنیادی جذبہ وہی آزاد اور بے فکر تلذذ ہے جو تہذیب نو کے مظاہر کی تصویر کشی میں پایا جاتا تھا۔ "پیاسا" کا ہیرو ایک نوجوان عالم دین ہے جس کی تربیت نہایت سخت اور خشک ماحول میں ہوئی ہے، جہاں جنس اور اس سے وابستہ جذبات یکسر ممنوع ہیں۔ لیکن فطرت اپنے مطالبے منوا کے رہتی ہے۔ چنانچہ عزیب عالم کلکتے پہنچ کر جب ایک عورت سے دوچار ہوتا ہے تو پہلے ہی قرب پر صرف اس کی حنائی انگلیاں دیکھ کر اور سریلی آواز سن کر پردے کے باوجود قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور جارحانہ دست درازی شروع کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں بالآخر اسے جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ "عمل خیر" میں ایک پیشوائے مذہب اپنی معتقد و دولت مند بہنوں کو فریضۂ حج کی ادائیگی پر اکسا کر ان کا عقد اپنے نابالغ بیٹوں سے کر دیتے ہیں، اس بہانے کہ اس طرح مولوی صاحب ان بہنوں کے خسر اور محرم ہو جائیں گے اور پھر وہ بہنیں محرم کے ساتھ حج کر سکیں گی، کیونکہ ان عورتوں کا کوئی محرم ایسا نہیں تھا جو انہیں حج کے لیے لے جاتا اور حج بغیر محرم کے عورتوں کے لیے ممکن نہیں، جب کہ دولت مندی کے سبب حج ان پر فرض ہو چکا تھا جس کی عدم ادائیگی گناہ کا باعث ہوتی۔ حالانکہ مولوی صاحب کی اصل نیت اس عمل خیر کے ذریعے ان عورتوں کی دولت پر قبضہ کرنا تھا۔ چنانچہ بھرم اس وقت کھل گیا جب

عین موقع پر مذکورہ عورتوں کا وارث بھتیجا پہنچ گیا، اور اس نے بندوق کی نوک پر مولوی صاحب کو مجبور کیا کہ جس طرح انہوں نے اس کی چچیوں کے ساتھ اپنے بیٹوں کا عقد بڑھایا ہے اسی طرح انہیں طلاق بھی اسی مجلس میں دے ڈالیں۔ "خالی گود" کی ہیروئن اولاد کے لئے کاشی کا سفر کرنے جا رہی ہے۔ اس نے اپنے ساہوکار بوڑھے شوہر پر یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ دیوتا کی استمداد لینے جا رہی ہے، حالانکہ بر حقیقت اس نے اپنی ملازمہ کے نوجوان بھائی کو رفیقِ سفر صرف اس لئے بنایا ہے کہ پردیس کی خلوتوں اور شوہر کے غائبانے میں اس نوجوان کے ساتھ اپنے جوان جذبات کی تسکین کرے۔

اسی طرح علی عباس زمانے کی ایک اور کروٹ کی بھی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں، ان کا دور اجتماعی تحریکات کی ابتدا کا دور ہے — "انقلاب زندہ باد" کے نعرے فضا میں گونجنے تو نہیں لگے تھے، مگر لوگوں کے شعور میں سرسرانے ضرور لگے تھے۔ سیاست ایک پیشے کے طور پر ابھر رہی تھی، سرمایہ و محنت کی کشمکش کا احساس بڑھ رہا تھا۔ انتظامیہ کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں عوام کے لیے معمولی معمولی چیزوں کے حصول کو بھی دشوار بنا رہی تھیں۔ "وکیل اور منشی" "میخانہ" اور "کفن" ان ہی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

معاصر حالات کے سطحی مطالعے کی اس عام صورت سے مستثنیٰ علی عباس کے بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن میں زمانے کے احوال و واقعات کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، مسایل کی تہہ میں پڑی ہوئی قدروں کو کھود نکالا گیا ہے، انفرادی حادثوں کے پیچھے وسیع سماجی پس منظر کو دریافت کر لیا گیا ہے، ساتھ ہی ان اسباب و عوامل کا بھی سراغ لگایا گیا ہے جنھیں فتنے کی جڑ کہا جا سکتا ہے۔ ان مطالعات میں افسانہ نگار کا انداز بڑا تیکھا ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن معاملات کی پردہ دری وہ کرنی چاہتا ہے وہ اس کے جذبات کو مجروح کرنے والے ہیں۔ فنکار اپنا ایک اجتماعی ضمیر رکھتا ہے، اس کا ذہن چند قیمتی اخلاقیات سے وابستہ ہے، ان اخلاقیات پر مبنی ایک خاص نظامِ معاشرت کو وہ پسند کرتا ہے۔ چنانچہ جب اس کے گرد و پیش ایسے حادثات کا ہجوم ہونے لگتا ہے جن کی زد اس کے پسندیدہ نظامِ معاشرت پر پڑتی ہے تو وہ جھنجھلا اٹھتا ہے، مگر فن کی حدود میں وہ جھاگ نہیں اڑا سکتا، لہٰذا اپنے جذبات کو وہ طنز کے کارِ نشتر میں ملفوف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی عباس کے ان گہرے سماجی مطالعات میں تہذیبِ مغرب پر سخت زہرخند پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس تہذیب کی بلاخیز جارحیت تہذیبِ مشرق کے ان آداب و روایات کو پامال کئے دے رہی تھی جو فن کار کو بہت عزیز ہیں، مگر اس جمیعت کے باوجود ایک طرف تو وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ حملہ آور تہذیب کے تار و پود دلائل سے بکھیر کر اس کے مقابل اپنی تہذیب کی برتری فکری طور پر ثابت کر سکے، اور دوسری جانب وہ حملہ آور تہذیب کے جابرانہ اقتدار اور لاتعداد مادی وسائل کے سامنے خود کو مجبور و بےبس محسوس کرتا ہے، نتیجۃً وہ اپنے سینے میں دبی ہوئی چنگاریوں کو ایک زہریلے تبسم میں ڈھال دیتا ہے، جس سے نہ صرف اس کی تسکین ہوتی ہے بلکہ فی الواقع ناپسندیدہ تہذیب اپنے تمام آلات و اسلحہ کے باوجود معرضِ تمسخر میں پڑ جاتی ہے اور کم از کم اخلاقی طور پر بالکل بے وقعت نظر آنے لگتی ہے۔ یہ بات علی عباس حسینی کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔

اس سلسلے میں اُن کا سب سے عظیم افسانہ "طمانچہ" ہے۔ اس کہانی میں ایک ڈاکٹر نے اپنی لڑکی کی تعلیم و تربیت کا ذمہ پورا کا پورا اپنی بیوی کو دے دیا ہے۔ ڈاکٹر خود ایک دین دار آدمی ہے اور مقابل صنفوں کے ارتباط میں قدیم مشرقی اخلاق کا پاس دار ہے۔ مگر اس کی بیوی جدت پسند ہے اور لڑکی کی تعلیم و تربیت نے مغربی انداز پر کرتی ہے۔ لڑکی بلوغ کے بعد پر پرزے نکالتی ہے، نئی آزاد تعلیم اور بے قید تربیت رنگ لاتی ہے، وہ آزادانہ اور بے محابا دوست لڑکوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ سیر و تفریح کرنے لگتی ہے، وہ حیا اور عصمت کو ایک فرسودہ چیز سمجھتی ہے، اس کے نزدیک جنس ایک حیوانی جذبہ ہے، یہاں تک کہ ماں باپ کے انسانی رشتے کی بھی وہ قائل نہیں، اس کے خیال میں اس کی تعلیم و تربیت کر کے والدین نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنی ہوس کا کفارہ ادا کیا ہے۔ باپ اپنے تساہل اور ماں اپنی مستعدی کا

یہ نتیجہ دیکھ کر دنگ ہیں۔ لڑکی ماں کے قابو سے تو بالکل باہر ہو چکی ہے اور اُسے نرا جاہل اور پس ماندہ سمجھتی ہے۔ باپ لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام ہوتا ہے ــ یہاں تک کہ ایک روز اسی نہا دُھو اور تنبیہ سے چڑ کر صاحب زادی اماں جان کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ رسید کر دیتی ہیں۔ اس واقعے کے بعد باپ بیٹی کو گھر سے نکال دیتا ہے ۔ صاحب زادی کہیں دور جا کر ایک ہسپتال میں ملازمت کر لیتی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اماں جان کو ایک خط میں اطلاع دیتی ہیں کہ وہ ایک مرد کے فریب میں آ کر ایک عدد صاحبزادے کی والدہ بن گئی ہیں اور درخواست کرتی ہیں کہ اماں جان بنفس نفیس تشریف لا کر ناتی کی پرورش کریں تاکہ صاحب زادی کا بوجھ ہلکا ہو۔ اماں جان ماضی کی تلخیوں کو بھول کر جوشِ مادری میں جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں، مگر باپ روکتا ہے کہ اب وہ ایک آبرو باختہ لڑکی سے کوئی ربط رکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن اماں جان اپنی ہٹ پر قائم رہتی ہیں۔ ڈاکٹر تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ چلی گئیں تو آئندہ وہ انہیں اپنے گھر پر نہیں چڑھنے دے گا۔ محترمہ بپھر جاتی ہیں اور شوہر کو اس کی پس ماندہ خیالی پر لعنت ملامت کرتی ہوئی بھرا ہوا پرس اس کی ناک پر دے مارتی ہیں اور روانہ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ماں اور باپ دونوں کے منہ پر طمانچہ لگ جاتا ہے اور وہ اپنی اپنی غفلت یا حرکت کا خمیازہ بھگت لیتے ہیں۔ افسانے سے ایک سنگین تر سبق یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ بی بیوں کے رُخ پر سے جو پردہ اٹھا ہے وہ دراصل جا کر مردوں کی عقل پر پڑ گیا ہے، اس طرح صورت حال کی حقیقی ذمے داری اس معاملے میں مرد کی غیر ذمے دارانہ روش ہی پر آتی ہے

کچھ اسی قسم کی کہانی "بدلہ" ہے۔ ایک انگریز عورت رات گئے ایک اسٹیشن کے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک ہندوستانی مرد پہلے سے لیٹا ہوا ہے۔ جاڑے کی رات ہے۔ عورت بے محابا مرد کا لحاف اُلٹ دیتی ہے۔ وہ بے چارا گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد عورت کی ضرورت سمجھ کر اپنے سامان سے کچھ گرم کپڑے نکال کر انگریزن کے لیے بھی ایک آرام دہ بستر الگ تیار کر دیتا ہے۔ اگلی صبح جب ہندوستانی اپنی منزل کی جانب جیپ روانہ ہوتا ہے تو انگریزن بھی اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے شہر میں پہنچ کر ایک ڈاک بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ اس قیام کے دوران انگریزن اپنے آپ کو ہندوستانی کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس طرح دونوں مل کر کئی راتیں عیش میں گذارتے ہیں۔ جاتے جاتے انگریزن ہندوستانی کے اصرار پر بتا جاتی ہے کہ وہ ایک بڑے انگریز افسر کی بیوی ہے، اُس اسٹیشن پر جب وہ تنہا اور بے سروسامان ویٹنگ روم میں داخل ہوئی تھی اس کا شوہر ایک معمولی سی بات پر بگڑ کر اسے تنہا چھوڑ گیا تھا، اور سارا سامان بھی ساتھ لیتا گیا تھا اور اس بات کی ذرا پروا نہ کی تھی کہ اس شدید سردی میں اُس بچاری کا کیا حال ہوگا، چنانچہ اُس نے اپنے شوہر کی بے مروتی کا بدلہ اِس بے وفائی سے لیا کہ اپنے آپ کو کئی راتوں کے لئے ایک غیر مرد کے سپرد کر دیا۔ یہ ہے نقشہ اُس خاندانی نظام کا جو یورپ کے بے دین تمدن نے برپا کیا ہے۔

یہ تلخ فکری مطالعے علی عباس حسینی کے عام فنی کردار میں مستثنیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا عام انداز بہرحال ایک ایسے زندہ دل داستان گو کا ہے جو دوسروں کی تفریح طبع کا سامان کر کے خود بھی خوش وقت ہوتا ہے۔ الف لیلہ کی شہرزاد کی طرح وہ دیس دیس کی کہانیاں سناتا ہے، بھانت بھانت کی زندگیوں کا نقشہ اُتارتا ہے، نوع بہ نوع واقعات کی تصویر کھینچتا ہے، زندگی کی نت نئی اداؤں کا عکس پیش کرتا ہے، سماج کے رنگ بہ رنگ نمونے سامنے لاتا ہے (گرچہ یہ سارا تنوع بالعموم شہری زندگی کی حد میں ہے)۔ اس سلوٰی داستان سرائی کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اپنی روزمرہ کی فکروں سے آزاد ہو کر عالم خیال میں اکثر اپنے سے مختلف اور کبھی اپنے ہی جیسے انسانوں سے متعلق دل چسپ واقعات کی روداد سے لطف اندوز ہو اور زندگی کی بوقلمونی کا احساس کر کے اپنا ذہن ذرا تازہ کر لے۔ بجائے خود یہ بھی ایک کارنامہ ہے اور فنی حد تک افسانہ نگاری کا ایک معیار یہ بھی ہے، گرچہ یہ بالعموم یہ ایک اوسط معیار ہے علی عباس حسینی بحیثیت مجموعی اسی قسم کے افسانہ نگار ہیں۔

علی عباس کا اسلوب اور تکنیک ان کے مواد و انداز کے متناسب ہیں۔ ان کی نثر میں سادگی کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ وہ سیدھے سادے لیکن چُست اور رواں انداز میں اپنے ماجرا کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے وہاں فن کاری، یہاں تک کہ سادہ بیانی کی بھی کوئی کوشش نہیں محسوس ہوتی۔ وہ بالکل فطری اور بے ساختہ انداز میں قصہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں سب اس بیان کے لپیٹ میں خود بخود آتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تشبیہیں اور استعارے بھی عبارت میں برجستہ داخل ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ یہ نقوش سامنے کی معمولی حقیقتوں سے لیے جاتے ہیں، ان میں کوئی علمی حوالے یا تخئیل کی پرواز نہیں ہوتی۔ بس آئے دن کی موٹی موٹی باتوں کو بطور مثال لے لیا جاتا ہے، اس سے باتوں میں تیکھا پن ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ گرچہ سنوار نہیں آتا ہو۔ اس طرح علی عباس کی نثر سپاٹ اور پھیکی نہیں، اس میں ایک ابھار اور رنگ ہے۔ بہر حال، اس میں عمومیت اتنی غالب ہے کہ افسانہ نگار کا کوئی انفرادی اسلوب نہیں بن پاتا۔

علی عباس کی تکنیک میں بھی کوئی پیچیدگی اور انفرادیت نہیں ان کے پلاٹ کا ارتقا بالکل سیدھی لکیر میں ہوتا ہے۔ اس مستقیم ارتقا میں بڑا سلیقہ پایا جاتا ہے، واقعات ایک سبک خرام نہر کی طرح سکون سے بہتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سلیقے میں کسی فن کاری کا بھی احساس نہیں ہوتا، معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی داستان گو بے تکلفی اور روانی سے اپنی روداد سناتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن عام پلاٹ میں اس سادگی کے باوجود اختتام پر ہلکی سی ڈرامائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ "طمانچہ" کے بالکل آخر میں کھلتا ہے کہ اماں جان بیٹی کی اٹھلو خیالیوں اور آوارہ گردیوں پر بظاہر خفا ہونے کے باوجود درحقیقت ان باتوں کو دل سے پسند کرتی تھیں۔ "بدلہ" کے بھی آخر ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزن نے اپنے آپ کو ہندوستانی کے سپرد اپنے خاوند سے اس کی بے مروتی کا بدلہ لینے کے لیے کیا ہے۔ "کلی" کا ہیرو بالکل خاتمے پر دریافت کرتا ہے کہ وہ پہلے ہی چٹک چکی ہے۔ "ولی عہد بہادر" اور "پہرے دار" میں بھی انکشاف اسرار کی یہی کیفیت ہے۔ یہ بات بحث طلب ہے کہ سادہ پلاٹ کے عروج میں یہ ڈرامائیت پلاٹ ہی کے فطری ارتقا کا نقطۂ آخر اور اس طرح اس کا ایک ناگزیر اور لازمی جز ہے یا یہ صرف فنی چابک دستی کا مظاہرہ ہے تاکہ ماجرا میں تیکھا پن اور نکیلا پن پیدا کر کے کہانی کو زیادہ دل چسپ اور پُر اثر بنایا جائے۔ میرے خیال میں وہ افسانے جن میں افسانہ نگار حالات کو ایک نیا موڑ دے کر اپنے کسی مقصد کو قاری کے دماغ میں اتارنا چاہتا ہے ان میں یہ ڈرامائیت پلاٹ کا ایک فطری عنصر ہے اور در اصل اتنی ڈرامائی بھی نہیں جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لیے افسانہ نگار قاری کے ذہن کو آہستہ آہستہ اشارے اشارے پہلے ہی سے تیار کرتا ہے، یہاں تک کہ نقطۂ عروج پر حقیقت واقعہ اندر سے ابھر کر ایک جھٹکے کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے اور قاری کے ذہن پر بجلی سی کوند جاتی ہے۔ مثال کے طور پر شوہر کے منہ پر بیوی کے طمانچہ" کا اشارہ افسانے کے شروع ہی میں اس وقت دے دیا گیا تھا جب بیوی کی جدت پسندی اور شوہر کی سپر اندازی کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر کہانی کے دوران یہ لہر زیر زمین چلی گئی اور وہاں اندر ہی اندر آتش فشاں بناتی رہی، یہاں تک کہ ایک روز لاوا پھٹ پڑا اور چنگاری میاں کے دامن کو جلا گئی۔ ممکن ہے شوہر نامدار کو یہ حملہ غیر متوقع معلوم ہوا ہو اور شاید بعض قارئین کو بھی کھٹکا ہو مگر درحقیقت یہ تو ایک فطری نتیجہ تھا اس نظم خاندان کا جس کی چھوٹ شوہر نے بیوی اور بیٹی کو دے رکھی تھی۔ اس لئے افسانے کا یہ عروج صدمے کا باعث ہو تو ہو، حیرانی کا باعث نہیں۔

عروج میں اس ڈرامائیت سے قطع نظر، تکنیک کے دوسرے عناصر حسب معمول سیدھے سادے ہیں۔ چنانچہ موضوع کے ارتقا میں کوئی کش مکش بمشکل پائی جاتی ہے، موافق و مخالف عوامل کی آویزش کا گویا فقدان ہے، قصہ جب چلتا ہے تو کوئی رکاوٹ اس کے پر سکون بہاؤ میں حائل نہیں ہوتی ہے اور اگر کبھی کوئی چیز درمیان آ ہی گئی تو وہ چٹان نہیں بنتی بلکہ تنکے کی طرح دھاروں میں بہ جاتی ہے، جیسے برائے تفریح آب رواں میں ایک کنکری ڈال دی گئی ہو، کچھ بلبلے اٹھے ہوں اور پھر سطح برابر ہو گئی ہو۔ شاید یہی سبب ہے کہ علی عباس کے

...توں میں کرداروں کا فقدان ہے، دلچسپ اور یادگار کہانیاں تو کئی ایک ہیں، مگر نمایاں اور متاثر کن ... کوئی نہیں، اس لیے کہ
...رمغیر کش مکش اور نشیب و فراز کے پیدا نہیں ہوتا، اس کی تربیت کے لئے الجھنیں اور کٹھنائیاں ضروری ہیں، اور علی عباس حسینی کے پلاٹ
باتوں سے خالی ہیں۔

یہ تو علی عباس حسینی کے فن پر ایک اصولی و تنقیدی تبصرہ ہوا۔ اس سے قطع نظر، موصوف کا اردو افسانے میں ایک تاریخی مقام بھی ہے
...تو ہوئے خود یہی بات ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ علی عباس پریم چند کے اولین پیرووں میں ایک اور دوسروں سے زیادہ کامیاب
...ب، انھوں نے پریم چند کے رنگ کے ایک پہلو کی تکمیل کی، اور اس طرح بحیثیت مجموعی اردو ادب میں مختصر افسانے کی روایت کو راسخ کر...
...ان کا اپنا انفرادی کارنامہ بھی ہے، وہ پریم چند کے تابع محض نہیں، انھوں نے محض گرد کے موضوعات کو گردو ہی کی زبان میں ڈھالا...
...یا ہے، بلکہ پریم چند کے دائرے میں انھوں نے اپنی لکیر الگ کھینچی ہے اور اس لکیر پر اپنے قدموں سے چل کر دور تک گئے ہیں، یہاں تک کہ
...ن میں ایک حد تک خصوصیت حاصل کرلی ہے، گرچہ یہ خصوصیت اسی تاریخی دایرے کے اندر ہے جس کے باہر اور جس سے جدا علی ...
... متصور نہیں۔ بہرحال، دونوں حیثیتوں سے علی عباس کی افسانہ نگاری اردو ادب میں ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔
... تاریخی اہمیت کا احساس اور بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند کے کامیاب اور موثر فنی اجتہاد کے باوجود اسی دور میں نیاز
فتح پوری اور ان کے ہم صفیر اردو افسانے کو ایک نئے ڈھنگ سے رجب علی اور سرشار کی قدیم داستانی فضاؤں کی طرف کھینچ رہے تھے، یہاں
تک کہ مجنوں گورکھپوری جیسے فن آگاہ استاد بھی مختصر افسانے کو بار بار داستان کی طرف موڑ رہے تھے، سجاد حیدر یلدرم بھی اپنے مختصر سانچے
کے باوجود خیالستان سے آگے قدم نہیں بڑھا پا رہے تھے۔ ایسے وقت میں افسانے کی مختصر نمائش کو استقلال کے ساتھ ترقی دینا، ساتھ ہی
گرد و پیش کے حقیقی احوال پر توجہ کو مرکوز رکھنا، علی عباس حسینی کے فن کو اردو افسانے کی تاریخ میں ایک محفوظ جگہ دلانے کے لیے کافی ہے۔

کاظم کمپنی حضرت گنج لکھنؤ

سے

آپ ہر قسم کی گھڑیاں۔ زیورات۔ تحائف کے اشیاء۔ نیز بجلی کا خاص خاص سامان خرید سکتے ہیں

گھڑیوں کی مرمت اور آرڈر کے زیورات کا سامان اور چاندی کا سامان تیار کرنا کمپنی کے قدیمی خصوصیات میں سے ہے۔

مقابلے کے کھیلوں میں دینے کے انعامات بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

کپ اور شیلڈ بھی آرڈر پر تیار کر دیئے جاتے ہیں۔

عمر علوی

علی عباس حسینی کے افسانوں کا پس منظر

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں سیاسی اور سماجی تحریکوں کا سرعنوان ہے۔ ان تحریکوں کے پس منظر میں کام کرنے والے عوامل انیسویں صدی کے سماجی نظام اور تہذیب کا زوال تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جد و جہد آزادی میں ناکامی ہندوستان کی غلامی پر منتج ہوئی بلکہ یہ انڈو مسلم تہذیب کے زوال کی بھی وجہ بنی۔ ملوکیت کے عملہ کا سماجی نظام مشترکہ محنت کے بل پر قائم تھا لیکن اس نظام کے خاتمہ کے بعد غیر ملکی حاکموں کا قائم کیا ہوا معاشرتی نظام کسانوں اور مزدوروں کے معاشی استحصال اور جاگیردارانہ معیشت پر مبنی تھا۔ ہندوستان کی غلامی انگلستان کے بورژوا طبقہ کے مفاد سے ہم آہنگ تھی۔ یہ طبقہ ہندوستان کی قومی صنعتوں کو تباہ کرکے ایک طرف تو اسے اپنی مصنوعات کی منڈی بنا رہا تھا اور دوسری طرف اسے خام مال کی فراہمی کا مرکز بنا چکا تھا۔ قومی صنعت کی تباہی کے سبب بے روزگاری اور افلاس عام تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غداروں پر مشتمل ایک نیا جاگیردار طبقہ تشکیل کیا گیا تھا جو ہندوستان کے قومی مسائل سے بیگانہ اپنے آقاؤں کے اشاروں کا پابند تھا۔ غربت افلاس جہالت توہم پرستی اور مذہبی تعصب میں گھرے ہوئے انسانوں میں جدید مغربی تعلیم یافتہ طبقہ نے اصلاحی تحریکوں کا آغاز کیا۔ یہ تحریکیں قوم پرستی کے بورژوائی نظریہ اور سامراج سے سمجھوتہ کے خمیر سے تیار ہوئی تھیں۔ اس عہد کی مخصوص معاشرت میں انکا وجود حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ اگرچہ ہندوستان کے تہذیبی ارتقا میں ان کا کوئی مقام متعین نہیں ہو سکتا۔ ہندوؤں میں رام موہن رائے اور کیشپ چندر سین نے اس نوع کی اصلاحی تحریک کا سب سے پہلے سلسلہ شروع کیا۔ یہ تحریک سامراج سے تصادم کے بجائے ہندوستانی عوام کو توہم پرستی، جہالت اور مذہبی تعصب سے نجات دلانے کا عزم رکھتی تھی۔ اسی کے متوازی تحریک مسلمانوں میں علی گڈھ تحریک تھی۔ یہ تحریک مذہب کی ایک نئی تعبیر کرکے اسے ایک سماجی قوت بنا دینے کی کوشش پر مبنی تھی۔ یہ تحریک بھی تاج برطانیہ سے کھلے تصادم کے بجائے اسی کے زیر سایہ ہندوستانی پبلک میں 'سوشل ریفارم' کی قائل تھی۔

۱۸۸۵ء میں ہندوستان میں قومی تحریک شروع ہوئی۔ یہ اولاً انہیں غیر ملکی حاکموں کے زیر سایہ ہندوستانی عوام کے لئے حقوق کی بھیک کی طلبگار رہی۔ تقریباً یہی زمانہ ٹیگور، حالی، سرسید، شبلی اور نذیر احمد کا ہے۔ یہ سب حضرات اصلاح پسند تحریکوں سے وابستہ ہیں اور انہوں نے ہندوستانی ادب کی جدید راہیں متعین کیں۔ ٹیگور برہمو سماج کی تحریک کی پیداوار تھے اور ان کا ادب اس تحریک کے زیر اثر پیدا ہونے والے ادب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح سرسید، حالی، شبلی اور نذیر احمد جن کی وابستگی مسلمانوں کی اصلاح پسند تحریک سے تھی جدید اردو ادب کے موسس بن گئے۔ حالی کی نیچرل شاعری کا ظہور اسی عہد میں ہوا۔ اردو فکشن داستانوں سے نکل کر ناولوں کے دور میں اسی زمانہ میں داخل ہوا اور اصلاح پسندی اور قومیت کے مخلوط رجحانات لیکر تھوڑے ہی عرصہ بعد اردو افسانہ بھی عالم وجود میں آیا۔ قوم پرست تحریک کو ابتدا میں اصلاح پسند عناصر کا تعاون بھی حاصل رہا۔ یہی وجہ ہے اردو کے

جدید ادب میں شروع ہی سے اصلاح پسندی اور قومیت کے جذبہ کا غلبہ رہا۔

بیسویں صدی میں قومی تحریک ہندوستانی عوام کی پسماندگی افلاس اور جہالت کا بنیادی سبب غیر ملکی حکومت کو سمجھنے لگی۔ اور اس حکومت کے قائم کردہ ملکی جاگیردار طبقہ سے کھلے تصادم پر آگئی۔ اس مرحلہ کی آمد تک اصلاح پسند ہندو تحریک ایک مذہبی فرقہ کی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن اس کا ایک عنصر قومی تحریک میں شامل ہو کر اس کے سطح نظر میں اصلاحی جذبہ کی آمیزش کرنے لگا تھا۔ لیکن ہندوستانی عوام کی سیاسی بیداری کے سبب قومی تحریک جلد ہی سامراج سے ٹکر لینے لگی اور ایسے موقع پر اعتدال پسندی کے نام پر اصلاح پسند تحریک نے گریز کی راہ اختیار کی۔ قومی تحریک اعلیٰ متوسط طبقہ کی قیادت میں شروع ہوئی تھی۔ یہ طبقہ اپنا مستقبل سامراج سے وابستہ کر چکا تھا چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں نچلے متوسط طبقہ کی حقوق کی بھیک طلب کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستانی سیاست کے افق پر خاموشی چھائی رہی۔

لیکن سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے آغاز سے ہندوستان کے معیشی ڈھانچہ میں تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں نے ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کے لئے نیا طرز عمل متعین کیا۔ جنگ عظیم کی بدولت سامراجی حکومت کو کسی نہ کسی حد تک ہندوستان کے پیداواری ذرائع کو ترقی دینی پڑی اور اس کے نتیجہ میں قومی صنعت کو بھی ترقی ہوئی۔ قومی صنعت کی ترقی سے ہندوستان کا قومی سرمایہ دار طبقہ وجود میں آیا۔ یہ طبقہ انگلستان کے سرمایہ دار طبقہ کے مفاد کا پابند تھا۔ جس حد تک یہ غیر ملکی سرمایہ داروں کا محتاج تھا۔ اس مرحلہ تک اس کی ہمدردیاں قومی تحریک کے ساتھ رہتیں اور جس مرحلہ پر اس کے اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے مفادات مشترک ہوتے اس حد تک وہ ان کے مفادات کا محافظ رہتا۔ قومی تحریک میں اسی طبقہ کی موجودگی نے اس تحریک کو بورژوائی قوم پرستی کی راہ پر لگا دیا۔ لیکن قومی صنعت کے بڑے حصہ پر غیر ملکی سرمایہ داران ابھی تک براہ راست قابض تھے اور ان کے خلاف ملکی مزدوروں میں ناراضگی اور عدم اعتماد کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ عوامی سطح پر ہندوستان کے مزدور اور کسان متحد ہو گئے۔

۱۹۱۴ء میں اور اس کے بعد جب قومی تحریک کی رفتار تیز تر ہو گئی اس وقت اردو افسانہ کے افق پر کئی نئی شخصیتیں ابھریں۔ یہ شخصیتیں علی عباس حسینی، مہاشہ سدرشن اور اعظم کریوی کی تھیں۔ ان حضرات نے افسانہ کے سادے سے خاکے کو لے کر موضوع پلاٹ اور مسائل کے اعتبار سے اس میں بے شمار تبدیلیاں کیں۔ اردو افسانے کو ایک واضح خاکہ عطا کیا اور اسے ایک ترقی پذیر صنف ادب بنا دیا۔ ان میں صرف عباس حسینی کی ذات آج تک فن کی تخلیق کے لئے موجود ہے۔

حسینی کے اس طویل ادبی زندگی میں اردو افسانہ نے بے شمار نشیب فراز دیکھے۔ ہیئت، اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے اردو افسانہ یکسر بدل چکا ہے۔ ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک نے افسانے کو بے پناہ ترقی دی اور جدید ترین مسائل کے اظہار کی گنجائش پیدا کی۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت چغتائی کو تو جانے دیجئے۔ رام لعل، قیصر تمکین، واجدہ تبسم اور انور سجاد وغیرہم کے ہاتھوں اردو افسانے کا مستقبل خاصا محفوظ ہے۔ اور نت نئے تجارب کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن حسینی اس تمام عرصے تک لکھتے رہنے کے باوجود ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے اسی قدیم ڈگر پر رواں ہیں جو پریم چند نے متعین کی تھی۔ افسانے کی ان تمام تبدیلیوں کا انہوں نے بہت کم اثر قبول کیا۔ لیکن اپنے عہد کے حالات سے حسینی متاثر ضرور ہوئے اس تاثر کو سمجھنے کے لئے ہمیں تحریک آزادی کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔

خلافت ترکی اور تاج برطانیہ کے تصادم نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کو خلافت سے مذہبی عقیدت کی بنا پر انگریزوں کے خلاف کر دیا اور قدرتی طور پر ان کی ہمدردیاں اتحادیوں کے خلاف گئیں۔ اس کے نتیجہ میں علی گڑھ کے مصالحت پسند عنصر کے بطن سے ایک نئے عنصر نے جنم لیا جو سامراج کے خلاف بین الاقوامی سطح پر جدوجہد کا قائل تھا اس عنصر نے قومی تحریک کے ساتھ اشتراک کر لیا اور ترک موالات کی پہلی تحریک

اسی کے تعاون کے ساتھ شروع ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں تاج برطانیہ نے از راہ عنایت خسروانہ ہندوستانی غلاموں کو دستوری اصلاحات عطا فرمائیں۔ لیکن ہندوستانی غلاموں نے انہیں نامنظور کر دیا اور ایک ایسی ملک گیر تحریک کا آغاز ہوا جس میں خلافت کے حامی مسلمان ہندوستانی کسان مزدور اور نچلے درمیانے طبقہ کے افراد حتیٰ کہ چھوٹے زمیندار بھی ایک ہی پلیٹ فارم پر متحد ہو گئے۔ یہ پرامن جد وجہد ۱۹۲۲ء تک جاری رہی۔ اور اس تمام عرصہ تک ہندوستانی عوام کا رویہ انتہائی سرفروشانہ رہا۔ ۱۹۲۲ء میں قومی محاذ پر خاموشی چھا گئی اور ایک طویل عرصہ تک جنگ آزادی کے کارکن تازہ دم ہوتے رہے۔ اس تحریک میں بنیادی جد وجہد غیر ملکی حاکموں اور ان کے پروردہ ملکی جاگیر دار طبقہ کے خلاف تھی۔

۱۹۱۹ء میں جب آزادی کی جد وجہد اپنے شباب پر تھی۔ جلیانوالہ باغ امرتسر میں ہندوستانی عوام کے نہتے پرامن جلسے پر برطانوی فوج نے گولیوں کی بارش کر دی اور آزادی کی شمع پر چند ہزار پروانے نثار ہو گئے۔ یہی عباس حسینی کے ناول سر سید احمد پاشا کا سنہ تالیف ہے۔ اس ناول میں حسینی نے اپنے قریبی زمانہ کو بطور پس منظر کے منتخب کیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار سید احمد ہندوستان کے جاگیردار طبقہ کا نمائندہ ہے۔ اور اپنی سرزمین پر آزادی پسندوں کے خون سے ہولی کھیل کر سرکار انگلشیہ کی خدمت کرتا ہے اور اس کے انہی کارہائے نمایاں نے اسے حسینی کا ہیرو بنا دیا۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حسینی نے انتہائی خام سیاسی شعور سے اپنی ادبی زندگی کا ابتدا کی۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ عباس حسینی نے اپنے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی ضرور کی، اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ ۱۹۲۲ء میں ستیہ گرہ کی پہلی تحریک کی ناکامی کے بعد ہندوستان کے سیاسی افق پر جو خاموشی چھائی اس نے انڈین نیشنل کانگریس اور قومی تحریک کے کارکنوں کو خود احتسابی کا موقع دیا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب ہندوستانی عوام نے یہ محسوس کیا کہ جنگ آزادی کے پہلے دور میں ان کی ناکامی کا سبب صفوں میں، نو دولتیے سرمایہ دار اور چھوٹے زمینداروں کا وجود تھا، جو ہر مرحلہ پر سامراج سے سمجھوتہ کے لئے تیار رہتے۔ اب ہندوستان کے مزدور کسان اور نچلے درمیانی طبقہ کے دانشور مذہبی اصلاح پسندی کے رجحان کو چھوڑ کر بنیادی سماجی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ روسی انقلاب کی کامیابی کے اثر سے مزدور اور کسان انجمنوں میں اشتراکی رجحان کے کارکن بھی نظر آنے لگے۔ غرض خود قومی محاذ میں سرمایہ دار طبقہ اور مزدور طبقہ کا تصادم غیر محسوس طور پر ہونے لگا لیکن قومی تحریک صرف جاگیرداروں کے سلسلے میں دوٹوک فیصلہ کر سکی اور سرمایہ دار طبقہ کے متعلق کسی واضح رویہ کا تعین نہ ہو سکا۔ یہ کیفیت ۱۹۲۸ء تک جاری رہی۔

ایک طرف تو ہندوستان کے ان سیاسی و سماجی حالات کو ذہن میں رکھئے۔ اور دوسری طرف حسینی کے ان فن پاروں پر نگاہ ڈالئے جو اس دور میں تخلیق ہوئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ فنکار اپنے عہد کی سیاسی و سماجی حالت سے آنکھ بند کر کے اصلاح پسندی کے دور میں سانس لے رہا تھا۔ عباس حسینی کے اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں کچھ تو اصلاح پسند جذبات کے عکاس ہیں۔ کچھ پر رومانی عناصر کے اغاذ ہیں۔ اور کچھ کلاسیکی تہذیبی قدروں کی باقیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خیر و شر کا ایک مبہم سا تصور بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ "آئی سی ایس" میں آئی سی ایس بھائی کا مجاہدانہ طرز عمل نیکی کے اس مخصوص خاکہ کو پوری طرح پیش کرتا ہے۔ جو عباس حسینی کے ابتدائی افسانوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ اس طرز کے دوسرے افسانے رفیق تنہائی، سکھی، انسپکٹر کی عید، شیخو چچا، جھوٹ، قانون باطن بختیارک کا نسخہ، شیخ کریم کی نفرت، دل کی آگ اور پیا کی جوگن وغیرہ ہیں۔ ان تمام افسانوں میں نیکی کا یہ مبہم سا تصور موجود ہے۔ مثلاً شیخو چچا کا کردار دیہاتی سادگی اور محبت کا کامل نمونہ ہے۔ جیسے نیکی خود بشکل مجسم سامنے آ گئی ہو۔ 'انسپکٹر کی عید' کے انسپکٹر کا کردار اور 'قانون باطن' کے پولیس افسر کا کردار بھی اسی نیکی اور سادگی کے تصور سے ہم آہنگ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ذوق گناہ

بالکل آلودہ نہیں ۔ نیکی اور رومان کی آمیزش سے بھی حسینی نے بعض خوبصورت افسانے تخلیق کئے ۔ "جھوٹ" کا ڈاکٹر محمود ۔ "انسپکٹر کی عید کی رات" ۔ "دل کی آگ" کی مشتری اور مولوی انوارالحق سب نیکی اور رومانس کے ملاپ سے جنم لیتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں ایک اور رجحان ان کے یہاں نظر آتا ہے کہ اونچے درمیانہ طبقے اور اونچے طبقہ کے افراد کی باہمی چپقلش اور کسی ایک کی نیکی کی بنا پر ان کا باہمی ملاپ خواہ وہ حسن و عشق سے مملو ہو یا نہ ہو حسینی کے کئی افسانوں کا موضوع ہے "سو بیگھے" میں آنند سنگھ اور اندرا دیوی کی باہمی محبت دو آمادۂ پیکار ریاستوں میں یگانگت کی بنا ڈالتی ہے ۔ تقریباً یہی "ملاپ" اور "دو دشمنوں کا مقابلہ" کا موضوع ہے ۔ حسینی ان جاگیرداروں کے ملاپ سے اپنی نیکی کے تصور میں رنگ تو بھرتے ہیں ۔ لیکن ان کی باہمی جنگ کے پس منظر میں ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی نظام کو جس حد تک دخل تھا حسینی اسے یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں ۔ انگریزوں کے قائم کردہ معاشرتی نظام میں جاگیرداروں کو جو کلیدی حیثیت حاصل تھی اس کی بنا پر ان کا اتحاد کسی مرحلہ پر بھی سامراج کے قدم اکھاڑ سکتا تھا ۔ سامراجی حکومت ۔ اس اندیشے کے پیش نظر ان کو منقسم رکھنے کی امکانی کوشش کرتی اور ان کے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے عدلیہ اور انتظامیہ کا نظام غیر مصالحانہ رویہ اختیار کرتا ۔ سامراج کی دوسری چال جاگیروں کی تقسیم میں اکثریت پر اقلیتوں کا راج قائم کرنے کی تھی ۔ اس طرح اکثریت جہاں بھی اقلیت کے ہاتھوں معاشی استحصال کا شکار ہوتی تو اس کا ردعمل سیاسی نہیں فرقہ وارانہ ہوتا ۔ لیکن حسینی کی نظر سے یہ تفاصیل پوشیدہ رہیں اور وہ محض جاگیرداروں کے ملاپ پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں ۔ اس دور کے تین افسانے "بوڑھا اور بالا" "دیش اور دھرم" اور "مادرِ ہند کے دو بیٹے" محض فرقہ وارانہ جذبات کی نفی میں لکھے گئے ہیں ۔ لیکن ان تینوں میں کہیں بھی فرقہ وارانہ تناؤ کی بنیادی وجوہ جن میں سے ایک کا اوپر ذکر ہو چکا ہے زیرِ بحث میں نہ آئی ۔ جاگیرداروں کی باہمی چپقلش بھی اگر وہ جدا فرقوں سے تعلق رکھتے فرقہ وارانہ تناؤ پیدا کرتی ۔ اسی طرح غیر ملکی حکومت احتسابی نظام جو فسادات کو فرو کرنے کے بجائے درپردہ انہیں ہوا دیتا اور خود بعض اصلاح پسند جماعتوں کی غلط حکمت عملی فسادات کا موقع فراہم کرتے ۔ لیکن حسینی کے ان تینوں افسانوں میں ان مسائل کا گہرا تجزیہ مفقود ہے وہ کسی کی موت کے المیے سے ایک خوبصورت افسانہ کی تخلیق ضرور کر لیتے ہیں لیکن اس موت کے ذمہ دار عنصر کی نشاندہی نہیں کر پاتے ۔ رومانی افسانوں میں حسینی کا رویہ انیسویں صدی کلاسیکی ہے ۔ البتہ بعض افسانوں میں رومان ہندوستانی عوام کے اتحاد کا ذریعہ بن جاتا ہے خواہ وہ مخالف فرقوں کا اتحاد ہو یا مخالف جاگیرداروں کا اتحاد ۔

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء تک حسینی کے افسانے سماجی شعور سے کافی حد تک عاری تھے البتہ تہذیب کے واسطے سے وہ انیسویں صدی میں سانس لیتے رہے اور دراصل اسی صدی کے رجحانات سے متاثر ہوئے ۔ یوں ۱۹۳۶ء تک میری نظر میں حسینی کے افسانوں کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ حسینی کے دوسرے دور کے افسانوں پر بحث سے پہلے ہمیں اس دور کے تاریخی اور سماجی حالات کا تجزیہ کرنا پڑے گا ۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ قومی تحریک کے کارکنوں میں پرولتاریہ طبقے نے بورژوا طبقہ کی سیاست کا دم چھلہ بننے سے بیزاری کا اظہار کیا تھا ۔ اشتراکی رجحان کی تنظیمیں اب گاندھی واد کی باغی بنتی چلی جا رہی تھیں ۔ اور ہندوستان کا پرولتاریہ طبقہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ غیر ملکی حاکموں اور جاگیرداروں کے استیصال کے بعد بھی انہیں استحصالی عناصر سے کلی طور پر نجات ملنی ناممکن ہے ، پُرامن ستیہ گرہ کے بجائے اب ہندوستانی عوام کا ایک بڑا جزو جدال و قتال کو سامراج سے نجات کا آخری ذریعہ سمجھنے لگا تھا ۔ لیکن ان تمام عناصر کو ایک فردِ واحد کی شخصیت یکجا کئے ہوئے تھی وہ شخصیت ہر فرد کے مسئلے کے حل کا "وعدہ" کر لیتی تھی ، اسے عوام کو مسخر کر لینے پر قدرت تھی اور اسی مسحور کن شخصیت کی موجودگی نے محاذ آزادی کے کارکنوں کو منقسم ہونے سے روک لیا ۔

پرولتاریہ طبقہ کی مزید سیاسی بیداری کی وجہ سے ستیہ گرہ کی دوسری تحریک کا آغاز اسی طبقہ کے ہاتھوں ہوا ۔ لگان کے

نئے قانون کے خلاف کسانوں کے ردعمل اور کلکتہ، کھڑک پور، جمشید پور اور بمبئی میں لاکھوں مزدوروں کی ہڑتال اس نئی جدوجہد کا عنوان ہے ۱۹۳۰ء میں نمک کا قانون توڑ کر گاندھی جی نے ہندوستان کے تمام عوام کو اس نئی جدوجہد میں شریک کر لیا۔ اس دفعہ استبدادی نظام کی مشینری اور تیزی سے حرکت میں آگئی کانگرس خلاف قانون جماعت قرار پائی۔ گرفتاریوں اور مظالم کی رفتار میں شدت آگئی۔ لیکن عوامی جوش و خروش میں بھی اسی تیزی سے اضافہ ہوا۔ سرکاری کارندوں نے عوامی جذبات کو پہچان کر باعزت سمجھوتے کی کوشش کی اور سینیگرہ کی تحریک عارضی طور پر ختم ہوگئی۔ لیکن گول میز کانفرنس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ۱۹۳۲ء میں یہ تحریک دوبارہ شروع ہوگئی۔ اس دفعہ سے انتظامیہ نے اور بھی سختی سے کچلنے کی کوشش کی ہنگامی قوانین حرکت میں آگئے اور جیلوں کی ویرانیاں ختم ہوگئیں لیکن بدقسمتی سے یہ تحریک اس دفعہ خود انتشار کا شکار ہوگئی۔ مئی ۱۹۳۳ء میں باضابطہ اس کے خاتمہ کا اعلان ہوگیا۔ اس دفعہ اس تحریک کی ناکامی سے عوامی حوصلے پست ہوگئے۔ سیاسی انجمنوں کو حکومت کی مشینری نے ذریعہ بدنام کرنے لگی عوام دہشت زدہ ہو گئے اور انہیں مزید دہشت دلانے کے لئے بے دریغ قومی کارکن گرفتار کیے گئے۔ غرض ایسی پریشانی اور شکست خوردگی کی حالت میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ ہوا جس کے تحت عوام کو بھی شریک اقتدار کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء تک کی سیاست میں بھی بورژوا رجحان کا غلبہ رہا۔ عوامی جوش و خروش پرامن طور پر زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتا۔ آخر کسی نہ کسی مرحلہ پر جب اس میں کمی آئی تو جبر و تشدد سے اسے کلیتاً کچل دیا بہت آسان تھا۔ مزدوروں کے مسائل کا حل یا سرمایہ داروں سے نجات کی امید نہ ہونے کی وجہ سے بھی خاصے کارکن بےحوصلگی کا شکار رہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ قومی تحریک سے بددل ہو کر مسلم بورژوا قیادت کو قبول کرنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلافت کا وہ تصور جس نے انہیں قومی تحریک سے وابستہ کر دیا تھا خود ناکام ہوگیا تھا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت قومی کارکنوں کو انتظامی معاملات میں شریک تو کر لیا گیا لیکن فیصلہ کن طاقت کی حیثیت غیر ملکی حاکموں ہی کو حاصل رہی۔ اقتدار میں آجانے کی وجہ سے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ بھی قومی تحریک میں شامل ہو کر اس کا ایک فعال عنصر بن گیا۔ البتہ تہذیبی اور لسانی مسائل پر قومی قیادت کی بعض لغزشوں کی وجہ سے مسلم عوام اس تحریک سے یکسر قطع تعلق کرنے لگے۔ خالص فرقہ پرست عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع ملا اور مسلم عوام کی جدوجہد کا مرکز پاکستان کا حصول قرار پایا۔

اسی زمانہ میں جنگ عظیم کے بادل چھا گئے۔ فسطائیت اور جمہوریت کے ٹکراؤ میں قومی تحریک جو اب بورژوا قوم پرست تحریک بن چکی تھی۔ برطانوی حکومت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے لگی۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر سمجھوتہ ممکن نہ ہوا اور ایک بار پھر قومی کارکن زندانوں کی نذر ہوگئے۔ اس موقع پر نودولتیہ سرمایہ دار طبقہ جنگی ٹھیکوں کے حصول کی خاطر قومی تحریک سے منہ موڑ کر پھر سامراج سے مل گیا۔

یہ تفاصیل میرے موضوع سے تعلق نہیں رکھتیں لیکن مجھے یہ دکھانا مقصود ہے کہ بورژوا تکنیک کی وجہ سے قومی تحریک میں شگاف پڑ گئے اور ۱۹۴۲ء کی سی اتحاد کی فضا ختم ہو کر رہ گئی۔ البتہ جنگ عظیم کے خاتمہ کے ساتھ ہی سرمایہ دار طبقہ پھر قومی تحریک سے مل گیا، اور اب تک ملا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے تقسیم کا مطالبہ منظور ہوگیا اور ۱۹۴۷ء میں دو آزاد مملکتیں معرض وجود میں آئیں اور مذہب کے نام پر لاکھوں بےگناہ انسانوں کے خون سے ہندوستان کی زمین لالہ زار ہوگئی، کروڑوں انسان بےگھر ہوئے غرض وہ سارا جذبہ جس کا اظہار غیر ملکی حکومت کے خلاف ہونا چاہئے تھا۔ اپنوں پر نکلا۔ اب ہم اس تاریخی پس منظر میں حسینی کے افسانوں کے دوسرے دور کو دیکھتے ہیں۔

اوپر میں عرض کر چکا ہوں کہ حسینی محبت اور نیکی کے جذبہ کی آمیزش سے خیر کا تصور تخلیق کرتے ہیں۔ ان کا یہ تصور چخوف کے فلسفیانہ تصورات پر پورا اترے یا نہ اترے ان کے فن کا ایک کامیاب پہلو ضرور ہے۔ افسانہ "باسی پھول" میں حسینی نے ایک ایسے ہی

رجحان کی تخلیق کی ہے۔ البتہ یہ افسانہ رومان کے ایک کلاسیکی تصور کو بھی پیش کرتا ہے اور اس کا یہ اضافی حسن ہے۔

اسی طرح "نئی ہمسائی" میں بھی بچے کی محبت اور نیکی کی آمیزش سے حسینی نے نئی ہمسائی کو فوق البشر بنا دیا۔ لیکن نئی ہمسائی میں اخلاق کے فرسودہ اقدار کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھی موجود ہے۔ یہ فرق زمانہ کا فرق ہے۔ 'باسی پھول' پہلے اور دوسرے دور (۲۸ء، ۳۰ء) کے بیچ میں لکھا گیا اور نئی ہمسائی کی تخلیق اس وقت ہوئی جب حسینی کا نقطۂ نظر کسی حد تک سماجی ہو چکا تھا۔

۱۹۲۹ء میں حسینی نے تین افسانوں کی تخلیق کی ان میں سے دو افسانے یکساں موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ یہ دو "کیڑے کا بھوگ" اور "عدالت" ہیں۔ دونوں کا موضوع جاگیردار طبقہ کی عیاشی ہے۔ یہ دونوں افسانہ پلاٹ سازی اور قصہ گوئی کے فن کے اعتبار سے بعید کامیابی سے تراشے گئے ہیں۔ ان دونوں میں حسینی "گناہ کی مزدوری موت" قرار دیتے ہیں۔ اس حد تک یہ افسانہ ان کے خیر و شر کے فلسفہ کا ابلاغ کرتے ہیں۔ لیکن جاگیردار طبقہ کی عیش کوشی کے ذکر میں حسینی اپنے ابھرتے ہوئے سماجی شعور کا پورا ثبوت دیتے ہیں۔ ۱۹۲۹ء کا تیسرا افسانہ "بیوی" اسی فوق البشر کے تصور کی عکاسی کرتا ہے جو حسینی کا محبوب موضوع ہے۔ بہرحال ان افسانوں سے ہمیں حسینی کے رویہ کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں قومی تحریک فیصلہ کن مرحلہ پر داخل ہو رہی تھی۔ اس سال حسینی نے کوئی بھی قابل ذکر افسانہ نہ لکھا۔ البتہ ۱۹۳۱ء کے افسانہ "انتقام" میں حسینی نے کسی حد تک جاگیرداروں کے ہاتھوں کاشتکاروں پر ڈھائے جانے والے مظالم سے متاثر ہیں۔ یہاں بھی ان کا کردار آقا کی طرف سے لطف و کرم کی ایک ہی نظر پر سمجھوتہ کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ اپنے آقاؤں سے زیادہ شرافت کا ثبوت دیتا ہے۔ حسینی کا یہ افسانہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:—

"رمپیا لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ وہ ٹھاکر کے مکان کے دروازے پر آ کر نوکروں کو نام لے لے کر پکارنے لگا
ٹھکرائن کے میٹھے بولوں نے جلاد کو مسیحا بنا دیا تھا، اس کے پاس ان منتروں کا کوئی توڑ نہ تھا۔ یہ تھا نیا انتقام"

۱۹۳۲ء کی تاریخی اہمیت کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس سال حسینی نے کسی افسانہ میں اپنے سیاسی رجحان کا پتہ نہ دیا۔ البتہ "باغی کی بیوی" میں انہوں نے ان انتہا پسند عناصر کی نفی کی ہے جو تشدد کے ذریعے انگریزی حکومت سے ٹکر لینا چاہتے تھے حسینی لکھتے ہیں

"وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی طرح سیکڑوں نوجوان بیکار ہیں ہر ایک اپنی جان سے
اور دنیا سے خفا ہے ...... مہیشور کی ایسے ہی لوگوں سے دوستی ہے وہ انہیں بہلا کر ہر طرح کے
کام کے لئے تیار کر سکتے ہیں . . . . آج کل ریلوے لائن اور پٹریوں پر باغیوں کا حملہ ہے
انہوں نے ٹرینوں کا الٹ دینا لڑانا یا سوراج حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھ لیا ہے۔"

۱۹۳۴ء میں حسینی نے "گونگا ہری" لکھا۔ اس افسانہ میں وہ جاگیردار طبقہ کے رعایا پر مظالم اور فرسودہ رسوم و رواج کی نفی کرتے ہیں اور آخر میں محبت کو ایک فاتح جذبہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں "اچھوت برہمن" میں پھر ایک مرتبہ فرسودہ رسوم کو ترک کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس المیہ میں انہوں نے تمثیلی انداز میں ذات پات کی بیجا پابندی کے نتائج بیان کئے ہیں۔

اب ذرا پلٹ کر نظر ڈالیں تو ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء تک ہمیں حسینی کے یہاں دو رجحان واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک رجحان اصلاح پسندی کا تھا جس میں سب سے نمایاں ذات پات کے نظام کی اصلاح تھی۔ اس کے پس منظر میں ہمیں گاندھی جی کی وہ تحریک صاف نظر آ جاتی ہے جس کا مقصد ایسی تمام اقدار کی بیخ کنی اور ہندوستانی عوام کے تمام طبقات کا اتحاد و اتفاق تھا۔ گاندھی جی سے پہلے

رام موہن رائے کی تحریک ایسی تمام اقدار کے خلاف سینہ سپر رہ چکی تھی اور قریبی زمانہ میں اچھوت لیڈر بھی اپنی قوم کی غلامی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اسی طرح "نئی ہمسائی" میں حسینی مسلمانوں کے اخلاق کی فرسودہ اقدار پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کے پس منظر میں بھی اصلاح پسندی کا جذبہ موجود ہے۔

دوسرا رجحان جوان افسانوں میں نظر آتا ہے وہ جاگیردار طبقہ کے ہاتھوں ہندوستان کے کاشتکاروں کے معاشی استحصال کی نفی ہے۔ اور ان کی سماجی تذلیل کے خلاف کراہیت کا احساس ہے۔ اس میں حسینی شائیت پرست بن کر کہیں تو سمجھوتہ کرا دیتے ہیں اور کہیں ظالم کو کیفرِ کردار پر پہنچا دیتے ہیں۔ یا "عدالت" کی بدلیا کی زبان سے حقیقت نگار بن کر کہلواتے ہیں ؎

"آج جو تمہاری عدالت میں پیش ہوا تھا وہ تمہارا وہ لڑکا ہے جو تمہاری "سرٹن" (دیوی) کے پیٹ سے ہے...... دونوں کو ایک ہی تربیت دی جائے تو فرق ہوتا ہے کہ نہیں۔ وہ رذیل بچہ ہے یہ شریف زادہ ہے فرق ہونا چاہئے مگر دونوں ویسے ہی نکلے۔ تم ڈپٹی ہو، انصاف کرتے ہو قانون پر عمل کرتے ہو، جاؤ دیکھو قانون میں انصاف ہے کہ نہیں کہ وہاں بھی شریف اور رذیل کا فرق ہے۔ ایک کے لئے ذلت اور دوسرے کے واسطے عزت۔"

شوکت حسین اور اندر بلی دونوں ہندوستان کے جاگیردار طبقہ کے افراد ہیں۔ دونوں حسینی کے نزدیک برے انسان ہیں، اور دونوں ہی سامراجی نظام کے آلہ کار ہیں۔ اس تاثر کو ذہن میں رکھتے ہوئے "باغی کی بیوی" میں دہشت پسند تنظیم کی مذمت دیکھ کر ہم محسوس کرتے ہیں کہ حسینی اصلاح پسند قوم پرستی کی طرف راغب ہیں۔ لیکن اصلاح پسند قوم پرست تحریک اس وقت سامراج کے خلاف صف آرا تھی۔ حسینی اس کے بہت سے تصورات کی وکالت کرنے کے باوجود سامراج کے ذکر سے دامن بچا جاتے ہیں۔ اسی طرح جاگیردارانہ معیشت کی نفی کرنے کے باوجود اس کے اس پہلو کے ذکر سے بھی دامن بچا جاتے ہیں۔

لیکن ۳۰ء میں "لیڈر" کی اشاعت سے حسینی کے زاویہ نگاہ میں زبردست تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ ہندوستان کے قومی محاذ میں سرمایہ دار طبقہ کے عمل دخل اور اس کے نتیجہ میں اس تحریک کے سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق کسی منفی رویہ سے عاری ہونے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ "لیڈر" میں حسینی نے قومی تحریک کے اسی پہلو پر زبردست تنقید کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس تحریک کے لیڈر سرمایہ دار طبقہ کے وہ افراد ہیں جو کاشتکاروں کے حقوق کے لئے تو سینہ سپر ہیں لیکن اپنے کارخانوں میں مزدور طبقہ کے مطالبات کو کسی طرح منظور نہیں کرتے اور قومی تحریک کا سہارا لے کر ان کے جذبات کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی افراد جنگِ عظیم کی امید میں رہتے ہیں تاکہ جنگ کی بدولت ان کی تجارت کو فروغ ہو یا یوں کہئے کہ سطحِ ارضی پر بہتے ہوئے انسانی خون کو وہ اپنی تجوریوں کے بھرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کا "لیڈر" کہتا ہے :-

"زمیندار دیس کا دشمن ہے۔ ہم ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دیتے ہیں ...... مجھے کسانوں کی سیوا سے اس وقت فرصت نہیں کہ میں اس قسم کی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ دے سکوں خود مزدوروں کو سمجھائیں کہ ہڑتال کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ ابھی حال ہی میں مہاتما جی نے ملوں میں دھرنا دینا عدم تشدد کے خلاف بتایا ہے۔ اگر وہ لوگ نہ مانیں گے تو میں چٹھی لے کر مہاتما جی کو سب مزدوروں سے خفا کرا دوں گا۔ پھر وہ کہاں کے رہیں گے، ہونہہ

> بڑے تیسے اسٹرائک کرنے والے۔ اگر ہم ہی لوگوں کے کارخانوں میں ہڑتال ہونے اور دھرنا دیا
> جانے لگا تو پھر دیس کی رکھشا کا کام ہو چکا۔" (لیڈر ۳۰)

سنہ ۱۹۳۲ میں حسینی نے ایک افسانہ "شکار۔ یا شکاری" لکھا جو فنی لحاظ سے زیادہ کامیاب نہیں۔ دیہی زندگی میں کسانوں کی تکالیف کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فنی خامیوں کی بنا پر وہ کوئی قوی تاثر نہ پیدا کر سکے۔ اس کا نچوڑ ایک کردار کے منھ سے نکلا ہوا یہ جملہ ہے:۔

> "ہندوستان کی غربت اب اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اس قسم کی حالت (زچگی کی حالت) میں بھی
> عورتیں جفاکشی پر مجبور ہیں۔"

اس افسانے کے علاوہ حسینی نے اسی سال ایک مکالماتی افسانہ "کیا کیا جائے" لکھا۔ اس تمثیلچے یا افسانہ میں انہوں نے نچلے، متوسط طبقہ اور درمیانہ طبقے کی درماندگی کی پوری تفصیل پیش کی ہے۔ اول الذکر طبقہ بے روزگاری اور روایتی اقدار کی پابندی کی بدولت موت کے منہ میں جاتا ہے اور موخر الذکر زمینداروں اور بڑے جاگیرداروں کی ملی بھگت سے ظلم و تشدد کا شکار ہوتا ہے۔ اس تمثیلچے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس استحصالی عمل کی تمام تفاصیل آجاتی ہیں جو ہندوستان کے کاشتکار پر روا رکھا گیا تھا۔ زمیندار ناجائز ٹیکس وصول کر کے، مہاجن سود کی بڑی شرح مقرر کر کے اور حکومت کی نام نہاد احتسابی مشینری اس سارے ظلم و ستم کی خاموش تماشائی بن کر بلکہ اس میں ظالموں کی حوصلہ افزائی کر کے اس مظلوم طبقہ کے دکھ میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہندوستان کا وہ کاشتکار جو مقروض پیدا ہوتا، مقروض زندہ رہتا اور مرکر اپنا بار اپنے ورثا کے حوالے کر جاتا۔ جس کی اشیائے ضرورت آئے دن قرقی کا شکار ہوتیں جس کو اراضی سے آئے دن بے دخل کیا جاتا اس طبقہ کی ساری معاشی اور ذہنی الجھنوں کو مذکورہ تمثیلچے میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ کسانوں کے خون پسینہ کی کمائی کا بڑا حصہ جاگیرداروں کے ہاتھوں عشرت کے ایوانوں میں جس طرح لٹایا جاتا یہ تمثیلچہ اس کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ البتہ اس سارے عمل کے پس پردہ کام کرنے والے غیر ملکی حاکموں کے ذکر سے حسینی پھر دامن بچا گئے

سنہ ۱۹۳۹ء میں "حق نمک" میں نیکی کے تصور کے ساتھ نچلے طبقہ کی مظلومی کی دھندلی سی تصویر کھینچی ہے۔ اسی سال حسینی نے "خوش قسمت لڑکا" جیسا لاثانی شاہکار تخلیق کیا۔ غربت اور افلاس کے نچلے طبقہ کے افراد نے خود فریبی کے جو تانے بانے اپنے ارد گرد بن رکھے تھے حسینی اس افسانہ میں ان کی حقیقت کو فاش کرتے ہیں۔ بہت سی فنکارانہ نزاکتوں اور مشاہدہ کے اعجاز دکھانے کے بعد حسینی آخر میں بتاتے ہیں کہ ایک دادی اپنے کمسن پوتے کو ایک فقیر کے ساتھ بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ جاتی ہے تو مڑ کر یہ دعا کرتی ہے:۔

> "تیرا شکر ہے میرے مالک کہ تو نے میرے پوتے کو اتنا خوش قسمت بنا دیا کہ یوں ہی
> "کام" پر لگ گیا۔"

"خاموش خاموش" میں زمینداروں کے رعایا کے ساتھ ذلت آمیز سلوک اور بیگار کو حسینی نے موضوع بنایا ہے لیکن ان کے بہت سے دیگر افسانوں کی طرح اس میں بھی فنی نقائص کی بدولت حسینی اس کے مرکزی تصور کو نمایاں نہ کر پائے۔

یہ افسانے جس دور میں تخلیق ہوئے اس وقت کانگریس وزارتیں قبول کر رہی تھی لیکن جلد ہی جنگ عظیم کی وجہ سے انگریزی حکومت سے مفاہمت نہ رہ سکی اور ہندوستان کے طول و عرض میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے استبدادی مشینری حرکت میں آگئی اور ایک بار پھر ہندوستان کے جیل بے گناہوں سے بھر گئے۔ اور حسینی ایک بار پھر سماجی مسائل سے قطع تعلق کر کے محض راجاؤں کی عیش کوشیوں کی داستانیں یا نیکی کی حکایتیں سنانے لگے۔

۱۹۲۹ء میں جس حد تک ان کا سیاسی اور سماجی شعور واضح ہو گیا تھا اس سے پیچھے ہٹ کر ایک دفعہ پھر ۱۹۳۲ء کے دور میں پہنچ گئے۔ اس دور کا افسانہ "طمانچہ" دو تہذیبوں کے ٹکراؤ سے بحث کرتا ہے اور جدید مغربی تہذیب سے تنفر کا درس دیتا ہے اور یہی وہ واحد افسانہ ہے جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک کے دور میں حسینی نے "مقصدیت" کو پیش نظر رکھ کر لکھا۔ اس افسانہ کے علاوہ اس زمانہ کے بیشتر افسانے محض قصہ گوئی کے فن پر پورے اترتے ہیں۔ "کنجی"، "[illegible] بہادر"، او [illegible] بھرمار [illegible] خیر خان گود" اور "کلی" بھی انہی بے مقصد افسانوں کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں اور [illegible] ان میں سے کئی افسانے بہت اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔

ہمیں "کفن"، "بیگار" اور "میلہ گھومنی" کے پیچھے [illegible] ۱۹۳۶ء [illegible] افسانہ نگاری کی تمام فنی نزاکتوں سے مالا مال ہیں لیکن باسوائے "بیگار" [illegible] کوئی گہرا تعلق نہیں اور خود "بیگار" کا موضوع اس سلسلہ میں قومی تحریک کے [illegible] رویہ اختیار کر لینے کی [illegible] جنگ عظیم کی وجہ سے جنم لینے والے [illegible] سرمایہ دار ان کے مظالم کا شکار مزدور اور فرقہ وارانہ منافرت یہ تھے وہ موضوع جو اس عہد کے زندہ مسائل پر روشنی ڈالتے تھے۔ اس دور کے دوسرے فنکاروں کا دل بجا طور پر عالم انسانی کا دل بن گیا تھا۔ اس زمانہ کے افسانہ نگار نہ صرف اپنے مسائل کو زیر بحث لاتے بلکہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ظلم و استبداد جب [illegible] تو وہ اسے اپنا درد سمجھتے اور فن کے ساز پر وہ نغمات سناتے جن میں سارے عالم انسانی کا درد ہوتا۔ لیکن حسینی اس سلسلہ میں ان فن کاروں سے بالکل مختلف رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ کے متعلق ایک افسانہ جو انہوں نے اسی دور میں لکھا تھا وہ بھی مشاہدہ کی کمی اور حقیقت نگاری سے گریز کا شکار ہو کر کوئی اعلیٰ فن پارہ نہ بن سکا۔ ان حالات میں حسینی کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور اختتام کو پہنچا اور تیسرے دور کا آغاز ہوا یہ دور آج تک جاری ہے۔ اس دور کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوتا ہے اور اس کے مسائل پہلے دو ادوار کے مسائل سے قطعاً مختلف ہیں۔

قومی محاذ آزادی سے مسلم عنصر کا جدا ہو جانا اور ۱۹۴۷ء کے فسادات، وہ موضوعات تھے جنہوں نے ہندوستان کے بیشتر افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ بے شمار افسانے لکھے گئے اور دنیا میں غالباً پہلی مرتبہ کسی ملک کے فنکاروں نے اپنے زمانے کے واقعات کے متعلق اس قدر بصیرت کا ثبوت دیا لیکن حسینی نے ان موضوعات پر کم ہی اظہار خیال کیا اور اگر کیا بھی تو کسی اعلیٰ فن پارہ کی تخلیق نہ کر سکے۔

قومی تحریک پر بورژوا انداز فکر کا جو غلبہ ہوا اس کی منطقی [illegible] یہ تھی کہ قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ قومی حکومت نے جاگیرداروں کے وجود کے مسائل کو تو کسی نہ کسی طور حل کر دیا لیکن ۱۹۴۷ء کی تقسیم نے اور بہت سے مسائل پیدا کر دئے، اور تقسیم سے قبل کے بھی بہت سے مسائل حل طلب پڑے رہے۔ مزدوروں اور قومی سرمایہ داروں کا نزاع تقسیم سے تہذیبی قدروں کی تباہی، نقل مکانی اور فرقہ پرستی یہ اور اسی نوع کے سیکڑوں دیگر مسائل جو معاشرتی اور تہذیبی اہمیت بھی رکھتے ہیں تا حال تصفیہ طلب ہیں اور دونوں حکومتوں کے فنکاروں کی آزمائش بنتے رہتے ہیں۔ لیکن حسینی قصہ گوئی اور مثالیت کی راہوں میں بھٹکے یا ماضی میں کسانوں کے سہے ہوئے مصائب کی تلخ یادیں تازہ کرتے رہے۔ بلاشبہ "نور و نار"، "جل پری"، "حاجی بابا" اور "دو دوراہے" میں سے اکثر افسانے عباس حسینی کی فنی پختگی پر شاہد ہیں۔ ان کے مثالی کردار اب زیادہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا فوق البشر اب زیادہ واضح شکل اختیار کر چکا ہے۔ "گاؤں کی لاج" میں وہ ملاپ کے موضوع کو دہراتے ہیں تو زیادہ چابک دستی کا ثبوت دیتے ہیں لیکن یہ افسانے کسی آدرش سے خالی ہیں اس میں ہندوستان کے عام انسان کی آشا کی تصویر نہیں ملتی۔ "ہمارا گاؤں" میں وہ جاگیرداری کے خاتمے کے عوامی ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے بھی اپنے کسی واضح رجحان کا پتہ نہیں دیتے۔ اپنے ایک انشائیہ نما افسانہ میں وہ ترقی پسندوں کے فن کا اعتراف کرتے ہیں لیکن خود ترقی پسندی کی سیدھی راہ پر گامزن نہ

ہو سکے۔ صرف ایک افسانہ "جہنم" میں وہ تہذیبی قدروں بورژوا سیاست اور فرقہ وارانہ تفریق پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ :-

ہندوستان میں لاکھوں انسان فاقوں سے مرتے ہیں۔ آپ کا (سیٹھ کا) مال روز بروز مہنگا ہوتا جاتا ہے۔ ہندوستان کا خون سستا ہے لیکن خون کی سزا ہر جگہ ایک ہے۔"

ایک مکالمہ میں اور زیادہ وضاحت سے لکھتے ہیں :-

"کیا تم نے نہیں پڑھا نہرو جی اپنی تقریر میں ان چور بازاروں کے لئے کیا کہتے ہیں ؟"

"جی ہاں میں نے پڑھا ہے لیکن اگر وہ ایمانداری اور غیر جانب داری سے کام لیں تو اس فہرست میں وہ تمام بڑے بڑے بیوپاری بھی آجاتے ہیں جن کے چندوں کے سہارے قومی انجمنیں چلتی ہیں۔"

"نصیر کے کام و دہن نے تلخی محسوس کی۔ اس نے 'ڈان' اور 'پترکا' اٹھایا ایک سیکنڈ رکا اور پھر 'جہنم' کہکر انہیں کھڑکی کے باہر ہوا کے سپرد کر دیا۔"

یہاں 'ڈان' اور 'پترکا' لیگی اور کانگریسی سیاست کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان دونوں سے بیزاری کا اظہار ان رسائل کے 'جہنم' ہونے سے ہوتا ہے۔ اسی افسانہ میں حسینی دبی زبان سے قومی انجمنوں کی باہمی چپقلش اور فرقہ وارانہ رجحان کی مذمت بھی کرتے ہیں اور ۳۶ء میں 'لیڈر' میں انہوں نے قومی سیاست پر بورژوا طبقہ کے غلبہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس افسانہ میں ان پر صاد بھی کرتے ہیں۔

اپنے واحد بھرپور سیاسی افسانہ 'پوتر سیندور' میں حسینی ایک ایسے کاشتکار کو پیش کرتے ہیں جو جاگیر دارانہ استحصال اور سامراج کے خلاف بغاوت کرکے قید و بند کی تکالیف برداشت کرتا ہے لیکن قومی حکومت کی عنایات سے فیضیاب ہو کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کی وطن پرستی اس سین سے عیاں ہے :-

"رامو نے گیلی مٹی رگڑ کر چھڑائی اس کا چورا بیوی کی مانگ میں بھر دیا (اور کہا) اے مورکھ اس سیندور سے کون پوتر سیندور ہو گا۔"

لیکن اس عہد کے سماجی مسائل سے حسینی پھر صرف نظر کر گئے۔

اب اگر ہم ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑ کر نظر ڈالیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ حسینی کا سیاسی شعور اکثر تضاد کا شکار رہا ہے۔ ان کی اصلاح پسندی گرام سدھار جذبات اور نیچر کا احساس اس عہد کی جس تحریک سے رشتہ جوڑ سکتے ہیں وہ بورژوا قوم پرست تحریک ہی ہو سکتی ہے لیکن اس تحریک کی واضح مذمت کے بعد حسینی کس نظریہ حیات سے متاثر تھے اس کا ہمیں کوئی پتہ ان کے افسانے نہیں دیتے۔ خود حسینی لکھتے ہیں :-

"میں آرٹ کو پراپاگنڈا بنانے کا قائل نہیں ... قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے شور میں انسانیت کی شیریں آواز اکثر دب جاتی ہے۔ میں اسی کے گن گانا چاہتا ہوں۔"

لیکن یہ کہہ کر حسینی ان ذمہ داریوں سے صرف نظر نہیں کر سکتے جو ایک عہد کے فنکار پر اپنے زمانہ کے مسائل کے متعلق عائد ہوتی ہیں انسانیت کی شیریں آواز اسی وقت گونج سکتی ہے جب نوع انسانی کو معاشی سکون ہو بھوک اور افلاس انسان اور حیوان کے فرق کو مٹا دیتے ہیں

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باوجود نکری تضاد کے مجرد حیثیت سے جاگیرداروں کے مظالم سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیاں اور قومی تحریک پر ان کے اثر کے متعلق حسینی صاحب ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک جس کامیابی سے لکھ چکے ہیں اس کے پیش نظر وہ اپنے فن کو صرف انسانیت کی شیریں آواز کے لئے وقف کردیں تو یہ ان کا اپنے فن پر ظلم ہو گا۔ جن عناصر کی انہوں نے ماضی میں نشاندہی کی اب ان کے برسر عمل آنے پر آج کا قاری بجا طور پر ان سے توقع کرتا ہے کہ وہ ان عناصر کو دوبارہ زیر بحث لائیں۔ ورنہ ان کا دامن مصلحت پسندی کے الزام سے آلودہ ہونے سے نہ رہے گا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مرد بزرگ جوانی کی خطاؤں کو بڑھاپے میں کس طرح بخشوا سکے گا؟

نسیم صبح گاہی

صبح نو شب فراق میں تڑپنے والوں اور رات بھر کروٹیں بدلنے والوں کیلئے بھی پیغام سکون وراحت لانے کیلئے ضرب المثل ہے تو اس دور اُردو کشی اور ہمارے شیدایان ادب کی حرماں زدگی کے عہد میں اگر عظیم آباد کے صبح نو سے اچھی امیدیں قائم کی جائیں تو اسے منصوبہ بندی تو نہ کہا جائے گا۔

سحر خیزی سے علالت نے محروم کر رکھا ہے لیکن وفا صاحب کی عنایت سے کبھی کبھی صبح نو کے جاں نواز اور فردوسی جھونکے ادھر بھی آجاتے ہیں۔ تازہ صبح نو کے اس مژدہ نے شعور ادبی کیلئے نسیم صبح گاہی کا کام کیا ہے کہ لکھنؤ کے نامور علمبردار ادب علی عباس صاحب حسینی کے ادبی کمالات اور ان کی افسانوی برتریوں کا جائزہ لینے کیلئے صبح نو کا ایک مخصوص نمبر منظر عام پر آنے والا ہے۔ اس طرح اب حضرت داغ کی طرح عظیم آباد میں ساون کا انتظار زائد نہیں کرنا پڑے گا بلکہ عنقریب ہماری کشت ادبی کے جل تھل بھر جائیں گے ؎

خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن سے ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

حسینی صاحب کی جلالت ادبی کا شاید میں پہلے پہل اس دن معترف ہوا جب ہونٹ بای پھول میں علائی خوشبو اور روح نواز شاعرانہ نوازی پیدا کرنے کی کامیاب اور بہت کامیاب کوشش فرمائی بلکہ ان کے قلم سے پھول جھڑے زبان لکھنوی بیان شائستہ طرز نگارش دلکش اور پر تاثیر۔ میں تو انکا اس وقت سے نیاز مند ہوں جب وہ ایک نامور اسکول کے صدر مدرس تھے۔ تعلیم و تدریس کے دماغ سوز اور فرصت ربا ماحول میں اتنا ستھرا اور بلند ذوق ادبی پیدا ہوجانا خدا کی دین ہے ــــــ میں نقاد تو نہیں ہوں مگر حسینی صاحب کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ناگوار ماحول میں خوشگواریاں ماتم کدوں میں تفریح سیلاب کی تباہ کاریوں میں سامان نشاط روحانی اور غسل خانۂ میت اور تابوت برداری میں دلچسپیوں کا بندوبست کرنا ان کا شاہکار ہے۔ اور اس میں تو شک نہیں کہ وہ اس وقت ملک کے ممتاز ادیبوں، نقادوں، معلم مہذب افسانہ نگاروں کی صف اول میں ہیں ــــ خدا کرے یہ مخصوص نمبر جلد بصارت نواز ہو۔ اس کیلئے میں ہمہ تن چشم انتظار ہوں ـــ

والسلام۔

فقیر شہید فرنگی محلی
فرنگی محل، لکھنؤ
۴ر نومبر ۱۹۶۴ء

کیا آپ کی بینائی کمزور ہے؟
اگر ہے!
تو ہمارے یہاں آیئے
نئے ڈیزائن کے فریم
اور عمدہ سے عمدہ شیشے کے لیے
کیا آپ کی سماعت کمزور ہے؟
تو ایک ہفتہ مفت آزمائیے
اوٹی کون ہیرنگ ایڈ
(OTICON HEARING AID.)
نیو ایرا (عینک ساز)
مقابل آنکھ ہسپتال۔ پٹنہ ۴
OPP: EYE HOSPITAL, PATNA 4.

علیم اللہ حالی

علی عبّاس حسینی اور ان کا فن

فن اور فن کار میں ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے ۔ یہ رشتہ محض یہی نہیں ہے کہ فن کار ایک فن پارہ کا خالق ہوتا ہے ، اور خالق و مخلوق میں کبھی نہ ختم ہونے والا تعلق ہوتا ہے ۔ بلکہ اس حقیقت سے ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو فن پارہ دراصل فن کار کی پوری ذات اور اس کی تمام صفات کو سامنے لا دیتا ہے ۔ ہمیں ہر فن پارے میں فن کار کا عکس دکھائی دیتا ہے ، جب کسی فن کار کی تمام تخلیقات سامنے ہوتی ہیں تو اس کی شخصیت کے تمام پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں ۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فن کار کی ذات تک پہنچنے کے لئے اس کی تمام تخلیقات کا بیک وقت سامنے ہونا ضروری ہے ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مختصر پارۂ فن میں بھی فنکار کی صورت اور اس کی شخصیت کے تمام نقوش ہویدا ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ذرہ میں آفتاب ، قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل دکھائی دیتا ہے ۔ کیا شاہنامہ سے فردوسی ، پیراڈائز لاسٹ اور پیراڈائز ریگینڈ [illegible] اور طلوع اسلام سے اقبال اور The Rape of the Lock سے پوپ کی شخصیت [illegible]

فن کار کی شخصیت اس کے فن پارہ میں عام طور پر بالکل غیر ارادی انداز میں ظاہر ہوتی ہے ، دیکھنے والے فن کار کو کبھی کردار نگاری کرتے ہوئے ، کبھی مناظر اور ماحول کی تصویریں اتارتے ہوئے اور کبھی مکالمے تراشتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں ۔ فنکار اپنے اس طرح سے ظاہر ہو جانے سے اکثر غافل رہتا ہے ۔ غالب نے اس حقیقت کو آپ بیتی بتاتے ہوئے یوں کہا کہ ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بات شعروں کے انتخاب کی ہو یا افسانہ نگاری کی یہ امر بہر حال مسلّم ہے کہ اس سے نہ صرف دل کا معاملہ کھلتا ہے بلکہ دل کے معاملے سے چہرے پر پیدا ہونے والے اثرات و تغیرات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں اور یہ اس طرح نمایاں ہوتے ہیں کہ چھپانے کی ساری کوشش ناکام ہو جاتی ہے ،

میں نے علی عباس حسینی صاحب سے ملنے کے قبل بھی ان کے کچھ افسانے پڑھے تھے اور ان کے افسانوں کے مختلف حصّوں سے ان کے بارے میں ایک تصور بھی قائم کیا تھا ، میں عام طور پر جس کی تحریر پڑھتا ہوں اس کی ذات اور شخصیت کے بارے میں خود ان تحریروں سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہوں ، یہ میری ایک عادت سی ہو گئی ہے ۔ میں کسی تحریر کو سمجھنے اور اس سے لطف لینے تک اپنے ذہن کو کبھی محدود نہیں پاتا ، اکثر میں تحریر سے اس کے لکھنے والے کا عکس تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں مثلاً برنارڈ شا ، گالسوردی ، کیٹس ، شیلی ، برٹرنڈ رسل ، عصمت چغتائی ، قرۃ العین حیدر اور شفیق فاطمہ شعریٰ وغیرہ (جنکی نگارشات

اور تحقیقات میں دل چسپی سے پڑھتا ہوں) کی شخصیت کے وہ نقوش جو مجھے ان کی تحریروں سے ملے ہیں میرے ذہن پر واضح ہیں۔ علی عباس حسینی صاحب کے افسانے، ان کی تنقیدی کتاب اور ان کے بعض تنقیدی مضامین پڑھ کر میں ان کے بارے میں بھی ایک تصوری خاکہ رکھتا تھا، ان سے ملنے کے بعد فن اور فن کار کے اس باہمی تعلق پر اور زیادہ یقین ہو گیا۔

حسینی صاحب نے افسانہ نگاری کو نہ تو خاص طور پر اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور نہ وہ اس سے کسی اصولِ حیات کی تبلیغ کرتے ہیں بنیادی طور پر وہ کسی "ازم" کا پروپیگنڈہ نہیں کرتے۔ ان کی افسانہ نگاری میں ہمیں زندگی کے اہم مسائل بھی نہیں ملتے کوئی نادر اور کمیاب تصور بھی نہیں ہے اور نہ کوئی اعلیٰ یا عمیق فکر ـــــ لیکن اس کے باوجود ان کے افسانے بیحد مقبول ہیں، اس کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ حسینی صاحب تمام زندگی میں پیش ہونے والے واقعات کو افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ اس بات کے حامی نہیں ہیں کہ آرٹ کا کمال حیرت فزائی ہے، وہ فن کو زندگی کی عام صورتِ حال کی عکاسی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اسے غیر معمولی اور محیر العقول خیالات کی پیش کش کا وسیلہ نہیں سمجھتے۔ ان کا فن چلتی پھرتی زندگی اور زندہ معاشرہ کی تصویر کشی ہے، وہ شعوری طور پر اپنے فن کے ذریعہ نہ گاندھی وادی خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں اور نہ فرائیڈ کے اصولوں کی تشریح، نہ افسانہ پڑھنے والوں کی روح اور عمل کے تصفیہ و اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے ہیں اور نہ یا نفسوں کی نفسیات کے تجزیہ کا دعویٰ کرتے ہیں، جو لوگ شعوری طور پر اپنے فن کو کسی خاص، اہم اور سنجیدہ مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دیتے ہیں وہ مقصد و مطلب کی نام نہاد اہمیت کے لئے فن کی روانی اور رنگینی کھو دیتے ہیں۔ حسینی صاحب نے اپنے آپ کو ہمیشہ اس سے محفوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں پڑھنے والوں کو زیادہ دل چسپی معلوم ہوتی ہے، ان کا فن عوامی بلکہ انسانی ہے، اس سے ان کی انسان دوستی اور اجتماعی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حسینی صاحب کی اپنی تہذیبی روایات سے دل چسپی بھی اسی اجتماعی ذہنیت کی غماز ہے۔ وہ ہندوستان کے عوام اور یہاں کی ثقافتی روایات سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں اور قدیم اقوال و قصص کو ایک عام اور سادہ ہندوستانی کی طرح بیان کرتے ہیں مثلاً قدیم ہندوستان میں بننے والی ململ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ : ـــــ

"ان کی باریکی کے بارے میں مشہور ہے کہ کوئی مغل شاہزادی اٹھارہ کپڑے پہن کر بادشاہ کو سلام کو گئی پھر بھی بادشاہ نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا کہ میرے سامنے ننگی کیوں چلی آئی، یہ ململ جس سوت سے تیار ہوتی تھی اس کا کاتنا ہر شخص کا کام نہ تھا اسے صرف نو دس برس کی کنواری اچھوتی لڑکیاں کاتتی تھیں۔ ان کے ماں باپ انہیں بڑے تڑکے بھور ہی کو جگا دیتے، وہ اٹھ کر نہاتیں، نماز پڑھتیں تب سوت تیار کرتیں۔" (مکڑی کا جال)

حسینی صاحب اپنے افسانوں میں ہندوستان کی پرانی سنی سنائی کہانیوں کے علاوہ قدیم تلمیحات و واقعات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں، وہ پرانی چیزوں کو بالکل ترک کر دینے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ قدیم عناصر کو شامل کرتے ہوئے جدید چیزوں میں تنوع پیدا کرنا چاہتے ہیں، روایات خواہ سماجی ہوں یا مذہبی حسینی صاحب ان سبھوں کی اہمیت کے محض اس لئے قائل ہیں کہ ان سے ہمارے ماحول کے بیشتر انسانوں کا ذہنی لگاؤ ہے۔ روایات سے یہ دل چسپی حسینی صاحب کے یہاں مختلف مقامات پر ظاہر ہوتی ہے، ان کے افسانہ "جل پری" کا ایک کردار اپنے بارے میں کہتا ہے : ـــــ

"میں الف لیلہ کا 'سوتا جاگتا ہارون' بن گیا۔ وہی عباسی جو رام چندر جی کی طرح رعایا کا دکھ سکھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے راتوں کو بھیس بدل کر نکلتا تھا اور جس کی راتیں ہمیشہ چھوٹی اور دن بڑے ہوتے تھے ...."

حسینی صاحب قدیم انداز رہائش کے پروردہ ہونے ہوئے بھی زندگی کے جدید تقاضوں سے واقف ہیں ، وہ جانتے ہیں کہ موجودہ دور میں ہماری معاشرت میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے مگر وہ زندگی کے کسی بھی معاملہ میں افراط و تفریط کے شکار نہیں ہیں نہ ان کے یہاں عبادت و ریاضت کی وہ شدت ہے جس سے انسان عبادت کرنے کی ایک مشین ہو کر رہ جاتا ہے ، اور اتنی آزادہ روی ہے جو جدید دور کو بدنام کرتی ہے ، ان کے افسانوں میں بھی ہمیں اعتدال اور توازن کی یہی فضا ملتی ہے ۔ ان کے افسانوں میں ایسی باتیں تو ضرور ہیں جو تقویٰ اور پرہیز گاری کی طرف لے جاتی ہیں مگر ان کے یہاں گناہ و ثواب کا تصور مذہب کے اعتقادی عناصر پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق معاشرہ میں سلامتی اور امن و مسرت قائم کرنے کی خواہش سے ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان قلم سے نکلی ہوئی تقویٰ و پرہیز گاری کی باتیں ناگوار نہیں معلوم ہوتیں بخلاف اس کے ان کے انداز تحریر کی سادگی اور لطافت سے ان میں زیادہ دلچسپی اور اثر پیدا ہو جاتا ہے ۔

حسینی صاحب اپنے افسانوں میں ایسے مواقع (Situations) لاتے ہیں جہاں نصیحت بھی پیاری لگتی ہے ۔ اس میں وہی نرمی اور وہی اعتماد ہے جو خود ان کے کردار و گفتار میں موجود ہے ۔ کسی کو جھانک کر دیکھنا بری عادت ہے ، لیکن اگر برائی سے دور رہنے کے لئے نصیحتوں کا طومار باندھا جائے تو افسانہ افسانہ نہیں رہے گا بلکہ جنت کی کنجی یا دوزخ کا کھٹکا ہو کر رہ جائے گا ۔ مگر جب ذکیہ (حسینی صاحب کا ایک آئیڈیل عورت کردار) رحمن بوا سے یہ کہتی ہے کہ :-

" بوا میری آنکھیں جو کچھ دیکھنے کے لئے بنی ہیں وہ میں سب دیکھتی ہوں ، خود بنانے والے نے حکم دیا ہے ان چیزوں کو مت دیکھو جو دوسرا چھپانا چاہتا ہے ، جھانکنے والا کبھی اچھی چیز نہیں دیکھتا نیکی ڈنکے کی چوٹ سے کی جاتی ہے ، بدی ہمیشہ اوٹ میں کی جاتی ہے ، تم جھانک کر دیکھو گی تو کبھی خوش نہ ہوگی ۔ " (نور و نار)

تو قاری کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے سامنے کوئی پند و نصیحت کی قسم کی بات آئی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود حسینی صاحب کو بھی اس کا احساس نہ رہا ہوگا کہ انہوں نے ایسے جملے لکھے ہیں جو عام طور پر نصیحت کے موقعوں پر بولے جاتے ہیں ۔ ان جملوں سے یہاں ذکیہ کا کردار زیادہ واضح اور مکمل ہو جاتا ہے اور قاری جب افسانے کے خاص کردار کو پہلو دار یا مکمل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو اسے ایک مخصوص قسم کی ذہنی انبساط ملتی ہے ۔ جیوں جیوں کردار ابھرتا جاتا ہے قاری اسے زندہ و توانا محسوس کرتا ہے اور سفید کاغذ پر سیاہ حرفوں سے ابھرنے والے زندہ و تابندہ کردار کو قاری کی تمام تر ذہنی قربتیں حاصل ہونے لگتی ہیں ۔

مزاح ' حسینی صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کا ایک ناگزیر عنصر ہے ، حسینی صاحب کے مزاج میں شرافت اور دلداری ہے ، بے رحمی اور دل آزاری نہیں ، ان کی نصیحتیں بسا اوقات اسی مزاح کی وجہ سے پسندیدہ ہو جاتی ہیں ۔ حسینی صاحب میں جو زندہ دلی اور خوش دلی ملنے والا ان سے مل کر محسوس کرتا ہے ، ٹھیک وہی چیز ہمیں ان کی تحریر سے بھی حاصل ہوتی ہے اخلاق و اصلاح کی باتیں عام طور پر وہ ایسے ہی ہلکے پُر مزاح اور پُر ظرافت اسٹائل میں کرتے ہیں ، ان کے یہاں مزاح عموماً دو طرح سے پیدا ہوتا ہے ۔ یعنی یا تو وہ اسلوب میں ادبی نکتے پیدا کر کے تحریر کو پُر مزاح بناتے ہیں یا پھر رومانی انداز بیان اختیار کرتے ہیں ، گویا ان کے یہاں نصیحت ، رومانیت اور ظرافت کا ایک حسین آمیزہ ملتا ہے ۔ ایک آدھ مثالیں دیکھئے :-

" جوانی میں ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے تہذیب نے اس کے لئے وقت مقرر کر دیا ہے ،

فطرت نے نہیں جہاں کسی نے تہذیب سے جھجکنا چھوڑا فطرت اس مشین کی طرح کام کرنے لگتی ہے، جس میں سے روک (بریک) ہٹادی جائے۔" (وفاداریاں)

(یا)

" پانچ برس کی ہوئی اور بیاہ رچا دیا گیا، بارہ تیرہ برس کی ہوئی اور گونا ہوگیا۔ میدانوں جنگلوں میں جانوروں کے اشغال دیکھے گھروں کے اندر والدین کے اعمال کا نظارہ کیا، نقل پر اُتر آئے اور نقل کو مطابق اصل کر دکھایا۔" (ھمارا گاؤں)

حسینی نے جہاں جہاں رومانی اسلوب اختیار کیا ہے وہاں بھی انہوں نے بڑا ہی شریفانہ انداز اظہار اختیار کیا ہے، اسلوب کی شرافت اور زبان کی حسینی صاحب کا اپنا حصہ ہے۔ کوئی اس میں ان کا شریک نہیں، انہوں نے مبتذل موضوعات کو بھی ایسی شرافت اور سادگی سے ادا کیا ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مثلاً جب وہ یہ بتاتے ہیں کہ چندو میاں کی شادی نے خود ان پر کچھ بھی اثر نہ ڈالا اور وہ اپنی بیوی کے لئے ہمیشہ بے ضرر بنے رہے تو دیکھئے وہ اس موضوع کو کس طرح بیان کرتے ہیں، کہتے ہیں :—

" وہ پیکے جاکر بیٹھ رہی۔ نہ چندو میاں اپنی سسرال گئے اور نہ اس نے میکا چھوڑا۔ نہ اُسے روزے نماز سے فراغت ملی اور نہ انہیں مقدمہ بازی سے۔ لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں مگر چندو میاں کے تزک میں کوئی فرق نہ آیا۔ بانڈیوں نے بھی پھندے ڈالے مگر وہ ہوشیار مچھلی کی طرح ہر جال سے پھسل کر نکل گئے۔ یہ لوگ کہتے تھے بھوک ہی نہیں چارہ کیونکر کھاتے!" (ھمارا گاؤں)

حسینی صاحب کو مرقع نگاری کی بے پناہ صلاحیت ہے، وہ الفاظ کی مدد سے ماحول، مناظر اور شخصیتوں کے ایسے زندہ و متحرک مجسمے بنا دیتے ہیں جو پڑھنے والوں کے ذہن میں طویل عرصہ کے لئے بس کر رہ جاتے ہیں، الفاظ کی اس آذری میں وہ مزاح کی ستیرنی بھی شامل کرتے ہیں، کبھی کبھی ان کی اس پیکر طرازی میں ان کے ادبی نکتے بڑا کام کر جاتے ہیں عموماً ماحول آفرینی، منظر پیشی اور کردار نگاری کے مواقع پر کوئی حسین تشبیہ، کوئی پر معنی تلمیح، کوئی استعارہ یا کوئی پُر مزاح اشارہ ان کی تصویر میں حسن اور اثر بخشتا ہے۔ اپنے افسانوں کے ایک مجموعہ "ہمارا گاؤں" کے ابتدائیہ میں حسینی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ ہندوستان کے دیہاتوں کی تصویر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ :—

" میں نے تو ایک مصور کی طرح جو کچھ دیکھا اس کی مرقع کشی کر دی، ہاں کبھی کبھی دُکھتی رگوں پر بھی انگلیاں رکھ دی ہیں۔"

میرا خیال ہے کہ حسینی صاحب نے یہاں اپنے بارے میں کچھ انکسار سے کام لیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں دیہاتی ماحول اور مناظر کی تصویر کشی ملتی ہے مگر یہ تصویریں محض اصل کی ایسی نقل نہیں ہے جسے موصوف نے جو کچھ دیکھا اس کی مرقع کشی کر دی کہہ کر بیان کیا ہے۔ بخلاف اس کے حسینی صاحب نے ان مناظر، ماحول اور شخصیتوں میں نئی آب و تاب اور نئی توانائی دی ہے۔ ان کی پیش کردہ تصویریں بسا اوقات اصل سے زیادہ زیب و زینت رکھتی ہیں۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حسینی صاحب وسیع حقیقت کو مختصر الفاظ میں سمیٹنے کا ہنر جانتے ہیں اور اس میں ان کی ادبیت بلکہ شعریت انہیں بڑی مدد پہنچاتی ہے۔ ایک نقشہ ملاحظہ کیجئے :—

"ملاحنیں اسے پکڑ کر لے آئیں ۔ بھیگے جسم پر سپید خشک ساری ، کمر سے نیچے بالوں سے پانی ٹپکتا ہوا ۔ چھوٹے نازک پاؤں گیلا نقش قدم بناتے ہوئے ۔ ان دونوں کالی ملاحنوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے مشک کے دو نافوں کے درمیان کافور کی ایک ڈلی ، جیسے دو آبنوسی مجسموں کے درمیان ایک شمع فروزاں ، جیسے بدلی سے ڈھکی کالی رات کا سینہ چیرتی ہوئی چمکتی بجلی !"

(جل پری)

حسینی صاحب کے فن میں جو سادگی ، مروت ، خلوص ، مزاح ، رومانی نکتے ، عام انسانی اور جمہوری تصور فطرت کی طرف خاص لگاؤ ، اور ادبی و لسانی خوبیاں ہیں ان سے ان کی شخصیت کے بارے میں ان سے ملے بغیر بھی بہت کچھ سوچا جا سکتا ہے اور ان کا ایک تصوری خاکہ بھی تیار کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی شخصیت ہی ان کے اس فن کی پروردگار ہے جس کی خصوصیت میں نے اوپر بیان کی ہے ۔ حسینی صاحب نے اپنے افسانہ جل پری کے ایک کردار کی زبان سے پریم چند کے فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ :-

"مجھے پریم چند کی جرأت ، غیرت ، ہمت ، شرافت ، محبت کی کہانیاں دل سے پسند تھیں ، ان سے کردار بنتے تھے ، ان سے سیرتیں درست ہوتی تھیں ، ان سے مزاجوں میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا تھا ، وہ آج کل کی کہانیوں کی طرح تحلیل نفسی کا نسخہ یا سیاسی تحریکات کا پروپیگنڈا نہ ہوتی تھیں ۔ پریم چند نے انسانیت کے غیر فانی قدروں کو کہانی کا روپ دیا تھا اور اسی لئے وہ امر تھا ۔"

ان جملوں سے جہاں ہمیں حسینی صاحب کے اندازِ فکر ، رجحانات اور ان کی شخصیت کے داخلی خصائص کا علم ہوتا ہے وہاں ان کے فن کے مطالعہ کے بعد مختصر طور پر جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بھی انہیں جملوں میں موجود ہے مستقبل کا نقاد ان سے یہ الفاظ مانگ لے گا اور انہیں کے آئینہ میں حسینی صاحب کا فن دیکھے گا ——— ••

مبارک تحریک

عزیزم دعائیں

مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ تم "علی عباس حسینی نمبر" نکال رہے ہو یقیناً ملک و قوم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ صاحبانِ کمال افراد کے کمالِ فن کا اعتراف کیا جائے اور انہیں تاریخ میں اُن کے شایان شان جگہ دی جائے ۔ مجھے حسینی صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل ہے اور دورانِ قیام لکھنؤ میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی ہے تم نے مجھے بھی حسینی صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے مجھے اور زیادہ مسرت ہوتی اگر اس سلسلہ پر کچھ لکھ سکتا ، مگر مسلسل علالت اور ضعیفی نے ایسا مجبور کر دیا ہے کہ کسی سطر پر قلم اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی ۔ خطوں کے جواب بھی دوسروں سے لکھوا کر بھیجتا ہوں تحریر میں ہاتھ کانپنے لگا ہے ۔ جو حضرات اس مبارک تحریک میں حصہ لے رہے ہیں وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں خداوند عالم ان کی توفیقات میں اضافہ کرے ۔

نجم آفندی

۲۵ نمبر ۱۹۶۲ء

دبیر پورہ ۔ حیدرآباد

(فراق گورکھپوری)

علی عباس حسینی — چند تاثرات

بات ہے اندازاً بیس برس پہلے کی۔ جب ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا جاڑوں کی صبح تھی اور میرے مکان کے صحن میں دھوپ اچھی طرح پھیل گئی تھی کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ اور میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا عالمِ تنہائی میں اپنی دو غزلوں کے چند نئے اشعار مدہوشی و محویت کے عالم میں گا رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسی وقت اور اسی عالم میں پہلا پہل جناب علی عباس حسینی نے شرفِ ملاقات بخشا۔ ان غزلوں کے دو ایک اشعار جو میں نے انہیں سنائے تھے غالباً حسب ذیل تھے

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دوسری غزل کا غالباً یہ شعر میں نے انہیں سنایا تھا

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ علی عباس حسینی صاحب نے ان اشعار کا اتنا شدید اثر لیا کہ میں خود بہت زیادہ متاثر ہوگیا۔ بعد کو یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے میری نئی شاعری کی بے حد تعریفیں بڑے بڑے حلقوں میں کیں۔ اس وقت تک میں نے ان کے افسانے پڑھے نہیں تھے۔ یوں بھی میرا مطالعہ میری پریشان خاطری کا شکار رہا ہے لیکن اس وقت کے بعد ان کی متعدد کہانیاں میرے لیے جاذبِ نظر ہوئیں۔ مجھے اس کی توفیق نہیں کہ تفصیل سے ان کی کہانیوں پر اظہارِ خیال کر دوں مگر اس معاملے میں خوش قسمت واقع ہوا ہوں کہ کسی حقیقی فنکار کے کارناموں کی اہم قدریں مجھے بادی النظر میں محسوس ہو جاتی ہیں۔ جس اردو افسانے کی صبحِ اولیں پریم چند کے کارناموں میں نظر آتی ہے اس کا جلوہ چڑھتے ہوئے دن کی صورت میں ان کے بعد کے تمام قابلِ قدر اردو افسانہ نگاروں کی تخلیقوں میں نظر آتا ہے اور ان قابلِ قدر افسانہ نگاروں میں جناب علی عباس حسینی صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی ایک کسک ابھری رہتی ہے جو ذکریات و نظریات سے ماورا ہے اور یہی خصوصیت دنیا کے سب سے بڑے افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ زندگی کو جیتے جاگتے ڈھنگ سے بغیر کسی شور و شغف کے یا بغیر کسی بلند آہنگی کے جوں کا توں پیش کر دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا لفاظی اور نظریہ فروشی آسان ہے۔ ان کے افسانے ہمیں ہندوستانی زندگی کا مرکزی احساس کراتے ہیں اور ایک خاموش لیکن ناقابلِ فراموش اثر ہمارے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ ہماری طرف سے نہیں سوچتے بلکہ وہ ہمیں مجبور کر دیتے ہیں کہ ہم اپنی طرف سے سوچیں۔ ان کے افسانوں میں ایک بھولا پن اور بے ساختہ پن ہے اور ایک ایسا احساس ہوتا ہے جیسے ہم با چشم اور تہہ دار یا تہہ در تہہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لفاظی ان کے افسانوں پر کبھی غالب نہیں آتی۔ حسنِ افسانہ اور حسنِ بیان مل کر ان کے یہاں ایک ہو جاتے ہیں۔ اب وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے کہ ادیب کسی نہ کسی مدرسۂ خیال کا نمایاں رکن ہو یا اس مدرسۂ خیال کی نمائندگی کرے۔ ہندوستانی تہذیب میں ہزاروں سال سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہم جنہیں مخصوص و محدود فلسفے کہتے رہے ہیں ان میں انسانی سماج بٹ کر نہ رہ جائے بلکہ تمام نظریوں اور فلسفوں کا سنگم بن جانا مقصدِ تہذیب کی تکمیل ہے اشتراکیت یا کمیونزم زندگی کے اہم مسائل میں ایک حد تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے بشرطیکہ اس میں لچک اور وسعت ہو۔ لیکن زندگی کے

گیتی آرا حسینی

حسینی صاحب کے افسانوں میں جذبۂ حب وطن

[ناچیز راقمہ کا یہ مضمون بہ حیثیت بیٹی کے نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک ادبی قاری کے ہے اسلیے ابا جان سے انکو حسینی صاحب کہنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ گیتی آرا]

اس موضوع پر لکھنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے کیونکہ آج کل محب وطن صرف ان لوگوں کو سمجھا جاتا ہے جو کسی پارٹی میں شامل ہوں۔ لمبی چوڑی تقریریں کریں۔ دو چار مرتبہ جیل ہو آئیں۔ کسی اسمبلی یا پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوکر وزارتوں میں حصہ بخرا لگائیں۔ یا پھر کسی حزب مخالف کے سرگرم بن کر حکومت کو برا بھلا کہیں۔ ظاہر ہے کہ حسینی صاحب اس طرح کے دیش بھگتوں میں نہیں ہیں۔ وہ تو فنکار ہیں۔ وہ فنکار جو اپنے خون جگر سے سینچے ہوئے شاہکاروں کے ذریعہ اپنا پیغام، اپنی آواز لوگوں تک پہونچاتا ہے۔ انہیں امن انسان دوستی، محبت، خلوص، ہمدردی، پیار کے نغمے سناتا ہے انہیں اونچے آدرشوں اور اعلیٰ قدروں سے آگاہ کرتا ہے۔ ان میں اپنے ملک و قوم کی محبت کو جگاتا ہے اور خدمت و سیوا کی لگن پیدا کرتا ہے۔

حسینی صاحب کو اپنے وطن سے بڑی گہری الفت ہے ان کے دل کا ہر گوشہ وطن کی محبت سے معمور ہے۔ اور یہاں کی خاک پاک کا ہر ذرہ ان کے لیے خاک شفا کا درجہ رکھتا ہے چنانچہ اپنے افسانے "پوتر سیندور" میں لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ بوڑھا رامو بیلوں کو چھوڑ کر کھیت کی مینڈ پر قدم رکھتا ہوا آیا جہاں پر رجیا کھڑی تھی۔ یک بیک ہی رامو نے ہاتھ کی گیلی مٹی رگڑ کر چھڑائی اور اسکا چورا بہو کی مانگ میں بھر دیا۔ وہ کچھ لجائی، کچھ شرمائی، کچھ جھنجھلائی۔ اس نے کہا "یہ میرے سر میں کیا پوت دیو" رامو نے ہنس کر کہا۔ ارے پگلی اس سے اچھا زیادہ پوتر اور کون سیندور ہوگا؟ یہ تو اپنے کھیت، اپنے دیش کی مٹی ہے۔ اور رجیا کے جھکے ہوئے سر کی مانگ اس طرح چمکنے لگی جیسے وہ سچ مچ افشاں اور صندل سے بھری ہو۔۔۔"

نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے انہیں پیار ہے بلکہ یہاں کی روایات، عزت اور ترقی پسندی سے بھی انہیں ایک طرح کا لگاؤ ہے۔ بقول جگر

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

جس معاشرہ میں انہوں نے آنکھ کھولی وہاں زمیندارانہ ماحول تھا مگر حسینی صاحب نے زمینداروں کے طریقے کے خلاف رعایا پر جا کے میلوں ٹھیلوں، تہواروں اور شادی و غمی کے کاموں میں شرکت کی۔

اسی لیے اسے انہوں نے سنی سنائی باتوں پر نہیں بلکہ گہرے مشاہدہ کا نتیجہ بنا کر اپنے مشہور افسانے "ہمارا گاؤں" میں صرف ایک جملے میں ہندوستانی گاؤں کی ایسی سچی تصویر کھینچ دی ہے۔

"گاؤں [illegible] ہیں [illegible] تنکے ہیں۔ گوبر اور گھی [illegible] اسکے پیچھے سے نکالو تو گائے، گوبر، گور، کوا اور گلی بچتی ہے۔"

حسینی صاحب [illegible] ان لوگوں میں ہیں جو اپنے مزاج کے علاوہ وہ کبھی قائل نہیں ہوئے۔ آزادی کے پہلے اور آزادی کے بعد جو نمایاں تغیرات واقع ہوئے ہیں ان سب کا براہ راست اثر انکے افسانوں میں ملتا ہے۔ [illegible] انہوں نے لکھا ہے:

"[illegible] اس کا [illegible] ہمارے اپنے [illegible] اپنے عہد کے
لیا [illegible] انقلاب کا [illegible] ہو رہا ہے [illegible] مسائل [illegible]
[illegible] آلام [illegible] خوشیاں و مصیبتیں [illegible]
[illegible] زندگی کی [illegible] ہے [illegible] انکا [illegible]
نمایاں طور پر دکھاتی ہیں۔"

جنگِ آزادی کے زمانے میں باوجود سرکاری ملازم ہونے کے حسینی صاحب نے اپنے افسانوں میں گاندھی جی کا پیام سنایا۔ عوام [illegible] کو [illegible] ظالم کی روداد بیان کی، اور مجاہدانِ آزادی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ [illegible] سے انتہا پیار کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے۔ انکے گلے میں ملازمت کا طوق ہونے پر بھی انہوں نے ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز کو ترجیح دی۔ اسی زمانے میں انہوں نے سانجھی اور [illegible] جیسے افسانے لکھے اور اس جرأت کو جگایا جو زمیندار [illegible] کے دل میں بھی انگریزوں کے خوف سے کبھی پڑی تھی۔

اور ۱۹۴۷ میں جب ملک تقسیم ہوا اور خون کی ہولی کھیلی گئی ایک بھائی نے دوسرے کا گلا کاٹا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آگ لگائی۔ ایک دوسرے کی بہنوں کی عصمتوں کو لوٹا۔ معصوم بچوں کو یتیم کیا، ماؤں کی گودوں کو ویران کیا۔ تو ایسے وحشتناک حالات میں بھی حسینی صاحب نے کسی خاص فرقہ کی طرفداری نہیں کی۔ کسی ایک کو قصور وار نہیں ٹھہرایا بلکہ وہ اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ کھلے بندوں صلح و آشتی، اخوت اور انسانیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد باوجود شدید اصرار اور بلاوے کے وہاں نہ گئے۔ بھائی چلا گیا۔ بہنیں وہاں جا کر بس گئیں اور دوسرے اعزہ نے بھی ہندوستان کو خیرباد کہا لیکن حسینی صاحب ایک مضبوط پیڑ کی طرح اپنے محبوب وطن میں جمے رہے۔ ان کو وہاں بڑی بڑی کرسیاں پیش کی گئیں روشن مستقبل کے وعدے سنائے گئے، معاشی ترقی کے وہ سبز باغ دکھائے گئے جن کی وجہ سے ہمارے اکثر بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے پاکستان کو جا لیا مگر حسینی صاحب کا یہی جواب تھا کہ دوسرے جگہ کی نان و مرغ سے اپنے ملک کی ایک سوکھی روٹی بھلی۔ اور اقبال کا یہ شعر گنگناتے رہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور جب ہندوستان کا کونسٹی ٹیوشن CONSTITUTION بنا اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے تو انہوں نے مقدس صحیفوں کے اسٹائل پر "ہمارا گھر" لکھا اور اسکے آخری پیراگراف میں سارے اعتراضوں کا یوں جواب دیا۔

"یہ مکان نہیں ہے، ہمارا گھر ہے اس کی چھتیں کمزور، اسکی دیواریں ٹیڑھی، اسکی برجیاں بیکار اور اسکے مینار بہت بلند نہ سہی، لیکن یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔ ہمارے خوابوں کی تعبیر ہمارے حوصلوں کا نچوڑ اور ہماری امنگوں کا عطر، اسکے گارے میں ہم نے اپنا خون ملایا ہے۔ اسکی دیواروں میں ہماری ہڈیاں پیوست ہیں۔ اور اسکی چھتوں میں ہم نے اپنی کھوپڑیاں لگائی ہیں۔ یہی امن کا گھر ہے۔ یہ اخوت کا گھر ہے۔ انسانیت کا۔ ہمارا اپنا گھر!!!

مہاتما گاندھی کو جب گوڈسے غدار نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تو حسینی صاحب ہی وہ افسانہ نگار تھے جنہوں نے اس موضوع پر ایک عظیم افسانہ "شیو کا باغ" لکھ کر گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

عام ہندوستانیوں کی خاص کر کسانوں کی غربت افلاس اور

معاشی پس ماندگی پر ان کا دل ہمیشہ کڑھتا رہا۔ اور اسی لیے پریم چند کی
طرح حسینی صاحب نے بھی دیہاتوں کی زبوں حالی، کسانوں کی
مظلومیت اور زمینداروں کی جیرہ دستیوں کا نقشہ کھینچا۔ ہندوستانی
زندگی میں طبقات کے فرق کو نمایاں کیا اور سیٹھوں اور جاگیرداروں کی
انسانیت سوز حرکتوں کے خلاف آواز بلند کی۔ اور کسانوں کے لیے
خود مختاری اور جائز حقوق کی حمایت کی۔ ان کا طویل افسانہ "ہمارا گاؤں"
اس کا شاہد ہے۔ کاش ہمارے ملک کا ہر گاؤں ویسا ہی بن جائے جیسا کہ
مصنف نے اپنے خواب میں اپنے گاؤں کو دیکھا۔

اکتوبر ۱۹۶۲ میں جب چین نے ہمارے ملک پر غاصبانہ حملہ کیا
تو اردو کے ادیبوں، شاعروں، افسانہ نویسوں اور انشاء پردازوں نے بھی
اپنی وطن پرستی کا ثبوت دیا۔ ان سب نے اپنے اپنے ڈھنگ اور اپنے
اپنے طرز میں وطن اور وطن والوں کے گن گائے اور ہندوستانیوں کے
دلوں کو حب وطن کے جذبے سے معمور کرنے میں مدد دی۔ حسینی صاحب
اس میدان میں بھی سب سے آگے رہے بلکہ انہوں نے اس خطرہ کو دو برس
پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور فوجی پروگرام میں ڈھال یا تلوار کے نام سے ہونوں کے
حملہ کی روداد سنائی تھی۔ اور بالآخر جب وہ روز بد آ ہی گیا تو حسینی صاحب نے
ایک نہیں متعدد افسانے لکھے اور قوم کے سورماؤں کو طرح طرح سے
للکارا۔ کچھ افسانوں کے نام یہ ہیں۔ ماں کی پکار۔ دکن کی پاک مٹی۔
ٹھاکر دل کی ٹھکرائیاں اور سب کو اپنی اپنی۔

یوں تو حسینی صاحب امن و آشتی کے قائل ہیں لیکن اگر دشمن
سر پر ہو تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے کے حق میں نہیں ہیں بلکہ خود دشمن پر
پہلے حملہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ڈھال یا تلوار میں لکھتے ہیں۔

"لڑائی جیتنے کا سب سے بڑا بھید یہی ہے کہ دشمن پر بڑھ کر حملہ کرو
اسے وار نہ کرنے دو۔ تلوار بنو ڈھال نہ بنو۔"

پھر دیکھیے حسینی صاحب نے ہر نوجوان کو اس کا فرض کس مزے
میں یاد دلایا ہے۔

"پتا جی نے کہا:۔ تو راج بھر کے جوان موجود ہیں۔ ایک اکیلے تم
نہ جاؤ گے تو کیا بگڑ جائے گا۔"

"بھیا بولے!:۔ اگر سب یہی سوچیں تو پھر کیا ہو۔۔۔ پتا جی
ملک کی حفاظت کرنا ہمارا دھرم ہے اور جب دھرم ہی نہ رہا تو یہ
کسر بل، یہ جوانی، یہ جیون کس کی ہے۔"

قومی یکجہتی کی ملک کو آج جس قدر ضرورت ہے اس سے
کون واقف نہیں۔ حسینی صاحب اپنے افسانہ "وطن کی پاک مٹی" میں
طارق اور پالشی کی دوستی کو یوں بیان کرتے ہیں ذرا آپ بھی
پڑھیے اور لطف زبان کے مزے لیجئے۔

"عجیب و غریب دوستی تھی ان دونوں لڑکوں میں۔۔۔ طارق
یتیم ہو کر ملا جی کی گود میں پلا۔ پالشی ماں باپ کا لاڈ اٹھا کر لاماؤں
کی آغوش میں پڑھا۔ لیکن بچپن ہی سے دونوں ساتھ کھیلے۔
بڑھے اور جوان ہوئے۔ نہ ملتوں کا بھید بھاؤ پاس پھٹکا۔
نہ مزاجوں کے فرق نے دل کے شیشوں میں کوئی خراش ڈالی۔
ایسا لگتا ہے جیسے ایک ہی شاخ پر دو پھول۔۔۔۔ اور
ایک ہی جھولے کے دو لال۔"

ایک دن جب ان دونوں کو بھی چینی دھوکے سے پکڑ
لے گئے تو ان پر وہ ظلم توڑے گئے وہ اذیتیں دی گئیں کہ ان کو
پڑھنے سے ہی دل کانپ اٹھتا ہے۔ حسینی صاحب نے چینی بربریت
اور ہندوستانی امن پسندی کا کیسے عمدہ طریقے سے تقابل کیا ہے۔

"اس نے (چینی نے) ایک ایک کرکے پالشی (جو کہ بودھ مذہب کا
پیرو تھا) کی انگلیاں اپنی ککری سے تراشنا شروع کر دیں۔
طارق بڑبڑانے لگا۔ گالیاں بکنے لگا۔ اور پھر پالشی کے لب بھی
ہلے لیکن آواز نکلی تو یہ۔۔۔۔۔ اور ساکیہ منی نے کہا: "میری آرزو
ہے کہ کوئی کسی کو دھوکا نہ دے۔ کسی کے بارے میں برے خیالات
دل میں نہ لائے۔ غصے یا نفرت سے متاثر ہو کر کسی کے لیے
برا نہ چاہے۔"

"اور طارق چیانگ۔ کی طرف غصے سے دیکھ کر چیخا۔ "سنتے ہو
تم دھوکے باز بودھ؟" اور پالشی کہتا گیا۔ ساکیہ منی کہتے ہیں
"میری آرزو ہے کہ کبھی دل میں دشمن کی پرچھائیں تک نہ ہو۔
اور آہ اور آہ!"

اور اس ذرا سنگ دل چینی کا طرز عمل بھی ملاحظہ کیجئے۔

"اور جیسے انگارے تنبیتے ہیں، [illegible] ایسی ہی [illegible] کے جوش میں، چوری ہنگامی بالشتی کرنے ہیں، [illegible] اور وہ آہ کرکے بیٹھ کے بیٹھ ساکت ہو گیا۔"

ہمارے ہندوستانیوں کے لیے یہ حد درجہ شرم کی بات ہے کہ ان نازک حالات میں، جبھی ملک پر مصیبت کے وقت بھی ٹھیکیداروں، چور بنیوں اور سرمایہ داروں کو بس اپنی اپنی تجوری بھرنے کی فکر تھی۔ رشوت و منافع خوری کا یہ بازار اس وقت بھی گرم تھا اور اب بھی ہے۔ اس وقت حسینی صاحب نے ملک و قوم کے ان دشمنوں کے خلاف، ایسا ایک طنز بھرا سکا "سرکو اپنی اپنی پڑی" لکھ لیا [illegible] کی [illegible] کا محبوب بہادری سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا اور وہ شدت غم سے یہ خبر سن کر بے ہوش ہو گئی۔ تو اسکے تینوں امیدواروں کا (جو خود بھی سیٹھوں کے بیٹے تھے) یہ دماس پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہوا اس محبوب حسن کے پاس آکر "ملا" چلو اچھا ہوا۔ یہی تو راہ کا روڑا تھا۔"

گویا اپنی جگہ سے ملا نہ تھا۔ وہ اپنے سوٹ کے تھ مل مل کر ہنستا ہوا بولا "وہ روڑا ہوگا یا کانٹا۔ اب تو راستہ صاف ہے۔ ہاں جگہ جنہیں یہ حسینی بھائی۔ ہمارا تو ہر حال فائدہ ہی فائدہ کرتے ہیں۔"

یہ ذہنیت ہے ہمارے یہاں کے لوگوں کی۔

حسینی صاحب اپنے وطن کو ایک ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں جہاں سب لوگ بھائی چارہ اور سکھ چین سے رہ سکیں۔ اسی لیے انہوں نے محنت محبت اور مل جل کر کام کرنے پر زور دیا۔ وہ تعمیری ادب کے طرفدار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ملک کی تعمیر میں عوام کے جوش و ولولہ کو ابھارنے کا کام ایک شاعر و افسانہ نویس کا پہلا فرض ہے۔ انہیں بھی اپنے ملک کو بنانے سنوارنے نکھارنے اسے ترقی و بلندی کی راہ پر لگانے میں معاون ہونا چاہیے۔

اپنے افسانہ "سالگرہ" میں انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو یہی بتلانے کی کوشش کی ہے کہ دوسروں کے دکھوں کو اپنے دکھ پر ترجیح دو۔ اور اپنے ملک و قوم کی خوشی پر اپنی خوشیوں کو نچھاور کر دو۔

یہی جذبہ ایثار تھا جس کی خاطر پیمو اپنی شادی کی سالگرہ پر نہ آیا۔ اس نے جنوبی ہند میں لوگوں کو طوفانی سیلاب سے بچانے کے لیے اپنے جان کی بازی لگا دی۔۔۔ اور اس نے اپنی محبوب بیوی کو جو اسی کی طرح لوگوں کی خدمت کرنے والی تھی لکھا تھا:

"اب ہم میں اتنی انسانیت آگئی ہے کہ ہم اپنی خوشی پر دوسروں کی خوشی کو ترجیح دیں۔ سچا عاشق وہی ہے جو ایک کی جگہ سب سے محبت کرے۔"

انکا تازہ ترین افسانہ (جو شاید اس شمارہ میں بھی آپکی نظر سے گزرے) نیا نتائج ہے۔ پنڈت نہرو کی وفات کے بعد یہ لکھا گیا۔ اور اس میں بھی ہندوستانیوں میں تعمیری و قومی بھلائی کے کام کرنے کا جذبہ ابھارا گیا ہے تاکہ ملک خوشحال ہو سکے اور پنڈت نہرو کا خواب حقیقت بن جائے۔

غرضکہ وطن کی یہ محبت حسینی صاحب کے ہر کام، ہر بات اور ہر افسانہ میں جلوہ گر ہے۔ اور وطن پرستی کی یہ روح اگر تمام ہندوستانیوں میں دوڑ جائے تو انہیں دنیا میں آگے بڑھنے اور اپنے ملک کا نام روشن کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ حسینی صاحب یہی پیغام کبھی نیکی کا، کبھی محبت کا، کبھی محنت کا، کبھی ایثار کا اور کبھی قومی یک جہتی کا اپنے افسانوں، ناولوں اور مضامین کے ذریعہ دینا چاہتے ہیں اور انہیں جیسے فنکاروں کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

ضمیر ان کا کسی اور کا غلام نہیں
کہ انکی سوچ محبت کے گیت گاتی ہے
شعور انکا زمانہ کو درس دیتا ہے
قلم سے انکے مشیت بدل سی جاتی ہے

۳ باتیں:
خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے۔
جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ بھیجیے۔
مضمون نگار حضرات مضمون صاف اور کاغذ کے ایک طرف لکھ کر بھیجیں۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل

علی عباس حسینی —— افسانوں کے پس منظر میں

علی عباس حسینی اردو افسانہ نگاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو پریم چند کے خیالات، طرزِ فکر اور سیاسی سوجھ بوجھ سے تو کم لیکن سماجی شعور سے اچھی طرح متاثر تھا۔ اس گروہ کے لکھنے والوں میں سدرشن اور اعظم کریوی خاص تھے۔ سلطان حیدر جوش سجاد حیدر یلدرم اور بعد کو مجنوں و نیاز نے تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ لکھنے کا ایک نیا ڈھنگ نکال کر اپنے کو الگ سا کر لیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو زندگی میں سیاست سے زیادہ حیرت، رومان اور نشاط کے قائل تھے اور اپنی راہیں پریم چند سے ہٹ کر متعین کرنے میں کوشاں تھے۔ چنانچہ اردو افسانہ اس وقت دو مختلف راستے اختیار کر رہا تھا۔ ملکی سیاسی سماجی اور انقلابی تحریکات کی شعوری تبلیغ کا راستہ اور ملکی وغیر ملکی اوپری طبقے کے مخصوص سماجی اور اخلاقی مسائل کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم، ذہنیت اور مذاق رکھنے والے لوگوں کے مخصوص میلانات کی پیش کش اور غیر شعوری طور پر اپنے گرد و پیش کے ہلکے غیر تلخ یا رومانی تلخی رکھنے والے تاثرات کا راستہ۔ حسینی صاحب کے افسانے انھیں دونوں راستوں کے درمیان سے ہو کر گزرتے رہے ہیں جو ان کے افسانوی مجموعوں (۱) رفیق تنہائی (۲) باسی پھول (۳) کچھ ہنسی نہیں ہے (۴) آئی۔ سی۔ ایس (۵) میلہ گھومنی اور (۶) ہمارا گاؤں میں بکھرے پڑے ہیں۔

حسینی صاحب کے ابتدائی دور میں، اردو میں افسانہ نگاری نے بہت ترقی نہیں کی تھی تکنیک کے اعتبار سے نہ اُن میں وسعت پیدا ہوئی تھی اور نہ موضوعات ایسے فراواں اور وافر۔ ایک خاص قسم کا مذاق جسے اخلاقی اصلاحی اور تاثراتی کہہ سکتے ہیں یہی اس وقت کا مطبوعہ رنگ تھا۔ افسانوں سے کسی نہ کسی طرح کا سبق تو آج بھی وابستہ ہوتا ہے لیکن اس وقت یہ سبق بہت واضح تھا۔ حالات کی گردش، واقعات کا الٹ پھیر یا کشش ایک خاص نتیجے کی طرف مڑتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی تھی بلکہ لکھنے والے کے مزاج کے بہت واضح اور جانے پہچانے موڑ افسانوں کو ایک پہلے ہی سے سمجھے بوجھے نتیجوں کی طرف موڑتے تھے۔ اس طرح افسانے، فارمولا افسانے ہوا کرتے۔ طرزِ بیان اور پیش کش میں ہی تبدیلیاں مقصود ہوتیں۔ محبت، نفرت، اخلاق سبھوں کا کوئی نہ کوئی فارمولا تھا جس کے باعث واقعات اپنے فطری راستوں سے ہٹ جاتے اور واقعاتی صلاحتیں کھو دیتے۔ خود پریم چند کے ابتدائی افسانے اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا ہیں لیکن پریم چند ہی کے ہاتھوں آگے بڑھ کر واقعات کو فطری طور پر مڑنے اور پھیلنے کا موقع ملنے لگا۔ افسانہ نگار کی بالقصد اور بہت واضح پسند کا دخل کم ہونے لگا۔ کردار اور واقعات جن حادثات، مواقع اور حالات سے دوچار ہوتے اسی کے مطابق قصے میں تبدیلی ہونے لگی ایسی صورت میں افسانہ نگار کے ذاتی تجربوں اور مشاہدات کا ضروری اور تیز ہونا یقینی سا تھا۔ ناممکن باتیں، ناقابلِ یقین صورتیں، موسمی، مقامی اور ماحولی اغلاط افسانے کی اکائی کو منتشر کر سکتے ہیں اور پڑھے لکھے ذہنوں کو آسودہ نہ کر سکیں گے۔ اس کا احساس بہت واضح طور پر اچھے افسانہ نگاروں کے سامنے آیا۔ کیونکہ انگریزی اور دوسرے ادب کے افسانوں سے پڑھا لکھا طبقہ متاثر تھا۔

اور مغربی نمونوں پر [illegible] ضروری سا ہو گیا۔ انگریزوں سے نفرت کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی خواہش
اُبھری کہ ہندوستانی ادب [illegible] ادب کے ہم دوش لائے [illegible] ادبی ترقیاں بہت پچھڑی ماندگی اور احساس کمتری کو کم کر گئی ہیں
حسینی صاحب نے بھی [illegible] وقت کے [illegible] افسانہ نگاروں کی طرح ادب کی اس آگہی کو لبیک کہا اور افسانوں کو خواب اور
غیر حقیقی مروجہ فضا سے نکال کر [illegible] حقیقت اور مشاہدوں کی دنیا میں لانے کی کوشش کی۔ افسانہ نگاروں کے دوسرے گروہ
کے تجربوں سے [illegible] اور زندگی کے مشاہدے سے کہیں کہیں تو گہرے لیکن اکثر سطحی ہو کر رہ گئے۔ کبھی انھوں نے
تفصیلات کو اس مشاہدے [illegible] ملک کی سیاسی تحریکات نے انھیں چند خاص سماجی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن رومان
جس کا چسکا [illegible] انھیں لگ چکا تھا [illegible] کا پیچھا نہ چھوڑا چنانچہ اگر ایک طرف :-

> بے وقوف [illegible] یہاں اسے پیٹ بھر روٹی کھانے اور چار آنے [illegible] ٹری پینے کو مل گئے۔
> [illegible] وہ زمیندار کے کارندے کی سنتا ہے نہ زمیندار کی۔ اس لئے کہ آریوں کی
> [illegible] اس وقت تک راجہ و دیا کا یہی تجربہ نسخہ ہے کہ تیار بھوکا ہے۔ چٹتا ہے اور
> بے کار [illegible] جاتا ہے

جیسا رنگ ہے تو دوسری طرف :-

> عجب نہیں کہ غنچوں کا یہ ڈھیر قبر میں میرے ساتھ ہو اور محشر کے دن جب یہ کلیاں پھولیں اور
> ان میں بہار کی تازگی پھر آ جائے تو میں ان کا ہار گلے میں ڈالے مستوں کی طرح جھومتا کسی کو
> تلاش کرتا پھروں۔ (باسی پھول)

یہ بھی حسینی صاحب کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی مکتب فکر سے وابستہ نہیں۔ جہاں انسان کا خون ہوتے دیکھتے ہیں وہ مظلوموں کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس ہمدردی میں کسی سیاست کو دخل نہیں ہوتا اور نہ کسی خاص طبقہ سے وہ اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہیں بلکہ ایک عام انسان کے ناتے حق کے شیدائی ہیں۔ لیکن اس پیش کش میں وہ صرف فن برائے فن کے رسیا نہیں رہتے جیسا کہ وہ خود مجھتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ حسینی صاحب کے افسانے کسی اقدام کے لئے تیار نہیں ہوتے وہ صرف انھیں راستوں کو اپنانا چاہتے ہیں جن کے تجربے ہو چکے ہیں۔ اور ایک مخصوص مکتب فکر اور مذاق کے لوگوں نے انھیں پسند بھی کیا ہے۔ اسی طرح فن کے استعمال میں بھی وہ نئے تجربوں کے زیادہ قائل نہیں جس کی وجہ سے نیا پن اور نرالی پیش کش دونوں ان کے یہاں کم رہ جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی دلچسپیاں زندگی کی صرف سیدھی سادی نقالی سے وابستہ نہیں بلکہ وہ اس میں ڈرامائیت (Dramatization) چاہتا ہے افسانے میں دلچسپی کی رنگ آمیزی جب تک نہیں کی جاتی اس میں تجسس اور دل بستگی نہیں پیدا ہوتی۔ حقیقت پر جب تک استعجاب لطف اور کسی حد تک ولولہ انگیزی ([illegible]) کی تہیں نہیں چڑھتیں، افسانوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی۔

اس لحاظ سے بی ہمسائی، راہِ عمل، عید یا شب برات، عدالت، بے وقوف، کفن، حسینی صاحب کے بڑے کامیاب، دلچسپ اور مکمل افسانے ہیں لیکن اگر اس ڈرامائیت، حقیقت، دل بستگی اور استعجاب میں توازن نہ قائم رہا تو افسانہ بلند منزلوں سے نیچے اُتر آتا ہے۔ جذب کامل، آئی۔ سی۔ ایس کی بیگم اور دودا کی طرح۔ زندگی فارمولے پر چل کر بھی اکثر ایک ہی طرح کے حالات سے دوچار نہیں ہوتی۔ اس کی گہما گہمی اور انہماک اس کی طرفگی ہی میں مضمر ہے۔

اسی طرح فن کا کتنا ہی اچھا نمونہ اور نظریہ کیوں نہ اپنایا جائے لیکن حالات کی گرمی اور چاشنی کے بغیر صرف فن کی پیمائش کام نہیں آتی۔

پو (Poe) نے اچھے افسانے کے لئے جو شرطیں رکھی تھیں ان کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی محسوس کرا دینا چاہا تھا کہ صرف اصولوں کو لے کر کوئی اچھا افسانہ نگار نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ انسان کا دماغ کوئی ایسا سانچہ نہیں جس میں اُن اصولوں کے ساتھ اگر کوئی مواد رکھ دیا گیا تو بہتر سے بہتر وہ نتیجے پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے ذہن کے کسی کونے میں اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اگر فن کار نے ہوشیاری، فن کی اہمیت اور سوزِ تخلیق سے کام نہ لیا تو وہ اچھا افسانہ ہرگز پیش نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اصولِ افسانہ نگاری کی تقریباً تمام راہوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی بہت سارے افسانہ نگار آج موپساں، کپلنگ، چیخوف اور خود پو (Poe) کا جواب نہیں پیش کر سکے۔

اردو کے بہت سے افسانہ نگار جو اچھے افسانہ نگار ہو سکتے تھے۔ چلتے چلتے راستہ بھٹک گئے اور یکسانیت کا شکار ہو گئے۔ حسینی صاحب کے لئے بالکل سے تو یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن بڑی حد تک وہ بھی اس لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کی گوناگونی، بوقلمونی اور طرفگی کی کمی کا اکثر احساس ہوتا ہے اور نئے نئے تجربوں سے ڈرنے کا بھی۔ ان کی شہری زندگی کے نمونے اب قدیم ہو چکے ہیں اور جدید کی طرف ان کی توجہ نہیں رہی۔ وہ کرشن چندر، بیدی اور عصمت کی طرح زندگی کی تہوں میں اتر کر ان کی جلوہ نمائی نہیں کرتے۔ ان کے تجربات بھی اس سلسلے میں محدود معلوم ہوتے ہیں۔

حسینی صاحب کے افسانوں کا مرکز عام طور پر دیہات ہے۔ گاؤں کے مناظر، اس کی سادگی، حسن اور زندگی اس کا کھردرا پن، زمینداروں کی زبردستیاں، کسانوں کی جہالت یہی سب باتیں ان کے افسانوں میں عام ہیں۔ وہ گاؤں کی گلیوں، وہاں کی چھوٹی چھوٹی سیاست، سماجی اتار چڑھاؤ سب سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ طبقاتی جنگ کینہ پرور کی کون کون سی شکلیں اختیار کرتی ہے یہ ہمارا گاؤں کے شیوخ اور گاؤں کی لاج کے کرداروں میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں لیکن حسینی صاحب گاؤں میں بھی ایک خاص طبقے ہی کی صحیح ترجمانی کر پاتے ہیں اور یہ طبقہ زمیندار طبقہ ہے۔ پریم چند کی طرح کسان کی اندرونی زندگی کی کش مکش، اس کے احساسات اور تفکرات کا کما حقہ بیان ان کے یہاں نہیں ملتا۔ ان کے افسانوں میں چمار ٹولی، اور اہیر ٹولی کا بہت ذکر ملتا ہے لیکن ان کی زندگی کا بالکل ظاہری رخ وہ پیش کرتے ہیں۔ شاید زمیندار انھیں جس طرح دیکھتے، سمجھتے اور برتتے تھے حسینی صاحب کے چمار میدانِ عمل کے چمار نہیں ہیں اور نہ ان کے دیہات کے کسان "گئودان" کے ہوری، ہیرا اور گوبر بن پاتے ہیں۔ وہ صرف آسودہ طبقے اور زمیندار کے لئے تفریح یا باربرداری کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جس سے ان کی زندگی کی مکمل تصویر نہیں ابھر پاتی۔ حسینی صاحب کا پیش کیا ہوا گاؤں ایک زمیندار کی نظر سے دیکھا اور پرکھا ہوا گاؤں ہے۔ جس میں لطف ہے، تازگی ہے۔ لیکن جس کے افراد میں سنوارنے یا سنورنے کی جہد اور گرمی کا پتہ نہیں چلتا۔ سرگرمیاں بنیادی مسائل نہیں بن پاتیں اور جو کچھ مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں نہ وسعت ہے اور نہ پھیلاؤ ایک اتفاقیہ (Casual) اور لمحاتی مسئلہ بن کر ساری باتیں ادھر ادھر منتشر ہو جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کے پیش کئے ہوئے دیہات میں ۱۹۳۰ء سے لے کر آج تک کی تبدیل ہوتی ہوئی زندگی کا کوئی واضح عکس نہیں ملتا۔ ان کے وہ افسانے جو ۴۹ء، ۵۵-۵۴-۶۵ء اور بعد کے افسانے ہیں ان میں بھی ۳۰ء سے پہلے کا ہی گاؤں آباد نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد نئی تحریکات، زمینداری کے خاتمہ پر زمینداروں کی حالت، منصوبہ بندی کے بعد دیہی معیشت کی ترقیاں یا خرابیاں ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ گویا جب سے انھوں نے دیہات چھوڑا ہوگا تب سے ابھی تک اس میں وہی رومانی فضا کروٹیں لے رہی ہے

افسانہ نویس کو اس بات سے اچھی طرح باخبر ہونا چاہیئے کہ ایک عام انسان چند مخصوص حالات میں کس طرح عمل پیرا (Re-act) ہو سکتا ہے۔ اس کے تاثرات اور طرزِ عمل میں کون سی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں یا ہوں گی۔ گویا کہ افسانہ نگار کو

س طرح حقیقت نگار بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بہت سارے لوگ حقیقت نگاری کو اس منزل میں نہیں لے جانا چاہتے، ہاں اصل اور نقل میں فرق نہ معلوم ہو کیونکہ حقیقت کی تصویر بہر حال نقل ہی ہے بالکل اصل نہیں ہو سکتی۔

سامرسٹ ماہم نے سنہری تجسس کے سلسلے میں لکھتے ہوئے ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ مصور میتسے (Matisse) نے عورت کی ایک بے ڈھب تصویر بنالی۔ ایک خاتون نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا کہ "مگر عورت ایسی تو نہیں ہوتی"۔ مصور نے جواب دیا کہ "یہ عورت نہیں ہے خاتون! یہ تو صرف ایک تصویر ہے۔"

لیکن اس سے حقیقت کا بنیادی مقصد فوت نہیں ہوتا۔ واقعات کی کڑیاں محض قیاس پر ہی جوڑی جا سکتی ہیں اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ پیشکش انسانی سماج کو متاثر نہیں کر سکتی اور محض افسانہ رہے گی۔ 'افسانہ' غیر حقیقی معنوں میں۔ اس لئے حقیقت کا کسی نہ کسی شکل میں موجود ہونا یقینی ہوتا ہے۔ خاتون کے استعجاب کے مطابق عورت ویسی نہ سہی لیکن عورت کے ہونے کا تصور، ڈھانچہ، حسن کا ادراک کوئی چیز اصل مقصد کی طرف متوجہ کرنے والی تو ضرور ہی ہونی چاہئے۔

دیہات میں منصوبہ بندی، چکبندی، امداد باہمی کی اسکیمیں اور اس کے متعدد اثرات، خوبیاں اور خرابیاں، کسان کی آزادی، پنچایت راج کی خدمت گردیں یہی تمام باتیں آج کے گاؤں اور دیہات کی تصویر پیش کر سکتی ہیں اور ایک حقیقت میں مصور ان کا تماشا پیش کئے بغیر ان کی جھلکیاں نہیں دکھا سکتا۔ پھر یہ تمام باتیں آج کے افسانوں کے لئے بڑا موضوع ہیں۔ اگر کوئی فن کار ان تمام چیزوں کو اپنے خیالات، محسوسات اور رنگ روپ میں حل کرلے تو پریم چند کی دنیا ایک نئے عنوان سے کروٹ لے کر سامنے آ سکتی ہے۔

حسینی صاحب کے افسانوں کی دوسری چیز جو ہمیں اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کرتی ہے وہ ان کی سادگی ہے۔ ان کے کرداروں میں نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ ایسی نفسیاتی الجھنیں جو کسی مریضانہ ذہنیت کا پتہ دیتی ہوں، نہ ان کے بیانات الجھے ہوتے ہیں اور نہ ان کے کردار [illegible]۔ واقعات اور پلاٹ بہت سیدھے سادے ہیں جو روزانہ کی آسانی سے سمجھ میں آنے والی زندگی سے حاصل کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات نئی نسل جو کسی حد تک دھماکوں اور بے انتہا پیچیدگیوں کی دلدادہ ہے۔ اسے حسینی صاحب کے افسانوں میں وہ لذت نہیں ملتی۔ حسینی صاحب افسانوں میں پیچیدگی صرف اسی حد تک پیدا کر سکتے ہیں کہ ان میں تجسس کی کارفرمائی باقی رہے اور تجسس حیرت انگیز ناممکنات کی سرحدوں میں نہ داخل ہو جائے۔ "عدالت" کے ڈپٹی شوکت حسین کا بیٹا جو بدلیا کے بطن سے ہے وہ بھی چور ہے، اور جو بیگم کے بطن سے ہے اسے بدلیا کی تربیت نے چور بنادیا، جسے ڈپٹی صاحب نے خود نادانستہ طور پر گرفتار کیا۔ یا پھر "کئے کا بھوگ" کے کنور صاحب جو ایک عیاش مزاج راجہ تھے۔ ایک دن ایسی حسینہ سے لطفِ صحبت اٹھاتے ہیں جو انھیں کی لڑکی تھی، ایک طوائف کے بطن سے۔ اور جب یہ راز لڑکی کے بازو پر کھدے ہوئے نام سے آشکارا ہوتا ہے تو کنور صاحب کے ہوش جاتے رہتے ہیں اور لڑکی فرطِ غضب میں کنور صاحب کے پستول ہی سے ان کا اور اپنا خاتمہ کر دیتی ہے۔ یہ تمام باتیں اس معاشرے میں ممکن ہیں اور اس کے بیان میں کوئی گھناؤنا پن (Morbidity) بھی نہیں پیدا ہوتا۔

حسینی صاحب کے افسانے مریضانہ ذہنیت نہیں رکھتے۔ ان کے عشق کی داستانیں ہمیشہ کھلی فضا میں سانس لیتی ہیں۔ یوں بھی ان کے افسانے پریم چند کی طرح رُندھے اور گھٹے ہوئے ماحول کو پسند نہیں کرتے۔ انھیں صاف میدان رُندھے ہوئے گھروں اور گلیوں سے زیادہ پسند ہیں۔ کھیت، گاؤں کی لاج، بیلوں کی جوڑی، سوتیلے، ملاپ، نئی ہمسائی، آم کا پھل، شکار یا شکاری جیسے افسانے اس کا ثبوت ہیں۔ ان کے افسانوں کی دنیا بہت وسیع نہیں۔ دیہات اور گھریلو زندگی کے سیدھے سادے تجربے ہیں —

انھیں کے گرد ان کے افسانے گھومتے ہیں۔ لیکن زندگی بڑی وسیع ہے اور اس کی مصوری کے امکانات اس سے زیادہ ہیں اور زمانہ برق رفتار۔ نتیجہ یہ ہے کہ حسینی صاحب اس میدان میں پیچھے چھوٹتے جاتے ہیں۔ ان کے اور پریم چند کے دیہات میں بھی بھونچال سا آ گیا ہے۔ نئی زندگی نے وہاں بھی "پروائی" "کھرا" اور رہٹ کو توڑ کر "ہینڈ پمپ" "ٹیوب ول" اور مشینی رہٹ فٹ کر دیا ہے اور زندگی کی رفتار ہزار گنی بڑھ گئی ہے۔ برق اور بھاپ کی طاقتوں نے کھیتوں اور کھلیانوں میں نور بکھیرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اب دیہات کی صبح گندا سے کی آواز سے آزاد ہے۔ ماگھ اور پوس کی راتوں میں "اُدکھ پیرنے" کا رومان ختم ہوتا جاتا ہے۔ سماج اور اصلاحی پنچایت نے سیاسی پنچایت کا چولا بدل لیا ہے اور کسان میں ایک نئی روح بیدار ہو رہی ہے۔ لاٹھی کی چوٹیں سہنے والا "ہم" پرانی کہانی بن چکا ہے۔ اب جھگڑے لٹھیتوں سے نہیں دیسی بنائے ہوئے پستولوں سے طے ہوتے ہیں۔ ہم پرانی اور نئی دونوں زندگیوں کے جاننے والے اس نئی تبدیلی کو ہلاکت بتائیں یا پرانی قدروں کے مٹنے کا ماتم کریں لیکن ان تبدیلیوں اور حقیقتوں کا دباؤ روز بروز بڑھتا ہی جائے گا۔ کیونکہ نئے ہندوستان کی یہی نئی زندگی ہے جو عالمی زندگی کے ہم قدم بننے میں کوشاں ہے۔ حسینی صاحب اور ان تمام لوگوں کو جو دیہات کی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، دیہات کی ان نئی کہانیوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

ان صنعتی سماجی تبدیلیوں کی طرف بھی اور ان کی سنطاہر کی طرف بھی جو ان صنعتی برقی تجربات سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ ان میں پروپگنڈے کی ضرورت نہیں (کیونکہ حسینی صاحب اور ان کے بہت سے ہم خیال ادب میں پروپگنڈے کے قائل نہیں) زندگی کی عکاسی کی ضرورت ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار چیخوف بھی افسانوں کو سیاست اور پروپگنڈے سے بچائے رکھنا چاہتا تھا لیکن زندگی کی عکاسی کا قائل تھا۔ وہ ادب کو کسی نظام کا مبلغ نہیں بنانا چاہتا تھا مگر جیسی بھی (اچھی بری) زندگی اپنے گرد و پیش دیکھتا اسے بغیر تغیر اور تبدل کے پیش کرتا تھا اور یہ کام اس نے پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس سے کس طرح کا اثر لیتے ہیں۔ کیونکہ مصنف یا فن کار کو اپنے گرد و پیش سے آنکھیں نہیں چرانا چاہئے۔ اور مصنف کے تاثرات کا اظہار ہی اس کا نظریہ حیات بنتا ہے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ کوئی اس سے متفق ہے یا نہیں۔

افسانے میں جذباتیت اور دردمندی کی بڑی اہمیت ہے۔ بہت سارے لوگوں پر ایک خاص قسم کا افسانہ پڑھنے کے بعد رقت طاری ہو جاتی ہے۔ کچھ افسانے چند لوگوں یا ایک خاص طبقے کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور انسانی اخوت کے رشتے سے ہم ان تصویروں سے بے انتہا متاثر ہوتے ہیں۔ اب یہ کون بتائے کہ مصنف نے بالقصد متاثر کرنے کے لئے یہ تصویریں بنائی تھیں یا اتفاقیہ طور پر واقعات اس طرح گندھتے چلے گئے کہ اس میں تاثر اور ترحم کا جذبہ جاگتا گیا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ دنیا کے بہت سے افسانے ایسے ضرور ہیں جنھیں انسان کبھی نہیں بھولتا۔ ایسے افسانے ذہن کے افق پر منڈلایا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے افسانوں کی تخلیق میں نہ خالص فن کا ہاتھ ہے اور نہ صرف ایک خاص قصہ یا پلاٹ کا، بلکہ دونوں کے میل سے ایسا اثر پیدا ہوتا ہے۔

حسینی صاحب کے افسانوں میں یہ دردمندی (Pathos) بہت نمایاں ہے۔ ان کے یہاں ایسے افسانے بھی ہیں جو ذہن پر چھا جانے کے خواص رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر "نئی ہمسائی" "بیوقوف" "کفن" اور "طمانچہ"۔ لیکن حسینی صاحب مغموم کے اسیر نہیں بنتے اور نہ حزن و ملال ان کے کرداروں کی تقدیر ہے۔ انھوں نے کہیں شخصی ہمدردی سے طبقاتی ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کہیں حالات کو چھوڑ کر اپنے جذبات اور احساسات کو کرداروں پر طاری کر دیا ہے جس سے ہم ہمدردی کا احساس مصنف سے ہم خیال ہو کر بہت ابھرتا ہے تاہم سینہ زنی اور قنوطیت کی حد تک ان کے یہ افسانے نہیں پہنچے اور نہ ایک ہی لکیر پیٹتے رہنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ افسانوں کی فضا مایوس کن نہیں ہوتی بلکہ کسی حد تک امید افزا ہوتی ہے۔

"ٹھکرا دنے سے ترقی کر جا بیٹا۔ اب انکار کرنے کا سمے نہیں۔ کاغذ لے لو۔ قدیر میاں سے مل جاؤ......
نیا کرنے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ لیا پھر جھک کر میر صاحب کی ماں کے پاؤں کی خاک سر سے لگالی۔" (سیلاب)

"یہاں نہ کوئی بچہ ہوتا ہے نہ مرد۔ نہ دوشیزگی ہوتی ہے نہ جوانی! اس ملک میں صرف ہڈی کے ڈھانچے
ہوتے ہیں اور بھنڈار تن، پیٹ سے ... کپڑے کہیں سڑتی ہوئی لاشیں ہوتی ہیں۔ ہاتھ کٹے ہوئے، آنکھوں سے
دیکھتا ہوا ... ہڈیوں سے نکلتا ہوا ایک چوہا۔ موٹا، چکنا اور چربی سے ڈھکا ہوا۔
ہندوستان کا ... یہی ... ہر جگہ ایک ہی ہے۔" (جہنم)

"جب خان صاحب کو جب معلوم ہوا کہ رائے صاحب نے گاؤں کی لاج رکھ لی مگر پھاٹک سے لوٹ گئے،
تو وہ قاضی صاحب کو روک کر بولے۔ ٹھہر جائیے! نکاح ابھی نہیں ہوگا...... دالان میں پہنچ کر خاں صاحب نے
رائے صاحب کی طرف ایک ملتجیانہ نگاہ سے دیکھا۔ رائے صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا، قاضی صاحب نکاح
پڑھئے اور دونوں کے گالوں پر موتی ڈھلک آئے۔" (گاؤں کی لاج)

حسینی صاحب کا طرز تحریر شاعرانہ بہت ہے جو اکثر نثر کی سنجیدگی کو قائم نہیں رکھ پاتا۔ کبھی کبھی کرداروں کے حرکات وسکنات کو غیر فطری بنا دیتا ہے۔ ان کے محاورں، ترکیبوں اور جملوں کی ساخت پر لکھنؤ کی پرچھائیاں ہیں لیکن عبارت میں بار بار اشعار پیش کرنا لفظوں کی کرخت آہنگ، افسانے کی زبان کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ اور مکالمے کا بیساختہ پن مجروح ہو جاتا ہے۔ ایسے ایسے ادق الفاظ بعض اوقات استعمال ہوتے ہیں جن کا روزانہ کی گفتگو میں آنا کیا اکثر علمی وادبی زبان میں بھی جن کے لئے لغت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں اس دور کا خیال کرنا پڑتا ہے جہاں سرشار اور طلسم ہوشربا کا سکہ رواں تھا۔ نذیر احمد کی عبارتیں ممدوح سمجھی جاتیں اور آسان وسلیس عبارت کو معیار سے گرا ہوا تصور کیا جاتا۔

حسینی صاحب کی یہی دقت ہے۔ ان کی ذہنی تربیت اسی قسم کے دور میں ہوئی ہوگی۔ چنانچہ وہ اسی وجہ سے بعض اوقات اپنی روایتوں اور مزاج کی تنظیم سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح افسانوں میں بہت سی حیرت انگیز باتیں بھی ملتی ہیں۔ کالج کا طالب علم "باسی پھول" میں علم النفس کی کتاب پھینک کر تاریخ روم اٹھاتا ہے۔ محض انطونی اور قلوپطرہ کی محبت کا فلسفہ سمجھنے کے لئے۔ پھر "پیراڈائز لاسٹ" پڑھتا ہے۔ انسانی کمزوریوں کی ذمہ داریوں کو تلاش کرنے کے لئے پھر تخلیق آدم اور مشرقیوں کے فلسفے پر غور کرتا ہے جو مضحک ہی نہیں بلکہ ناممکن باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں کردار سے زیادہ مصنف اپنی علمی استعداد کا مظاہرہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

"کمرے میں واپسی پر میں بہت دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا کہ قدرت نے ایک صورت میں جو مجموعہ ہے
تھوڑے سے بالوں، کچھ ہڈیوں، کچھ گوشت اور چند عدد ناخن کا اور جو مشرقی فلسفیوں کے مطابق مٹی،
پانی، ہوا اور آگ سے بنائی گئی ہے اس بلا کی دلآویزی کیونکر ودیعت کر دی ہے۔ نہ تو دائرے
درست ہیں نہ سطح برابر ہے نہ خطوط متوازی ہیں نہ مستقیم اور پھر اتنی دلفریبی! جتنا ہی میں انسانی اعضاء
ان کی ساخت، ان کی اقلیدسی شکلوں پر غور کرتا رہا۔ اتنی ہی میری حیرت بڑھتی جاتی۔"

یہ تقریر یا غور وفکر ایک عاشق کی نہیں بلکہ کسی جوگی، صوفی اور ریاضی داں کی ہو سکتی ہے جو انسان کی دلآویزی کو خطوط مستقیم اور منحنی سے ناپتا ہے۔ عشق کا انتہاب معمولی عقلی دلائل اور ممکنات جب برداشت نہیں کر سکتا تو اس حد تک سوچنے کا بار کیونکر اٹھا سکتا ہے۔ پھر ایک لڑکا جس نے ابھی زندگی کی سنجیدگیوں میں قدم بھی نہیں رکھا صرف کالج کا ناپختہ طالب علم ہے۔

اسی طرح بنگالی عورت کملا ایسی فصیح و بلیغ شاعرانہ زبان میں باتیں کرتی ہے کہ شاید لکھنؤ کی بیگمات بھی دنگ رہ جائیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے (پریم چند کے سوزِ وطن میں بھی یہی رنگ ملتا ہے) عبارت کیا ہے جیسے کسی داستان کا کوئی ٹکڑا ہو۔ یہ انداز "ہمارا گاؤں" کے افسانوں میں بھی تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے گرد و پیش یہ رنگ بہت مقبول تھا۔ مجنوں کے سمن پوش اور خواب و خیال کے افسانے، نیاز کے جمالستان اور نگارستان کے قصے اور ٹیگور کی رومان پرور کہانیاں، ایک خاص طریقے پر لوگوں کو متوجہ کرتی تھیں۔ عبارت میں خوابناکی اور ڈرامائیت سے قصے کو ابھارا جاتا تھا۔ حسینی صاحب نے بھی اس مقبول رنگ کو اپنے افسانوں میں بکھیرنے کی کہیں کہیں کوشش کی ہے۔

"وہ اسی الجھن میں پھنسی ہوئی تڑپ تڑپ کر کروٹیں لے رہی تھی کہ پپیہے کو بھی چھیڑ سوجھی اور اس نے پی کہاں! پی کہاں! کہہ کر اپنے پیارے کو پکارا۔" (جھولا)

"لہلہاتے کھیتوں، جھومتے درختوں، چھلکتے تالابوں اور بہتے ہوئے نالوں میں کیا نہیں۔ جوانی کی امنگیں بھی ہیں، معشوق کی مست خرامی بھی، سدھ بھرے کانٹے بھی ہیں اور عاشق کا ہر وقت رِسنے والا دل ناسور بھی۔ ہاں صرف دیکھنے کو نظر چاہیے۔" (بہو کی ہنسی)

"شہزادی کی نظر میں غرور تھا۔ فخر تھا، تبختر تھا۔ وہ سب کچھ تھا جو اپنے بہترین شاہکار کو دکھاتے وقت ایک کامل صناع کی نظر میں ہوتا ہے۔ آنکھیں کہتی تھیں، دیکھی تم نے میری تخلیق؟ ...... یہ تو بہاروں کا نچوڑ ہے۔ کھلی ہوا، آزاد فضا، شبنم و یاسمن، گلاب و سنبل، لالہ و بنفشہ کی آمیزش و خمیر سے بنا ہے۔" (جل پری)

یہ رنگینی، یہ شعریت اور کیف آگینی، نیاز کے افسانوں، ایک رقاصہ، عورت، کیوپڈ اور سائکی۔ اور مجنوں کے "تم میرے ہو" بیگانہ اور شکست بے صدا میں قدم قدم پر دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم علی عباس حسینی نے اپنا ایک الگ راستہ بنا لیا ہے۔ ان کی دردمندی کو نہ ہارڈی کی حزنیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ اُن کی وطنیت کو کپلنگ کی شہنشاہیت سے بلکہ حسینی صاحب کی مجموعی تصویروں کو حقیقت کے پس منظر میں ابھار کر کہیں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندوستان میں پریم چند کے گرد و پیش دیکھنا چاہیے جہاں اظہاریت ہے، ہم آہنگی ہے، سادگی ہے اور جہاں کہیں کہیں نفسیات کی آڑی ترچھی لکیریں سی اُبھر آتی ہیں۔

"سیلاب کی راتیں" اور "ایک غسل خانہ میں" پہلی بار مصنف کی نظرثانی کے بعد یکجا پڑھنے کے لئے

ماہنامہ کتاب کا **علی عباس حسینی نمبر** ملاحظہ فرمائیے

متعدد تصاویر سے مزین ۱۳۶ صفحات کے اس نمبر کی قیمت صرف سوا روپیہ ہے۔ ۶ روپیہ زر سالانہ بھیج کر یہ نمبر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے

صرف حسینی نمبر حاصل کرنے کے لئے سوا روپے کے ٹکٹ بھیجئے۔

مینیجر ماہنامہ کتاب — چوک — لکھنؤ۔۳

ہندوستان کا
بہترین
تمباکو خوردنی
خریدنے سے پہلے
مال اور لیبل کے اصلی ہونے کا اطمینان کرلینا ضروری ہے
فقیر محمد اینڈ سنس
پوسٹ بکس نمبر
184.
فون نمبر
25438
دریائی ٹولہ لکھنؤ

مظہر امام

"باسی پھول" ـــــــ قدیم و جدید کا سنگم

علی عباس حسینی کے جس افسانے کو میں نے اس گفتگو کے لیے منتخب کیا ہے وہ نہ تو انکا پہلا افسانہ ہے اور نہ آخری۔ نہ بہترین نہ بدترین۔ لیکن انکے افسانوں میں نہ صرف سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ شاید یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ باسی پھول[1] علی عباس حسینی کی شہرت کا نقطۂ آغاز ہے۔

حسینی اردو کے سینیر (SENIOR) افسانہ نگار ہیں۔ اگر انگریزی لفظ ناگوار گذرے تو "سینیر" کی جگہ "بزرگ" کہہ لیجئے اور اگر شعری تنقیدی اصطلاح سے رغبت ہو تو "کہنہ مشق" کی ترکیب سے شوق فرمائیے۔ اپنی اور اپنی افسانہ نگاری کی عمر کے لحاظ سے وہ اپنے ہم عصروں میں نیاز فتحپوری، ل احمد اکبرآبادی، اور مجنوں گورکھپوری کے علاوہ غالباً سب سے بزرگ ہیں۔ اور کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے اردو افسانے کی تاریخ میں انکا مقام محفوظ ہی نہیں بلکہ ممتاز بھی ہے۔

باسی پھول غالباً پہلی بار مئی ۱۹۳۶ء کے عالمگیر لاہور میں جو اپنے وقت کے بلند پایہ رسائل میں تھا اشاعت پذیر ہوا تھا ۱۹۳۶ء اردو افسانے کی تاریخ میں کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا سالانہ جلسہ ہوا۔ جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اسی وقت سے اردو میں حقیقت نگاری کی باقاعدہ تحریک شروع ہوئی جس سے آج کے تقریباً سب ہی قابل ذکر افسانہ نگار متاثر ہوئے ہیں۔ اسی سال پریم چند کی وفات ہوئی۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کی باقاعدہ افسانہ نگاری کی ابتدا بھی اسی سال سے ہوئی ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل میں اردو افسانہ نگاری میں چند نئے نام ابھرے۔ پروفیسر عابد علی۔ پروفیسر محمد مجیب۔ فیاض محمود۔ اختر حسین رائے پوری۔ احمد علی۔ رشید جہاں وغیرہ علی عباس حسینی نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز ان سب سے پہلے ہی کر دیا تھا لیکن انکا کوئی ایسا افسانہ سامنے نہیں آیا تھا جو ناقدین یا قارئین کے پردۂ ذہن پر ان کا نام مرتسم کر دیتا۔ مجھے صحیح علم نہیں کہ انکا پہلا مجموعہ "آئی سی ایس اور دیگر افسانے" کب منظر عام پر آیا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس مجموعے کو کوئی خاص پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اور نہ اس مجموعے کی بنا پر علی عباس حسینی کو اس وقت کے نمایاں افسانہ نگاروں میں کوئی مقام نصیب ہو سکا۔ ہر چند کہ اس مجموعے سے ہی "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" دکھائی دینے لگے تھے۔

باسی پھول کی اشاعت کے وقت تک عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی کے بھی افسانے منظر عام پر نہیں آئے تھے اور سعادت حسن منٹو اس وقت تک طبع آزاد افسانہ لکھنے کی بجائے روسی اور فرانسیسی افسانوں کے تراجم پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔

---

[1] "باسی پھول" حسینی کے افسانوی مجموعے کا بھی نام ہے لیکن یہاں گفتگو صرف ایک افسانے کی ہو رہی ہے (مظہر امام)

عورت ہو تو غنیمت شاید تذکرہ بھی کردوں کہ عالمگیر کے جس شمارے میں باسی پھول شائع ہوا ہے اسی میں منٹو کا ترجمہ کردہ چیخوف کا ایک افسانہ بھی شائع ہوا ہے۔

علی عباس حسینی نے جس زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی ان دنوں افسانوی ادب پر یلدرم، سجاد حیدر یلدرم سدرشن۔ سلطان حیدر جوش۔ نیاز فتحپوری۔ ل احمد اکبر آبادی مجنوں گورکھپوری اور اعظم کریوی چھائے ہوئے تھے۔ افسانوی ہیئت کی ان قد آور شخصیتوں کے سامنے نئے فن کا چراغ جلانا کسی کے لیے آسان نہ تھا لیکن حسینی نے نہ صرف اپنے فن کا چراغ جلایا بلکہ اسکی لو کو بھی اتنا تیز کیا کہ انہیں جلائی ہوئی شمعوں کے آگے بہتوں کے چراغ ماند پڑ گئے۔

حسینی کے ابتدائی افسانوں کا محور عورت ہے۔ عورت کا حسن و شباب، اسکی عشوہ کاریاں اور عشق و رومان سے پیدا ہونے والی رنگا رنگ کیفیات حسینی کے ابتدائی افسانوں میں بار بار جلوہ دکھاتی ہیں۔ شاید یہ اردو افسانے کے اسی رومانی دور کا اثر ہے جس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم۔ نیاز اور ل احمد کے جادو نگار قلم کر رہے تھے لیکن زندگی کی تلخ حقیقتیں حسن و رومان کے آئینہ خانوں میں بھی در آتی ہیں۔ رومانی دور کا بھی کوئی افسانہ نگار زندگی کے حقائق سے کسی نہ کسی موقع پر نظر ملائے بغیر نہ رہ سکا۔ حسینی کو جو ماحول ملا اس میں شعر و رومان سے زیادہ معاشرے کے نئے تقاضوں سے آگہی کا احساس ملتا ہے۔ لیکن رومانیت حسینی پر اس قدر غالب ہے کہ وہ معاشرے اور سماج کی برائیوں پر قلم اٹھاتے وقت بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ مرد اور عورت کی محبت ہر زمانے کا محبوب موضوع رہا ہے۔ لیکن رومانی دور کے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ جذبہ اتنا حاوی نظر آتا ہے کہ زندگی کی دیگر سچائیاں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔۔ چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔ رومانی دور کے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں علی عباس حسینی کا امتیازی وصف عشق و محبت کے باب میں انکا حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انکے دور اول کے افسانوں میں حقیقت بہت جھجکی لجائی سمٹی سمٹائی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی دلہن کی طرح سامنے آتی ہے جسکا چہرہ گھونگھٹ میں مستور ہے۔ حسینی کے اس دور کے افسانوں میں زندگی کے مختلف مظاہر پر عورت کی شخصیت کی گرفت مضبوط ہے خواہ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کی باہمی آویزش کو اپنے افسانے کا موضوع بنائیں یا مسلم معاشرے میں بیوہ کی شادی کے مسئلے کو۔ یا امیر طبقے کی عیش کوشیوں اور عشرت پسندیوں کو یا نیکی اور بدی کی طاقتوں کے تصادم کو۔ حسینی کا رومانی تصور ہر جگہ اپنا رنگ دکھاتا ہے اور اسی لیے انکے اسلوب اور طرز فکر دونوں میں جذبات کے شعلے دہکتے رہتے ہیں۔

باسی پھول میں بھی اسی جذباتیت کی فراوانی ہے جو حسینی کے دور اول کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ کہانی پلاٹ اور کردار نگاری دونوں اعتبار سے کسی خاص توجہ کا مطالبہ نہیں کرتی۔ بادی النظر میں اسے ہم ایک سادہ سی رومانی کہانی کہہ سکتے ہیں جس میں کوئی پیچ و خم کوئی تہہ داری نہیں ایک سیدھی سادی سی کہانی ہے۔ دو دل ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں۔ حالات انہیں الگ کر دیتے ہیں۔ ایک حادثہ انکے دل کی دھڑکنوں کو ایک دوسرے سے دوبارہ ہم آہنگ کر دینے کا موجب بن جاتا ہے پلاٹ میں کوئی ندرت نہیں۔ کلائمکس بھی ایسا نہیں جو چونکائے یا کہانی کو کسی غیر متوقع انجام تک لے جائے۔ اس کہانی کو جو صفت اس وقت کی عام کہانیوں سے بلند کرتی ہے یا جس نے اسے مقبول بنایا ہے وہ واقعہ نگاری کا حسن اور اسلوب کی جذباتی شدت ہے۔

باسی پھول کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔

صابرہ (ہیروئن) کی شادی کو سات سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ رشید (ہیرو) وکالت کے پیشے میں اپنی محبت کی پرانی یادوں کو دفن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن غیر کی ہو جانے کے باوجود صابرہ کے

دل میں رشید کی محبت چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ اور وہ ہر سال اپنی شادی کی سالگرہ پر رشید کو مرجھائی ہوئی ایک کلی پرنسے میں بیپیٹ کر بھیج دیتی ہے اس سات سال کے آخری دو برسوں میں پرزوں کے بجائے خطوط آتے ہیں اور پیرٹن ہیر یسے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ بھی متاہلانہ زندگی اختیار کرلے۔ صابرہ متاطلگی کے فرائض انجام دینے پر آمادگی ظاہر کرتی ہے۔ دل اور دماغ کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے بعد وہ ہیرٹن کی خواہش کے آگے سپر ڈال دیتا ہے۔ صابرہ اسکے لیے اپنے سسرالی رشتے کی ایک لڑکی منتخب کرلیتی ہے۔ اور شادی کے انتظامات ہونے لگتے ہیں۔ اچانک صابرہ کا شوہر ایک حادثے کا شکار ہوکر مرجاتا ہے۔ رشید کی شادی ملتوی ہوجاتی ہے اور اب اپنے ایک دوست کے احساس دلانے پر اپنے دل میں نئی امیدوں کو جگہ دیتا ہے۔ صابرہ کے بچے کو اپنے مرحوم باپ کی جائداد کا وارث بنانے کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرنی پڑتی ہے۔ رشید بڑی محنت اور لگن سے مقدمے کو کامیابی کی منزل تک پہونچاتا ہے۔ اور کوئی فیس نہیں لیتا۔ ایک روز ٹیلیفون پر دوران گفتگو میں وہ صابرہ کا ہاتھ طلب کرتا ہے۔ صابرہ یہ عذر پیش کرتی ہے کہ اسکی جوانی اور دلکشی کا خاتمہ ہوچکا۔ اور اب اس میں کوئی وجہ کشش نہیں رہی۔ رشید اس عذر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کوئی اور صورت نہ دیکھ کر وہ صابرہ کی بھیجی ہوئی ہر سال کی پژمردہ کلیاں اسے واپس کردیتا ہے اور گذارش کرتا ہے کہ اگر صابرہ اس سے شادی کرنے کو تیار ہو تو چوبیس گھنٹوں کے اندر تازہ پھول بھیجکر اپنی رضامندی کا ثبوت دے ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجائے گا۔ صابرہ اس درخواست کو قبول کرلیتی ہے دونوں رشتۂ مناکحت میں منسلک ہوجاتے ہیں اور خوش وخرم زندگی گذارتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے پلاٹ میں کوئی ندرت نہیں۔ اس میں محبت کی وہی ازلی تثلیث ہے جو ہماری فلموں میں آئے دن دکھائی دیتی ہے۔ آج کے معیاروں کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بہت کمتر درجے کی کہانی معلوم ہوگی۔ لیکن اب سے کم وبیش تیس سال پہلے کی ایک تخلیق کی بابت موجودہ تنقیدی شعور کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنا درست نہ ہوگا۔ باسی پھول دراصل ایک مقصدی اصلاحی افسانہ ہے۔ اسکا موضوع ہے۔ بیوہ کی شادی۔ ہندوستان میں بیواؤں کی شادی کو آج بھی بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا۔ گو ہمارے معاشرے نے بہت سے قدیم رسم ورواج اور توہمات سے نجات حاصل کرلی ہے۔ جس زمانے میں باسی پھول لکھا گیا اس نوع کی شادیاں ناممکن نہیں تو محال ضرور تھیں۔ خود بیوہ بھی اپنے دل کو سمجھا لیتی تھی کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ اسکی باقیماندہ زندگی یاس و محرومی اور اضطراب و تنہائی میں گذرے اور اس سے انحراف کرنا گویا دین وایمان سے انحراف کرنا ہے۔ جب رشید فون پر صابرہ سے شادی کی درخواست کرتا ہے تو وہ کہتی ہے:

"اسکے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ دین وایمان سب بھول کر جہنم، جنت سب سے انکار کرکے کفر بکنے لگیں۔"

افسانہ نگار رشید کو مصلح کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اسکی زبان سے یہ جملے کہلواتا ہے۔

"کیا خدا نے بیوہ سے عقد کا حکم نہیں دیا ہے۔ کیا رسول اللہ ص نے خود اس پر عمل کرکے نہیں دکھا دیا ہے۔ لیکن آپ نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ سوا ہندوستان کے کسی ملک میں اسے نہ معیوب سمجھتے ہیں نہ خلاف عقل وشرع۔"

باسی پھول میں ہم اسی زبان اور اسلوب کی جلوہ گری دیکھتے ہیں جو اردو میں ابوالکلام آزاد سے نیاز فتحپوری کے یہاں اور انکے اثر سے دوسرے لکھنے والوں کے یہاں آیا۔ مثال کے طور پر زیر بحث افسانے کے پہلے پیراگراف سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"میں ہرگز ہرگز دعویٰ نہیں کرسکتا کہ صابرہ کی یاد مجھے ستاتی تھی اسلئے کہ امتداد زمانہ نے دل کو اس تکلیف سے اس قدر مانوس بنا دیا تھا کہ اب الم کی جگہ لذت محسوس ہوتی تھی۔ سن کے بڑھنے کی وجہ سے اعصابی ہیجان مفقود اور جذبات کا وفور معدوم ہوگیا تھا۔ گویا چشمۂ محبت میں برساتی جزر ومد کی جگہ اب موسم گرما کی سبک ونرم روانی تھی۔ ہیجان وہوسناکی کے خس وخاشاک تہہ نشین ہوچکے تھے اور طغیان وطوفان کی جگہ

صفات قسمت اور شعاری وفادار ہے ہیں۔ اگر دل میں درد تھا تو
بالکل ویسا ہی جیسا کہ محنت کش طبقے کے ہونے میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اور
جب یہ وجہ ختم کے دینے میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

اردو افسانے کا ابتدائی دور افسانہ نگاری سے زیادہ انشاپردازی
کا دور تھا۔ پریم چند اور ان کے ہمعصر ... سدرشن اور اعظم کریوی کے علاوہ
اس دور کا کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں ملتا جس نے زبان کی سادگی
کو افسانے کی روح کا ایک جز لازم قرار دیا ہو۔ اس وقت کے
تقریباً تمام افسانہ نگار خواہ وہ رومانیت کے علمبردار اور حقیقت
نگاری کے علمبردار ہی کیوں نہ ہوں اردو کی اسلوب نگارش سے دامن
نہیں بچا سکے ہیں۔ حتیٰ کہ انگارے کے افسانوں میں بھی جو مواد اور
ہیئت ہی نہیں زبان کے اعتبار سے بھی اردو افسانہ میں ایک نئے
انقلاب کے مظہر ہیں، اس دور کی انشاپردازی کی جھلک مل جاتی ہے۔
یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کرشن چندر کو جس صنف نے غیر معمولی
مقبولیت بخشی ہے وہ انکی انشاپردازی کا حسن ہی ہے۔

علی عباس حسینی کے بعد کے افسانوں میں زبان زیادہ صاف
اور سلیس ہو گئی ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اب انکی زبان جدید اسلوب کی
زبان ہے۔ سادہ، لیکن دلنشین اور شگفتہ۔ حسینی کو قدیم سے جدید کی
طرف آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ حقیقت نگاری سے قریب آنے کی
شعوری کوشش انکے افسانے "باسی پھول" میں بہت نمایاں ہے
اور اس کوشش میں انہوں نے کہیں کہیں فنی بے ساختگی کو بھی
مجروح کیا ہے۔ باسی پھول سے تقریباً نو سال بعد لکھے ہوئے انکے
ایک افسانے "خالی گود" (ادب لطیف جولائی ۱۹۴۵ء) کی ابتدا
یوں ہوتی ہے:۔

"سیٹھ جی موٹے بھی تھے، چھوٹے بھی تھے، کھوٹے بھی تھے۔
صورت شکل ماشاءاللہ، فطرت مزاج سبحان اللہ! چندیا پر بال گنے
بال۔ آنکھیں چھوٹی اور دھنسی ہوئی۔ ناک پر ملیں چلا ہوا۔ ٹھوڑی اور
جبڑا خاص طور سے نمایاں۔ گردن گداز اور موٹی۔ ہاتھ موٹے بھدے
بڑی سی توند ایسی کہ بار بار دھوتی سنبھالنا پڑے ...."

"باسی پھول" کے مکالمے کا انداز یہ ہے:۔

"کیا میری اور تمہاری محبت بھی بوالہوسی اور حیوانیت پر
مبنی ہے کہ ہمارے عقد میں بھی جسمانی حیثیات و کیفیات کا
لحاظ رکھا جائے۔ طاہرہ بیگم! یہ جسم کی نہیں، روح کی پیاس ہے۔
وہ پیاس ہے کہ اسے سوائے تمہارے سارے عالم کے دریاؤں کا پانی
یہاں تک کہ کوثر و تسنیم کا آب شیریں بھی نہیں بجھا سکتا۔"

اور "خالی گود" کے مکالمے کی نوعیت یہ ہے:۔

"بھوکا ننگا کون ہے۔ بچا۔ پھر ... جو کسی کے
پاس لیٹی۔ جیسی نکلے جیسی بڑھیاں ہم بیچتے ہیں۔ جرا سیلی ہو گئی ہے
پیر یہ سال سال اکولی اور کاہے کو لگائے گا۔ تین برس ہوئے۔
لکھنو سے ساڑھے چار آنے گج کپڑا منگوا دیا تھا۔ پھر گیارہ سے کا استر
دے پوری آدھ پاؤ رنگی دلوا دی تھی۔ اب بھی ایسی گرم ہے کہ
دس دس بارہ بارہ روپئے کا سویٹر اس کے سامنے مات ہے۔"

طرز گفتگو اور زبان کا یہ فرق ایک پڑھے لکھے مسلم گھرانے
اور ایک ان پڑھ ہندو گھرانے کا ہی نہیں ہے۔ اس سے صرف
یہی پتہ نہیں چلتا کہ حسینی دونوں طرح کی زبان پیش کرنے پر
قدرت رکھتے ہیں بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب اپنے
مکالموں میں کتابی زبان کی بہ نسبت عام بول چال کی زبان کو زیادہ
اہمیت دینے لگے ہیں۔

"باسی پھول" کا مطالعہ کرتے وقت کچھ اور باتیں بھی
ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ اس افسانے کے شائع ہونے سے پہلے
انگارے کی اشاعت ہو چکی تھی اور اس نے ادبی دنیا میں ایک
تہلکہ ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ انگارے کی کہانیوں میں معاشرے
اخلاق، سماج اور مذہب پر جس انداز میں تنقید کی گئی اس نے
مروجہ اقدار کی بنیادیں ہلا دیں اور نتیجے کے طور پر یہ مجموعہ حکومت کی
جانب سے ضبط کر لیا گیا۔ پریم چند کا "کفن"[1] بھی باسی پھول سے

[1] حسینی نے بھی کفن کے عنوان سے ایک بہت اچھا افسانہ لکھا ہے جو
پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۴۵ء کے ادب لطیف میں طبع ہوا تھا۔ (مظہر امام)

پہلے شایع ہو چکا تھا۔ اگر کبھی ایک ایسے افسانہ کا انتخاب کرنا ہو جس نے اردو افسانے کو انقلابی حقیقت نگاری سے روشناس کرایا تو بلاشبہ کفن ہی کا نام آئے گا۔ اس انقلابی حقیقت نگاری کی گونج اس دور کے بعض افسانوں میں سنائی دیتی ہے۔ مثلاً احمد علی اور رشید جہاں کی کہانیوں میں۔ حیات اللہ انصاری کا مشہور افسانہ "انوکھی مصیبت" ۱۹۳۶ء ہی میں جولائی کے جامعہ میں شایع ہوا۔ باسی پھول میں اس انقلابی حقیقت نگاری سے متاثر ہونے کا کوئی اشارہ نہیں۔ تاہم چند کہ بعض نقادوں نے علی عباس حسینی کو پریم چند کے نقش قدم پر چلنے والوں میں اولیت کا درجہ عطا کیا ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ انھیں رومانی افسانہ نگاروں سے کوئی گہری مناسبت اور موانست ہے۔ انکے ابتدائی افسانوں اور خاص طور پر باسی پھول کو پڑھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ رومان اور حقیقت کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ باسی پھول عام عشقیہ افسانوں سے مختلف اور حقیقت نگاری سے قریب ہے۔ گو اس پر اصلاحی پہلو غالب ہے۔ اس افسانے کا ہیرو رشید عشق میں ناکامی کے بعد مجنوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر جنگلوں کی راہ نہیں لیتا بلکہ اپنے پیشے وکالت میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگتا ہے تاکہ وہ اپنے دل کے زخموں کو مندمل ہونے کا موقع دے شاید وہ اپنی محبوبہ کو یکسر فراموش کر دینے میں بھی کامیاب ہو جاتا اگر ہر سال اسے محبوبہ کی طرف سے مرجھائی کلی کا تحفہ نہ ملتا اور اگر وہ رشید سے شادی کر لینے کے لیے اصرار اور اسکے لیے دلہن تلاش کرنے کی پیشکش نہ کرتی۔

رشید افلاطونی محبت کا بھی قائل نہیں معلوم ہوتا ہر چند اسکی محبت شرافت اور تہذیب کی حدود سے کبھی متجاوز نہیں کرتی اپنی محبوبہ سے چھوٹنے کے بعد رشید دوسری لڑکی سے شادی کر لینے کے لیے بے چین نہ سہی لیکن اس سے منکر بھی نہیں ہے وہ محض جذبات کی رو میں نہیں بہتا بلکہ عقل و شعور سے بھی کام لیتا ہے۔ "مرد ایسا مرد جسکے قوائے عقلی و ذہنی درست ہوں، جسکی تندرستی ٹھیک ہو اور جس کو کوئی جسمانی بیماری نہ ہو تاہل کی زندگی کے لیے فطرتاً مجبور ہے۔ یہی فطرت میری عقل کے ساتھ تھی۔ دل کہتا صابرہ کی سی شریف، غیور، باحیا خاتون کی یاد مجھ میں اب تک بسی رہی ہے اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس گھر میں کسی دوسرے کو جگہ نہیں مل سکتی۔ جسم کہتا میں ایک خیال، ایک تصویر لیے اپنے کو کب تک مارتا رہوں پھر یہ امر تو عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی"

یہی وہ فن کارانہ رویہ (APPROACH) ہے جو علی عباس حسینی کو دوسرے نوجوان افسانہ نگاروں سے ممیز اور متمیز کرتا ہے اور انھیں حقیقت نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ حسینی نے رشید کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہر چند کہ اسکے ایثار اور شرافت نفس کی جھلکیاں کئی جگہ ملتی ہیں۔ یہ اوصاف اس تہذیب و تربیت کا عطیہ ہیں جو اسے ورثے میں ملی ہیں۔ اسی لیے اس کی خود غرضی اور نفسانیت بھی بہت مہذب اور مودب ہو کر سامنے آتی ہے یہ اوصاف الوہی نہیں انسانی ہیں۔ اس لیے رشید کوئی عجوبہ مافوق الفطرت کردار نہیں معلوم ہوتا وہ ہماری اور آپ کی دنیا کا ایک فرد ہے جو محبت کرتا ہے، محبت میں ناکامی سے بھی دوچار ہوتا ہے لیکن وہ اپنے پیشے کی طرف سے غفلت نہیں برتتا۔ اپنی سماجی ذمہ داریوں سے بھی نہیں جی چراتا۔ صابرہ کے شوہر کی قبل از وقت موت پر یہ سوچکر غمزدہ بھی ہوتا ہے کہ اسکی محبوبہ اب بے یار و مددگار اور بیکس و تنہا بیوگی کی زندگی گذارنے کے لیے مجبور ہوگی اور پھر یہ خیال کرکے کہ اب اسے اپنی محبوبہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں اپنے دل میں نئی امیدوں اور مسرتوں کو جگہ دیتا ہے۔ بے غرضی اور خود غرضی کی اس کشمکش کا اظہار دلپذیر نفسیاتی پیرائے میں ہوا ہے۔

علی عباس حسینی کا نام عموماً پریم چند کی روایت کو آگے

نادم سیتاپوری

حسینی بحیثیت نقاد

حسینی صاحب کو جس نے بھی محض پڑھا ہے وہ یقیناً نہیں وہ افسانوی ادب کے اس عظیم تخلیق کار کی گونا گوں صلاحیتوں کو مشکل ہی سے سمجھ سکیں گے اور سمجھ بھی لیں گے تو ان کے تصورات پھر بھی ان کہانیوں کے ارد گرد گھومتے رہیں گے جن کا لکھنے والا ان افسانوی کرداروں سے ہٹ کے رہنے والا ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جہاں نہ رومانس کی رنگینیاں ہیں اور نہ ان گھناؤنے سماج کی سڑاند ... جیسے ایک گہرے احساس کے ساتھ ان افسانوں میں سمو دیا گیا ہے۔

جنہوں نے حسینی صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ عظیم فنکار جس کی سیدھی سادی زندگی کے پیچھے نہ کوئی پارٹی ہے نہ مسن تراحامی بگو ہم۔ کا پس منظر اگر تیرہ نصف صدی سے ایک انجان مسافر کی طرح ایک ایسی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے جس کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس کی دور رس نگاہیں اگرچہ آج اور کل کے افسانوی ادب سے بے خبر نہیں رہیں اور نہ اس کے ذہن و شعور نے بدلتے ہوئے سماج سے بے اعتنائی برتی پھر بھی اس کے محسوسات اور مشاہدات نے اپنے لیے جو بنیادی راہیں متعین کر لی تھیں ان پر وہ مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ یہی ان کے فن کی وہ پختگی ہے جسے بادِ مخالف کے مسموم جھونکے آج تک کوئی نقصان نہیں پہونچا سکے۔

حسینی صاحب کا کردار ان کے افسانوی کرداروں سے کوئی مماثلت و مشابہت نہیں رکھتا لیکن ان کی شخصیت کو ان کے فن سے علیحدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ ان کی رنج و مرنجاں صورت کے پیچھے مسکراتی ہوئی سلگتی ہوئی نوجوانیوں کے روشن نقوش بھی ہیں اور ان کی سنجیدہ نگاہوں میں تاثرات کا عمیق سمندر بھی ... مطالعہ بھی....

حسن نے ان میں ایک متوازن "حسنِ تنقید" پیدا کر دیا ہے جو محض افسانوی ادب تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخی اور ادبی اتار چڑھاؤ، شعری مد و جزر اور علمی و فنی رموز کی پاسداری اور پرستش حسینی صاحب کا انداز احساس نئے تجربات سے خالی نہیں ہے۔

جنہوں نے حسینی صاحب کی پہلی تنقیدی تخلیق "ناول کی تاریخ و تنقید" (مطبوعہ ناظرین بک ڈپو لکھنؤ جولائی ۱۹۴۷) کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کی ناقدانہ عظمت سے بے خبر نہیں ہیں لیکن ان کا جدید تنقیدی کارنامہ ان کی مرحلۂ ادراک کی وہ منزل ہے جہاں پہونچنے کے لیے ایسے ہی گہرے تنقیدی مطالعے کی ضرورت تھی جس کی تکمیل کے لیے حسینی صاحب جیسے مقبول افسانہ نگار نے نہ جانے کہاں سے وقت نکال لیا۔

فل اسکیپ کے پانچ سو تیس صفحات پر مشتمل ان کی جدید تنقیدی کاوش "ہماری اردو شاعری" (اعتراضات و معروضات) کا اصل مسودہ دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ حسینی صاحب کا شعری مطالعہ بھی اتنا ہی وسیع ہے جتنا افسانوی! انہوں نے اپنی اس غیر مطبوعہ تصنیف میں اردو شعر و ادب کی تنقید کے ان تمام روشن و تاریک پہلوؤں کو اپنے سامنے رکھ کر متوازن لب و لہجے میں اس کا تجزیہ کیا ہے۔ اور اگر ان کے نکالے ہوئے نتائج سے

حیثیت بھی نہیں دی جاسکتی۔

(۱۴) آفسر کے خیالات سطحی اور معمولی ہیں۔

(۱۵) اختر کا تخیل بھی عمیق و بلند پرواز نہیں۔ جذبات سطحی اور نوخیز ہیں۔ ان میں گہرائی و جوش کا وجود نہیں۔ خیالات جذبات سے زیادہ سطحی ہیں۔

(۱۶) جوش میں باریکی۔ تنوع اور عمق موجود نہیں۔

(۱۷) مجاز کا ادراک معمولی اور سطحی ہے خیالات عامیانہ جذبات معمولی۔

(۱۸) وقار کو شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں۔

(۱۹) جاں نثار اختر، علی سردار جعفری کے ہاں انتہا پسندی کا عام خواب ہے۔ انفرادیت کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔

(۲۰) مخدوم محی الدین حقیقت طرازی سے واقف نہیں۔

(۲۱) ڈاکٹر محمد دین تاثیر صرف قافیہ پیمائی کرتے ہیں۔

(۲۲) رباض خیرآبادی کے خیالات و جذبات میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں۔

(۲۳) جلیل کے خیالات نہایت عامیانہ اور اصلیت سے مبرا۔

(۲۴) نوح ناروی کی شاعری پر تعجب ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں تہذیب و تعلیم یافتہ طبقے میں اسے شاعری سمجھا جاتا ہے۔

(۲۵) احسن مارہروی کے کلام میں تاثیر کا کہیں نام نہیں اصلیت معدوم۔

(۲۶) حسرت موہانی کی شاعری کا اہم ترین نقص یہ ہے کہ وہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے میر مومن کی فضا میں سانس لے سکتی ہے۔

(۲۷) فانی بدایونی کے دل میں نہیں سینے میں ایک درد ہے اس مستقل درد کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن غالب کی ریس کرتے ہیں حالانکہ غالب کی دنیا وسیع، فانی کی دنیا تنگ ہے۔ فانی کا دماغ یا تخیل غالب کی گرد کو نہیں پاسکتا۔

(۲۸) اصغر گونڈوی کے اشعار میں گہری شرار جو زندگی کی دلیل ہے مفقود ہے اور تاثیر کا پتہ نہیں۔

(۲۹) جگر مرادآبادی صاحب طرز نہیں۔ ان کے ہاں کوئی جدت یا انوکھا پن نہیں۔ فرسودہ خیالات کا قدیم طرز بیان۔ انکی شاعری کی دنیائے تغزل میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔

(۳۰) تلوک چند محروم۔ انکی غزلیں ایک شاعرانہ مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

(۳۱) احسان دانش غزلیں کہہ کر اردو غزل پر ظلم کرتے ہیں انکے اشعار پڑھ کر دل گھبرانے لگتا ہے۔

(۳۲) علی اختر اختر۔ انکا تخیل شتر بے مہار کی طرح جس طرف جی چاہتا ہے چل پڑتا ہے۔ انکے خیالات بھی خام ہیں۔ انکا دماغ عالی و محیط نہیں۔ خیالات میں جدت ہے نہ گہرائی نہیں۔

(۳۳) سرور صدیقی۔ علی اختر اختر کی طرح کچھ غور و فکر سے کام لیتے ہیں لیکن اس غور و فکر کا نتیجہ اہم و با اثر نہیں ہوتا۔

(۳۴) آنند نرائن ملا مضامین اور مضامین کی ترجمانی میں ابتذال اور رندی سے پرہیز ہے لیکن جدت اور باریکی کا نام و نشان بھی نہیں۔

(۳۵) کیفی کے اشعار دل شاہجہانپوری اور ناطق گلاؤٹھوی کے اشعار سے زیادہ مختلف نہیں۔ اور ان میں بے رنگی اور نثریت بھی ہے۔

(۳۶) امید امیٹھوی شعر گوئی سے کوئی فطری لگاؤ نہیں۔

(۳۷) امرناتھ ساحر کلام کا کوئی خاص رنگ نہیں خیالات و تصورات میں ناہمواری ہے۔

(۳۸) عبدالباری آسی الدنی۔ شاعر نہیں شعر گو ہیں۔

(۳۹) دل شاہجہانپوری۔ انکے اشعار میں جذبات کی فراوانی نہیں ہے۔ آورد صاف نمایاں ہے۔

(۴۰) ناطق گلاؤٹھوی۔ انکی حیثیت استاد فن کی ہے شاعر کی نہیں۔

(۴۱) تاجور نجیب آبادی۔ اور وحشت کلکتوی انکی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز نہیں۔

(۴۲) یگانہ چنگیزی وہ تاثیر نہیں جو دل کی گریبان گیر ہوجائے وہ لہجہ نہیں جو ابدیت کی نشانی ہے۔

ماضی رزمگاہ میں تبدیل ہو گئی ہے اور "بانگ دلسوز" کے وہ
فلک شگاف نعرے لگ رہے ہیں کہ کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی۔
کوئی کہتا ہے اس پوری عمارت کو ڈھا دو۔ کوئی کہتا ہے اس
دفتر بے معنی کو جلا دو۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کا ارشاد ہے
"اردو کے تذکرے ردی کا ڈھیر ہیں اور اردو شاعری میں صرف
چند دھجیاں ہیں... اور پرزے ہیں اور بس!"

"... بحوالہ (کلیم الدین احمد نے) "اردو شاعری پر
ایک نظر" اور "عملی تنقید" اپنی دو کتابوں میں اردو کے
تقریباً پچاس ممتاز ترین شعرا کا جائزہ لے ڈالا ہے۔ ان کے
نزدیک شاعری صرف مغرب کی زبانوں میں ہوتی ہے اردو میں تو
محض ہذیان سرائی آتی ہے۔ یہاں کے غیر مہذب نیم وحشی
شعرا کو غزل جیسی مبتذل چیز پسند ہے اسکی پیرہ سنائی کو
تہذیب و ثقافت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔"

یہ آخری سطور میرے اسی قیاس کی عکاسی میں جس کا ذکر
کیا جا چکا ہے۔ تنقید و اصلاح کے پردے میں اردو شاعری کے خلاف
جس بھیانک انداز میں محاذ قائم کیا گیا ہے وہ ایسی بات نہیں تھی کہ
اسے سطحی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا۔ غزل جو اردو شاعری کی سب سے زیادہ
مقبول صنف ہے اپنی تمام خامیوں کے باوجود ہمارا ایسا شعری سرمایہ
ہے جسے شکسپیئر، ملٹن اور بائرن کے افکار شعری کو سامنے رکھ کر
بہرحال "غرق مے ناب اولیٰ" نہیں کیا جا سکتا اور نہ میر، سودا
غالب، انیس اور دبیر کا فن ایسی بے جان چیز ہے جس کے افکار و
تذکار جلا کر خاکستر بنا دیئے جائیں۔ حسینی صاحب نے "ہماری اردو
شاعری" میں اسی اہم مسئلہ کا تنقیدی جائزہ لے کر یہ ثابت کرنے کی
کوشش کی ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے غیر متوازن ناقدین نے اس
سلسلے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ تنقید سے زیادہ تنقیصی نقطہ نظر پر
مشتمل ہے۔ ان نقادوں نے ایک لمحے کے لئے نہ تو مشرق کے مزاج
کو سمجھنے کی کوشش کی نہ یہاں کی علمی و ادبی روایات کو اپنے سامنے
رکھا۔ انہوں نے پل بھر یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں گوارہ فرمائی کہ
اردو شاعری کا ماضی روایتی و لسانی حیثیت سے [illegible]

وابستہ نہیں ہے۔

حسینی صاحب نے ان تمام معترضین کے جوابات دلائل کے
ساتھ دیئے ہیں۔ اور مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی مختلف اصناف
سخن میں ارتقائی صلاحیتوں کا فقدان ہے اور نہ بحالت موجودہ یہ
اصناف سخن اتنی نامکمل ناقص اور غیر معتبر ہیں کہ انہیں دوسرے
ممالک کے ادبی پرچم کے آگے سرنگوں کر دیا جائے۔

ان محدود صفحات میں اتنی گنجائش تو ہے نہیں کہ حسینی صاحب کا
طرز تنقید نگاری کا مکمل جائزہ لیا جا سکے یا انکی جدید تصنیف
"ہماری اردو شاعری" کی تفصیلات پیش کی جا سکیں۔ صرف "غزل" کے
تاریخی اور ذاتی تجزیہ پر حسینی صاحب کے "[illegible]"
کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا مطالعہ
کتنا عمیق اور گہرا ہے۔ اور اردو غزل پر اعتراض کرنے والے اگر
ٹھنڈے دل سے اس پس منظر پر نگاہ رکھیں تو شاید انہیں اردو کی
اس منفرد صنف سخن میں برائیوں کے علاوہ کچھ اچھائیاں بھی نظر آئینگی۔

اردو غزل کا تجزیہ فرماتے ہوئے حسینی صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"اب اگر آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائینگے تو یہ محسوس کرینگے کہ
ان اعتراضات کی بنیاد ہی غلط ہے... یہ امر مسلم ہے کہ زبان و
کلام پہلے جاری ہو جاتے ہیں پھر ان کے لیے قواعد بنتے ہیں....
ایرانیوں نے عربی قصیدے کی تشبیب کو الگ کر کے اس میں
ایک مطلع اور مقطع کا اضافہ کر دیا۔ اور اس کا نام غزل رکھا۔
چونکہ قصیدوں کی تشبیب میں کسی مسلسل مضمون کو ربط دیکر
بیان کرنا ضروری نہ تھا بلکہ وہ ہم وزن و ہم قافیہ ہونے کے علاوہ
کوئی خاص ربط آپس میں نہ رکھتے تھے بلکہ اپنے اپنے طور پر
شعر مفرد کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے غزل میں بھی یہی
بات پیدا ہو گئی۔

یوں غزل کی تعریف یہ ہوئی کہ غزل وہ صنف شاعری ہے جس میں
ایک ہی بحر میں محض قافیے یا قافیے اور ردیف کی پابندی کے
ساتھ اشعار کہے جاتے ہیں اور جس کی ابتدا میں ایک ایک سے
زائد مطلع ہوتے ہیں اور آخر میں شاعر کے تخلص کے ساتھ ایک مقطع

غزل کے اشعار کے لیے آپس میں ربط و تسلسل ضروری نہیں یہ
یہ صنف شاعری فارسی کی ایجاد ہے۔ اور سوائے اردو یا فارسی
دنیا کی کسی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ غزل مسلسل ہو سکتی ہے
پوری غزل ایک جذبہ کے ماتحت لکھی جا سکتی ہے لیکن شاعر کو
اس امر کی بھی آزادی ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی غزل میں مختلف
طرح کے اور بعض وقت ایک دوسرے سے مختلف و متضاد
خیالات کا اظہار کرے۔ اس کا ہر شعر ایک مکمل جذبہ خیال یا
مشاہدہ یا تجربے کا حامل ہوتا ہے۔ اور شعر کی کامیابی یا
ناکامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ اس میں جو جذبہ، خیال یا
مشاہدہ بیان کیا گیا ہے، اس میں کتنا خلوص ہے۔ کتنی
صداقت ہے، کتنی شدت ہے۔ کتنا عمق ہے کتنا تنوع ہے
کتنی وسعت و گیرائی ہے اور اسکا اسلوب کتنا حسین و جاذب ہے"

" ہماری اردو شاعری کے یہ اہم نکات ہیں اس موضوع کی
تشنگی دور نہیں کر سکتے پھر بھی انہیں سامنے رکھ کر ہم حسینی صاحب
کی تنقیدی صلاحیتوں کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ضرور کر سکتے ہیں
اور وقت کے اس اہم تقاضے کو بھی محسوس کر سکتے ہیں جو "ہماری
اردو شاعری جیسی بلند و عمیق تنقیدات کیلئے نظر براہ ہیں۔
حسینی صاحب کی یہ عظیم تنقیدی تخلیق سامنے آجائے
تو میں سمجھتا ہوں ہماری تنقید کے وہ بہت سے تقاضے پورے
ہو جائینگے جو نئی تعلیم کی روشنی پانے کے باوجود کبھی کبھی غیر متوازن
اور ناہموار راہوں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔

صبح نو

میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے۔ جو
بہار کا ہر دلعزیز علمی و ادبی پرچہ ہے۔

برگزیدہ ادیب

محی وفا صاحب! سلام محبت

میں اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر آپ کے
علی عباس حسینی نمبر کیلئے کچھ نہیں لکھ سکا۔
میں حسینی صاحب کو اردو کے چند برگزیدہ اور قابلِ
احترام ادیبوں میں سمجھتا ہوں۔

انھوں نے پریم چند کی جاندار روایت کو
آگے بڑھایا اور نئی سمتوں سے آشنا کیا ہے
وہ اردو کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں
جن کے یہاں ابتدا ہی سے قوم پرستی کا رجحان
تہذیبی وحدت کا تصور، عوامی زندگی کی
بصیرت اور اس کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔

وہ محض افسانہ نگار نہیں بلکہ ایک
صاحبِ اسلوب افسانہ نگار ہیں اور اس
اعتبار سے زندہ افسانہ نگاروں میں کم ہی
ان کے حریف نکلیں گے۔

مجھے امید ہے کہ ان پر آپ جو
مضامین شائع کریں گے وہ محض رسمی
نہ ہوں گے بلکہ ان مضامین میں آپ کے
فن کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔

خلیل الرحمن اعظمی

۳ر دسمبر ۱۹۶۴ء

زین العابدین روڈ
علی گڑھ

تذرامام

پریمی حسینی

میں جانتا ہوں میرا کوئی حق نہیں، کوئی ادھیکار
ہیں ـــــ مگر کیا کروں؟ کہنے کو جی چاہتا ہے۔
علی عباس حسینی ـــ بابائے افسانہ ہیں،
انی کے پتا ہیں۔ ہند میں اردو کے، آج کے دور میں
ن آنکھوں میں ـــــ منشی پریم چند چھن گئے،
ہین لئے گئے ـــ کسی نے روکا نہیں، ٹوکا نہیں۔
عباس حسینی کے چھن جانے کا ڈر نہیں۔ بھلے نہیں،
اپیار ان کو چھین لے جانے کا سوال نہیں، پرشن
ہیں!

(۳۱-۱۹۳۹ء میں، سائنس کالج، پٹنہ کی
بریری کے اندر
جہاں فزکس، میتھمیٹکس کی ہزاروں کتابیں تھیں
اں انگلش، ہندی اور اردو کی بھی سیکڑوں مشہور چیزیں تھیں
انھیں میں سے ـــ مجھے
علی عباس حسینی کے "باسی پھول" کی خوشبو ملی،
"ی سی ایس" وحید کا کردار نظر آیا اور "گونگے بہری"
موا لی کے درشن ہوئے۔
اور ــــــ
ذہن میں ایک افسانہ نگار کے لئے مان جان کے
ربے نے جنم لیا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور
پڑھتا رہا۔
کم و بیش ۵-۶ برسوں تک جب کبھی ان کا نام
کسی رسالے میں دیکھ لیتا تو یقین جانئے، وشواش کیجئے
اپنے ضروری کام کو چھوڑ کر یا ٹال کر اُن کے افسانہ کو
پڑھ جاتا اور اکثر میری آنکھیں ڈبڈبا آتیں (حالانکہ
مجلسوں میں بھی مشکل سے رو پاتا ہوں!) ــــ کیا یہ
افسانہ نگار کا کمال نہیں کہ وہ ایک انجانے کو .. یوں
اپنا لے، اُس کے دل کو یوں موہ لے اور اُس کے
ذہن کو یوں موڑ لے؟
چودہ برس کی عمر سے ان کو پڑھتا رہا ہوں
اور آج خیر سے چالیس برس کا ہو چلا ہوں مگر
ہر دور میں ان کی تحریر پر سر دھنتا رہا ہوں اور کم و بیش
اُسی شدت سے!

حال ہی، یہی ۶۴-۱۹۶۳ء میں،
ان کی قسط وار کہانیاں "سیلاب ...."
اور "حمام ......" نے وہ نفسیاتی تقاشی کے مناظر
دکھائے کہ کہنا پڑا۔ "ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

میں نے ان کو دیکھا ہے نہ ان کی تصویر کو ــ
اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسے ہیں؟
اور اگر کہنے کی کوشش بھی کروں تو تانپوری والے

میر کلّو کی گواہی ہو جائے گی، وہ چاہے لمبے ہوں یا چھوٹے،
داڑھی رکھتے ہوں، کلین شیو ہوں، شیروانی پاجامہ
پہنتے ہوں یا سوٹ، ٹوپی اوڑھے، کھلے ہوں یا رامپوری،
تاش کھیلتے ہوں، سینما دیکھتے ہوں یا دونوں سے
متنفر ہوں، شیعہ ہوں یا سنی (یا صرف مسلمان!)
جنسلسٹ ہوں یا کمیونسٹ (یا صرف ورلڈ سٹی زن!)
— مجھے ان تمام باتوں کی نہ جانکاری ہے نہ
جاننے کی ضرورت۔

وہ لکھتے رہیں اور میں پڑھتا رہوں،
کچھ سمجھتا ہوں، جیسے سیکھتا ہوں وہ جیتے بھی ہوں —
ان کے سینے میں درد آشنا ایک دل ہے،
سر میں انسانیت کا ایک سودا ہے، قلم کا ایک طریقہ ہے
بات میں ایک سلیقہ ہے — دیہات کا ماحول ہو یا
شہر کی زندگی کا اظہار ہو یا نفسیاتی، سماجیات کا ذکر ہو
یا نفسیات کا، حسن بھی نمایاں ہے جو کنٹرول اور
مولویانہ یا پنڈتانہ فراڈ سے خود دور رہتے ہیں اور
دوسروں کو بھی دور دور رکھتے ہیں۔

اُردو والوں نے بھی ان کو نصف صدی سے
کچھ ہی کم مدت تک پڑھا ہے اور سراہا ہے اور نہ معلوم
کتنی صدیوں تک پڑھتے اور سراہتے رہیں گے (بشرطیکہ
بھارت میں اُردو باقی رہ جائے!)
مگر — کوئی بات ہے جو یہ لوگ
علی عباس حسینی کو ان کا اصل مقام دینے سے
کتراتے ہیں!
کاش کہ وہ ہندوستان کے اُتر پردیش کی جگہ
دنیا کے کسی پچھم دیس میں پیدا ہوئے ہوتے، کسی مغربی
زبان، فرانسیسی یا انگریزی کے افسانہ نگار ہوئے ہوتے
تو پھر دنیا دیکھتی کہ
ان کا نام کہاں ہوتا اور اُن کا مقام کیا ہوتا!
یا پھر — ہندوستان میں ہی جنم لیا تھا
تو منشی پریم چند کی طرح ہندی میں بھی کچھ لکھتے ہوتے
مگر — وہ تو (شاید) بدنصیب ہیں
جو بدخواہوں، بدخواہوں اور بدگمانوں کے غول میں
سانس لے رہے ہیں اور لئے جا رہے ہیں۔
اگر اب بھی —
وہ اپنی کتابوں کو ہندی میں چھپوا دیں تو ایک
تماشا ہو جائے گا، ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔
لوگ منشی پریم چند کو اُردو کی گود میں واپس
ڈال دیں گے اور علی عباس حسینی کو ہندی کے دامن میں
چھپا لیں گے۔

پریم چند حسینی زندہ باد!
علی عباس پریمی کی جے ہو!

غلام سرور کے ایام اسیری کی ڈائری

گوشے میں قفس کے

قیمت: ۲ روپے

پٹنہ میں (۱) بک امپوریم سبزی باغ (۲) کتاب منزل سبزی باغ (۳) پرویز بک ہاؤس سبزی باغ (۴) شرف الدین بک اسٹال سبزی باغ (۵) نفیس بک ڈپو چوہٹہ (۶) محمد اسرائیل صاحب باقر گنج۔

پٹنہ سیٹی میں (۷) محمد قمر الدین صاحب ایجنٹ اخبارات عدر گلی۔

گیا میں عزیز بک ڈپو۔ باری روڈ۔

اس سلسلے میں خط و کتابت کرنے اور روپیہ بھیجنے کا پتہ یاد رکھیں

ملکہ بانو۔ صدر بازار۔ داناپور کینٹ

وقار عظیم

آنسوؤں کا خراج

علی عباس حسینی کے افسانوں کے متعلق اپنے دل کی بات کہنے کے لیے قلم اٹھایا ہے تو یادوں کے افق پر ایک ایک کرکے بہت سے افسانے ابھرتے اور لپکتے ہیں۔ رفیق تنہائی۔ دو سہیلیوں کا مقابلہ۔ گناہوں کی لاج۔ بوڑھا اور بالا۔ آئی سی ایس اور آدمی ذہن کو کرید کرید کر نام یاد کرنے کی کوشش کرے، تو اور ایسے ہی کئی افسانے جن کی یاد کے ساتھ رقت قلب کی یاد اور اسکے ساتھ کچھ آنسوؤں کی یاد وابستہ ہے۔ میرے نزدیک علی عباس حسینی کے افسانوں کا فنی حاصل یہی رقت قلب ہے اور یہی آنسو۔ آنسو جو کبھی سیلاب بلا بن کر امنڈ آتے ہیں۔ کبھی صف مژگاں پر ابھرتے ہیں کبھی پتلیوں کی سطح پر موتی بن کر تیرتے ہیں اور کبھی دل کے اندر مچل کر رہ جاتے ہیں۔ اعتراف فن کا یہ نذرانہ میں نے بار بار ٹالسٹائی، چیخوف، ٹیگور اور پریم چند کی بارگاہ میں بھی پیش کیا ہے لیکن حسینی نے یہ خراج جتنی مرتبہ وصول کیا ہے اسکی گنتی آسان نہیں۔

حسینی کی ہر کہانی کسی نہ کسی اخلاقی اور اصلاحی مقصد کی کہانی ہے۔ کسی نہ کسی معاشرتی یا انسانی قدر کی حمایت، وکالت اور پاسداری کی کہانی اور اس سے، بالواسطہ اس قدر کو اپنانے، اختیار کرنے اور اس کی خاطر قربانی دینے اور ایثار کرنے والے انسان کی کہانی۔ یہ حمایت و وکالت یا پاسداری محض کسی وقتی جوش، یا اضطراری جذبے کا نتیجہ ہرگز نہیں ہوتی۔ اس کی پشت پر پسند و ناپسند کا وہ معیار کارفرما ہے جسے سہولت کیلئے حسینی کا فلسفہ حیات کہا جا سکتا ہے۔

یہ فلسفہ قدیم و جدید کے تعصب سے خالی ہے۔ اس فلسفے کی نظر میں جس طرح قدامت کے بہت سے معیار ہر زمانے میں قائم رہنے کے قابل ہیں اسی طرح جدت کے بعض اصول بھی ایسے ہیں کہ انہیں سر آنکھوں پر رکھا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے بہت سی قدیم چیزیں قدیم اور جدید چیزیں جدید ہونے کے باوجود پسندیدہ نہیں ہیں۔

حسینی کی سب کہانیاں زندگی کی پسندیدہ و غیر پسندیدہ، ممدوح و مذموم اور سدا قائم رہنے اور یکسر مٹ جانے والی قدروں کے تصادم کی کہانیاں ہیں۔ اس تصادم میں جب قدریں زندگی کے گوناگوں واقعات کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوتی ہیں تو حسینی پہلی طرح کی قدروں کے وکیل بن کر سامنے آتے ہیں اور اس وکالت میں بے لوث اور بے باک حمایت (بلکہ طرفداری) کا حق ادا کرنے کو ایک فنی منصب اور فریضہ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ اور انہیں اپنا یہ فنی منصب ادا کرنے میں کامیابی اس لیے ہوتی ہے کہ زور بیان اور حسن کلام کسی قدم پر انکے احساس کی شدت اور جذبے کی صداقت کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

اپنے دل کی یہ ساری کیفیتیں دکھانے کے لیے میرا جی چاہتا ہے کہ حسینی کے چند منتخب افسانوں یا ان کے افسانوں کے کسی مشہور مجموعے (رفیق تنہائی۔ آئی سی ایس۔ میلہ گھومنی وغیرہ) کا ذکر چھیڑ کر آنسوؤں کا وہ خراج ایک بار پھر پیش کروں جسے میں نے اس

تبصرے یا تجزیے کا عنوان دیا ہے۔ تو ہم بھی یاس اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ "باسی پھول" اس مجموعے میں باسی پھول کے علاوہ (جس کا ایک حصہ ۱۹۱۸ اور دوسرا ۱۹۳۰ میں لکھا گیا) ۱۹۲۹ سے ۱۹۳۹ تک کے گیارہ افسانے شامل ہیں۔ یہ سب افسانے کسی نہ کسی انداز میں بعض قلمکاروں کے لیے محبت اور بعض کے لیے نفرت (شدید محبت اور شدید نفرت) کے اظہار کا وسیلہ ہیں۔ فنی اس لحاظ سے کہ حسینی کے افسانے جہاں ایک طرف ہمیشہ ان کے درد مند دل کی بے چینیوں کے اظہار کا ذریعہ بنے ہیں دوسری طرف ہمیشہ ان کا یہ مقصد رہا ہے کہ اپنے دل کی اس دردمندی میں وہ قاری کو پوری طرح شریک کر لیں اُسے اپنا ہم نوا بنائیں۔ اور زندگی کے کسی واقعے یا سانحے کے انجام پر ان کا دل جو طمانیت محسوس کرتا ہے اور کبھی آنکھوں میں مسرت کے جو آنسو چھلکتے ہیں یا ان کے دل میں درد کی جو ٹیسیں اٹھتی ہیں وہی قاری کا مقسوم بن جائیں۔ دوسرے اس طرح کہ علی عباس حسینی کا ہر افسانہ زندگی کی نسبتاً نفسیاتی حقیقت کی نشان دہی کرنے کے باوجود تخیل کی پوری ہم نوائی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتا۔ یہ تخیل کہانی کو انجام تک پہونچا لے اور اس انجام کو وہ باقی شعلہ نظر سے زیادہ سے زیادہ موثر اور رقت انگیز بنانے کے لیے واقعات کی ایسی تصویر بناتا اور کرداروں کے عمل اور ردعمل کو ایسی شکلیں دیتا ہے کہ وہ زندگی سے مختلف اور بعض اوقات زندگی سے بہت دور ہونے کے باوجود زیادہ حسین بھی دکھتی ہیں اور زیادہ دلکش اور موثر بھی [illegible] کہ ذہن کے لیے قابل قبول بھی [illegible] کی یہ دنیا۔ اس دنیا کے واقعات [illegible] اپنی منطق سے خالی نہیں ہے جسے ہم فن کی منطق کہتے ہیں۔ فن کی اس منطق کا سب سے بڑا مربی حسن بیان ہے اور [illegible] "باسی پھول" کے سب افسانے حسن بیان کی اس فنی منطق کے پابند ہیں۔

۱۹۲۹ اور ۱۹۳۶ کے درمیان لکھی ہوئی ان کہانیوں میں سب سے پہلی کہانی "گونگا ہری" ہے۔ یہ کہانی پندرہ برس کے ایک بے سہارا شودر بچے کی مثالی محبت اور ٹھاکر اجیت سنگھ کے پر نخوت احساس برتری کے تصادم کی کہانی ہے۔ کہانی شروع ہوتے ہی ٹھاکر اجیت سنگھ کی یہ کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ "بہت غصے میں تھے۔ ان کے راجپوتانہ غرور کو صدر درجہ صدمہ پہونچا تھا۔ ان کی شرافت مجروح ہوگئی تھی اپنی خاندانی نجابت کی نظر میں یہ قصور ناقابل عفو تھا۔ یہ دھبا صرف خون بہا کر ہی دھویا جا سکتا تھا۔"

ان کا سانحہ عبارت یہ ہے کہ "ہندوستانی شرافت اور راجپوتی غیرت یہ ابھی گوارا نہیں کر سکتی کہ بن بیاہی اکلوتی بیٹی پر ایک شودر لونڈا عاشق ہے۔"

شودر لونڈے ہری کے خلاف جو گونگا ہے اور سنگ تراش ہے ٹھاکر صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ان کی دس برس کی بیٹی کو گھورتا اور اس کی مورتیاں بنا بنا کر اپنے پاس رکھتا ہے۔ اس مقدمے میں ٹھاکر صاحب خود ہی مدعی بنے اور خود ہی منصف۔ ہری ان کی جابرانہ عدالت میں پیش ہوا اور حاکم عادل نے اس کے سوکھے ہوئے جسم پر بڑی بے دردی سے مضبوط اور لچکدار چھڑی چلائی اور ہری جامن کی بودی شاخ کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ بدحواس ہو کر بھاگا اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک کہ قصبے کی سرحد سے باہر نہ نکل گیا۔

خاندانی شرافت و نجابت کے غرور اور نخوت [illegible] معصوم اور بے لوث محبت کی بے بسی کے مقابلے میں بظاہر ٹھاکر صاحب جیتے اور ہری ہارا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ تو اب شروع ہوا ہے اور اس مقدمے میں خاموش اور بے زبان ہری کی حیثیت مدعی کی ہے۔ اور ٹھاکر اجیت سنگھ کی مدعا علیہ کی۔ وکالت کی خدمت افسانہ نگار کے دل درد آشنا نے اپنے ذمے لی ہے۔ وکیل اپنے سارے حربے لے کر میدان میں اترتا ہے۔ وکیل کی حیثیت سے اس کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ ہری کے طرز عمل کی جو دیکھنے میں آیا، بزدل کمزور اور بے ہمت عاشق کا طرز عمل ہے حمایت کرے اور ایسے انداز میں حمایت کرے کہ قاری اس بے ہمت اور بزدل عاشق کا طرفدار بن جائے۔ دیکھیے کہ افسانہ نگار نے وکالت کے اس فریضے کی انجام دہی کیسے فنکارانہ انداز میں شروع کی ہے۔ ہری کے گاؤں سے بھاگ جانے کے بعد اس تصادم کے انجام کی خبر ہمیں ان لفظوں میں سنائی گئی ہے۔

"غرور و نخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی۔"

یہ اظہارِ واقعہ ہے کسی قدر جذباتی انداز میں۔ لیکن اس بیان یا اعلان کے جذباتی ہونے کے باوجود قاری کے دل میں ہری کے نصب العین کے لیے اتنی گنجائش نہیں پیدا ہوتی کہ وہ ہری کا پیچھا کرے اور دیکھے کہ اس ناکام عاشق کا انجام آخر کیا ہوا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس بیہودہ واقعے کی کوئی شدید جذباتی، نفسیاتی اور اخلاقی تاویل اور توجیہ کی جائے۔ اسی لیے افسانہ نگار اپنی بات کو یوں آگے بڑھاتا ہے:۔

"غرور و نخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی..... محبت کی یہ باقاعدہ پسپائی نہ تھی بلکہ وہ سراسیمگی کی بھگدڑ تھی۔"

وکیل نے اپنے موکل کے لیے (یا افسانہ نگار نے ہری کے لیے) ہمارے دل میں ہمدردی پیدا کر دی لیکن اس ہمدردی میں پختگی اور استقامت صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ ہری کی مظلومی صرف ایک و فرد کی نہیں بلکہ جماعت کی مظلومی نظر آئے۔ یہ بات اس طرح پوری ہوتی ہے:۔

"غرور و نخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی۔ محبت کی یہ باقاعدہ پسپائی نہ تھی بلکہ سراسیمگی کی وہ بھگدڑ تھی جو بلندی و پستی کی قسمت میں اکثر موقعوں پر مقدر رہی ہے۔ مادیت کے سامنے اکثر روحانیت یوں ہی بھاگ نکلی ہے۔ تاریکی اسی طرح آفتاب کو زرد بنا کر چھپا دیتی ہے۔ کالی راتوں سے چاندنی اسی طرح فرار کر جاتی ہے۔ سیاہ دراز زلفیں اسی طرح افشاں کی پتلی لکیر کو ڈھک لیتی ہیں۔ ظلمات اسی طرح آبِ حیات کو چھپا دیتی ہے!"

ہری کے اخلاق درست اور بہتر پسند وکیل نے خطابت کے زورِ کلام اور شاعری کی رنگینیٔ تخیل سے ہری کو قاری کی توجہ، ہمدردی اور شفقت کا مرکز بنا دیا۔ اور اب وہ ہر اس بات کو جس میں اسکی بھلائی اس کی محبت کی جیت اور ٹھاکر جیت سنگھ کی شکست ہو، بہت دلچسپی سے سنتا اور دیکھتا ہے۔

کہانی آگے چل کر بہتر تخیل اور تصور کے بنائے ہوئے ایسے ایسے مناظر میں سے گذرتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہری کی ذات اور اس کے مقصدِ حیات میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

ہری گھر سے بھاگ کر کلکتہ پہونچا تو ایک دن اسے ایک مجسمہ ساز بت تراش کی دکان نظر پڑی۔ بہت دیر تک باہر کھڑے رہنے کے بعد وہ اندر گھستا اندر گیا۔ دکان کے مالک موتی بابو نے اس سے پوچھا:۔

"تم کیا چاہتے ہو، کیوں اتنی دیر سے باہر کھڑے ہو"

گونگا ہری کچھ جواب نہ دے سکا۔ موتی بابو نے اسے اپنے بنائے ہوئے مجسمے دکھانے شروع کیے اور تھوڑی دیر بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ ہری سے بڑا صناع ہندوستان نے اس وقت نہیں پیدا کیا۔

وہ اپنے وقت کے مشہور مجسمہ ساز تھے۔ ان کی نگاہ التفات ہری پر پڑی تو گویا پھسلتے ہوئے پتھر کے ٹکڑے کو پہاڑ کا سہارا مل گیا اور ہری کی بدولت انکی دکان کی شہرت اقصائے عالم میں پھیلی۔ ہری کی بدولت کہ حسن اس کی جاگیر تھا۔ تخیل اس کی ملکیت، اور صفت اسکی لونڈی اور سنگ تراشی اسکا آلۂ کار۔ وہ دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں بناتے بناتے خود ہی دیوتا بن گیا تھا۔

لیکن یہ دیوتا جب اپنے کمرے میں جاتا تو سرہانے کے طاق پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹاتا۔ ایک دس سالہ لڑکی کے مجسمے کو حسرت سے دیکھتا عقیدت کے پھول چڑھاتا، محبت کی شمع جلاتا اور گھنٹوں کی پرستش کے بعد اپنے دل میں ایک روحانی تسکین محسوس کر کے سو رہتا۔

"ایک دن دکان کے سامنے ٹیکسی آکر رکی..... راما مل ہمہ حسن، ہمہ شباب، ہمہ رعنائی بنی ہوئی اتری۔ ٹھاکر صاحب بھی ساتھ تھے۔ بیٹی گریجویٹ ہو چکی تھی۔ شادی کی فکر تھی۔"

پہلے ہری کے دل نے اور پھر آنکھوں نے اندرا کو پہچان لیا۔ اندرا نے بھی اسے من مندر میں جگہ دی۔ موتی بابو کو یہ دونوں طرف لگتی ہوئی آگ نظر آگئی۔ انہوں نے دو دلوں کو ملانے کی یہ تجویز ٹھاکر صاحب کے سامنے رکھی تو وہ بولے:۔

بابو صاحب ہم راجپوت ہیں۔ ایسے ذلیلوں کو بیٹی نہیں دیتے۔"

"آپ کی بات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شودر ہے۔" مولی بابو نے جھلا کر جواب دیا۔

"ٹھاکر صاحب! شودر، راجپوت، چھتری، اچھوت اور چھوت سب پرمیشر کے بنائے ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے ایک صدیوں کا مظلوم ہے اور دوسرا صدیوں کا ظالم۔ ایک کمزور تھا دوسرے نے دبا لیا۔ اب اس صدی میں یہ زور و ظلم نہیں چلے گا۔"

ٹھاکر صاحب کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ "میں اپنی لڑکی کا اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ دونگا مگر اسے کسی بدقوم کمینے سے بیاہ نہ کرنے دونگا۔"

ٹھاکر صاحب کے اس رویے کا قاری کے دل پر یہ اثر ہوتا ہے کہ ہری کے لیے اسکی جانب داری، ہمدردی اور حمایت سے بڑھ کر انتقام کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اسکا جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ ہری اور اندرا کی فتح سے زیادہ ٹھاکر صاحب کی شکست کا تماشا دیکھے۔ اور اس کی یہ اور دلچسپی لے۔ یہ فن کارانہ انداز میں پوری کی ہے۔ کہانی اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ اندرا اور ہری کی بے تکلفی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے کے سپرد کر چکے ہیں۔ لیکن رسم و رواج، زمانہ، ٹھاکر صاحب، باہمی حجاب راستے میں حائل ہیں۔ دلوں میں حیات جاوید بخشنے والی خوشی پیدا ہوتی ہے لیکن کوئی نہ کوئی دیوار تن کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور خوشی کے آگے بڑھنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ ایک دن ٹھاکر صاحب اندرا سے کہتے ہیں۔

میں ہری بابو کے ساتھ تمہارا گھومنا نہیں پسند کرتا۔ یہ کمینہ!۔۔"

اندرا بھی باپ ہی کے تیور سے پوچھتی ہے۔ "وہ نیچ اور کمینے کیسے ہو گئے۔"

اور قاری کا دل اس جرأت پر باغ باغ ہو جاتا ہے۔

ٹھاکر صاحب اپنے گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اندرا ہری سے رخصت ہونے آتی ہے۔ ہری نے رات دل سے جنگ کرنے میں گزاری تھی۔ اندرا اس سے فرمائش کرتی ہے کہ میرے جانے سے پہلے مجھے وہ چیزیں دکھائیے جو میں نے اب تک نہیں دیکھی ہیں۔"

ہری اپنا راز پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اس نے کہا۔ "ساری چیزیں آپ کے سامنے ہیں آپ ان میں سے ہر ایک کو کئی بار ملاحظہ فرما چکی ہیں۔"

لیکن اندرا شرارت پر آمادہ تھی۔ ہری کے کمرے میں گھس گئی۔ اور کمرے کی سب چیزوں کو دیکھ بھال چکی تو طاق کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور اس پر پڑا ہوا پردہ الٹ دیا۔ ایک دس برس کی لڑکی کا مرمریں مجسمہ سامنے آ گیا۔ یہ اسی کا مجسمہ تھا۔

اندرا نے دونوں ہاتھوں سے اس مورتی کو اٹھا لیا۔ اسکے گلے سے شام کا چڑھایا ہوا ہار نکال لیا اور اسے اپنے جوڑے میں رکھ کر بولی۔ "اب تو آپ گونگے نہیں ہیں۔"

ہری نے محسوس کر لیا کہ وہ اسے اچھی طرح پہچان گئی ہے۔ پہلو بدل کر بولا۔ "آپ کو کب معلوم ہوا؟"

وہ بولی۔ "کل رات بابو جی کی باتوں سے مجھے سب یاد آ گیا۔"

ہری نے کہا۔ "کیا اسکے بعد بھی آپ کو میرے آج تک گونگے رہنے پر کوئی تعجب ہوتا ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں اسلیئے کہ دیویاں جب کسی کی منت برآری کرنا چاہتی ہیں تو پھر انہیں حاجت مند کی خاموشی بری معلوم ہوتی ہے۔"

ہری نے کانپ کر کہا۔ "دیوی! دیوی! میں کیسے کہوں کہ تمہاری پوجا کرتا ہوں اور صبح کو اسی کی زیارت کرکے کام شروع کرتا ہوں۔ لیکن شودر ہوں تم راجپوتن ہو۔ ٹھاکر صاحب اگر سن لینگے تو میرا کام تمام کر دینگے۔"

وہ ہنسنے کی جگہ متین ہو کر بولی۔ "تم اور شودر! تم تو دیوی دیوتاؤں کے بنانے والے ہو اور۔۔۔۔ اب ایک پوتر راجپوتن کے دیوتا۔"

ہری نے گھبرا کر کہا۔ "اے ٹھاکر صاحب کیا کہینگے؟" وہ مسکرا کر بولی۔

ان سے اتنا مت ڈرو۔ ان کو بھی منا لونگی۔ اور اگر نہ بھی مانے تو کیا! بیٹی کی حیثیت سے انیس بائیس سال تک باپ کی خدمت کر چکی ہوں اب استری بن کے انکی سیوا کرونگی جو آج دس سال سے ہر روز گلے میں محبت کا ہار ڈالتا ہے۔"

اندرا کے ان الفاظ میں ہری کی فتح اور ٹھاکر صاحب کی شکست کا جو اعلان ہے اس سے قاری کا دل بھر آتا ہے اور پھر:۔

"ہری نے اندرا کو اسی عزت، اسی احترام، اسی محبت سے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا جس طرح وہ اس کی مورتی کو روزانہ پرنام کیا کرتا تھا اور اندرا نے جھک کر ہری کے پاؤں چھوئے۔"

اندرا کو ہری کے پیروں پر گرتا دیکھ کر قاری کا دل اس فنکار کے قدموں پر جھک جاتا ہے جس نے اسے شادمانی کا یہ منظر دکھایا۔ اور وہ اپنی عقیدت کا اظہار آنسوؤں کا خراج دے کر کرتا ہے۔

آنسوؤں کا یہ خراج حسینی کی ہر کہانی اپنے اپنے انداز میں قاری سے وصول کرتی ہے۔ "باسی پھول" کی سب کہانیاں اسکے باوجود کہ حسینی کی بہترین کہانیاں نہیں ہیں، آنسوؤں کے خراج کی کہانیاں رہیں۔ **بیوی** اور نئی ہمسائی میں افسانہ نگار نے بعض ایسی قدروں کے ذکر اور پھر انکی فتحمندی سے دردمندی اور بالآخر رقت کی فضا پیدا کی ہے جنہیں ہماری دنیا نے ماضی کی چیز سمجھ لیا ہے۔

بیوی کے ہیرو ڈاکٹر منور کا عقد سلمیٰ سے ہوا لیکن رخصتی نہیں ہوئی۔ وہ یورپ گئے اور وہاں سے عورت کی نفرت کی سوغات اپنے ساتھ لائے۔ سلمیٰ کے ماں باپ نے انہیں راہ راست پر لانے کے لئے طرح طرح کے جتن کئے لیکن کوئی کارگر نہ ہوا۔ بالآخر بات طلاق اور مہر کے ذکر تک پہونچی۔ اب تک سلمیٰ نے منہ پر مہر لگا رکھی تھی جب طلاق کا نام سنا تو شرم دنیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ایک سہیلی سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"بہن! مجھے یہ مہر اور طلاق کا ذکر ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اب تو جس کے ساتھ مقدر تھا نکاح ہو چکا۔ میں انکی لونڈی بن چکی وہ خواہ مجھے پوچھیں یا نہ پوچھیں۔ میں ان کے نام پر بیٹھی رہونگی۔ سیکڑوں رانڈیں ساری عمر دن ہی بسر کر دیتی ہیں۔ یہ بدنام کیوں نہیں کر سکتی۔ تم کسی طرح اس بات کو ابا جان کے کانوں تک پہونچا دو کہ اگر طلاق کا پھر کسی نے نام لیا تو میں کچھ کھا کے سو رہونگی۔ مجھ سے یہ رسوائی نہ سہی جائے گی۔"

بظاہر بات یہاں ختم ہوگئی لیکن افسانہ نگار کے لئے بات اصل میں اب شروع ہوئی ہے۔ اتفاق سے ڈاکٹر منور چیچک کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ ڈاکٹر اور نرس کی پوری توجہ بھی انہیں اچھا نہ کر سکی۔ حالت یہ ہوئی کہ لوگ اسے چھونے بھی ڈرتے تھے۔ سلمیٰ نے یہ حال سنا تو تہیہ کر لیا کہ شوہر کے پاس جا کر اسکی خدمت کریگی۔ ماں باپ سے اجازت لے کر شوہر کے پاس پہونچی تو اسکی یہ حالت تھی کہ:۔

"دیکھنے سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ انگریزی بال سر کے دانوں کی وجہ سے مونڈ دیئے گئے تھے مگر لمبی چہرے پر داڑھی اور مونچھ کے بال ناہموار طور پر نکلے ہوئے تھے۔ سارے جسم پر ورم تھا۔ ناک کا بانسا سوج گیا تھا۔ پلکیں پچی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ہر ہر عضو ہرن ہو، دانوں اور زخموں سے ڈھکا ہوا تھا۔"

سلمیٰ کی خدمت گذاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرض کا زور گھٹنا شروع ہوا اور منور رفتہ رفتہ اچھے ہوگئے لیکن آنکھیں جاتی رہیں۔ منور نے اچھے ہوتے ہی آنکھوں کا ماتم شروع کر دیا۔ اور ہر وقت "ہائے میری آنکھیں، ہائے میری آنکھیں" کی رٹ لگائی۔ منور کی بےتابی پر ایک دن تسکین کے یہ لفظ سلمیٰ کی زبان سے نکل گئے:

"خدا کو یوں ہی منظور تھا اب اتنا رنج فضول ہے۔"

منور نے آج پہلی دفعہ ایک نئی، دلکش اور سریلی آواز سنی۔ پوچھا۔۔۔ "کون!" سلمیٰ کے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ اس نے کئی مرتبہ

زبان خشک، ہونٹوں پر پھیری۔ رک رک کے بولی "آپ کی لونڈی ۔۔۔۔ سلمیٰ!"

منور نے تعجب سے پوچھا "تم یہ کیونکر یہاں آئیں؟"

سلمیٰ نے آہستہ سے کہا "اماں کے ساتھ ۔۔۔ آپ کی خدمت کرنے!"

منور کی بے نور آنکھیں اس جواب پر کھل گئیں۔ اللہ اکبر! عورت اس قدر خطا پوش و عطا پاش ہے۔ وفا کا مجسمہ، محبت کی پتلی! ایثار کی جان! ... شرما کے بولا "میں نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔"

یہ گویا افسانہ نگار کی فن کارانہ فلسفہ طرازی کی حیثیت ہے۔ اور اس کی وکالت کی حیثیت حقیقت میں عورت، مشرقی عورت، ہندوستانی عورت کی خطا پوشی، وفا، محبت اور ایثار کی حیثیت بن کے ہم سے انسانیت کا بھرم قائم ہے۔ رفتہ رفتہ مندی کے اس احساس پر قاری کا دل بھر آتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔ گفتگو کا سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ سلمیٰ ہر طرح منور کی دل دہی کرتی ہے۔ سلمیٰ کے ایثار اور محبت کی باتیں سن کر منور کے دل کی یہ حالت ہوئی کہ:-

آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر رخسار پر آ گئے۔ سلمیٰ نے جھک کر انہیں پاک کر دیا۔ گویا شبنم کے موتی تھے کہ گلوں کی نازک پنکھڑیوں نے سمیٹ لیے گئے۔

منور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "واللہ تم عورت نہیں فرشتہ ہو۔"

سلمیٰ کا چہرہ خوشی سے ایسا دمکا، معلوم ہوتا تھا افق مشرق سے ابھی ابھی آفتاب نکلا ہے۔ وہ فخریہ لہجے میں بولی "نہیں نہیں، میں ایسے مرتبہ والی نہیں۔ میں صرف عورت ہوں۔ نہ بھی کوئی اور نہیں۔ آپ کی بیوی، آپ کی باندی، آپ کی لونڈی!"

منور روتے میں مسکرا کے بولا "تو خدا سب کو ایسی ہی بیوی دے۔"

"اور دو بچھڑے ہوئے دل اس طرح مل گئے جیسے الہ آباد کے قریب گنگا جمنا ۔۔۔ ہاتھوں میں ہاتھ لیے، خلوص و محبت کے عہدوں میں اور خوش زندگی بسر کرنے کی تدبیریں زبانوں پر!"

اس مرحلے پر منور اور سلمیٰ کے دل کی خوشی ہر قاری کے دل کی خوشی بن جاتی ہے اور مسرت کے جو آنسو اب تک آنکھوں میں تیر رہے تھے خراجِ عقیدت بن کر پلکوں پر نمودار ہو جاتے ہیں۔

منشی ھمسائے کے اشرف صاحب رنگیلے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ ہر سال "تقویم پارینہ" علیحدہ کر دیتے اور نئی جنتری سے دل بہلاتے۔ اب کے نظرِ انتخاب بی ہمسائی پر پڑی اور وہ بغل والے مکان میں لا کر اتاری گئیں۔

ایک دن اشرف صاحب مولانا کو راستے میں مل گئے انہوں نے سختی سے اس بات کی شکایت کی کہ آپ نے طوائف کو میرا ہمسایہ کیوں بنایا؟ اشرف صاحب نے بڑے معصومانہ انداز میں جواب دیا:-

"بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس حسن، اس گلے اور اس مزاج کی رنڈی آج تک نہیں دیکھی۔ میں نے اسی لیے اس سے یہ خواہش کی کہ وہ مجھ سے نکاح کر لے۔ مگر وہ آزادی کی زندگی کی اس قدر عادی ہو گئی ہے اور گھریلو زندگی سے اس قدر گھبراتی ہے کہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی۔ اسی لیے آپ کے ہمسایے میں لایا ہوں کہ وہ آپ کے گھر کی زندگی اور آپ میاں بیوی کی محبت و آشتی کو دیکھ کر میری بات مان لے۔"

اس معقول دلیل کا مولانا نے جو جواب دیا وہ یہ ہے:-

"تو اتنا بڑا شہر ہے آپ کو سینکڑوں اس طرح کے میاں بیوی مل جاتے مجھی پر کرم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

اس دن سے شور ہنگامے میں کمی ہو گئی لیکن مولانا کا بچہ ہر روز دونوں گھروں کی درمیانی کھڑکی پر جا کر بی ہمسائی کو آواز دیتا اور وہ کھڑکی پر

باتیں اور غالب کی غزل لہک لہک کر اسے سناتیں۔ مولانا نے اسے بچھڑ سمجھا اور اس کا تدارک اس طرح کیا کہ اول تو اشرف صاحب کو ایک تیز قسم کا خط لکھا اور دوسرے کھڑکی میں قفل ڈلوا دیا۔

اسکے دو ہی چار دن بعد مولانا کو ایک سرکاری کام سے دیہات جانا پڑا۔ بہت رات گئے واپس آئے تو دیکھا کہ گھر میں سب جاگ رہے ہیں۔ اندر پہنچے تو دیکھا کہ بیوی پلنگ پر لیٹی ہیں اور ماما انکے تلوے سہلا رہی ہے۔ بچے کو ایک حسین دوشیزہ کلیجے سے لگائے بیٹھی ہے۔ ماں اور ماما کی زبانی ساری داستان سنی تو پتہ چلا کہ بچے کی بیماری اور ماں کے رونے دھونے سے متاثر ہو کر ہی ہمسائی ان کے گھر آگئیں اور بچے کو بہلا کر سلایا۔ یہ داستان سنکر مولانا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ "اللہ اللہ میں اور ایک قحبہ کا احسان مند! میرا گھر اور ایک بازاری رنڈی! میرا بچہ اور ایک فاحشہ کی گود۔"

ہمسائی نے انکے چہرے کی رنگت سے دل کی کیفیت کا اندازہ لگایا اور بچہ کو آہستہ سے ماں کی گود میں دے دیا۔ بچہ ماں کی گود میں جاتے ہی بلبلانے لگا۔ بیگم نے ہمسائی سے گڑگڑا کر کہا "بہن! تم پھر لے لو۔ یہ تمہاری ہی گود میں چپ رہے گا۔" ہمسائی نے مولانا کی طرف دیکھا اور انکے چہرے پر نفرت اور حقارت کی جگہ عاجزی اور خوشامد کے آثار دیکھے تو بچے کو گود میں لے لیا۔ بچہ گود میں آتے ہی مسکرا دیا۔

مولانا بارش میں بھیگے تھے اس لیے انہیں سردی کے ساتھ بخار آگیا اور تین دن تک ایک سو چھ ڈگری بخار رہا۔ سرسام کی حالت میں بار بار کہتے تھے "میرا بچہ اور بیسوا کی گود۔" خود ہمسائی کا یہ حال تھا کہ تیمارداری اور خدمت گذاری کا حق اس طرح ادا کیا کہ تین رات پلک سے پلک نہیں ملائی۔

کہانی کے شروع میں قاری مولانا کا ہم خیال ہے لیکن واقعات اسکے دل میں ہمسائی کی عزت پیدا کر دیتے ہیں۔ مولانا اور ہمسائی کے طرز عمل میں جو نمایاں فرق ہے اسکی بنا پر قاری رفتہ رفتہ مولانا کو برا اور ان کے مقابلے میں ہمسائی کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ اسلیے کہ مولانا نے "مولانا" ہو کر بھی بلند اخلاق کا ثبوت نہیں دیا تھا اور ہمسائی نے طوائف ہو کر نیکی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ مولانا نے ہمسائی کے متعلق جن خیالات کو اپنے دل میں جگہ دی تھی ان کے اثر سے قاری کے دل میں یہ خواہش پیدا ہونے لگتی ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ جس طرح مولانا نے ہمسائی کو ذلیل کیا ہے اسی طرح یہ بھی ذلیل اور شرمندہ ہوں۔ اس لیے کہ واقعات کی رو سے پسندیدہ اور غیر پسندیدہ قدروں کے درمیان جو تصادم پیدا کیا ہے اس میں مولانا کا دامن غیر پسندیدہ قدروں کے کانٹوں سے چھلنی ہے اور طوائف ہمسائی کی گود پسندیدہ قدروں کے پھولوں سے معطر ہے۔

یہاں سے افسانہ نگار کی فنی چابکدستی شروع ہوتی ہے۔ اسکے آنے والے واقعات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ قاری کی یہ آرزو پوری ہو کہ مولانا اپنے کیے پر نادم ہوں اور ہمسائی کو معاشرے میں عزت کی وہ جگہ ملے جسکی وہ اپنے پسندیدہ اوصاف کی وجہ سے مستحق ہے۔

مولانا اچھے ہو گئے اور بیوی نے انہیں بیماری کے زمانے کی ساری کیفیت سے آگاہ کیا تو انہیں حد سے زیادہ خجالت و ندامت ہوئی۔ "اور انہیں اس دن محسوس ہوا کہ ذلیل و شریف کا فرق حد سے زیادہ مشکل ہے اور سوسائیٹی کے قوانین کی پابندی میں افراط بعض اوقات خود ہمیں بداخلاق و بد تہذیب بنا دیتی ہے۔"... حد درجہ شرمسار و منفعل ہو کے بیگم سے کہا "للہ ہمسائی کو ملاؤ۔ میں ان سے معافی مانگونگا۔ میری اخلاقی حالت ان سے پست تر ہے۔ مجھے انکو ذلیل کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔"

قاری کی تسکین کا پورا سامان مہیا ہو گیا۔ لیکن افسانہ نگار یہ سامان مہیا کر کے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ وہ بات اس طرح آگے بڑھاتا ہے کہ قاری کا دل خوشی سے لبریز ہو جائے۔ اس کی خوشی ابل کر آنکھوں میں آئے اور افسانہ نگار کو اسکی محنت کا انعام مل جائے۔ آنسو کے چند قطرے۔ قاری کا خراج عقیدت۔

بیگم نے کھڑکی کھٹکھٹائی تو پتہ چلا کہ اشرف صاحب کل شام کو مکان چھوڑ کر چلے گئے۔ تین دن بعد اشرف صاحب کا خط ملا۔ جس میں ایک طرف تو ایک "بیسوا" اور "قحبہ" کے شریفانہ اوصاف کی داستان تھی اور دوسری طرف مولانا کے طرز عمل کی شدید مذمت۔ اشرف صاحب نے لکھا تھا کہ "ہمسائی" پھر اپنی ماں کے گھر چلی گئی اسلیے کہ اسکے خیال میں انسانی قانون خدائی قانونوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔"

[illegible] صاحب کے گھر پہونچے۔ [illegible] صاحب سے معافی مانگی اور آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کو [illegible] کہا "[illegible]

[illegible] دیا [illegible]

[illegible] کہا [illegible] میرا قصور معاف کردو۔ واللہ تم [illegible]

[illegible] صاحب کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئیں" جیسے خوش بخت اپنی جان [illegible]

[illegible] دوسرا ایک محبت کی شمع جلی دونوں [illegible]

[illegible] مسرت سے ہمکنار رہی تھیں۔

[illegible] اور جانے کی آنکھوں سے منتقل ہو کر قاری کی آنکھوں میں جگہ بناتی ہے اور مسرت کی یہ شبنم فن کی بارگاہ میں اس کا خراج [illegible] ہے

[illegible] ایسی کہانیاں ہیں جن کے انجام پر پڑھنے والے کو سخت عبرت ہوتی ہے۔ دونوں کہانیاں [illegible]

[illegible] قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل غم کی شدید کیفیت سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں [illegible]

[illegible] لیکن اہمیت [illegible] افسانہ نگار نے ایک یا دو کرداروں کی بات کو ساری دنیا کی بات بنا دیا ہے اور ہم

[illegible] انجام کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اور افسانہ نگار کی نظر میں یہی اسکی انسانیت پسند

فن کاری کا [illegible] اس مرتبہ آنکھوں سے بہنے والے نہیں بلکہ دل میں مچلنے والے آنسوؤں کی صورت میں۔

"کیے کا بھوگ" کے کنور اندر [illegible] ریاست لکھن پور کے ولی عہد تھے لیکن انہیں شراب اور عورت سے نفرت تھی۔ مہاراجا کو یہ بات شان امارت کے خلاف معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنے مصاحبوں کو تاکید کی کہ کنور صاحب کو اس دنیا کی سیر کرا دو" شاطر مصاحب خدمت پر مامور ہو گئے اور کنور صاحب کو دلی والی رام دلاری کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ مہاراج نے بیٹے کی شکست پر مصاحب اور رام دلاری دونوں کو مالا مال کر دیا۔ تعلقات نے رنگ لائے۔ رام دلاری کے لڑکی پیدا ہوئی اور کنور صاحب نے نشانی کے لیے اسکے بازو پر اپنے نام کے حروف گدوا دیئے۔

کچھ دنوں بعد مہاراج مر گئے اور ان کی گدی کنور صاحب کو ملی۔ رام دلاری اور بیٹی کی یاد دل سے نکل گئی۔ پندرہ برس بعد دسہرے سے ملنے دلی آئے، تو مصاحبین نے رام کنور ایک "نخچہ ناشگفتہ" کا ذکر کر کے دل میں اشتیاق کی آگ بھڑکا دی۔ بی رام کنور طلب کی گئیں اور جتنی تعریف کی گئی تھی اس سے بھی سوا نکلی۔ [illegible] رام کنور کی زلفیں کنور صاحب کے شانوں پر پریشان ہو گئیں۔

صبح ہوئی۔ رام کنور محو خواب تھی۔ اتفاق سے کنور صاحب کی نظر اسکے شانے پر پڑ گئی اور وہاں دو حرف کھدے نظر آئے۔ گھبرا کر رام کنور کو جگایا اور اس سے ان حروف کا راز پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ماں نے مرتے وقت بتایا تھا کہ یہ میرے باپ کے نام کے حرف ہیں۔

کنور صاحب کے ہوش جلتے رہے۔ انہوں نے خالی ریوالور میں کارتوس بھرے اور رام کنور سے کہا "اسے تو جانتی ہے کہ میں کون ہوں۔ میں ہی تیرا باپ ہوں۔" رام کنور کے حسین چہرے سے نفرت ٹپکنے لگی وہ شیرنی کی طرح جھپٹی اور کنور صاحب کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر انکے سینے پر فیر کر دیا۔ باپ نے غصہ اور حقارت سے کہا کیا تو اب اپنی جان بچا لے گی؟"

رام کنور نے زہرخند کے ساتھ کہا "نہیں! میری رگوں میں بھی راجپوت خون ہے" یہ کہتے کہتے اس نے نال اپنے سینے کی طرف پھیری۔ گھوڑا گرا دیا۔ آواز ہوئی ---- اور وہ سسکتے ہوئے باپ کے قدموں کے پاس گر کر دم توڑنے لگی۔

اس انجام پر قاری کے دل پر ایک سخت گھونسا لگتا ہے۔ وہ دم بخود رہ جاتا ہے وہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ بھی پیش آیا ہے اس سے نفرت کرے، اس پر غصہ ظاہر کرے یا محض ہمدردی۔ اور یہاں افسانہ نگار اپنی چابکدستی دکھاتا اور کہانی کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے

کھٹا ہوا چراغ بھڑک اٹھا۔ مہاراج کی آنکھوں میں آخری چمک پیدا ہوئی۔ انہوں نے رک رک کر کہا: بھگوان...... تمہارے! مجھے میرے...
[illegible] ...... جنم ...... میں ...... مل گیا۔"

[illegible] سلامت ہیں ہے... سولہ [illegible] ان نگر کے [illegible] کے [illegible] بیٹے تھے۔ اسی لیے [illegible] ان نگر کے اس [illegible] ٹوٹے ہوئے دلوں کا ایک انبار تھا۔ [illegible] کلونا بیٹا تھا۔ یہ باتیں [illegible] دو بار گاہ [illegible] انہیں دیکھ کر [illegible] دل میں درد ہوتا [illegible] ہونا [illegible] ہوا کا یقین تھا۔ لیکن سینے پر [illegible] کیا تھا۔ [illegible]

[illegible] اتنے شیشہ ساز دل [illegible] اور [illegible] ہوتے تھے ورنہ نہ کسی کو ٹھوکر مار دیتے ہیں کسی [illegible] کر [illegible] لگے تھے کر دعا [illegible] مہاراج یہ فرض ہے کہ [illegible] کی خدمت [illegible] اسی طرح اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ زمیندار کے جوان لڑکے کے [illegible] ہوں [illegible] میں انکا حصہ ہی کیا ہے؟

اسی طرح کی ایک بیٹی فرخ [illegible] اور [illegible] تھی [illegible] حسین [illegible] کو صید افگنی کی شکار رہی اور اپنا سب کچھ کھو بیٹھی۔ [illegible] ایک دن گاؤں سے یوں غائب ہوئی کہ [illegible] سمجھا کہ جان دے دی [illegible] حسین ڈپٹی کلکٹر ہوئے شادی ہوئی اور ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن پیدا ہونے کے [illegible] دن غائب ہو گیا۔ [illegible] غم [illegible] رہا ہوا تھا۔ اس کیفیت نے بڑا [illegible] دیا تھا جو ملزم ان کے اجلاس میں پیش [illegible] سخت سزا پاتا۔

ایک دن پولیس نے ایک نوجوان بجا رے کو پیش کیا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ اسے دو سال سے کم کی سزا نہ دوں گا۔ اسی دن شام کو ایک عورت ان سے ملنے آئی۔ یہ بدلیا تھی اور نوجوان بجارے کی ماں۔ بدلیا کو دیکھ کر ڈپٹی صاحب کی آتش شوق بھڑکی۔ بدلیا نے کہا کہ جو لڑکا آپ کے اجلاس میں پیش ہوا ہے وہ میرا لڑکا ہے۔ اور بالکل بے قصور ہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ لیکن بتاؤ اصلی چور کہاں ہے؟ بدلیا نے کہا اگر اصلی چور پکڑوا دیا جائے تو میرا بیٹا چھوٹ جائے گا؟" بولے "یقیناً" بدلیا نے کہا "تو رات کو بارہ بجے میرے ساتھ چلئے چور کو گرفتار کرا دوں گی"

حسب وعدہ ڈپٹی صاحب پہونچے۔ بدلیا نے اشارے سے دکھایا تو ایک نوجوان نقب لگانے میں مصروف تھا۔ ڈپٹی صاحب نے آگے بڑھ کر ریوالور اس کے سینے سے لگا دیا۔ اور بدلیا سے کہا میری جیب میں ہتھکڑی ہے اسے پہنا دو۔ بدلیا قریب آئی تو چور نے اسے پہچان کر کہا "ماں" ڈپٹی صاحب نے بدلیا سے کہا "یہ بھی تمہارا بیٹا ہے؟" بدلیا نے جواب دئیے بغیر ہتھکڑی ڈپٹی صاحب کی جیب سے نکالی اور نوجوان کے ہاتھوں میں پہنا دی۔ نوجوان نے فریاد شروع کی "ماں ماں!" بدلیا نے بگڑ کر کہا "ماں ماں کی رٹ کیوں لگا رکھی ہے۔ اب باپ باپ کہہ۔ دیکھ یہ تیرے باپ کھڑے ہیں جنہوں نے تیرے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنوائی ہے اور تیرے سینے سے ریوالور لگائے کھڑے ہیں۔ میں تیری ماں نہیں۔ تیری ماں انکے بنگلے میں ہیں۔"

ڈپٹی صاحب پر سارا راز منکشف ہو گیا۔ انکے اکلوتے بیٹے کو بدلیا نے غائب کیا تھا۔ ..... ڈپٹی صاحب غصہ سے بے قابو ہو گئے۔ ریوالور سیدھا کیا اور بدلیا پر فیر کر دیا۔ بدلیا لڑکھڑائی۔ اور ان کے قدموں کے پاس گر پڑی۔ ...... بیٹا ہتھکڑی بھرے ہاتھ جوڑے سامنے کھڑا تھا... انہوں نے جلدی سے اسکی ہتھکڑی کھول دی اور کہا "بھاگ جاؤ۔ جلدی!"

وہ مشکل سے گلی سے نکلا ہوگا کہ دوسرے فیر کی آواز سنائی دی۔ ... مدعی، مدعا علیہ سب سے بڑی عدالت کے سامنے پیش تھے۔

کتنا عبرت خیز انجام ہے۔ "کئے کا بھوگ" کی طرح یہاں بھی ہم ایک بدکردار کے برے انجام پر خوش ہونے کے بجائے کڑھتے ہیں۔ طبیعت میں رقت پیدا ہوتی ہے۔ اور خیال کسی ایک آدمی کے انجام پر ٹھہر کر اسکے برے بھلے پر سوچنے کے بجائے اسی طرح کے نہ جانے اور کتنے آدمیوں کے انجام کے

تصور میں غرق ہو جاتا ہے ایک آدمی کی بدی اسی طرح کے بہت سے آدمیوں کی بدی اور ایک آدمی کا انجام بہت سے آدمیوں کا انجام بن جاتا ہے۔ افسانے کے آخری چند الفاظ زندگی کے ایک بہت بڑے رخ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اور قاری کی نظر افسانہ ختم کرنے کے بعد اس دامن کے موڑ کبھی اور طرف نہیں جاتی کہ جب تک اس دامن پر اسکی نظر ہے زندگی کے غم کے ساتھ اس کا تعلق استوار ہے۔

معمولی کے ساتھ انسان کا کبھی نہ ختم ہونے والا رشتہ ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس رشتے کے بندھن میں اسی تعلق سے جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی تعلق سے اسکی آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ علی عباس حسینی کا فلسفہ حیات محبت، ایثار، قربانی، خدمت گزاری، وفاداری اور گہری دردمندی سے تشکیل پاتا ہے۔ ہر افسانہ اسی فلسفہ حیات کے کسی نہ کسی عنصر کی تعبیر یا تفسیر ہے۔ اس افسانے میں زندگی کی حقیقتیں بھی ہوتی ہیں اور حقیقتوں میں تخیل کا گہرا رنگ بھی ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تخیل کی صداقت زندگی کی صداقت پر یوں غالب آجاتی ہے کہ کہانی زندگی سے بہت مختلف ایک دوسری زندگی کی تصویر بن جاتی ہے۔ لیکن دردمندی کے فلسفے کی روشنی تصویر کے پردوں میں بھی جھلکتی رہتی ہے۔ جب تک یہ جھلکی رہتی ہے قاری کا دل رقت کی دولت بیدار سے مالامال رہتا ہے اور اس کا خراج عقیدت ان کی بارگاہ میں ہوتا رہتا ہے کبھی [illegible] کی صورت میں اور کبھی ان آنسوؤں کی صورت میں جو دل میں مچلتے رہتے ہیں اور سر مژگاں تک نہیں پہونچ پاتے

مقام پرورش آہ و نالہ ہے یہ چمن — نہ سیر گل کے لئے ہے نہ آشیاں کیلئے

آنجہانی راجہ پی سی لال، پورنیہ سٹی (بہار) کی اہم ترین شخصیتوں میں سے تھے اپنی اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے وہ دور دراز میں مشہور تھے۔ ان کی موت سے پورنیہ سٹی میں جو تاریکی پھیل گئی ہے اس کا احساس وہاں کے ہر باشندے کو ہے۔ دولت کے علاوہ علم اور ادب نوازی غربا پروری اور وضعداری راجہ صاحب کی وہ خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے ان کے جاننے پہچاننے والے ہمیشہ انہیں یاد رکھیں گے ان کی موت سے مجھے بجد صدمہ پہنچا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں جب بھی پورنیہ جاتا تھا اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا تھا تو وہ بڑی خوش خلقی، انکسار اور عزت افزائی کے ساتھ ملتے تھے۔ مجھے ان کے حادثہ انتقال پر ان کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔

د فالکٹ پوری

آہ! عابدین صاحب

موت کا سفاک چنگل صفتوں اور خصوصیتوں کو بھی نہیں بخشتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی اپنی پیہم کوششوں کے بعد خوبیوں کا جو مرقع تیار کرتی ہے موت کی خونیں نگاہ اس کے دل و جود کو چیرنے کے لئے زیادہ عجلت سے کام لیتی ہے۔

جناب زین العابدین صاحب پرنسپل پٹنہ کالج کے انتقال سے یہ حقیقت آشکار ہے، پرنسپل صاحب مرحوم ایک کامیاب و پر اثر شخصیت کے مالک تھے اپنے علم و فضل کی وجہ سے وہ علمی و تہذیبی حلقوں میں خاص عزت و احترام رکھتے تھے۔ موت نے آج انہیں بھی ہم سے چھین لیا ہے اور آج اس مبلغ علم و تہذیب کے اٹھ جانے سے تعلیمی و تہذیبی اداروں میں ایک اندھیرا ہے۔

ادارہ صبح نو مرحوم عابدین کے پسماندگان کے غم میں شریک ہے۔

ادارہ

وفا ملک پوری

علی عباس حسینی کے مذہبی نظریات و رجحانات

افسانوی ادب سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود جب بھی کبھی فرصت کے رات دن میسر ہوئے ہیں "تصور جاناں" کی جانسوزی سے بچنے کے لئے افسانوں کی دنیا میں پناہ لی ہے اور نہ اوروں کے فسانے سن سن کر خود اپنا فسانہ لکھنے کی کوشش کی ہے اب یہ نہ پوچھئے کہ اس کوشش میں کامیابی کہاں تک ہوئی۔

بہرحال، آپ اسے چاہے مری قدامت پرستی کہہ لیجئے یا اس کا کچھ اور نام دیجئے مگر یہ بات آپ سے نہیں چھپاؤں گا کہ مجھے جدید افسانہ نگاروں میں کوئی بھی اتنا متاثر نہ کرسکا جتنا میں قدیم افسانہ نویسوں سے متاثر رہا ہوں، بالخصوص منشی پریم چند، علی عباس حسینی اور شفیق الرحمن میرے پسندیدہ فنکاروں میں ہیں۔ پھر ان میں "پژمردہ کلیاں" اور "باسی پھول" کے مصنف کے نفحاتِ قلم نے خاص طور پر مشام جاں کو ہمیشہ معطر اور گلشنِ خیال کو برابر تر و تازہ رکھا ہے اور میں ہمیشہ ان کی شخصیت اور فن کے جمال و جلال کا معترف و معتقد رہا ہوں۔ اور کون علم دوست اور ادب نواز ہوگا جسے حسینی صاحب کے جیسے باوقار ادیب اور سدابہار فسانہ نگار سے عقیدت و محبت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمارے بزرگ محترم علامہ جمیل مظہری اور برادر مکرم جناب سہیل عظیم آبادی نے ماہنامہ "صبح نو" کا "علی عباس حسینی نمبر" نکالنے کی تحریک فرمائی تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے انہوں نے مرے ہی دل کی بات مرے کہے بغیر جان لی ہو اور پھر میں نے ان حضرات کے مخلصانہ مشورہ کے سامنے دیدہ و دل فرش راہ کردیا۔

صبح نو میں علی عباس حسینی نمبر کا اعلان ہوا اور مضامین کے لئے مستند اور مسلم الثبوت ادیبوں اور ناقدوں کو خطوط لکھے گئے جواب میں تقریباً ہر مکتب خیال کے اہل قلم نے اس تجویز کو سراہا، حوصلہ افزا خطوط سے ہماری تقویت کار میں اضافہ ہوا اور ہم نے ابتدائی کام شروع کردیا۔ اور مضامین آنا شروع ہوئے ـــــ آتے رہے ـــــ اور اب تک (جبکہ یہ نمبر تکمیل کی منزل میں ہے) آرہے ہیں اور مضامین نو کے اس انبار میں ترک و انتخاب کا سخت مرحلہ درپیش ہے۔

اشاعتی مضامین کے انتخاب میں یہ پہلو خاص طور سے ہمارے پیش نظر رہا کہ جناب علی عباس حسینی کے فن اور شخصیت کا کوئی گوشہ تشنۂ تشریح نہ رہ جائے اور یہ مقام اطمینان و امتنان ہے کہ "خاصان ادب" نے اپنے تراوشِ قلم سے ہمارے اس منصوبہ کو جامعیت بخشی اور علی عباس حسینی کی تہ دار شخصیت کے تمام خد و خال اور ان کے فکر و فن کے تمام مشترک عناصر ان کے افسانوں کی فضا، ڈراموں کے مناظر، تنقیدی کاوشوں کا انداز و آہنگ۔ غرض حسینی صاحب کی شخصیت اور فن کے تمام رنگ و رخ ہمارے سامنے آتے گئے اور اس بحر بیکراں کے لیے سفینہ سازی کا سامان مہیا ہوتا گیا اور جب ہم نے اس میں ایسے ایسے

تاحال اپنے فن کو حصہ لیتے ہوئے [illegible] کے ہو رہے " سفینہ رواں ہو سراب میں " تو خود بھی اس انجمن گل میں شرکت کی آرزو نے [illegible] شوق [illegible] ہمارے دوران سال رفیق کار برادرم علیم اللہ حالی نے اور بھی اس شوق کو ہوا دی انہوں نے اصرار کیا [illegible] اس نمبر میں [illegible] کی شرکت ضروری ہے [illegible] اب مضمون [illegible] کے لئے موضوع کی جستجو ہوئی۔ اس خصوصی اشاعت کے قلمکاروں نے کوئی موضوع چھوڑا [illegible] کہ بھول کے مضمون کو سونگھ سے باندھ کر اپنے پسندیدہ موضوعات پر اپنی گرفت کا ثبوت دیا تھا [illegible] کہ جو ہو " گفتگو [illegible] " ۔

[illegible] حسینی صاحب کی کتاب زندگی کا ایک ورق سادہ نظر آیا کسی نے حسینی صاحب [illegible] فرمائی نہیں کی حتی کہ دل میں یہ خیال ہوا کہ شاید یہ موضوع بنام [illegible] دیوانہ محفوظ ہو چکا ہو [illegible] داخل ہونے کا ایک راستہ [illegible] ہاتھ آگیا۔

[illegible] کہ فنکار پہلے فنکار ہوتا ہے اس کے بعد کچھ اور ــــــ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فن کار بھی ایک انسان ہی ہوتا ہے [illegible] زمین پر بسنے والا، وہ کوئی آسمانی فرشتہ نہیں ہوتا کہ اس کا زمین والوں سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ جس طرح عام انسانوں کے [illegible] خاندانی نسلی رشتے ہوتے ہیں، سماجی و مذہبی پابندیاں ہوتی ہیں، قومی و ملکی تہذیب ہوتی ہے اسی طرح ایک فنکار کا بھی خاندان ہوتا ہے، اس کا گھر ہوتا ہے، اس کے اعزا و احباب ہوتے ہیں، اس کا وطن ہوتا ہے، اس کا مذہب ہوتا ہے اور اس کی اپنی تہذیب و معاشرت ہوتی ہے اور کسی بھی فنکار کو ان رشتوں، ناتوں اور سلسلوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اردو ادب کے عظیم فنکار سید علی عباس حسینی بھی اگرچہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں بقول پروفیسر احتشام حسین " کچھ آبا و اجداد کے کارناموں کی یادیں، کچھ عربی، فارسی کی [illegible] تعلیم یعنی رسمی اخلاق اور مذہب کی بے روح تلقین کرتی ہے اور جس کی [illegible] بزرگوں کا احترام اور عقائد کا بے چون و چرا تسلیم کیا جانا ایک طرح کی لازمی نوعیت رکھتا ہے بلکہ انہیں کو اقدار حیات کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ "

مگر میں نے جب حسینی صاحب کی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لیا اور ان کو خود ان کے افسانوں کی فضا اور ناولوں کے پس منظر میں تلاش کیا، علمی و مذہبی تحریروں میں ڈھونڈا اور خطوط کے آئینہ میں دیکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ حسینی صاحب نے مذہب کی " بے روح " تلقین کو شاید کبھی قبول نہیں کیا اور عقائد کو " بے چون و چرا " تسلیم کرنے سے بھی گریز کرتے رہے۔ البتہ بزرگوں کے احترام کو غیر مشروط طور پر مان لینے کو انہوں نے اقدار حیات کے منافی نہیں سمجھا ہے۔

ان کے نزدیک مذہب کی روح " خدا کی اطاعت و بندگی اور مخلوق خدا سے محبت و شفقت ہے " ان کے مذہبی نظریات و رجحانات کے یہی دو ستون ہیں جن پر مذہب انسانیت کی پوری عمارت قائم ہے۔

مذہب کی کورانہ تقلید اور عقائد کو بغیر چھانے پھٹکے ہوئے اپنے اوپر عائد کر لینا کوئی دینی اور اسلامی خدمت نہیں ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ " ہم نے اپنے باپ دادا کو جس مسلک پر دیکھا ہم بھی اسی پر چلے جائیں گے " باپ دادا کے راستے پر چلنا (چاہے باپ دادا صحیح راستے پر نہیں رہے ہوں) اور خدا کی دی ہوئی دولت عقل فراست اور قوت غور و فکر کو بروئے کار نہ لانا، کوئی مذہب دوستی نہیں ہے روایت پرستی ہو تو ہو۔

علی عباس حسینی مذہب کے معاملے میں بھی روایت پرست نہیں ہیں وہ شیعہ اثنا عشری ہوتے ہوئے بھی قلادۂ تقلید کے قائل نہیں ہیں وہ " خوش اعتقادی اور پر خلوص مذہبیت " کے باوجود نذر و نیاز، رسوم و رواج اور غیر سنجیدہ مراسم شادی و غمی کو پسند نہیں کرتے، اور

بقول علی جواد زیدی " مذہب کو صرف روح کی بلندی اور نفس کا تزکیہ سمجھتے ہیں، مناظرہ بازی اور عصبیت کے بیری ہیں اور دامے درمے، قدمے سخنے اس کے خلاف جہاد کرتے رہتے ہیں "۔ دراصل ہیں ہے بھی ان کو معاملات مذہب میں جو ئے شیر خواں اور شبنمی مزاج ہی پایا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے مذہبی پابندیوں سے بچنے اور اعمال و اقدامات کو خلاصی کے لئے محض کچھ " فارمولے " بنا لئے ہوں اور نماز کو " ورزش " اور روزہ کو " فاقہ " سمجھتے ہوں، ایسا نہیں ہے۔ میں اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں کہ مجھے بھی چند دنوں ان سے قریب رہنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ دن میں پانچ وقت خدا کا نام بھی لیتے ہیں اور تھانے میں رپٹ لکھوانے جانے سے نہیں ڈرتے، سال میں کچھ دن روزے بھی رکھتے ہیں اور نماز عشا کا عادی نہیں پاتے، مجالس و محافل میں شرکت بھی کرتے ہیں اور ان کے گھر کا مذہبی ماحول بھی۔ ہم نے دیکھا ہے خدا کے فضل سے ان کی بیوی محترمہ اور بچیاں بھی (اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود) عبادت گزار ہیں۔ فریضۂ سحری کے وقت ان کے ان الفاظ نے " لڑکیو! اٹھو نماز کا وقت جا رہا ہے " گیتی و نازش سلمہا کو پیام بیداری بھی دیا ہے۔ ایمان و عمل صالح کے یہ مظاہرات ان کو مسلم و مومن ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی مذہبی خوبی جو راقم الحروف کو ان کی ذات میں بلکہ بات بات میں نظر آئی وہ معاملات مذہب میں ان کی کشادہ دلی و وسیع النظری ہے۔

ان کی تحریروں میں اخلاق و آداب اور انسانیت کی حفاظت کی جو کوششیں ملتی ہیں وہ بھی دراصل مذہب کی سچی روح سے متعلق ہیں، وہ مذہب اور انسانیت کو دو خانوں میں نہیں بانٹتے " بیوقوف " والے نام ماموں یا " نوروز " والی زکیہ کا کردار انہیں اسی لئے پسند ہے کہ ان میں مذہب اور انسانیت کی شیریں آواز ملتی ہے ان کی کردار نگاری کرتے ہوئے حسینی صاحب نے ان عناصر کو خاص طور پر اجاگر کیا ہے جنہیں لوگ مذہبی عناصر کہتے ہیں

حسینی صاحب مذہب (یا جسے وہ انسانیت کہتے ہیں) کے ذریعہ اخلاق کو عام کرنا چاہتے ہیں، دیکھئے گناہ کے بعد ندامت و پشیمانی کے احساسات جو جل پری کا کردار چھوٹا شہزادہ ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہے کتنا مذہبی کتنا اخلاقی اور کتنا انسانی ہے وہ کہتا ہے :-

> " اور مجھے خود اپنے سے نفرت معلوم ہونے لگی، میں ڈاکو تھا، بے زبانوں کمزوروں کی پونجی لوٹ لینے والا ڈاکو، میں نے ایک کنیز پر ہاتھ ڈالا تھا اس لئے نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی یا میں اس کا والہ و شیدا تھا بلکہ محض اس لئے کہ اس کا جسم میرے لئے خریدا گیا تھا، چند سکوں کے عوض اس کی پسند کا حق اس سے چھین لیا گیا تھا۔ باندی ہونے کے بعد وہ اسی طرح استعمال کی جا سکتی تھی، جس طرح بستر کی چادر یا تکیہ کا غلاف۔ "

اپنے نجی خطوط اور دوسری تحریروں میں حسینی صاحب کے اخلاق کی یہ وسعت زیادہ دور تک نظر آتی ہے۔ ذیل میں ہم حسینی صاحب کے ایک ایسے خط کا ایک حصہ نقل کر رہے ہیں جو ان کے اور پروفیسر سید صفدر علی صاحب مفسر قرآن و مصنف " احیاء الاسلام " کے درمیان ایک طویل خط و کتابت کا ایک جزو ہے۔ ان خطوط میں الہیات اور مابعد الطبیعات کے مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ حسینی صاحب نے قرآن کریم سے وہ آیتیں پیش کی ہیں جن کی بنا پر وہ غیر مسلموں کو بھی مستحق نجات اور حصول جنت کا حقدار سمجھتے ہیں

یہ مسئلہ بڑا بحث طلب ہے اور ان کے اس نظریہ سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے مگر اختلاف کیلئے بھی ایسے دلائل و براہین کی ضرورت ہے جو وزن و وقار رکھتے ہوں اور [illegible] قبول کرنے میں پس و پیش نہ کرے۔ اگرچہ یہ مراسلت حسینی صاحب اور [illegible] صاحب کے درمیان کی بات ہے مگر یہ کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک علمی مسئلہ ہے اور اس کے مخاطب اس وقت مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا [illegible] آبادی، مولانا مودودی اور سید العلماء مولانا سید علی نقی اور دوسرے علماء و مفسرین بھی ہو سکتے ہیں۔ [illegible] رکھنے والے اہل علم و ارباب فکر کا فرض ہے کہ وہ ان گتھیوں کو سلجھانے کی فکر کریں ممکن ہے یہ [illegible] ایک گراں قدر اضافہ کا سبب ہو سکے۔

[illegible] صاحب کے [illegible] درج ذیل ہے:۔

"میں نے اپنے پچھلے خط میں عرض کیا تھا کہ آپ جو تمام عیسائیوں اور ہندوؤں کو بغیر کسی استثنا کے کافر و مشرک [illegible] قرار دیتے ہیں اور انھیں مستحق عذاب قرار دیتے ہیں یہ امر آپ جیسے مفکر مفسر قرآن کے شایان شان نہیں۔ عیسائیوں اور ہندوؤں میں بھی موحد ہیں اور وہ بھی روز آخرت اور عذاب و ثواب پر یقین رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ سورہ احزاب میں تقریباً دس بارہ اقسام کے بندوں کی نجات کا وعدہ کیا گیا ہے۔ آپ نے میری [illegible] کا جو جواب دیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

(۱) "عیسائی، ہندو مذہب کے اصول عقلاً ثابت نہیں اور نہ وہ لوگ اس کے مدعی ہیں۔"

میں عرض کروں گا کہ اس جواب کے پہلے حصے سے دونوں مذہبوں کے بارے میں ہر مسلمان اور عیسائیوں کے بارے میں ہر ہندو اور ہندوؤں کے متعلق ہر عیسائی اتفاق کرے گا۔ مگر جواب کا دوسرا حصہ یعنی "نہ وہ لوگ اس کے مدعی ہیں" خلاف واقعہ ہے اور کم آگاہی کا نتیجہ۔ میرا خیال ہے کہ آریہ سماجیوں کی مذہبی تحریریں اور ہندو مفکرین نے اپنے مذہب کی حقانیت اور اس کے مختلف فلسفوں اور نظریوں کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں وہ غالباً آپ کی نظر سے نہیں گزری ہیں۔ یہی حالت عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اسی امر کا مدعی ہے کہ انہیں کا مذہب عقلاً درست و صحیح ہے۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ آپ ان مذاہب کے اصول کو عقلاً ثابت نہیں سمجھتے، لیکن باوجود اپنی کم نگاہی کے اعتراف کے، میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ لوگ اس کے مدعی بھی نہیں ہیں کہ ان کا مذہب عقلاً ثابت ہے!۔

(۲) سورہ احزاب کا جو میں نے حوالہ دیا ہے اس کے جواب میں آپ نے اس سے بھی عجیب تر بات تحریر فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:۔

"سورۂ احزاب میں دس بارہ اقسام کے مختلف بندوں کی نجات کا وعدہ نہیں ہے بلکہ ان کی نجات موعود ہے جن میں یہ دس بارہ اوصاف پائے جائیں۔"

میری عرض حسب ذیل ہے:۔

(الف) صرف ہندو اور عیسائی ہی نہیں بلکہ یہود اور لامذہبوں میں سے بھی جو شخص خدا کو واحد مانے، روز آخرت پر یقین رکھے اور عمل صالح کرے اس کی نجات کا خدا نے وعدہ فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ بقر۔ رکوع

ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر

وَعمل صالحًا فلهم اجرهم عند ربهم ۵ ولاخوف علیهم ولاهم یحزنون ۵ ”

” بینک مسلمانوں اور یہودیوں اور نصرانیوں اور لامذہبوں میں سے جو کوئی خدا اور روز آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتا رہے تو ان کے لئے ان کا اجر و ثواب ان کے خدا کے پاس ہے اور نہ (قیامت میں) ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ دل ہوں گے۔“ (ترجمہ مولانا فرمان علی)

ملاحظہ فرمایئے۔ مسلمانوں (مومنوں) کے ساتھ ساتھ یہودیوں، نصرانیوں اور سارے لامذہبوں کے لئے صرف تین شرطیں نجات کے لئے بیان کی گئی ہیں۔ (۱) وہ موحد ہوں (۲) وہ روز قیامت پر یقین کریں، اور (۳) وہ اچھے اچھے کام کرتے رہیں۔ ہندو مختلف نظریوں اور فلسفوں کے ماننے والے ہیں اس لئے وہ ”لامذہبوں“ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اور خدا، جو ہماری طرح ان کا بھی رب ہے۔ نجات کا وعدہ کرتا ہے بار شرط یہ ہے کہ وہ موحد ہوں۔ روز قیامت پر یقین رکھتے ہوں اور نیک اعمال ہوں۔ آپ کو اس دنیا میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں ایسے ہندو اور عیسائی ملیں گے جو موحد ہیں، روز آخر پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی زندگی میں اچھے اچھے کام کرتے رہتے ہیں، پھر بھی آپ ان سب کو خدا کے وعدے سے محروم کر دیتے ہیں۔ اور ملائے مسجد کی طرح سب کو مشرک و کافر کہہ کر معذب قرار دینا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ صرف صریحی زیادتی ہی نہیں، اپنے خدا کو جھٹلانا ہے اور اسی امر کو میں آپ جیسے مفکر مفسر قرآن کی شان کے خلاف سمجھتا ہوں۔

(ب) یہود اور نصاریٰ اہل کتاب ہیں۔ وہ یقینی محمدؐ رسول اللہ کی نبوت کے منکر ہیں، پھر بھی ان کے متعلق باری تعالیٰ جل شانہ کا حسب ذیل ارشاد ہے۔ (آل عمران ۱۲ رکوع)۔

من اهل الکتاب امةٌ قائمةٌ یتلون آیت اللہ آناء اللیل وهم یسجدون ۵ یومنون باللہ والیوم الآخر ویامرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات واولئک من الصالحین ۵ وما یفعلوا من خیر فلن تکفروه ط واللہ علیمٌ بالمتقین ۵

” اہل کتاب میں سے ایک گروہ ثابت قدم ہے، جو راتوں کو آیات خدا پڑھتے اور سجدے کیا کرتے ہیں۔ وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیکی کا حکم کرتے ہیں اور بدی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی لوگ صلحا میں سے ہیں اور جو نیکی بھی وہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اور اللہ پرہیزگاروں کے حال سے آگاہ ہے۔“

کیا اس خدائی تحریر کے بعد بھی آپ نصاریٰ کو نجات سے روک لیں گے؟ خدا خود ان کے پرہیزگاروں سے واقف ہے۔ ہمیں اور آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ ہم اس سے بھی زیادہ ان عیسائیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ ضرور معذب ہوں گے؟ نہ جنت ہماری، نہ جہنم ہمارا، نہ بندے ہمارے، مگر ہم عذاب و ثواب کے معاملے میں مالک و مختار بن بیٹھتے ہیں۔ اور اپنی اردو کے محاورے میں ”خدائی بانٹ“ بانٹنے لگتے ہیں! جس کے متعلق جی چاہا کہہ دیا ہم نے جنت دی، جس کے بارے میں جی چاہا فرما دیا ”جہنم میں جاؤ!“

یہ بات عصبیت کی دلیل ہے، تفکر کی نہیں! اور نہ یہ تعلیم اسلام ہے، جس کے معنی ہیں راضی برضائے الٰہی! آپ بظاہر اس کے جنت و جہنم بانٹنے کے طریقہ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں! کیا اسکی یہ فیاضی ناپسند ہے؟

(ج) قبل اس کے کہ میں سورۂ احزاب کی زیر بحث آیتیں نقل کروں۔ چاہتا ہوں کہ المعارج (آیتیں ۱۹ تا ۳۵) کی ان آیتوں پر بھی آپ نظر ڈالیں جو ان الانسان خلق ھلوعا۔ اذا مسہ الشر جزوعا۔ سے شروع ہوکر اولئک فی جنت مکرمون۔ پر ختم ہوتی ہیں۔ ترجمہ لکھے دیتا ہوں تاکہ میری گزارش واضح ہو جائے۔

" بے شک انسان حریص پیدا کیا گیا ہے۔ جب اس پر کوئی تکلیف پڑتی ہے تو بڑا گھبرا جانے والا ہے اور جب اسے دولت مل جاتی ہے تو (خیرات سے) بڑا روکنے والا ہے۔

ہاں وہ نماز پڑھنے والے اس سے مستثنیٰ ہیں جو اپنی نمازوں پر قائم رہنے والے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کے مالوں میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کا ایک مقررہ حق ہے۔ اور وہ لوگ جو فیصلے کے دن کو سچا جانتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ بے شک ان کے پروردگار کا عذاب ایسی چیز نہیں کہ اس سے بے خوف ہوجائیں۔ اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کو اپنی بیبیوں اور لونڈیوں کے سوا اوروں سے محفوظ رکھنے والے ہیں کہ اس صورت میں ان کو کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی۔ پس جو اس کے سوا خواہشمند ہوں تو ایسے ہی لوگ تو حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اپنی گواہیوں پر قائم ہیں اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایسے ہی تمام لوگ تو جنت میں عزت پائیں گے۔ "

چونکہ یہ آیتیں تمام انسانیت سے متعلق ہیں، اس لئے وہ اسلام سے قبل والے انسانوں پر اسی طرح صادق آتی ہیں جس طرح اسلام کے بعد والے انسانوں پر۔ اس لئے یہاں نماز کے معنی وہ نہیں ہیں جو مخصوص طور پر مسلمانوں کی نماز ہے بلکہ اس سے مراد ہے عبادت الٰہی۔ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم المرسلینؐ تک تمام طرق عبادت اس امر کو ملحوظ خاطر رکھ کر ان آیات پر جب آپ نظر ڈالیں گے تو سات طرح کے لوگ ملیں گے جن سے جنت میں عزت پانے کا وعدۂ الٰہی ہے۔ (۱) وہ لوگ جو اپنی نمازوں پر قائم ہیں (یعنی اپنے اپنے مذاہب کے مطابق عبادت کرتے ہیں) (۲) وہ لوگ جو سوال کرنے پر یا نہ سوال کئے جانے پر بھی اپنے مالوں کا ایک خاص حصہ خیرات کرتے اور مستحقوں کو دیتے ہیں (۳) وہ لوگ جو قیامت پر یعنی فیصلے کے دن پر یقین رکھتے ہیں (۴) وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں (۵) وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (۶) وہ لوگ جو سچے ہیں اور غلط گواہیاں نہیں دیتے۔ (۷) وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی اپنی نمازوں میں خضوع و خشوع سے کام لیتے ہیں اور ان عبادتوں میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہونے دیتے۔

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ ان سات اقسام میں کتنے غیر مسلم آگئے۔ اگر آپ نماز کو صرف مسلمانوں کے مخصوص طریقۂ عبادت تک محدود بھی کر دیں تو پانچ قسم کے عام لوگ اس سلسلے سے نہیں نکالے جاسکتے۔ (۱) خیرات کرنے والے (۲) روز جزا پر یقین رکھنے والے (۳) خدا کے عذاب سے ڈرنے والے (۴) شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور (۵) اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے سچے لوگ۔

(د) خیرات کرنے والوں کے متعلق بالکل الگ ایک جگہ صاف صاف وعدۂ نجات ہے۔ وہ ہے سورۂ الحدید میں حسب ذیل آیات:۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ

"یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور وہ جنھوں نے خدا تعالیٰ کو قرض حسنہ دیا ان کے لئے دو چند کر دیا جائے گا اور ان کے لئے نفع بخش اجر ہوگا۔"

دیکھئے حضور یہاں بھی نہ تو مسلم کی شرط ہے ورنہ موحد کی۔ صرف صدقہ دینے والوں اور خدا کو قرض حسنہ دینے والوں کو جنت کا وعدہ ہے۔ (امامؑ کا قول ہے کہ صدقہ دینے والوں کو دس گنا ملے گا اور قرض حسنہ دینے والوں کو اٹھارہ گنا)

(۵) اچھا اب سورہ احزاب کی ان آیتوں کو لے لیجئے جن کے حوالے کے سلسلے میں آپ نے اپنا یہ عجیب و غریب خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:۔

"سورہ احزاب میں دس بارہ اقسام کے مختلف بندوں کی نجات کا وعدہ نہیں ہے مگر ان کی نجات موعود ہے جن میں یہ دس بارہ اوصاف پائے جائیں۔"

غالباً آپ نے اس جواب کے لکھنے کے سلسلے میں ان آیتوں کو ملاحظہ کر لینے کی زحمت نہیں گوارا فرمائی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں انہیں نقل کر دوں۔ آپ انھیں بغور مطالعہ فرمائیں گے تو اس میں علیٰحدہ علیٰحدہ مختلف صفات کے بندوں سے وعدۂ اجر ہے۔ اور اس وعدے میں مرد اور عورتیں یکساں طور پر شریک ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:۔

ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والصابرین والصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات والحافظین فروجھم والحافظات والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجراً عظیما ۝

(دل لگا کے سنو) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کی بہ کثرت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، بے شک ان سب لوگوں کے واسطے خدا نے مغفرت اور بڑا بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے۔ (ترجمہ: از مولانا فرمان علی)

دیکھئے اس منقول ٹکڑے میں پروردگار مغفرت و رحم و کرم کے نیچے کتنے قسم کے لوگ آگئے۔ (۱) مسلم (۲) مومن (۳) فرماں بردار (۴) صابر (۵) فروتنی کرنے والے (۶) خیرات کرنے والے (۷) روزہ رکھنے والے (۸) شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے (۹) اور خدا کو بہ کثرت یاد کرنے والے اور یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں آٹھوں کے لئے موحد ہونے کی بھی شرط نہیں۔ (۱) صبر کرنے والے (۲) فروتنی کرنے والے (۳) خیرات کرنے والے (۴) شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے (۵) اور روزہ یا بہ کثرت رکھنے والے (اس لئے کہ مسلمانوں کا روزہ مسلم اور مومن کے صفات میں آچکا) واقعی رب العزت رحیم و کریم

وغفور و رحمن ہے! اور ہم ہیں کہ عقلی و نقلی دلیلیں دے دے کر اور خواہ مخواہ کی شقیں بڑھا بڑھا کر اس کی رحمت کو اپنے دستور کی طرح محدود بنائے دیتے ہیں! حالانکہ خود اپنی رحمت کو اس رحیم نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے!

اس لئے بہ ادب گزارش ہے کہ "احیاء الاسلام" پر نظر ثانی کرتے وقت آپ اس سے ایسے فقرات فرو نکال دیں جو لامذہبوں اور دیگر مذہب والوں کو بغیر کسی استثنا کے گمراہ و باطل قرار دیتے ہیں اور ان کے ماننے والوں کو ہر حالت میں مستحق عذاب ثابت کرتے ہیں۔ رب العزت خود جب بعض صورتوں اور حالتوں میں ان کی نجات کا وعدہ فرماتا ہے، تو میرے نزدیک آپ کا یہ فرمانا ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ "اور رسالت کے ساتھ ایمان نہ ہو تو وہ نجات کے لئے کافی نہیں!" معاف کیجئے گا ارحم الراحمین کے صاف اور صریح وعدے کے بعد اپنی طرف سے شرطیں بڑھانا ایمان نہیں، کچھ اور ہے! اس لئے بہ حیثیت ایک مخلص کے آپ کو اس جرأت بیجا سے باز رہنے کا مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں! اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ وہ صرف "محمد رسول اللہ" کہنے والوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا! اور نہ اس کی جنت اتنی چھوٹی ہے کہ اس میں صرف مومنین ہی کی سمائی ہو۔"

بندۂ اخلاص

علی عباس حسینی

مذکورہ بالا نظریات و رجحانات، طریق استدلال اور استنباط نتائج کی روشنی میں بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حسینی صاحب کے پاس ایک "بین الاقوامی" نظریہ مذہب ہے، وہ قرآن مجید کو ایک عالمی و آفاقی کتاب سمجھتے ہیں۔ اور اسے سارے عالم کے بنی نوع انسان کے لئے ہدایت نامہ تسلیم کرتے ہیں اور وہ اسلام کو اسی زاویہ فکر سے "پیش" کرنا چاہتے ہیں اور اس کو کسی وسیع سے وسیع حلقے میں بھی محدود کرنا کوئی مذہبی خدمت نہیں سمجھتے۔ دراصل اسلام کی صحیح اسپرٹ بھی یہی ہے۔ اسلام کا پیغام بین الاقوامی پیغام ہے، اس کا نقطۂ نظر عالمی ہے، اور اس کا خطاب ساری نوع انسانی سے ہے۔

میرے پاس حسینی صاحب کے کچھ ا ور خطوط ہیں جن سے ان کی مذہبی رواداری اور درد اسلامی کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنؤ میں سال گذشتہ مدح و قدح کی قدیم نزاعی بدعت دہرائی گئی اور نتیجہ میں وہاں افسوسناک شیعہ سنی تصادم ہوا۔ حسینی صاحب کے حساس دل پر اس سے چوٹ پڑی، انہوں نے لکھا:

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مسلمانوں کو کب عقل آئے گی اور وہ ہندوستان میں آپس کی یک دلی و یک جہتی کو کب سمجھیں گے۔ بہر حال میں ان سر پھرے شیعوں میں سے ہوں جو تبرا کو جزو ایمان نہیں سمجھتے دنیا میں آپ جتنے مذاہب دیکھیں گے وہ اپنے مذہب کی بنیاد اور اصل اصول صرف محبت بتائیں گے، خواہ وہ عملاً دوسروں کو بزعم خود جہنم واصل کرتے پھریں۔ پھر یہ آخر مذہب شیعہ کو کیا سوجھی ہے کہ وہ تبرا کو جزو ایمان کہے یا بتائے۔ اس لئے جب کبھی اس طرح کے فسادات ہوتے ہیں تو میں اس طرح کے خون خرابے کا باعث دونوں طرف کے ان علماء، واعظین، مبلغین اور ذاکرین کو سمجھتا ہوں جو اجتماعی نفسیات سے واقف ہوتے ہوئے بھی محض اپنی شہرت اور جیبیں گرم کرنے کے لئے

دونوں طرف کے مجمعوں کو بھڑکاتے ہیں اور انہیں مشتعل کرتے ہیں اور اس طرح کے فساد میں مارے جانے والوں کو جنت نعیم کا مژدہ سناتے ہیں ۔" "اللہ رحم کرے سنیوں پر، شیعوں پر اور اس ملک کے ہندوؤں پر بھی جہاں مذہب کے نام پر آدمیت و انسانیت کا بے وجہ خون ہوتا رہتا ہے اور قاتل اپنے ہم وطن، پڑوسی اور بھائی کو جان سے مار ڈالنا کارِ ثواب سمجھتا ہے ۔"

زبانِ قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ حسینی صاحب کے اس سوزِ دروں کا پتہ دیتے ہیں جو اسلام اور انسانیت کے لئے حسینی صاحب کے دل میں ہے ۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اگر علی عباس حسینی جیسے شیعہ اور خواجہ حسن ثانی نظامی جیسے سنی ہندوستان و پاکستان میں ابھر آئیں تو اسلام کے ان دو اہم فرقوں میں کوئی مغائرت و منافرت باقی نہ رہے اور ہمیشہ کے لئے رزم و پیکار کا سدباب ہو جائے ۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے ماہنامہ منادی دہلی ۱۹۶۴ء کا گیارہواں شمارہ)

ماضی قریب میں ماہنامہ کتاب لکھنؤ کے کسی شمارہ میں کوثر چاندپوری صاحب کی ایک کہانی "جور راستے" چھپ گئی جس سے شیعوں کے عقائد پر بالواسطہ ایک ہلکی سی چوٹ پڑ رہی تھی ۔ مدیر سرفراز نے کوثر صاحب اور اس سے زیادہ مدیر کتاب کے خلاف بڑا ہی تیز و تند اداریہ لکھا اور تمام ہم مذہب اہل قلم کو بھی تند رو کی طرح للکارا ۔ سچی بات یہ ہے کہ موقر معاصر کا یہ لب و لہجہ ہمیں بھی پسند نہ آیا اور حسینی صاحب قبلہ نے بھی ہمیں لکھا :

"کیا ہمارا مذہب اتنا ہی تنگ نظر ہے ؟ میں تو بھائی اس کا قائل ہوں کہ اپنے عیب کو دور کرو، تب جا کر عیب جو کو ٹوکو ۔ غور تو کیجئے کتنی پیشہ ور مستورات مدد کرتی ہیں کیا ان کی نذر کو جائز سمجھا جائے؟ اور اگر کوئی حرمت ظاہر کرے تو اس پر چراغ پا ہونا اپنا منصب سمجھا جائے ۔"

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسینی صاحب کا دل کتنا کشادہ اور ان کی نظر کتنی وسیع ہے اور یہی وسعتِ قلب و نظر اور خلوصِ فکر و خیال ان کی سیرت و کردار اور اعمال و افکار میں ہر جگہ نمایاں ہے ۔

اردو کتابوں کا اہم اور نایاب ذخیرہ

ہمارے یہاں بہترین علمی، ادبی، مذہبی اور قومی کتابیں، تاریخی، اصلاحی، جاسوسی اور رومانی ناولیں نیز نظم و غزل کے بلند پایہ مجموعے ملک کے مشہور اور نامی مکتبوں کی تصانیف و تالیف آپ اپنے جانے پہچانے مشہور اور محبوب شاعر، ادیب، نقاد اور ناول نگاروں کی بہترین تخلیقات ہم سے طلب کر سکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی کورس کی کتابیں بھی ہمارے یہاں دستیاب ہو سکتی ہیں ۔

اپنی پسند کی کتابوں کے لئے ہمیں نہ بھولیئے ۔

کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ - ۴

بہار اسٹیٹ کوآپریٹو مارکٹنگ یونین لمیٹڈ

مغرب لان، پٹنہ

● زیادہ غلہ اُپجانے کو استعمال کریں ●

۱۰ ہارس پاور کا جاپانی ٹریکٹر کا دواور جوتی کرنے اور کیاری بنانے کی مشینوں کے ساتھ جو خاص اٹیچمنٹ کی حیثیت سے ہوں گے ہر ایک کی حیرت انگیز کم قیمت ۵،۰۰۰ روپیہ (سیلز ٹیکس علاوہ) ہے۔ مناسب جوتائی کیلئے مکمل طور پر ترقی یافتہ زرعی آلات بھی دستیاب ہیں۔

فصلوں کی مناسبت سے کھاد کا مکسچر بنیادی شئے کی حیثیت سے استعمال کیا جانا چاہئے۔ جبکہ یوریا اور کلشیم امونیم نائٹریٹ (سستی ان کھاد) ٹاپ ڈریسنگ کی حیثیت سے بونے اور پودے لگانے کے تین ہفتے بعد استعمال کئے جائیں ــــــــ ہیڈ آفس یا آرہ کریڈٹ ایگریکول ڈپو سے پاور ٹیلرس کیلئے رابطہ قائم کریں۔ آلات اور کھادوں کیلئے ریاست میں تمام ایگریکول ڈپوؤں اور سیل مرکزوں سے خط و کتابت کریں۔

● **جوندسنگھ** ●

(آئی۔ اے۔ ایس)

مینجنگ ڈائرکٹر بہار اسٹیٹ کوآپریٹو مارکٹنگ یونین لمیٹڈ

علی عباس حسینی

میری زندگی کے چند اوراق پریشاں

[[illegible] نائیل عظیم آبادی علیم اللہ حالی اور نریش کمار شاد کے سوالات کی روشنی میں ....]

(۱) سن و مقام ولادت | میں موضع بارہ ضلع غازی پور (یوپی) میں ۳ فروری ۱۸۹۷ء ۲۹ شعبان ۱۳۱۴ھ

(۲) موضع بارہ

کو پیدا ہوا۔ والد ماجد کا اسم گرامی محمد صالح تھا۔ بارہ سادات حسینی کی بستی ہے۔ انکے مورث اعلیٰ ملک السادات سید مسعود غازی حسینی الترمذی السہسوانی تھے۔ یہ سید مسعود انہیں سید محمد توختہ حسینی ترمذی کی نسل سے تھے جن کا مزار لاہور میں ابتک مرجع خلائق ہے۔ چونکہ نقوش، لاہور نمبر میں سید محمد توختہ کے حالات و اولاد کے ذکر سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ انکے صرف دو بیٹیاں تھیں، ذکور اولاد نرینہ میں سے کوئی نہ تھا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید مسعود غازی حسینی الترمذی کا سلسلہ نسب بیان کر دیا جائے جو درج ذیل ہے۔

سید مسعود غازی حسینی الترمذی السہسوانی ابن سید جلال الدین ابن سید عبدالرحید ابن سید عبدالحمید ابن سید حسن ابن سید سلیمان کفار شکن ابن سید زید شہید ابن سید احمد زاہد سہسوانی ابن سید حمزہ ابن سید ابوعلی ابن سید مرتضیٰ المعروف بہ سید عمر ابن سید محمد توختہ ابن سید احمد توختہ سید السادات (مثال رسول) مدفون بہ لاہور۔

سید محمد توختہ کا سلسلہ نسب حضرت حسین اصغر ابن امام چہارم حضرت علی ابن الحسین علیہم السلام تک ختم ہوتا ہے اسلیے انکی اولاد اپنے کو حسینی یا عابدی کہتی ہے۔ بعض حضرات صرف ترمذی لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

سید مسعود غازی نے بارہ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۳۰ء میں فتح کیا تھا۔ سلطان نے بطور اظہار خوشنودی انہیں "ملک السادات" اور "غازی" کے خطابات عطا فرمائے اور اسے بطور جاگیر کے انہیں اور انکی اولاد کو عطا فرما دیا۔ سید مسعود نے یہاں ایک شہر بسایا اور اسکا نام غازی پور رکھا۔ انکی اولاد اس ضلع کے پانچ دیہاتوں میں آباد ہے۔ جن کے نام گنگولی۔ بگھولی بزرگ۔ تاج پور۔ نونہرہ۔ اور محی پور بارہ ہیں۔

(۳) بارہ کی آبادی اسکے بازار اور میلے | بارہ کی آبادی تقریبًا ڈھائی ہزار ہے تیس تیس گھر سادات کے ہیں۔ بقیہ دوسری اقوام کے ہیں۔ مسلمانوں میں کنجڑے، قصاب، دھنیے، جولاہے، نائی، درزی اور مخلوط النسل پٹھان ہیں۔ ہندوؤں میں صرف ایک گھر برہمن کا ہے اور ایک گھر کا ستھ کا۔ ٹھاکر و راجپوت پوری بستی میں کوئی بدیسی نہیں رہتا۔

۱؎ برادر عزیز سید امتیاز حسین ترمذی ایڈووکیٹ حال مقیم [illegible] پٹنہ سیٹی (خواہر زادہ عالی جناب خان بہادر سید علی احمد خاں مرحوم) بگھولی بزرگ کے رہنے والے ہیں۔

مالی امیر۔ چمار، کوری، کنجڑے، دھوبی وغیرہ الگ محلے ہیں جو امیر پوری، چمار ٹولی اور کوئیری ٹولہ کے نام سے موسوم ہیں۔ دوسری قوموں میں ڈھولی، پاسی، نہار، حلوائی، نونیا، لوہار، سونار، بڑھئی، سلاخ گر، موچی وغیرہ۔ ڈوم، نٹ، بہروپیے اور بیٹھنے کے لوگ موجود ہیں۔ تین چار گھر بڑھیا اور کے بھی ہیں۔ پیاز لانے کی دوکان سکتے ہیں اور کبھی [illegible] میں واپس نہ پہنچی بہت تستے۔

جب تک زمینداری نہ ٹوٹی تھی سادات زمیندار تھے اور یہ سب رعایا پرجا سمجھے جاتے تھے۔ اب سب سے خراب حالت میں سادات ہیں [illegible] مسعود غازی حسنی الترمذی کی اولاد [illegible] حکومت نقش دکھائی دے رہی ہے

میرے بچپن کا بارہ} میں ایسے زمانے میں پیدا ہوا تھا جب بارہ سیر گیہوں روپے کا ملتا تھا اور گھی دو روپے کا۔ ہمارے ہاں کا سیر اٹھائیس گنڈے کا ہوتا تھا۔ اور شہروں کا انگریزی سیر بیس گنڈے کا۔ ہمارے دیہاتوں میں اس وقت گورکھپوری پیسہ بھی چلتا تھا۔ اور اس کا ایک آنہ بجائے چار کے پانچ پیسوں کا ہوتا تھا۔ اس پیسے کو "ٹکہ" "دھیلا" بھی کہتے تھے۔ کوڑیاں بھی سکوں میں داخل تھیں۔ اور مٹی ڈھونے کی مزدوری "کوڑی کھیپ" کے حساب سے دی جاتی تھی۔ بارہ اور نو شہروں میں ہر ساتویں دن بازار لگتا تھا اور میلوں ٹھیلوں کی طرح ان میں نٹ کا تماشہ بھی ہوتا۔ بھالو بندر بھی نچائے جاتے۔ مرغ، تیتر اور مینڈھے بھی لڑائے جاتے تھے۔ نوجوانوں میں ورزش کا شوق تھا۔ گاؤں میں کئی اکھاڑے تھے اور ان کے الگ الگ خلیفہ۔ "پچیاں" کے دن ہر اکھاڑے میں مقابلے کی کشتیاں ہوتی تھیں۔ سادات زمیندار زادوں کے طریقے کے خلاف میں نے ان بازاروں میلوں کی خوب سیر کی ہے۔ "پچیاں" کے دن اکھاڑوں اکھاڑوں گھوما ہوں اور ہر قوم کے تیج تہوار، شادی بیاہ میں میں نے شرکت کی ہے۔ میں نے اپنے دیہاتوں میں کھایا جانے والا ہر کھانا کھایا ہے۔ چھوٹے بڑے کا گوشت، لال مرچیں، کھٹائی، گھی، تیل، مٹر، چنا، مختلف طرح کی ترکاریاں، ہر قسم کے پھل سب کچھ کھایا ہے اور اب اس عمر میں بھی کسی قسم کا "پرہیزی کھانا" نہیں کھاتا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ معدہ اپنے فرائض کی انجام دہی سے

اغماض نہیں برتتا۔

دیہاتوں سے متعلق میری کہانیوں میں آپ انہی کرداروں کو پائیں گے جن میں میں پلا بڑھا ہوں اور وہی فضا پائیں گے جسے میں نے دیکھا اور برتا ہے۔ میں ان کے لیے باہری اور اجنبی نہیں ہوں۔ میں اسی چمن کا کیڑا ہوں۔

میں دیہاتی بھی ہوں} اسی کے ساتھ میں شہری بھی ہوں اور اب تو گویا لکھنوی ہو گیا۔ شہری بھی} اٹھارہ برس شہروں میں تعلیم پائی، نوکری کی اور اب ریٹائر ہو کر بجائے اپنے گاؤں واپس جانے کے لکھنؤ میں ایک کرایے کے مکان میں پڑا ہوں۔ اپنی عمر کے اکتیس برس میں نے اسی شہر میں گنوائے ہیں۔ "لکھنؤ ہم پر فدا" ہو یا نہ ہو" ہم "فدائے لکھنؤ" ضرور ہیں۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ لکھنؤ والے اپنے ادیبوں کی نہ زندگی میں قدر کرتے ہیں نہ مرنے کے بعد۔ میر تقی میر، مرزا سودا، ناسخ و آتش کے مزارات تک کا پتہ نہیں۔ اسی شہر میں مرنے اور دفن ہونے کا ارادہ بھی ہے۔ اسلئے کہ اردو زبان کے طالب علم کے لیے جو اس کی خاک پاک میں کشش ہے وہ کہیں نہیں۔ اب بھی جبکہ افراط سہل پسندی نے بول چال کی زبان تک کو قبرستان گھاٹ کے مسافروں کا روپ دے دیا ہے اس البیلے شہر کے بعض حصوں میں ایسی نکھری ستھری زبان بولی جاتی ہے اور لب و لہجہ میں وہ شیرینی ہوتی ہے کہ سننے والے کو شہد و شیر کا مزہ آجاتا ہے۔

یہاں مرنے کے بعد تو کسی نے پوچھا تو کیا، نہ پوچھا تو کیا؟
ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے
لحد میں ہم تو اکیلے رہیں گے!

خاندان} میرے جد امجد مولانا سید حسین اصغر اور میرے نانا سید جعفر علی موضع بجوی ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے زیدی[1]

[1] زیدی، حسینی اور عابدی ہی ہیں۔ امام چہارم علی ابن الحسین کے تین صاحبزادے امام محمد باقر، اور حضرت حسین اصغر اور حضرت زید شہید۔ سادات بارہہ جنکے بارے میں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے کہا تھا "سادات بارہہ درکار زار ہا کارہائے نمایاں کردند" اور جو بخاری سادات سمجھے جاتے ہیں انہیں زید شہید کی نسل سے ہیں۔

سید تھے مگر دادی اور نانی دونوں بارہ کی تھیں۔ دادا اور نانا دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کی خاطر اور اپنی اپنی ملازمتوں کی دوری کے باعث بارہ ہی کو مسکن بنایا اور والد و والدہ دونوں بارہ ہی میں پیدا ہوئے اور عمر بھر وہیں رہے۔ میں بھی وہیں پیدا ہوا اور اسلئے باردی ہوں۔

میرا ددیہال مولویوں کا خاندان ہے اور ننیہال سرکاری حکام کا۔ نانا مرحوم حیدرآباد دکن میں تعلقہ دار تھے اور ان کے اکثر عزیز پولیس کے انسپکٹر اور سب انسپکٹر۔ دادا مرحوم نواب سید لطف علی خاں سی آئی ای (گذری پٹنہ سیٹی) کی باؤلی کی مسجد میں امام جمعہ وجماعت تھے۔ عمر بھر پٹنہ ہی میں رہے۔ سوائے عشرہ محرم اور خاص خاص تقریبوں کے بارہ تشریف نہ لے جاتے تھے چنانچہ وہیں پٹنہ میں انکا انتقال بھی ہوا اور وہیں نوابین گذری کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام تھے مولانا سید محمد علی۔ مولانا سید محمد صالح۔ اور سید محمد اسحاق الحسینی۔ دادا مرحوم کے انتقال کے بعد مولانا سید محمد علی مرحوم باؤلی کی مسجد کی امامت کے فرائض کی انجام دہی پر مامور ہوئے مگر جوانی ہی میں وہیں پٹنہ میں انتقال فرمایا اور اپنے والد کی بغل میں دفن ہوئے۔ والد مرحوم سے جب امامت مسجد کے فرائض ادا کرنے کی خواہش کی گئی تو باوجود صاحب اجازہ ہونے کے انہوں نے اس فریضہ کا بار اپنے سر لینا پسند نہ کیا۔ اس عہدے کے فرائض جد امجد کے عزیز شاگرد مولانا سید گدا حسین صاحب زنگی پوری (حضرت ثلیس زنگی پوری کے جد امجد) کو تفویض کئے گئے اور والد نے بارہ میں بیٹھ کر ایک چھوٹے سے خوشحال زمیندار کی زندگی بسر کی۔

پٹنہ سے نسبت خصوصی

پھوپھیوں میں سب سے چھوٹی پھوپھو کی شادی نواب لطف علی خاں کے سب سے چھوٹے صاحبزادے نواب سید اکبر علی خاں عرف چھوٹے نواب کے ساتھ ہوگئی۔ عم محترم محمد اسحاق الحسینی انہیں کے ہمراہ پٹنہ میں رہتے اور اپنے بہنوئی اور بعد میں اپنے بھانجے نواب زادہ سید محمد مہدی عرف میاں سلمہٗ کی اسٹیٹ کی منیجری کے فرائض ادا کرتے تھے۔ انکی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں کٹا۔ چونکہ میری پہلی بیوی انہیں چچا صاحب کی صاحبزادی تھیں اور پٹنہ ہی میں پیدا ہوئیں، پلیں اور بڑھیں اسلئے پٹنہ ایک طرح میری سسرال ہے اور میں بہ فخر کہہ سکتا ہوں کہ ع

پٹنہ سے اس حزیں کو بھی نسبت ہے دور کی

تعلیمی منازل، پٹنہ، غازی پور، الہ آباد اور لکھنؤ

اس شہر سے ایک اور نسبت بھی سن لیجئے۔ دس برس کے سن میں پہلے وطن میں گھر تمام کر کے چھوٹے نواب کے ساتھ جامع عباسی ختم کی ہی تھی کہ عم محترم مجھے اپنے ہمراہ پٹنہ لے گئے۔ یہاں پھوپھی صاحبہ مرحومہ (والدہ نواب زادہ محمد مہدی سلمہٗ) اور ان کے درمیان خاصی رسہ کشی رہی کہ بھتیجا کس کے ہاں قیام کر کے تعلیم حاصل کرے۔ جیتے چچا صاحب ہی۔ میں انہیں کے ہاں رہا اور میرا نام مدرسہ سلیمانیہ[1] میں لکھوا دیا گیا۔ میرے داخلے کے وقت یہ مدرسہ ڈپٹی احمد علی خاں مرحوم کے مکان میں تھا۔ اور موجودہ عمارت زیر تعمیر تھی۔ ایک سال پرانی عمارت میں اور ایک سال نئی عمارت میں میں نے تعلیم پائی۔ اور شرائع پڑھ رہا تھا کہ طے کیا گیا کہ مجھے انگریزی تعلیم دلوائی جائے اور میں محمڈن اسکول کے چھٹے درجے میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ درجہ بہ امتیاز خاص پاس ہی کیا تھا کہ سخت بیمار پڑا اور بارہ لایا گیا۔ بعد صحت والدہ نے پٹنہ جانے کی سخت مخالفت کی۔ اسلئے غازی پور کے جرمن مشن اسکول میں (جو اب سٹی انٹرمیڈیٹ کالج کہلاتا ہے) ساتویں درجے میں نام لکھوا دیا گیا اور شہر میں قیام و طعام کا انتظام کر دیا گیا۔ یہ انتظام مجھے ناپسند تھا اسلئے کہ میں نے وہاں گاؤں میں کرکٹ ٹیم بنا رکھی تھی۔ ہر روز

---

[1] سلیمانیہ مدرسہ میں مجھے مولانا سید فرمان علی صاحب قبلہ مرحوم کی شاگردی کا بھی فخر حاصل ہوا۔ وہ مدرسہ کے مدرس اعلیٰ تھے۔ اس مدرسہ میں میرے دوران تعلیم ہی میں مولانا نے قرآن کے ترجمے اور تفسیر کی تکمیل اور اردو میں شیعہ دینیات کی درسی کتابوں کا وہ سلسلہ شروع فرمایا جو بعد میں صد درجہ مقبول ہوا ..... نواب سید محمد صاحب مرحوم متولی وقف امام باندی بیگم صاحبہ مرحومہ گذری باغ پٹنہ۔ علی اکبر صاحب کاظمی مرحوم ڈائرکٹر تعلیمات کشمیر۔ جناب سید علی خاں ریٹائرڈ چیف انکم ٹیکس اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب مظفر پوری میرے ہم سبق تھے۔

طے ہوا کہ "گر بہ کشتن روز اول" کے مصداق اس بلی کو ختم کر دیا جائے اور اس غرض سے دریا میں پھینکوا دیا جائے۔ ملازم اسے ٹوکرے میں بند کرکے پیٹھ پر لاد کر چلا۔ راستے میں بڑھنے بورا کاٹا اور بجائے اسکے کہ کود کر بھاگ جاتی اس نے اپنی بلی کی گردن پر منہ مارا۔ وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگا اور گھر پلٹتے ہی شور مچایا کہ "اس بلی پر کوئی جن سوار ہے"۔ دو دن بلی غائب رہی۔ تیسرے دن آتے ہی اس نے ایک مرغی پر حملہ کیا۔ پکڑ کر بند کر دی گئی اور ایک مجھے سپرد کی گئی۔ میں نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے اسے محمڈن اسکول کے ایک گہرے اندھے کوئیں میں ڈال دیا۔ دوسرے ہی دن وہ اس سے نکل کر پھر گھر آنے لگی۔ تین چار روز بعد اس نے پھر ایک مرغی کو دبوچا اور پھر پکڑ لی گئی۔ میں شام کو اسکول سے کھیل کر پلٹا تو بلی کی شکار کردہ مرغی اور گرفتار شدہ بلی کا مقدمہ پھر میرے سامنے پیش ہوا۔ میں نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ میں اسکے اب سے ضرور مار ڈالونگا۔ چنانچہ میں نے بلی کی دونوں پچھلی ٹانگیں پکڑ کر اسے پتھر کی دہلیز پر دھو ڈالا۔ اسکا سر اور کلا پھٹ گیا۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ مرگئی تو میں اسے گھر کے باہر مزبلے پر پھینک آیا۔ شب میں چچا صاحب کو جب یہ روداد سنائی گئی تو وہ بہت خفا ہوئے کہ اس بلی کو کیوں مارا وہ آسیب زدہ ہے۔ اب دیکھئے ان صاحبزادے کی اس حرکت کی وجہ سے کیا آفت آتی ہے۔"

جب انہوں نے اپنے بستر پر آرام فرمایا تو میں لالٹین لے کر باہر گیا کہ دیکھوں وہی گھورے پر پڑی ہے کہ کوئی کتا اسے کھا گیا۔ وہ وہاں سے غائب تھی۔ یقین ہو گیا کہ کوئی جانور اسے کھینچ لے گیا۔ مگر تیسرے ہی دن اطلاع ملی کہ بلی کھپریل پر دکھائی دی اور اس نے چھتوں ہی چھتوں پورے گھر کا تین چکر لگایا اور نہایت بھیانک آوازیں "میاؤں میاؤں" کرکے لنگڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اسی دن شام کو جب میں "بڑی حویلی"[۱] میں بیٹھا نواب زادہ سے گپیں لڑا رہا تھا کہ آدمی آیا "فوراً گھر چلو۔ بلایا ہے"۔ وہاں جاکر دیکھا تو عجیب

گا کھلا ہے۔ صحن میں پلنگ نکلے ہوئے تھے اور ان پر بستر اور سفید سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ مگر ہر پلنگ پر بلی کے پنجوں یا انسانی انگلیوں اور ہاتھ کا خون بھرا نشان پڑا تھا۔ یہی حالت دہلیزوں دیواروں محرابوں اور کھمبوں کی تھی۔ ہر جگہ کا ہاتھ دھو ڈالا۔ کسی جگہ کوئی خراش بھی نہ تھی۔ چچا صاحب کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھی صحبت احباب سے اٹھ کر آئے۔ دیکھ کر مجھ پر برہم ہوئے کہ دیکھا "یہ ہے آپ نے اپنی حرکتوں کا نتیجہ!" پھر ہر ایک پر آیۃ الکرسی دم کی ہر ایک سے تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھوایا۔ پھر ہمارے پلنگوں کے گرد دعائیں پڑھ پڑھ کر حصار باندھا جب جاکر سونا نصیب ہوا۔ صبح کو شیعہ مسجدوں کے پیش نماز اور مدرسہ سلیمانیہ کے کئی مولوی جمع ہوئے ہر کمرے اور دالان میں دعائیں پڑھی گئیں۔ تعویذ لٹکائے گئے اور ہم لوگوں نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ مگر چوتھے ہی دن ایک شب کو چچا صاحب کے باہر سے آنے پر حسب دستور خوان بچھا اور کھانا چن دیا گیا اور حسب معمول انہوں نے اپنی پلیٹ میں قورمہ نکالا اور اس میں لقمہ تر کرکے نوالہ اٹھایا تو انہیں اس میں انسانی فضلے کی بو محسوس ہوئی۔ انہوں نے نوالہ پھینک دیا اور پلیٹ اٹھا کر سونگھی اور اسے صحن میں پھینک دیا۔ ہم میں سے جو بھی اپنی پلیٹ سونگھتا ہے اس میں سے اسی طرح کی تعفن آرہی ہے غرض ساری پلیٹیں اور قورمے کے پیالے پھینک گئے۔ ہم نے دال روٹی کھانے پر اکتفا کی اور باورچن کو خوب صلواتیں سنائیں۔

صبح کو چچی صاحبہ نے گوشت اپنی نگرانی میں بھنوانا شروع کیا۔ ابتدا میں تو وہ سوندھی سوندھی خوشبو تھی کہ سبحان اللہ! مگر تھوڑی دیر بعد دفعتاً وہی سنڈاس والی بو سے ناک سڑنے لگی ساری پتیلی پھینکی گئی بس ترکاری ہی پر صبر کرنا پڑا۔ پھر سہ پہر کو باورچی خانے کے ہر کونے سے اس طرح کی بو آنے لگی جیسے چھچھوندریں مری ہوئی پڑی سڑ رہی تھیں۔ فوراً راج مزدور بلوائے گئے۔ کونا کونا کھرچ کر صاف کرا دیا گیا قلعی کرائی گئی۔ پائے نکس دیمور نک کے برابر نک کے سوراخ بند کرائے گئے۔ مگر بو کو نہ جانا تھا نہ گئی۔ صحن میں چولہا جلا کر کھچڑی ابالی گئی اور

[۱] نواب زادہ کے آبائی مکان کا نام ہے۔

اور سب نے دو دو چار چار نوالے کھا کر خوف و ہراس کی چادر اوڑھ کر سوتے جاگتے رات کاٹی۔ صبح سویرے ہی بانکی پور اور دانا پور سے پیتی ور عامل اور شاہ صاحبان بلائے گئے اور آسیب کا تدارک ان کے سپرد کر دیا گیا۔ جو ہیں گھنٹے کے لئے عورتیں بچے پھوپھی صاحبہ کے ہاں بھیج دیئے گئے اور گھر عاملوں سیانوں اور ملاؤں کے سپرد کر دیا گیا۔ دوسرے دن اطلاع ملی کہ ایک بڑا ہی خبیث جن تھا جو گرفتار کر کے بوتل میں بند کر کے گنگا ندی کے بہت گہرے میں دفن کر دیا گیا ہے اب کوئی خطرہ نہیں۔ مزید احتیاط کے طور پر گھر کے ہر کونے میں دعائیں دم کر کے کیلیں گاڑ دی گئیں۔ اور ہر حصے میں تعویذ لٹکا دیئے گئے اس لیے اب گھر ہر طرح مامون و مصئون ہے۔ اور حقیقتاً ہوا بھی ایسا ہی۔ اب نہ بوٹی نہ کھانوں کی خرابی اور نہ گھر میں وہ ڈراؤنی فضا۔ سب لوگ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ لیکن اسی ہفتے میں میں بیمار پڑا اور اتنی شدت سے ٹائیفائیڈ ہوئی کہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی والدہ ردولی بیٹھتی پار سے آئیں اور اسی حالت میں انھیں وہاں اٹھالے گئیں۔ تین مہینے بیمار رہا پھر نہ جانے دیہاتی حکیموں کے علاج سے یا تعویذ گنڈوں کی برکت سے یا وطن کی آب و ہوا کے صحت مند اثر سے اچھا ہوا تو کافیہ شافیہ کو بسم اللہ سے تمت بالخیر تک فرفر زبانی سنانے والا حافظہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ بس نام نہاد ذہانت اور طباعی رہ گئی جس کی بدولت میں آج بھی آپ کی سرکار میں حاضر باتیں بنا رہا ہوں۔

میں مسلمان ہوں ادھر کئی سال سے بعد نماز صبح تلاوت قرآن بھی کرتا ہوں اسلئے جنوں کا قائل ہوں مگر میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ اس قوم کو اپنی سواری کے لیئے کتے اور بلی کیوں پسند ہیں۔ یا تو پری چہرہ حسینہ یا پھر میاؤں میاؤں کرتی بلی! اور یا پھر چیں چیں کرتا ہوا کالا کتا۔ لاحول ولا قوۃ!

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

غرض یہ تھے بچپن کے دو اہم واقعات جنہوں نے میری زندگی کو خاص طور سے متاثر کیا۔ ایک نے تعلیم کی منزل اور اس کا مقصد دیا گو مقصد حاصل نہ ہوا مگر منزل ضرور مل گئی۔ دوسرے نے حافظہ چھین کر مجھے نقالی اور سرقے کے الزام سے بچا لیا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ طبعزاد ہے میرا ہے۔ اگر کبھی دیدہ و دانستہ دوسرے کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے تو ہمیشہ اسکے ماخوذ ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔

بچپن میں متاثر کرنے والی ادبی | اس میری سیرت کو متاثر کرنے والی
میرے میں | شخصیتیں تو وہ دو ہی تھیں۔ ایک تو
والد مرحوم، دوسرے عم مغفور۔ والد مرحوم مولانا سید محمد صالح صاحب عربی و فارسی کے جید عالم ہونے کے باوجود اپنے کو "مولوی" کہلانا ناپسند کرتے تھے۔ بڑے وسیع النظر اور وسیع القلب بزرگ دنیا کے حالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ گاؤں میں صرف میرا ہی گھر تھا جہاں پیسہ اخبار لاہور، مشرق گورکھپور اور اثنا عشری دہلی، نیز روزانہ اور ہفتہ وار اخبار آتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ دلگداز اور مرقع کے ماہوار رسالے بھی۔ عبدالحلیم شرر اور محمد علی طبیب کے سارے ناول گل بکاؤلی۔ سحر البیان۔ الف لیلہ و منظوم۔ شاہنامہ اردو۔ قصائد و مثنوی میر شکوہ آبادی۔ وزیر۔ رند۔ صبا و آتش کے دیوان۔ مراثی انیس و نفیس و دبیر و مونس وغیرہ وغیرہ سیکڑوں اردو کے شہ پارے انکی لائبریری میں عربی و فارسی کی کتابوں کے ساتھ ساتھ موجود تھے۔ میں نے بچپن میں جو کچھ اردو سیکھی وہ والد سے چھپا کر انہیں کتابوں کو پڑھ پڑھ کر سیکھی۔ یہ والد مرحوم کی سہل گیر طبیعت تھی جس نے عربی کی بڑی بڑی درسیات اور مجلسوں میں پڑھی جانے والی بحار الانوار جیسی حدیث کی کتابوں کے ساتھ ساتھ دیوان نظیر اکبرآبادی۔ دیوان چرکین اور واسوخت امانت جیسی کتابیں بھی اپنی لائبریری میں جمع کر دی تھیں۔ وہ اپنے ہم مذاقوں سے طرح طرح کی علمی و ادبی گفتگو کرتے اور زمیندارانہ ذہنیت والے ساتھیوں کے ساتھ کھیت کھلیان مالگذاری، قرقی اور بے دخلی کی باتیں۔ باوجود زمیندار ہونے کے نہ انہوں نے کبھی کاشتکار یا رعایا کو مارا اور نہ کبھی لگان باقی ہونے کا دعویٰ کیا۔ انہوں نے کبھی مجھ سے میری تعلیم کے بارے میں نہ پوچھا کہ تو کیا پڑھتا ہے کیا نہیں پڑھتا۔ انہوں نے

اس سال ہائی اسکول پاس کیا ہے۔ انشاءاللہ نو عمر ہے، اور ڈاکٹر بننے کا قصد رکھتی ہے۔ کشور کی طرح مہدی عباس کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ کشور کے شوہر شاہ ضیا زیدی کا شجرۂ نسب بھی ہے جو ... ملتا تھا۔ گویا بجولی کی وہ شاخ جو ... میں لگالی گئی تھی ... اپنی اصل سے جا کر مل گئی۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . . سب ... کو

... ترجمانی ... مجھ سے بعید تر نہ ... وہ حقیقتاً اسکے اہل ہیں۔

... معاملے میں بھی خوش قسمت ہوں اور اولاد ... دولت سے ... بھی ... بیٹی ہوا ۴۳ برس ... پوتوں کی دیکھ بھال ... میں جنت ... حافظ کلام ... ہیں اور السلمان منا اہل البیت ... حاصل کر چکے ہیں۔ ان نعمتوں پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں

گھریلو زندگی کا اثر

ہر مصنف پر اسکی گھریلو زندگی کا اثر پڑتا ہے۔ افسانہ نویس پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ وہ عام درجہ ... ہوتا ہے اسلئے اسکا اپنے گھر کے ماحول سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ گو میری دونوں بیویاں آج کل کے نقطۂ نظر سے تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ اور میری ساتھی نہ بن سکیں لیکن انکے حسن صورت و سیرت نے مجھے عورتوں کے معاملے میں عقیدت مند بنا دیا۔ دونوں چونکہ زیادہ تر علیل رہیں۔ ایک نے داغ مفارقت دیا دوسری سے دو پیاری اولادیں بھی ضائع ہوئیں۔ ان میں کا ایک پانچ برس کا بیٹا غالب حسن نام ... جو مجھ سے بے حد مانوس تھا ... مرنے سے دس دن پہلے نماز کے بعد مجھے دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتے دیکھ کر "دعا کر رہے ہیں دعا کرنے والے" کی آپ ہی آپ ایسی رٹ لگائی تھی کہ میں نے ہنس کر اسکے ننھے ہاتھ گرا دیے تھے۔ افسوس کہ دس دن بعد اسکا یہ الہامی مصرعہ بالکل حقیقت بن کر سامنے آیا اور اسکی

صحت کے لیے میری ساری دعائیں بیکار گئیں۔ البتہ دونوں لڑکوں نے بچوں سے بے انتہا پیار کی نعمت عطا کی اور اقبتہ السبقت ولادوں کی ہنرمندی و سعادت مندی نے ایک خاص طرح کی مسرت دی اسلیے نہ میں دنیا کا شاکی ہوں اور نہ اپنے رب رحیم و کریم کا!

غرضکہ میرے گھر کا ماحول ایشیا کے روایتی "شرفا" کا ماحول ہے اور ... کی حمایت آپ کو میرے افسانوں میں ملے گی ... ماحول میں افسانے کیونکر لکھتا ہوں اسکی جھلک "مصنف اور ہمارا گھر" میں موجود ہے۔ حافظ کلن پر میں نے "خدا بخش" کی سرخی سے کہانی ہی لکھ دی ہے۔

... دوست (۱) نواب زادہ محمد مہدی } احباب بدلتے گئے ہیں۔ مرزا حامد حسین صاحب ایم اے ایل ٹی مرحوم ہو گئے۔ حکیم صاحب عالم بھی جنت سدھارے۔ اب صرف تین رہ گئے ہیں۔ انکے سرخیل میرے پیارے نواب زادہ محمد مہدی ہیں۔ وہ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے ہیں۔ دس برس کی عمر سے اس وقت تک جبکہ ہجری سنوں کے حساب سے ہمارے سن ستر برس کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں دوستی اور محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ زندگی کے ہر اہم موڑ پر ہم نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا۔ اور ایک دوسرے کی بات مانی۔ اس دور میں بھی جبکہ چودہ کریٹ گولڈ کا رواج عام ہے اس شخص کا دل خالص سونے کا ہے۔ حد درجہ خلیق، منکسر، مہذب، مخلص، بے شر، نیک انسان ہیں۔ شعر و ادب میں انکی نظر وسیع بھی ہے اور عمیق بھی۔ صرف ہیروں کے جوہری نہیں ہیں۔ بلکہ انسانوں کے بھی اور ادب پاروں کے بھی۔ وہ ایک مدت مدید تک سیاست کے مرد میدان رہے ہیں اور تھوڑے عرصے کے لیے شعر و سخن کے بھی۔ خدا انہیں نظر بد سے بچائے۔ اس سیرت و کردار کے رئیس زادے ہندوستان میں بہت کم ہوتے ہیں۔

(۲) اختر علی تلہری } علامہ اختر علی تلہری مجھے ۱۹۲۷ء میں ملے۔ ہم نے بارہ برس جوبلی کالج میں اس یگانگی و اخوت سے کاٹے کہ میں انکی ساری خوبیوں سے واقف ہو گیا اور وہ میرے سارے معائب سے۔ وہ دوست ہی کیا جو دوست سے اپنی لغزشیں چھپائے۔ چنانچہ

میرے معاملے میں فادر کنفسر (FATHER CONFESSOR) کا درجہ
رکھتے ہیں۔ عربی و فارسی کا یہ جید عالم فلسفۂ قدیم و جدید میں بھی اسی
طرح دستگاہ رکھتا ہے جس طرح شعر و ادب میں۔ منطق و علم کلام
علامہ تلہری کی خاص چیزیں ہیں۔ لغات عربی کے وہ ماہر خصوصی ہیں۔
صرف و نحو اور عروض کی غلطیاں انکی عقابی آنکھیں فوراً تلاش کر لیتی
ہیں۔ خود موزوں طبع ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نکتہ سنج و دقیقہ رس
بھی ہیں اور ہم عصروں کے اچھے کلام کی ایک غیر شاعر کی طرح تعریف
کرنے میں فیاض بھی لیکن بڑا ہو یا چھوٹا غلطی کسی کی وہ معاف نہیں
کرتے۔ نقاد بھی کرنے ہیں اور نکتہ چینی بھی۔ کمیونسٹ ترقی پسندوں
کے خلاف اچھا خاصا محاذ بنا کر وہ تیس برس سے ڈٹے رہے اور بالآخر
انہیں بھی اپنے قلم کا لوہا ماننا پڑا۔ لیکن آپ کہیں علامہ کے خطاب کی
وجہ سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ان کے علمی احتساب اور انکے منطقی ذہن نے
انکو ملائے خشک بنا دیا ہوگا۔ جی نہیں انکی تحریر کی شگفتگی انکی
بذلہ سنجی پر گواہ ہے۔ برسہا برس سرفراز کے کالموں میں ان کا
گل افشاں قلم خامہ بر انداز چمن بنا رہا ہے۔ ادھر بلڈ پریشر
اور مرض قلب نے [illegible] انہیں خاموش بنا دیا ہے
بڑے سادہ مزاج اور سچے دوست ہیں۔ اپنی طرح ہر ایک کے نیک
ہونے کا جلدی سے یقین کر لیتے ہیں اسلئے اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔
خدا حسن زلیخا کی طرح انکی صحت کو جلد پلٹا دے تاکہ انکا اشہب قلم
علم و ادب کے گل پوش وادی میں نئی نئی ترکتازیاں دکھائے۔

(۳) خواجہ اطہر حسین

خواجہ اطہر حسین میری زندگی میں
علامہ اختر تلہری کے ساتھ آئے۔ مگر نسبتۃً آہستہ قدمی اور سبک خرامی
سے آئے۔ یہ چھوٹے قد کے دبلے پتلے بظاہر حد درجہ سنجیدہ بزرگ
انگریزی اور فلسفہ دونوں مضامین میں ایم اے ہیں اور تمام عمر
منطق اور انگریزی ہی پڑھاتے رہے چنانچہ وہ حد درجہ معقولی
ہوگئے ہیں۔ ہر منقول کو خواہ وہ آیت و حدیث ہی کیوں نہ ہو عقل کی
میزان پر تولنے کے عادی ہیں۔ ریاضی و سائنس سے بھی دلچسپی ہے۔
اسلئے نظریات کو تجربات کی لیبوریٹری میں جانچنے پرکھنے کے قائل ہیں
مطالعہ انکا بھی بہت ہی وسیع ہے اور نگاہ عمیق۔ بڑی سلجھی ہوئی
طبیعت پائی ہے اور ہر طرح کی گتھیاں سلجھانے کا خاص سلیقہ رکھتے
ہیں۔ اردو میں بہت ہی پسندیدہ طنز و مزاح لکھنے کی صلاحیت
رکھتے ہیں۔ بلا مبالغہ دوسرے پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی
بن سکتے ہیں مگر جب تک کوئی سر پر سوار نہ ہو قلم ہی نہیں اٹھاتے
جس زمانے میں میرے بھانجے اعظم حسین اعظم مرحوم نے
۱۹۲۹-۳۲ میں "ادب" نکالا تھا کچھ مضامین لکھے تھے۔ پھر
افراط انکسار کے باعث خاموش بیٹھے ہیں۔ بڑے مخلص سچے دوست
اور مکمل انسان ہیں۔ دوستوں ہی کو اپنے سے زیادہ نہیں بلکہ دوستوں
کے بچوں کو بھی اپنے بچوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں
کم ہی دکھائی دیتے ہیں خدا اس "قوم" میں اضافہ کرے۔

اب جبکہ میرے اسلاف، میرے خاندان، میری بیوی،
میرے بچوں اور میرے دوستوں سے آپ مل چکے اور آپ کو
اس پوری فضا کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا جس میں میرا بچپنا،
اور میری نام نہاد جوانی گذری اور جس میں میرا بڑھاپا گذر رہا ہے
تو آئیے آپ کو اپنے افسانہ نویس بننے کی کہانی بھی سنائیں۔

میرے مزاج میں افسانہ نویسی کی نشو و نما

جب تک بالکل بچہ تھا اپنی دایہ،
ماں، نانی سے کہانیاں سنیں۔ جب
حرف شناس ہوا تو محمود دادا (میرے ایک فسانہ "دو دادا" کے ہیرو)
سے امیر حمزہ کی داستانیں سنیں۔ پٹنہ گیا تو وہاں اس زمانے کے نوابین
کی زندگی بچشم خود دیکھی۔ مرغ بازی۔ بٹیر بازی۔ کبوتر بازی۔
پتنگ بازی۔ افیون بازی۔ رنڈی بازی۔ مقدمہ بازی اور مہاجن
بازی! پھر ان درباروں میں بڑے بڑے طرار مصاحب اور
داستان گو بھی تھے۔ پٹنہ چھوٹا تو ہم سنوں کے ساتھ جہاں
کرکٹ کھیلا اور کشتی لڑی وہاں کتابوں کی الماریوں کا بھی
جائزہ لے ڈالا۔ اردو کی ساری کتابیں ایک کے بعد ایک پڑھ
ڈالیں۔ اردو میں الف لیلہ اور منظوم شاہنامہ۔ عبدالحلیم شرر
اور محمد علی طبیب کے ناول گلزار نسیم۔ سحر البیان۔ قصہ چہار درویش
باغ و بہار۔ بیسیوں دیوان۔ ہر طرح کی کتابیں پھانک ڈالیں
لیکن سب سے زیادہ لطف آتا تھا الف لیلہ اور شاہنامے میں۔

ان کے قصے خود ہی نہ بار بار پڑھتا تھا بلکہ ہم سن اور ہم عمر ساتھیوں کو بھی پڑھ پڑھ کر سناتا تھا۔ غرض قصے کہانیوں کی کتابوں کی اپنے گھر ہی میں موجودگی نے اس طرح کی چیزوں کی طرف میری رغبت کو بھڑکایا۔ اتفاق سے میٹریکولیشن کے انگریزی کورس میں "لیمبس ٹیلز فرام شکسپیر" اور "کینٹربری ٹیلز" پڑھا۔ اسکاٹ کے ناولوں کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میٹرک کا امتحان دے کر گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ نوہرہ میں ایک عزیز کے یہاں پورا بکس "اسکاٹ" اور "رینالڈس" کے ناولوں سے بھرا پڑا ہے۔ سارے "ویورلی" ناول پڑھ ڈالے۔ پھر جو رینالڈس کی "مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن" وغیرہ میں ہاتھ لگا تو پوری پوری راتیں لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی میں پڑھنے میں گذار دیں۔

کرسچین کالج میں داخل ہوا تو اسٹیونسن، ڈکنس اور تھیکرے سے سابقہ پڑا۔ ناول بینی کا چسکا پڑا اور جو بھی قصے کہانی یا ناول کی طرح کی کتاب کالج لائبریری میں دکھائی دی اُسے پڑھ ڈالا۔ جب اس طرح کی تفریحی چیزیں ختم ہو گئیں تو مذہبی تاریخوں پر اتر آیا۔ مشن کالج تھا۔ ہندو، بودھ، جین اور عیسائی مذہب پر جتنی کتابیں وہاں کی لائبریری میں تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ ایک امریکن پروفیسر نے فرما دیا جسے انگریزی نثر سیکھنا ہو وہ بائبل پڑھے۔ میں نے جدید و قدیم انجیلیں سات بار پڑھ ڈالیں۔ بی اے میں آیا تو شکسپیر اور ملٹن سے شناسائی ہوئی۔ شکسپیر اور اس کے ہم عصروں کے تقریباً سارے ڈرامے چاٹ گیا اور ملٹن کی "پیراڈائز لوسٹ" اور "پیراڈائز ریگینڈ" نگل ڈالی۔ پھر اپنی پسند کے خاص خاص شعرا کا پورا کلام۔ شیلے، کیٹس، کالرج، ٹینیسن اور براؤننگ۔ مجھے ورڈس ورتھ میں زیادہ دلچسپی نہ پیدا ہوئی۔ مجھے براؤننگ سے زیادہ جذباتی ہم آہنگی محسوس ہوئی تھی۔ ناول نویسوں میں اس زمانے میں مجھے ایچ جی ولز۔ ٹامس ہارڈی گالسورڈی اور ایلیٹ ہو بہت پسند تھے۔ امریکی افسانہ نویسوں میں آئرونگ سے زیادہ برٹ ہارٹ اور او ہنری سے زیادہ متاثر تھا۔ فرانس کے وکٹر ہیوگو، بالزاک۔ اناطول فرانس رومین رولاں

اور روسیوں میں مجھے ترگنیف، چیخوف اور ٹالسٹائے پسند تھے۔ دوستوفسکی کی چیزیں پڑھیں تو ضرور مگر پسند آئیں۔

یہ میں اس وقت کے حالات لکھ رہا ہوں جبکہ میں نے ۱۹۱۸ میں سب سے پہلا | سب سے پہلا افسانہ "غنچۂ مردہ کلیاں کیونکر لکھا گیا"

افسانہ لکھا۔ یہ حادثہ بھی پٹنہ ہی میں پیش آیا تھا۔ ۱۹۱۵ء سے میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ گرمیوں کی تعطیل کا بڑا حصہ پٹنہ ہی میں گذارتا تھا چنانچہ بی اے کے پہلے سال کے امتحانات سے فارغ ہو کر میں آرہ سے ہوتا ہوا اپنے "پیارے بھائی"[1] کے پاس پہونچ گیا۔ دن میں گرمی بڑی شدت کی ہوتی تھی۔ اس سے بچنے کے لئے ہم لوگ "بڑی حویلی" کے دیوان خانے کے سب سے ٹھنڈے کمرے کو خس خانے میں تبدیل کرکے اس میں بیٹھتے، گپیں لڑاتے، تاش کھیلتے اور لیٹتے سوتے تھے۔ ایک دن طے ہوا کہ "بادشاہ منزل"[2] کی پوری سہ منزلہ عمارت خالی پڑی ہے اسکا فرش سنگ مرمر و سنگ موسیٰ کا ہے۔ اور سب سے نیچے والا حصہ خاصا ٹھنڈا ہے۔ وہیں کیوں نہ دوپہر کاٹی جائے فوراً پوری "چنڈال چوکڑی"۔ بھائی قمرالدین صاحب مرحوم (میرے پھوپھی زاد بھائی)، قیصر نواب و اصغر نواب۔ (نوابزادہ کے رشتے کے بھانجے)۔ حسن مہدی (چچا زاد بھائی) نواب زادہ اور میں۔ بادشاہ منزل میں چلے گئے۔ سنگ مرمر کے فرش کو ملازموں نے جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ ایک بڑی سی چاندنی اس پر بچھا دی۔ دو تین گاؤ اور تکیے لا کر رکھ دیئے۔ اور ہم لوگ ہمیشہ کی طرح گپیں لڑانے اور بحثیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سلسلہ گفتگو میں پریم چند کے کسی افسانے پر بحث ہونے لگی۔ دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک

---

[1] ہم دونوں میاں ایک دوسرے سے خطوں میں اکثر یوں ہی تخاطب کیا کرتے ہیں۔

[2] یہ عمارت نواب لطف علی خان صاحب کے بڑے صاحبزادے نواب بادشاہ نواب صاحب مرحوم نے بنوائی تھی اور اسکی تعمیر میں چار لاکھ روپے صرف کیا تھا چونکہ وہ لاولد تھے اسلئے وہ میاں کو وراثتہً ملی اور اب وہ اسی میں مع عیال قیام کرتے ہیں۔

زندگی کی عکاسی کی طرف متوجہ کیا اور یلدرم کی تحریر میں مجھے ایک پسندیدہ مہذب ظرافت اور دلپذیر بانکپن نظر آیا جو اردو کے کسی لکھنے والے کو پھر نصیب نہیں ہوا۔ میں یلدرم کا افسانہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کبھی نہیں بھول سکتا۔ سلطان حیدر جوش اور نیاز فتحپوری نے بھی یقینی غیر محسوس طور پر متاثر کیا ہوگا اسلیے کہ دونوں کے قلم میں زور تھا اور بلا کی دلکشی تھی۔

میرے پسندیدہ افسانہ نگار میرے پسندیدہ افسانہ نگار مشرقی نہیں مغربی ہیں۔ انکے سرتاج لارنس۔ ورجینیا ولف۔ موپاساں اناطول فرانس۔ برٹ ہارٹ۔ او ہنری۔ چیخوف اور ٹالسٹائے ہیں یوں تو سمرسٹ ہام۔ کہانی لکھنے والوں کا شہزادہ کہلاتا تھا مگر مجھے سوائے "آف ہیومن بانڈیج" کے اسکا کوئی ناول یا اسکی کوئی کہانی لاثانی نہ محسوس ہوئی۔ ہندوستانیوں میں رابندر ناتھ ٹیگور اور سرت چندر چٹرجی مجھے بہت پسند ہیں۔ امریکیوں میں فاکنر کے اکثر مختصر افسانے اور ہمنگوے کا "اولڈ مین آف دی سی" غیر فانی ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں پریم چند کا "کفن" اور سدرشن کا "سداسکھ" بھلایا نہیں جاسکتا۔ ل۔ احمد، محمد مجیب۔ اور اعظم کریوی کی بھی بعض کہانیاں لافانی ہیں۔ ذرا اور بعد والے ہم عصروں میں کرشن چندر کی کشمیر سے متعلق رنگین کہانیاں بے مثل ہیں۔ شفیق الرحمن۔ قدرت اللہ شہاب۔ بیدی۔ احمد عباس۔ عصمت چغتائی۔ منٹو۔ احمد ندیم ممتاز مفتی۔ مہندر ناتھ۔ ابراہیم جلیس۔ آغا بابر۔ خدیجہ مستور۔ ہاجرہ مسرور۔ حجاب امتیاز علی تاج۔ اپندر ناتھ اشک۔ اختر انصاری تسنیم سلیم۔ صالحہ عابد حسین۔ اختر حسین رائے پوری۔ خواجہ منظور جلیل قدوائی۔ احمد علی۔ فضل حق قریشی۔ منصور احمد محشر عابدی۔ بلونت سنگھ۔ مجنوں گورکھپوری۔ حیات اللہ انصاری۔ اختر اورینوی سہیل عظیم آبادی۔ انتظار حسین۔ غلام عباس۔ حسن عسکری۔ شوکت صدیقی۔ ممتاز شیریں۔ رام لال۔ شکیلہ اختر۔ قرۃ العین حیدر نے بھی بعض بے نظیر افسانے لکھے ہیں۔ ان سے نسبتہً جوانوں اور نوجوانوں میں، دیویندر اسر۔ قاضی عبدالستار۔ انور عظیم۔ اشفاق احمد جیلانی بانو۔ واجدہ تبسم۔ رضیہ سجاد ظہیر۔ کشور نہیدی۔ آمنہ ابوالحسن۔

جوگندر پال۔ بشیشر پردیپ۔ اقبال مجید۔ ستیش بترا۔ ابن الحسن ضمیر الدین۔ خلیل احمد۔ مسیح الحسن۔ غیاث احمد گدی۔ کلام حیدری پریم ناتھ۔ نریندر لوتھر۔ زکی انور۔ اے حمید وغیرہ جیسے درخشاں ستارے ہندوستان اور پاکستان کے آسمان افسانہ پر اپنی اپنی تابناکی سے نئے کہکشاں بنارہے ہیں۔ ان سب میں بڑی فنکارانہ صلاحیتیں ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان میں سے بعض نے اشتراکی پروپگنڈا کو شعار بنالیا ہے اور کچھ جنس کے سلسلے میں تحلیل نفسی کی ظلمات سے اب تک نہیں نکل پائے ہیں۔ صرف یہی افراط ان میں سے بعض کو ایک افسانہ نویس کا مقام حاصل کرنے میں مانع ہوسکتی ہے مجموعی طور پر ہمارے فنکاروں کی نگارشات نے اردو افسانے کو دنیا کے افسانوی ادب کے شاہکاروں کی محفل میں کرسی تدین پر بٹھادیا ہے۔

زندگی کی ترجمانی اور افسانہ میں افسانوں کو زندگی کا ترجمان بنانے کا قائل ہوں۔ بھوک ہو یا جنس۔ زندگی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ ایک کے پیٹ سے تمدن و تہذیب یعنی سیاست نکلتی ہے دوسرے کے بطن سے اس سیاست کے برتنے والے ہم انسان۔ اسلیے جب بھی زندگی کی مرقع کشی کی جائیگی سیاست اور جنس کی جھلکیاں ان میں ضرور آئیگی مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ادب و شعر کو سیاسی نظریات کے پروپگنڈے اور ترویج کا ذریعہ بنایا جائے۔ میرے نزدیک یہ اصول فن کے منافی ہے۔ اسی طرح جنس یقینی زندگی کا اہم ترین جز ہے مگر اس جنس کے بیان میں لذتیت پیدا کرنے کا سختی سے مخالف ہوں اور اسے بھی فن کا خون سمجھتا ہوں۔ لحاف۔ پھسلن۔ بو۔ ٹھنڈا گوشت جیسی کہانیوں میں یہی عیب ہے۔ ان میں جنسی تلذذ کے بیان پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد کو کھو بیٹھی ہیں۔ میں نے خود بھی سیاسی کہانیاں لکھی ہیں اور جنس کے موضوع پر بھی لکھا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی میں انکی اہنسا اور انکے دوسرے نظریات کی حمایت میں کہانیاں لکھیں مثلاً مانجھی۔ اقا۔ ہمارا گاؤں وغیرہ۔ ان کی موت پر "شیو کا بلاغ" لکھا اور اس وقت لکھا جبکہ اردو۔ ہندی۔ انگریزی

زبانوں میں نہ ان پر کوئی نظم لکھی گئی تھی اور نہ کوئی فسانہ۔ ادھر بہت سے ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں ہمارا گھر۔ قابیلی تجربے۔ یہیں کا عجائب گھر۔ وڈھال یا تلوار۔ ٹھاکروں کی ٹھکرائیاں۔ وطن کی پاک مٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن ہر جگہ اس کا خیال رکھا ہے کہ نظریات کے ہاتھوں فن کا خون نہ ہونے پائے۔ جنس کے موضوع پر "میلہ گھومنی" اسکی شاہد ہے کہ عورت و مرد کے فطری تعلق پر سب کچھ لذتیت پیدا کئے بغیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ "سیلاب کی راتیں" کی ہیروئن باوجود عریاں ہونے کے نہ آرٹسٹ کی نظروں میں عریاں ہوتی ہے اور نہ کہانی کے ناظر کی۔ "ایک غسل خانے میں..... سب ہی ننگے ہیں مگر اسے بھی عریانی و فحاشی سے کوئی مناسبت نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بقول زولا" ہم نابالغ بچوں کے لیے نہیں لکھتے" لیکن یہ امر بھی تو قابل فروگذاشت نہیں کہ گو جسمانی طور پر ہمارے گرم ممالک میں بلوغ کے لیے نو اور پندرہ ہی برس درکار ہیں مگر دماغی بلوغ کے لیے ایک عمر چاہیئے۔ سعدی نے غلط نہیں کہا ہے ؎

چہل سال عمرت عزیز گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت!

ناظرین کی بچکانی ذہنیتیں مقصد کو بھول کر لذت کوشی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ اور اگر اسے حقیقت نگاری کا نام دیا جائے تو گورکی کی رائے بھی سن لیجئے۔ اشتراکیت کا یہ امام ادب کہتا ہے "بہت سے حقائق ایسے ہیں جن کا نہ یاد رکھنا ہی زیادہ اچھا ہے۔ ایسی اچھائیاں جھوٹ کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہیں اور ان میں اس زہریلے جھوٹ کے وہ تمام عناصر موجود ہوتے ہیں جنہوں نے ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کو ایک ایسا جہنم بنا دیا ہے جو نا پائیدار بھی ہے اور غلیظ و متعفن بھی۔ ..... زندگی کے گندے پہلوؤں کو نمایاں کر کے بیان کرنا ایک گندہ کام ہے۔ اور اسی کعبۂ ترقی پسندگان کے

اس افسانہ نگار و ناول نویس[1] کے جسکے بارے میں کہا گیا ہے کہ "روس نے ایک بار زبان کھولی اور سارے یورپ کو گونگا بنا دیا۔" اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ "انتہائی جمالیاتی کیفیت ہمیں کبھی پوری آسودگی نہیں بخشتا۔ ایک دردمند انسان اسکے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ وہ مکمل آسودگی صرف ادب سے پاتا ہے جو صالح ہو اور انسان کے اخلاق کو بلند کرے!"

اردو افسانہ نویسی کا | ہمارے افسانے کا مستقبل امید افزا اور درخشاں ہے
درخشاں مستقبل | نئے لکھنے والوں میں امنگ اور حوصلہ ہے۔ ہاں مطالعے اور مشاہدے کی کمی ضرور ہے اور اپنے طور پر مسائل پر غور کرنے کی جد و جہد بھی کم ہے۔ قدیم غزل گو شعرا کی طرح وہ پیش رووں کے مضامین جنس و افلاس اور طبقاتی تصادم کو مصرع طرح کی طرح استعمال کرنے لگے ہیں۔ اگر وہ ان روندی ہوئی وادیوں کو چھوڑ کر اپنے لیے نئے موضوعات تلاش کریں۔ ہندوستان کے اندر کے دور دراز حصوں کی زندگیاں بیان کریں یا جو گندر پال کی طرح ملک سے باہر کی زندگیاں اور انکے مناظر و مسائل۔ تو اردو افسانے میں وسعت پیدا ہوگی۔ بے بہا اضافہ ہوگا اور نئے لکھنے والوں پر بار بار کچلے ہوئے نوالوں کو مزید کچلنے کا الزام عاید نہ ہوگا۔ ہندوستان کے لکھنے والوں کے لیے اڑیسہ آسام اور کیرالا کی زندگیاں بڑا مواد فراہم کر سکتی ہیں۔ اور پاکستان کے لکھنے والوں نے اب تک نہ سرحد کی زندگی بیان کی ہے نہ بلوچستان کی اور نہ مشرقی پاکستان کی۔ ضرورت ہے کہ افریقی اور ایشیائی ممالک کی زندگی کے مرقعے ہمارے فسانوں میں آ جائیں۔

اس زمانے کے افسانہ نویسوں کو اپنے اپنے ملک کی ترقیاتی پروگراموں اور منصوبہ بندیوں کے کاموں کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے یعنی "تعمیری افسانے" بھی لکھنا چاہیئے۔ اشتراکی ممالک کی ریس کرنے والوں کو روس اور چین سے سبق لینا چاہیئے۔ وہاں نہ محبت کے فسانے ہیں نہ جنسی تخلیل۔ اب تو ہر قدم پر مشین کی کہانیاں ہیں اور سائنس کی کامیابیاں۔ کم سے کم روس میں تو

لہ سریتا کے ایڈیٹر نے اسکی سرخی بدل کر اسے "مردوں کا حمام" کے نام سے شایع کیا۔ اور مجھے غسلخانے اور حمام کے فرق سے ناواقف اور ایک عام مستی ننگے کے محاورے سے ناآشنا ثابت کیا ہے۔ انکی اصلاح کا شکر گذار ہوں مگر مجھے اپنی ہی سرخی زیادہ درست محسوس ہوتی ہے۔

[1] ٹالسٹائے

سارا ادب خالص "تعمیری" ہے۔

ہمارے ترقی پسند ادیب روسی مصنفوں کی جگہ امریکی عریاں نویسوں کے مقلد ہیں

ہمارے افسانہ نویس اور ناول نویس باوجود ادعائے ترقی پسندی اپنی تحریروں میں روس سے زیادہ امریکہ کا اتباع کرتے ہیں۔ خدا جانے وہاں کے لکھنے والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انکے جتنے "بیسٹ سلرز" ہیں وہ عریانی و فحاشی سے پر ہیں۔ جنسی تعلقات کے سلسلے میں انکے مصنفین اس قدر حقیقت نگاری پر اتر آتے ہیں کہ ہر کتاب "کوک شاستر" بن جاتی ہے۔ ملٹی گیت، انکے راک اینڈ رول جیسے رقص، انکے اسٹیج ڈراما اور انکے اسٹ کلبوں میں ایک تیز کے مظاہرے، اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ ہنرمندوں اور دانشوروں کی یہ حکومت زوال پذیر ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹئے۔ بابل و نینوا کی سلطنت زوال کا حال دیکھیے۔ مصر کے فراعنہ کا حال پڑھیے۔ سلطنت روما کے خاتمے کو دیکھیے۔ خود دلی کے محمد شاہ رنگیلے اور لکھنؤ کے واجد علی شاہ پیا جان عالم کے دور پر نظر ڈالیے۔ انتزاع سلطنت کے وقت ملک کی عام فضا جنسی لذت کوشی تھی۔ اگر امریکہ کے موجودہ ادیب حقیقت نگار ہیں تو ہمیں تسلیم کر لینا پڑے گا کہ وہاں جنسی تعلقات پر ہر طرح کا احتساب کالعدم ہے اور باعصمت عورت کے تصور تک کا قطعی فقدان۔ رینالڈس نے عہد وکٹوریہ کے متعلق لکھا تھا کہ "اس ملک میں وہ صرف دو ہی عورتوں کے متعلق زبان نہیں کھول سکتا۔ ایک ان میں سے ملک کی ملکہ ہے دوسری اسکی ماں۔ ورنہ کسی عورت کی عصمت قابل اعتماد نہیں۔" کچھ اسی طرح کا حال امریکہ کا بھی ہو رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ملک میں اب بھی سیتاؤں، ساوتریوں کی کمی نہیں۔ اسلیے انکی جفاکشی، انکی عصمت مآبی، ان کی وفا کیشی، انکی پاک دامانی، انکے شکر و صبر، انکے عزم و استقلال، ان کے ایثار و قربانی، انکی نفس کشی، انکی ممتا، انکی پتی ورتا، ماں باپ بھائی سے انکی محبت، انکی رحم دلی، ان کا جذبہ خدمت وغیرہ وغیرہ کی کہانیاں کیوں نہ سنائے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ادب و آرٹ کے ہر گوشے سے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر و رانجھا ہی کا قصہ دہرایا جائے۔ اور جنسی اشتہا کا مسئلہ ہر وقت بھنگ کی طرح گھوٹا اور دہی کی طرح متھا جاتا ہے۔ ہم تو فیل گائے TEOPHILE GANTIER ہی کی سی کیوں کریں اور اخلاق و تہذیب کے صالح اقدار سے کیوں منہ موڑ لیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح کے خیالات کے اظہار پر مجھے قدامت پرست، ملائے مسجدی اور غیر ترقی پسند کہا جائے گا۔ لیکن میں بادب عرض کرونگا کہ اگر انہیں اقدار کی حمایت قدامت پرستی اور منافی ترقی پسندی ہے تو بہتر ہوگا کہ معترض حضرات پھر سے اپنی پرانی الف۔ ایوا در حرف شیجوت کو پڑھ ڈالیں اور محبت و رومان اور جنس کے متعلق انکے نظریات سے استفادہ فرمائیں۔ صحیح معنوں میں ترقی پسندات سوائے فراریت کے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

پوچھیے۔ میں کہاں سے کہاں بہک گیا۔ آپ کا سوال اردو افسانے کے مستقبل سے تھا۔ میں اس سے مایوس نہیں۔ گو آج کل کا رجحان افسانوں کی جگہ ناولوں کی طرف ہے اور وہ بھی سستے قسم کے جاسوسی اور رومانی ناولوں کی طرف۔ جن میں ننانوے فی صدی کے پلاٹ انگریزی ناولوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ پھر بھی اگر اردو باقی رہے گی تو مجھے یقین ہے کہ اسکے ہونہار نوجوان لکھنے والے افسانے کو اسکے اعلیٰ معیار سے گرنے نہ دینگے۔

میرے افسانوں کے مجموعے { خود میرے افسانوں کے اس وقت تک سات مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

(۱) رفیق تنہائی۔ مکتبہ لاہور (۲) باسی پھول۔ مکتبہ لاہور (۳) میلہ گھومنی مکتبہ لاہور (۴) آئی سی ایس انڈین پریس الہ آباد (۵) کچھ ہنسی نہیں ہے۔ انڈین پریس الہ آباد (۶) ہمارا گاؤں فروغ اردو۔ امین آباد لکھنؤ (۷) کچے لون کی چھڑی (مہندی) دانش محل، امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ۔

رفیق تنہائی۔ باسی پھول۔ میلہ گھومنی کے متعلق مجھے علم نہیں کہ یہ مجموعے پاکستان میں اب بھی ملتے ہیں یا نہیں۔ آئی سی ایس اور کچھ ہنسی نہیں انڈین پریس الہ آباد نے شایع کیے تھے تقسیم ہند کے بعد انہوں نے اردو کتابیں شایع کرنا ترک کر دیا اسلیے انکے ملنا بھی مشکل ہی ہے۔ "ہمارا گاؤں" اور "پھولوں کی چھڑی" کا

البتہ ابھی تک لکھنؤ میں مل سکتے ہیں۔ دو مجموعے سندھ اکاڈمی کراچی شایع کر رہی ہے اور وہ زیر طبع ہیں۔

مجموعوں میں نہ شامل کیے جانے والے افسانوں کی تعداد و تلاش

جو افسانے اب تک کسی مجموعے میں شامل نہیں کیے گئے وہ آج کل دلی۔ نیا دور لکھنؤ۔ نقوش لاہور۔ افکار کراچی۔ شمع دلی۔ بانو دلی۔ کھلونا دلی۔ صبح نو پٹنہ۔ کتاب لکھنؤ۔ بعد تقسیم والے مشہور رسالوں میں زمانہ کانپور۔ عالمگیر لاہور۔ نیرنگ خیال لاہور۔ بیسویں صدی لاہور۔ ادب لطیف لاہور۔ مست قلندر لاہور۔ اطلاعات لکھنؤ۔ نیا ادب لکھنؤ۔ ادب لکھنؤ۔ مبصر لکھنؤ وغیرہ میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ بنگلور۔ مدراس۔ الہ آباد۔ کلکتہ۔ بھوپال۔ دلی کے بعض ایسے جرائد میں بھی میں نے کہانیاں لکھی ہیں جن کی مدت عمر دو تین سال سے آگے نہ بڑھی۔ اب نہ ان کے نام یاد ہیں نہ ان کی سرخیاں۔ دو تین افسانے نگار لکھنؤ اور شاعر آگرہ و بمبئی میں بھی لکھے ان کی فائلیں دیکھنا ہونگی۔ ایک درجن کے قریب افسانوں کے انگریزی ترجمے ہندوستان اسٹینڈرڈ کلکتہ اور یوجنا دلی میں شایع ہوئے اور بیس کے قریب ہندی رسائل میں۔ اس طرح کے یا شاں افسانوں کی تعداد پچاس سے کم نہ ہوگی۔ پھر ریڈیو دلی اور لکھنؤ سے برابر دو تین افسانے ۱۹۳۲ سے براڈکاسٹ کیے ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی کسی مجموعے میں شریک نہیں کیا ہے چنانچہ ان کی تعداد بھی پچاس سے اوپر ہی ہوگی۔ غرض اب تک میں نے دو سو سے زاید افسانے لکھے ہیں اور انکی زیادہ تعداد اب تک کسی مجموعے میں شامل ہونے سے محروم ہے۔

میں اور فلمی دنیا

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۵۵ میں بمبئی میں چھ ماہ اس غرض سے قیام کیا کہ شاید فلمی دنیا میں کچھ ہم جیسوں کی کہانیوں کے لیے جگہ نکلے۔ لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ نئے "ہز ہائی نسز" یعنی پروڈیوسرز اپنے اپنے خاص مصاحبوں چیلوں کے حلقے میں گھرے ہیں اور انکے درباروں میں بس اسی کی رسائی ہو سکتی ہے جسکی بغل میں پیش کش کے لیے مست کرنے والی چیزیں دبی ہوں۔ بعض جو ان سے بالاتر ہیں وہ ادب اور فن کو اپنی پسند کا تابع بنانا چاہتے ہیں اور ضرورت ہو یا نہ ہو ان کا سارا زور گیتوں اور گانوں پر ہے۔ غرض بڑی مشکلوں سے مسٹر سہراب مودی کے ہاتھ صاحبقران تیمور لنگ پر ایک کہانی دس ہزار پر بیچی۔ پانچ ہزار نقد اور پانچ ہزار اسکے پروڈکشن کے وقت ملنے کی امید پر۔ سو آج تک وہ پردہ سیمیں پر نہ آئی۔ اسلیئے پریم چند کی طرح موعودہ رقم کے نصف ہی پر قناعت کرنا پڑی۔ بعد کو فلمستان کے مکرجی نے مخصوص طور پر بلایا اور پچیس تیس کہانیوں کے پلاٹ سننے کے بعد سوکھا ہی ٹال دیا۔ ہاں، ایک بار ریٹائر ہونے سے پہلے بھی بمبئی گیا تھا۔ یہ جون ۱۹۵۴ کا واقعہ ہے۔ اس وقت سنتوش جارجی کا طلبیدہ گیا تھا۔ ان کا خیال تھا امراؤ جان ادا کا فلم بنایا جائے اور اس میں بعض سین نذیر احمد کی توبۃ النصوح کے مدغم کر دیئے جائیں۔ میں نے کہانی تقریباً مکمل کر دی تھی کہ دفعتہً وہ کچھ خاص پریشانیوں میں گرفتار ہو گئے اور میں لکھنؤ واپس چلا آیا۔ میں دوران قیام میں انکا مہمان رہا اور وہ مجھ سے ایک عزیز خورد کی طرح پیش آتے رہے لہٰذا معاوضہ طلب کرنے کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہی کہانی مزید کتر بیونت کے بعد انہوں نے فلمائی۔ مجھے کوئی پیسہ نہ دیا۔

عرض دس پندرہ فلمی کہانیوں کے خاکے، مکمل و نامکمل مسودے بھی میری نامطبوعہ تصنیفات کے اوراق پریشاں میں پڑے ہوئے ہیں۔

افسانوں کے علاوہ کیا کیا لکھا

افسانوں کے علاوہ دو ناول لکھے۔ ایک تو وہی ۱۹۱۹ والا "سر سید احمد پاشا"۔ دوسرا "شاید کہ بہار آئی" جس کا ہندی میں ترجمہ "کومل نگری" کے نام سے شایع ہوا۔ ایک اور ناول نامکمل سا پڑا ہے۔ قصد ہے کہ ذرا سکون و اطمینان ملے تو گالسورڈی کے "فورسائٹ ساگا" جیسی چیز لکھوں۔ لیکن یہ بظاہر ہوس ہی ہوس ہے شاید ہی انجام کو پہونچے اسلیئے کہ اب اعصاب کا اعتدال رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ صبر و استقلال میں کمی آتی جا رہی ہے۔

اور معاش کی ضروریوں کی وجہ سے اسی کام کی طرف جھک پڑتا ہوں
جس کی انجام دہی کے بعد نقد پیسے ملیں، بہ جلد ملیں۔
ایک ایکٹ کے ڈراموں کا ایک مجموعہ بھی "نورتن" کے نام سے
شایع ہو چکا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبا کے اسٹیج کرنے
کے لیے اسد اللہ کاظمی صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات یو پی اور
ڈائرکٹر تعلیمات کشمیر کی فرمائش پر لکھے گئے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد
اردو زبان کی تعلیم ہی اسکولوں اور کالجوں کی اکثریت سے
غائب ہو گئی، انکا اسٹیج کون کرتا۔
تنقیدی مضامین بھی کچھ نہ کچھ الٹے سیدھے لکھے ہیں اور تلف
کتابوں پر تبصرے اور مقدمے بھی۔ انکی تعداد بھی پچاس سے کم
نہ ہوگی۔ مگر انکو کا مجموعہ اب تک نہیں شایع ہوا۔ "ناول کی
تاریخ و تنقید" ... لکھی گئی تھی جب انگریزی راج تھا
اور اردو کے کسی ناول نگار پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔
بہرحال اس موضوع پر سب سے پہلی قاعدے کی تفصیلی کتاب
لکھنے کا فخر مجھی کو حاصل ہے۔ ادھر اردو شاعری پر اعتراضات
کے جوابات پر ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔
میرے ناقدین (میری کتابوں، میری شخصیت یا میرے فن پر
جن حضرات نے مضامین لکھے ہیں انکے اسمائے گرامی جو میری یاد میں
باقی رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ مظفر شاہ صاحب (آج کل۔ دلی)
علی جواد زیدی (آپ سے ملیے) شوکت تھانوی (شیش محل)
زوار حسین زیدی (مصنفین اردو) وقار عظیم (ہمارے افسانے اور
داستان سے افسانے تک) ڈاکٹر اعجاز حسین (مختصر تاریخ اردو ادب)
کشور زیدی (نقوش شخصیات نمبر)۔ سنا ہے کہ پروفیسر شجاعت
علی سندیلوی اور پروفیسر شکیل الرحمن (کلکتہ کے کسی رسالہ میں جسکا
مجھے نام یاد نہیں) نے بھی اپنی اپنی مختصر تاریخ ادب اردو میں میرا ذکر
کیا ہے مگر میں انکے مطالعے سے اب تک محروم ہوں)
ان کے علاوہ اردو داستانوں پر اظہار خیال کرتے
ہوئے بہتوں نے ضمناً ذکر کیا ہے جن کے مضامین کی نہ سرخیاں
یاد رہیں اور نہ انکے اسمائے گرامی۔

اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا بھی ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔
بہت سے لوگوں نے "رومانی اور جاسوسی دنیا" (الہ آباد) کے
مالک عباس حسینی صاحب کی "گہر ریز و گہر بیز و گہرزا" تخلیقات بھی
میرے سر منڈھ دی ہیں۔ اور بعض ناقدین نے مجھ پر اظہار خیال
کرتے ہوئے عباس حسینی صاحب کی افادات عالیہ کو بھی میری
تصنیفات میں شامل کر دیا ہے۔ یہ انکے ساتھ بھی ظلم ہے اور میرے
ساتھ بھی اسلیئے مجھ پر یا میری کہانیوں پر لکھتے وقت اسکا خیال
ضرور رکھا جائے کہ وہی کہانیاں مجھ سے منسوب کی جائیں جنکے
ساتھ میرا پورا نام علی عباس حسینی لکھا ہو۔ ملازمت کی
مصلحتوں کے زیر نظر میں نے کچھ کہانیاں (مثلاً بختیارک کا
نسخہ وغیرہ) ممتاز حسین کے نام سے بھی لکھی ہیں۔ یہ میرا عرف ہے
اور اب سوائے نوابزادہ محمد مہدی سلمہ اور چند خاص قریبی اعزا کے
مجھے کوئی اس نام سے پکارنے والا باقی نہیں رہا۔
مجھے لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق ہے (میں سمجھتا ہوں کہ جو جوابات میں نے قلمبند
کر دیئے ہیں ان سے وہ تمام باتیں منکشف ہو گئی
ہونگی جن کے متعلق آپ نے سوالات میں اشارہ کیا ہے۔ بس
اتنا اور عرض کرتا چلوں کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے ویسے
ویسے مجھے اپنی جہالت کا یقین ہوتا جاتا ہے۔ میں چند ہی زبانیں
جانتا ہوں۔ میں نے دنیا کی سیر نہیں کی ہے ہندوستان تک کے
سارے بڑے شہر نہیں دیکھے ہیں۔ میں سائنس اور ٹکنولوجی سے
واقف نہیں۔ سیکڑوں علوم کی ابجد تک نہیں جانتا۔ مجھے لکھنے
اور کچھ کہنے کا کیا حق ہے۔ پھر لطف یہ کہ جو کچھ آج تک پڑھا وہ
"حافظہ صفر" ہونے کے باعث کچھ بھی یاد نہیں۔ یہ سب میں
از روئے انکسار نہیں کہتا بلکہ اظہار حقیقت ہے۔ یقیناً میں بھی
نوجوانی میں "کوس لمن الملک" بجانا چاہتا تھا مگر اب سمجھ میں
آیا کہ "ع ایں سعادت بزور بازو نیست" اسلیئے میں اپنا گھسا پٹا
قلم چلانے پر کتب بینی کو ہر حالت میں ترجیح دیتا ہوں اور جب
تقاضوں سے عاجز آجاتا ہوں یا اقتصادی ضرورتوں سے مجبور
ہو جاتا ہوں جبھی کچھ لکھتا ہوں۔ جب سے ریٹائر ہوا ہوں

اوسطاً اٹھارہ گھنٹے روزانہ پڑھتا ہوں ۔ اخبار، رسالے اور انگریزی ناول۔ یہ بھی وائلڈ وسٹ یا جاسوسی ناول یا کبھی کبھی امریکہ کے تازہ سے تازہ "بیسٹ سلرز" قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئی سنجیدہ کتاب اسی وقت پڑھتا ہوں جب مجھے کسی سنجیدہ موضوع پر لکھنا ہوتا ہے ورنہ روزانہ بعد نماز صبح تلاوت قرآن کے علاوہ میں سنجیدہ کتابوں کے مطالعے سے گھبرانے لگا ہوں۔ قرآن کی تلاوت کی مزاولت نے مجھے انسانیت کے معنی سمجھائے ہیں اور اسلام کی وسیع دامانی مجھ پر واضح کی ہے۔

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ میں قرآنی اسلام پر کچھ لکھوں، مگر کاہلی مانع ہوتی ہے اور اپنی علمی بے بضاعتی کے دامن میں پناہ لے کر جلدی سے کوئی ناول اٹھا لیتا ہوں تاکہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے مسائل میرے کمزور دماغ پر دیر تک بار نہ بن سکیں۔ بس مفر اسی میں ہے کہ شاد عظیم آبادی کا یہ شعر گنگنائے اور اپنے دماغ کو سوچنے کی زحمت سے بچائے۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

میرے عیوب : اس "آپ بیتی" کے اختتام پر مجھ سے "اقراری مجرم" کی طرح میرے وہ عیوب بھی سن لیجئے جو میری فطرت ثانیہ بن گئے ہیں۔

(۱) میں اتنا کاہل ہوں میں اس وقت تک اپنی جگہ سے ہلنا نہیں چاہتا جب تک کہ مجبور نہ ہو جاؤں۔ یا مجبور نہ کر دیا جاؤں اکثر دنیاوی ترقیاں مجھے محض اسلئے نہ حاصل ہوئیں کہ میں نے ان کے لئے تگ و دو نہ کی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اگر میں اس کام کو کروں تو سب سے بہتر انجام دے لونگا۔ میں نے ہمیشہ اسے خود انجام دینے سے اپنی جان بچائی۔ اور دوسروں کو اپنے سے برتر اور بہتر تسلیم کرکے وہ کام انہیں سے لے لئے۔ اب چاہے بعد میں اس گھٹیا کام پر میرا ضمیر مجھے کتنی ہی ملامت کرے اور دوسرے معترض بھی ہوں مگر میں سب کے سامنے بہ اصرار اسی کا اقرار کروں گا کہ اگر میں نے خود اس کام میں ہاتھ لگایا ہوتا تو وہ یقینی اس سے بھی زیادہ خراب ہوتا۔ اسی کاہلی کا نتیجہ ہے کہ میں اپنے اور اپنے عیال کی بیماریوں کے لئے ڈاکٹر، حکیم، دوا اور تیمار داری کی ذمہ داریوں سے گریزاں رہتا ہوں۔ میری موجودہ بیوی کو جو معدہ کی خرابی کی مستقل مریضہ ہیں مجھ سے یہی شکایت ہے کہ وہ خواہ کتنی ہی تکلیف میں ہوں، خواہ لڑکیاں کیسی ہی بیمار ہوں، علاج معالجہ کی ذمہ داری انکے یا دوسرے خورد عزیزوں کے سر رہتی ہے۔ مجھ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ میں انکی طعن و تشنیع "شیر مادر" کی طرح پی جاتا ہوں۔ اس "شیر مادر" پر ہونٹ نہ کچکچائیے۔ سچ مانئے۔ چالیس برس کے بعد ہر بیوی بیوی کم رہ جاتی ہے "مادر" زیادہ بن جاتی ہے۔ اسی کاہلی کے سر اہت سے اپنے پلاٹوں اور افسانوں کا خون بھی ہے۔ مثلاً میں پلنگ پر لیٹا ہوں۔ ذہن میں ایک کہانی چھم چھم کرتی، انگڑائیاں لیتی یا روتی بسورتی سسکیاں بھرتی یا فلسفے کو شعر و شاعری کا جامہ پہناتی آئی اور قلم، پنسل اور کاغذ ذرا فاصلے پر ہے۔ زیادہ نہیں۔ یہی دو تین گز کی دوری میں میرے لمبے ہاتھوں کی رسائی سے باہر اور کوئی ایسا مددگار برمحل نہ آیا جو ان نارسیدوں کو رسیدہ بنا دے تو بجائے اسکے میں اٹھوں اور اپنے ذہن کی نوبہ نو "تخلیق" کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی زحمت اٹھاؤں میں "اونہہ" کرکے کروٹ لے لونگا اور آئی ہوئی پری ایک ہلکے رقص کے بعد کوہ قاف واپس اڑ جائے گی۔ حافظے میں اسکا مقبرہ بنانے والا کوئی زندان ہی نہیں جہاں وہ شکستہ پر سہی مگر محفوظ تو رہتی۔

(۲) میں کچھ جھینپو قسم کا آدمی ہوں اسلئے مجمعوں میں "اسپاچ" دینے سے گریز کرتا ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ میں تقریر نہیں کر سکتا۔ میں لکھنؤ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے مباحثوں میں شریک ہوا ہوں۔ اور ہم چشموں میں اچھے مقرروں میں شمار کیا گیا ہوں۔ میں نے والد مرحوم کی حیات میں انکے حکم کی تعمیل میں کئی سال عشرۂ محرم کی آٹھ آٹھ، دس دس مجلسیں، گھنٹے گھنٹے، ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کی پڑھی ہیں۔ مگر میں نے ہمیشہ پلیٹ فارم پر جا کر مجمع کو خطاب کرنے سے

منہ چرایا۔ میں دوسروں کی لاطائل بکواس پر ہنسنا اور خود اپنی
بے معنی گفتگو پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع دینے سے میں نے پرہیز کیا۔
یہ تجنب کسی احساس کمتری کا نتیجہ نہیں۔ یہ اپنی رائے کی صحت کے
متعلق ایک تذبذب اور اپنی فہم و فراست کے بارے میں ایک تشکیکی
کیفیت کا نتیجہ ہے۔ دنیاوی کامیابی اور ترقی انہیں لوگوں کو حاصل
ہوتی ہے جو اپنی برتری پر وثوق کامل رکھتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ
انکی رائے کے خلاف مسلّم دانش وروں کی رائیں بھی غلط ہیں
جن کا انداز بیان و مزاج کچھ ایسا ہوتا ہے "جہنم میں جائیں یہ
بے عقل مخالف رائے رکھنے والے! سب جھک مارتے ہیں"
میرے مزاج میں یہ ہٹ دھرمی نہیں۔ مجھے اپنے مخالف کی بات کے
ان بھی کچھ نہ کچھ صحیح اور درست پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کی
نظر سے اگر ہچنسن کا ناول "اِف ونٹر کمس" گزرا ہوگا تو آپ کو
مجھے پہچان لینے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔ میری ذہنیت اور مزاج
بالکل اسی کے ہیرو جیسے ہیں۔ یقین مانیے ایسا آدمی جو اپنے کو
ہر معاملے میں سو فیصدی درست نہیں سمجھتا جسے مخالف کے
استدلال میں بھی تھوڑی بہت حق و صداقت کی جھلک
دکھائی دیتی ہے وہ کبھی دنیاوی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔
غالباً وہ ایک بڑا فنکار اور ادیب و شاعر بھی نہیں بن سکتا اسلئے کہ
ان میں سے ہر ایک کے لیے "ہم چو من دیگرے نیست" والے یقین کی
غالباً سخت ضرورت ہے۔ اردو کا ہر شاعر "سخن گسترانہ" طور پر ہی
ہی مگر اس امر کا مدعی ہے اور برنارڈ شا اور ابوالکلام آزاد کی
عظمت کا راز بہت حد تک اسی کوس لمن الملک بجانے کی
لے میں پوشیدہ ہے۔ غالباً اپنے مزاج میں اسی عدم تیقن اور اسی
عدم انانیت کی موجودگی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب میں کسی بڑے مصنف
کی کوئی حقیقتاً عظیم تصنیف پڑھ لیتا ہوں تو مہینوں قلم اٹھانے کی
ہمت نہیں کرتا۔ مجھ کو اپنی بے بضاعتی بری طرح محسوس ہوتی ہے
اور جرأت تخلیق مجھ سے بالکل سلب ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ
اب تک اردو کا کوئی مصنف مجھ میں یہ احساس کمتری نہ پیدا کر سکا
غالباً یہی وجہ ہے کہ مجھ جیسا کم سواد بھی اس زبان کا خادم بننے کی
ہمت کر سکا۔

(۳) میں مزاج کا جھلّا ہوں۔ اسی کے ساتھ مضحکہ خیز حد تک
رقیق القلب بھی۔ بس یوں سمجھیے کہ ناک پر غصہ اور پلک پر آنسو۔
لیکن یہ غصہ کبھی دیرپا نہیں ہوتا۔ چند ہی منٹ بعد اس پارہ کا
پارہ اتر جاتا ہے۔ پھر اگر میں غلطی پر ہوں تو ندامت کے آنسو۔ یا
مخالف نے معافی مانگ لی تو محبت کے آنسو۔ مدرسی کے پیشے نے
اس غصے پر قابو پانے کا گر تو سکھا دیا مگر آنکھوں کی بہیا کے آگے
کوئی بند نہ باندھ سکا۔ میں نے اسسٹنٹ ماسٹری کے زمانے میں
کبھی کسی شاگرد کو نہ مارا مگر ہیڈ ماسٹری اور پرنسپلی کے عہد میں
ماتحت معلمین کی شکایت پر طلبا کو سزائیں دیں۔ اکثر ان کی
بید سے تواضع کی۔ مگر مجرم جیسے ہی بلکتا بسورتا ہوا کمرے سے
باہر جاتا میرا دل مجھے اس تادیب کی سزا دیتا۔ مجھے رومال کی مدد سے
اپنے آنسو ماتحتوں سے چھپانا پڑتے۔

اقتضائے سن کی وجہ سے میری یہ اعصابی کمزوری اس قدر
بڑھ گئی ہے کہ آپ کوئی اچھا شعر پڑھ دیجیے آنکھیں نم ہو جائینگی
کوئی بات غیرت، حمیت، شرافت، مروت، محبت و انسانیت کی
ذرا زوردار طور پر پُرخلوص لب و لہجہ میں کہہ دیجیے اور میں سسکیاں
اشکبار ہو جانے لگا۔ میں اپنی اس جذباتیت اور ذکی الحسی سے
بہت عاجز ہوں۔

میں تقی میر جیسا "گدائے متکبر" بھی ہوں۔ دس بیس
تعلقہ داران اودھ کی خدمت میں رسائی تھی۔ ان میں سے دو
تین شاگرد بھی تھے مگر میں نے نہ کسی کی دربارداری کی نہ کاسہ لیسی۔
میں ہمیشہ سے صاف اور کھری بات کہنے کا عادی رہا۔ وہاں یہ حال کہ
اگر کونین کی بھی صحت ذہنی کے لیے ضرورت ہو تو اسے شکر میں لپیٹ کر
پیش کرو۔ اسلیے دور ہی دور سے نیازمندانہ سلام و پیام رہا۔ یہی
حالت اپنے محکمے کے افسروں کے معاملے میں بھی رہی۔ میں کام کے
لحاظ سے ہر ایک کی نظر میں درجۂ اول کا ممدوح رہا مگر حاضر باشی کے
خانے میں میرے نام کے سامنے ہمیشہ "غ" ہی لکھا گیا اور آج کل کے
زمانے میں ترقی کے لیے حاضر باشی ٹھہری شرط اول۔ یہی وجہ ہوئی کہ

میں پراونشیل ایجوکیشنل سروس کے درجہ دوم سے آگے نہ بڑھ سکا درآنحالیکہ میرے دوسرے ساتھی جو مجھ سے کم ڈگریاں رکھتے تھے یا جن کے اعمالنامے مجھ سے بڑے تھے درجۂ اول پا گئے۔ ہاں مگر اس معاملے میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔ یعنی وہی مذہبی تعصب جس کا بدقسمتی سے یہ صوبہ خاص طور سے شکار ہے۔ خدا جانے اس گندی ذہنیت کی لعنت ہمارے ملک سے کب رفع ہوگی۔

(۵) میں اچھی غذاؤں کا لالچی ہوں۔ میں اپنے آقا و مولا حضرت علیؑ کی طرح نان جویں کھا کر نہ جسمانی محنت کر سکتا ہوں نہ عبادت الٰہی۔ اور نہ سوکھی روٹی کھا کر نکات حکمت بیان کر سکتا ہوں۔ میں خراب کھانا کھا کر کوئی اچھا فسانہ یا مقالہ نہیں لکھ سکتا۔ "خوردن برائے زیستن" انہیں لوگوں کا عملیہ ہو سکتا ہے جو اللہ والے ہیں۔ یا جو زندگی کے حریص ہیں۔ اللہ والوں کے متعلق زبان کشائی کی مجال نہیں مگر یہ جو دوسرے قسم کے فاقہ مست ہیں ان کی ذہنیت میری سمجھ سے باہر ہے۔ ابال ابال کر ترکاریاں کھاؤ مگر جیتے جاؤ۔ پوچھئے حضرت۔ اگر آپ نہ جئیں گے تو کیا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اسلئے میں جناب "زیستن برائے خوردن" کا زیادہ طرف دار ہوں۔

میرے نزدیک جنت ارضی کے عناصر ترکیبی چار ہیں۔ اچھا کھانا، اچھی بیوی۔ اچھے دوست اور اچھی کتابیں۔ اچھے کھانے سے میری مراد یہ نہیں کہ ہر وقت باقرخانی، پلاؤ، قورمہ، مرغ و ماہی۔ مزعفر اور شاہی ٹکڑوں ہی پر ہاتھ مارا جائے بلکہ جو کچھ پکا ہو وہ خوش ذائقہ و خوش رائحہ ہو۔ نمک مرچ سے درست ہو اور اس میں گوشت کا حصہ کافی ہو۔ اور کوئی میٹھی چیز بھی ضرور ہو۔ الحلو للمومن

میری دایہ پٹھانی تھی۔ اس "کھلائی" نے مجھے روٹی اور بوٹی ہی کھلائی یا مونگ کے لڈو۔ بادام اور گاجر کے حلوے اور طرح طرح کی مٹھائیاں۔ اسی نے میری عادت بگاڑ دی۔ پھر نانی مرحومہ کا میں لاڈلا تھا انہوں نے میرے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا۔ ان کی حیات تک (تا ۱۹۲۱ء) میں جب بھی چھٹیوں میں گھر جاتا تو مجھے درجنوں چوزے کھانے کو ملتے۔ گھر میں مرغیاں وہ اپنے نام کی مخصوص طور پر اسلئے پالتی تھیں کہ وہ اپنے چھوٹے نواسے کو ذرا "چکنا" بنا کر پردیس میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے واپس بھیجیں۔

چنانچہ اب بھی جبکہ صرف دو چپاتیاں اور دو لقمہ چاول میری غذا ہے زبان کا چٹورا پن نہیں گیا۔ اچھے کھانے پر رال ٹپکتی ہے۔ اور دعوتیں کھانے اور کھلانے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ غرض سب ہی پنج عیب شرعی مجھ میں موجود ہیں۔ میں اقراری مجرم ہوں۔ جو چاہے سزا دے لیجئے ع

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

~~~ ⁂ ~~~

~~~

نِرمل پکچرس

خالق

"گنگا میّا توہے پیری چڑھیبو"

"سولہو سنگار کرے دلہنیاں"

اور

"روٹھا نہ کرو"

(رنگین)

علی عبّاس حسینی نمبر کی اشاعت پر اپنی مبارکباد پیش کرتا ہے

جاری کردہ: کاظم رضوی آنریری پریس اڈوائزر نرمل پکچرس بنارس

N.P. K. R.- 27/65

علی عباس حسینی

نیا تاج

رحمان کو بس ایک ہی دُھن تھی۔ کسی طرح اس کے پاس اتنے روپے ہو جائیں کہ وہ اپنی نورا کا مقبرہ بھی تاج جیسا بنوا دے بیس برس سے وہ یہی خواب دیکھ رہا تھا، سنگ مرمر میں ڈھلے ہوئے حسن مجسم کا خواب! اس نے اپنی نورا سے ممتاز محل کی قبر کا کٹہرا پکڑ کر یہ وعدہ کیا تھا، اور اس کی نورا نے مرنے سے پہلے اپنی خاص ضد کرنے والی ادا سے مسکرا کر اس سے اپنا وعدہ نہ بھولنے کا اقرار بھی لیا تھا۔ بیس برس میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب رحمان کو اپنا وعدہ نہ یاد رہا ہو۔ وہ دُور دُور ملکوں میں رہا۔ اس کی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے مگر وہ نہ نورا کو بھولا اور نہ اس کے فرمائشی تاج کو۔ اب وہ وطن پلٹ رہا تھا اسی ایفائے عہد کے لئے۔

بیس برس پہلے وہ اپنے گاؤں لہرا کا ایک چھوٹا سا کاشتکار تھا۔ رحمان کے باپ نے گاؤں کے ٹھاکر راجہ کی بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں، نہ جانے کتنی بار اس نے ان کی سپر بن کر اپنے ہاتھ پاؤں تڑوائے تھے۔ راجہ نے انھیں خدمتوں کے صلے میں اپنے سیر کے کھیتوں سے دس بیگھے کا ایک مسلم چک بطور رعایتی کے اس کے نام لکھ دیا تھا۔ رحمان کے باپ نے اسی چک کے کنارے اپنا ایک چھوٹا سا کچی دیواروں کا کھپریل سے چھایا ہوا مکان بنوا لیا تھا اور باہری صحن میں اسارے کے قریب ایک "یک پلیا" چھپر اپنے بیلوں اور بھینس کے باندھنے کے لئے ڈال لیا تھا۔ رحمان اسی مکان میں پیدا ہوا، پلا، بڑھا، اور اس نے اپنے گاؤں کے اسکول سے اردو ہندی مڈل پاس کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ آگے بھی کچھ پڑھتا، مگر گاؤں میں طاعون آیا۔ باپ، ماں، چھوٹی بہن سب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ سولہ برس کے لڑکے پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ گھر کاٹنے کھانے لگا۔ وہ کہئے کہ بچاری "مامی" جو پہلے ہی سے بیوہ اور بے اولاد تھی، اسے سنبھالنے کے لئے اپنا گھر چھوڑ کر اس کے گھر میں اُٹھ آئی۔ بڑھیا کو ایک تندرست سولہ برس کا ہونہار بیٹا ملا۔ رحمان کو پھر اپنے گھر میں سر پر دست شفقت پھیرنے والی اور دو وقت کی روٹی پکا دینے والی ہستی مل گئی۔

اس طرف سے تو ذرا اطمینان ہوا، مگر حریفوں نے لڑکا سمجھ کر اسے دبانے کی کوشش کی، کھیتوں پر قبضہ کر لینے کی فکریں تدبیریں کیں۔ عزیزوں، قرابت داروں کی ہمدردیاں بھی خود غرضی سے خالی نہ تھیں۔ کوئی کھیتی میں شریک، "ساجھی" بننا چاہتا تھا، کوئی اس کا مختار عام بن کر ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے کر اسے ایک بے دست و پا زمیندار جیسا بنانے کے لئے تیار تھا۔ چور اُچکوں نے گھر میں سیند لگائی اور گھر کا برتن باسن، گیہوں، چاول اور دالوں کے بورے اُٹھا لے گئے۔ شریر دشمنوں نے ایک پورا لہلہاتا ہرا بھرا کھیت چروا لیا وہ روتا ہوا بڑے ٹھاکر کے پاس گیا۔ انھوں نے ضلع دار، پیادوں کو بلا کر بہت ڈانٹا۔ ان کے انتظام کی خرابی پر انھیں ملامت کی۔ اور اسے اچھا بیج مہیا کرنے اور ہر طرح کی مدد دینے کا انھیں حکم دیا۔ انھیں پریشانیوں میں دو برس گزر گئے۔ اور رحمان سختیاں جھیل کر جوان ہو گیا۔

"مامی" نے اس کی بھیگی مسیں دیکھ کر اور اسے وقت ناوقت گنگناتے سُن کر ادھر اُدھر رشتے کی بات چیت کی۔ اسے بھتی پور کی نورا بہت پسند آئی۔ اس نے ایک دن رحمان سے کہا "اب تو جوان ہو گیا ہے۔ اپنا گھر بسا۔ گھر میں چاند سی بہو لے آ۔ میں اکیلی بیٹھی مکھی مارا کرتی، وہ آجائے گی تو ذرا چہل پہل ہوگی۔ کچھ دن اس کو چھن چھن کڑے بجاتی اِدھر سے اُدھر آتے جاتے دیکھوں گی۔ پھر تیرے لعل سے بچے اس آنگن کی دھول میں لوٹیں گے، مٹی کے لڈو بنائیں گے۔ انھیں دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگا!"

رحمان نے شرماتے ہوئے مُسکرا کر کہا "تو جا کے ڈھونڈ ھ لا، میں کب انکار کرتا ہوں!" اور بڑھیا نے چٹ منگنی پٹ بیاہ پر عمل کیا، رحمان کو سہرا باندھ کر بھتی پور برادری والوں کے ساتھ لے گئی اور چودہ برس کی نورا کو بہو بنا کر لے آئی۔

رحمان کی نظر میں نورا سر سے پاؤں تک نور میں ڈھلی ہوئی تھی۔ قاف کی پری تھی، بہشت کی حور تھی، بس کچھ انی ہی خوبصورت تھی کہ اس دیہاتی کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ نہ ملتے تھے۔ وہ اس چاند کا چکور تھا، وہ اس پھول کا بھونرا تھا، وہ اس چراغ کا پروانہ تھا وہ گرم گرم سانسیں لے کر کہتا "تم اتنی اچھی لگتی ہو نورا! اتنی اچھی کہ جی چاہتا ہے کہ تمھیں چبا جاؤں! سینہ چیر کر تمھیں اُس کے اندر رکھ لوں!" اور نورا اس طرح ہنستی جس طرح پتلی گردن والی صراحی چپٹ بیا کھڑ کے پیاسے کو پانی دیتے ہوئی ہنستی ہے لیکن اس ہنسی سے رحمان کی پیاس بڑھتی ہی تھی، بجھتی نہ تھی۔ اور جب جس طرح قلقل کی آواز تیز ہوتی، رحمان کی آواز گلوگیر ہوتی جاتی۔

نورا کی آواز واقعی بھی بڑی شیریں اور سُریلی۔ وہ بہت اچھا گا لیتی تھی۔ وہ اچھے سے اچھے گویّوں کی نقل اُتار نے پر قدرت رکھتی تھی۔ اسے بڑے بڑے موسیقاروں کے سننے کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ گرام سبھاؤں میں اس وقت ریڈیو کا چلن بھی نہ تھا۔ مگر برادری کا ایک شخص، جو کلکتہ "جٹ کل" میں کام کرتا تھا۔ نورا کی شادی سے پہلے اپنی جوان بیوی کے لئے نیا گراموفون اور درجن بھر فلمی گانوں کے ریکارڈ لایا تھا دس بارہ مُسلسل راتوں کو یہ ریکارڈ بجائے گئے۔ گاؤں کی بوڑھیاں، جوانیں، بچیاں سب ہی تو "کلکتیا بھائی" کے گھر میں گراموفون کے گرد حلقہ بنائے بیٹھی رہتی تھیں اور ان ریکارڈوں کو سُن سُن کر ٹھکتی، تالیاں بجاتی اور جھومتی تھیں۔ نورا نے ان کو دھیان لگا کر سنا، ان کے بول ساتھ ساتھ دہراتی گئی اور ان کی ہُو بہو نقل کرنے لگی۔

جب چاندنی راتیں ہوتیں، اندھیاری سپید چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ لیتی اور "مامی" اپنی کھٹیا پر پڑی خرّاٹے لیتی ہوتی، تو رحمان اور نورا ایک دوسرے کو آنکھ مارتے، بلّی کی چال چل کر گھر سے باہر نکلتے، دروازے میں باہر سے تالا ڈال کر، ہاتھ میں ہاتھ دے کر گاؤں کے پیچھے "تالاب" پر چلے جاتے۔ دونوں وہاں پانی سے قریب والی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے اور نورا شوہر کو فلمی گانے سناتی۔ رحمان کو کبھی بیوی کی "لے داری" پر، کبھی گانوں کے بول پر ایسا مزہ آجاتا کہ وہ پتھر کی سیڑھیوں کو زور زور سے گھونسوں سے مارتا اور یہ بھول جاتا کہ وہ نہ تو بھینس کی پیٹھ ہیں اور نہ بیل کے پُٹھے۔ ایسے میں جب اُسے چوٹ آجاتی اور وہ "سی" کر کے ہاتھ کو اپنی گرم گرم پھونکوں سے سینکنے لگتا، تو نورا اُس پر بگڑتی، پھر اس کا ہاتھ اپنے نرم نرم ہاتھوں سے سہلاتی اور اسے چوم چوم کر رحمان کو ایک نئی تکلیف میں مبتلا کر دیتی۔ وہی تکلیف جو اسے نورا کو اپنے سینے میں نہ رکھ پانے سے ہوتی تھی!۔ اور نورا اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بے ساختہ ہنستی، اور اس پر پانی اُچھال دیتی۔ پھر دونوں کی ایک دوسرے کو پکڑنے اور بچنے کی کوشش بھاگ دوڑ کی صورت اختیار کر لیتی۔ اور نورا جب پھولتی سانسوں کے ساتھ تھک کر گرفتار ہو جاتی، تو وہ رحمان کی گرم جوشیوں کو بھڑکانے کے لئے، سطحِ آب پر چمکتے چاند کی طرف اشارہ کر کے کہتی "ارے کیا کر رہے ہو، دیکھتے نہیں وہ چندا ماموں کیا گھور رہے ہیں!" رحمان فوراً ہی ایک ڈھیلا اُٹھا کر پانی پر چمکتے چاند کو کھینچ مارتا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، اور نورا کے دیدوں میں جھمکتے تاروں کی طرح نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے چاند پانی میں تیرنے لگتے۔ نورا کے حلق سے قُلقُل مینا جیسی صدا نکلتی اور رحمان آپے سے باہر ہو کر اسے چبانے کی کوشش کرنے لگتا۔

نورا کی اُس زمانے میں بس ایک تمنا تھی کس طرح وہ اجمیر شریف ۔ عرس میں پہنچ جائے ۔ اس نے سن رکھا تھا کہ وہاں ہندوستان اور پاکستان کا بڑے سے بڑا قوال آتا ہے ۔ وہ چاہتی تھی اس نے جس طرح فلمی گانے سیکھ لئے ہیں ، اسی طرح وہ اچھے اچھے ترانے اور قوالیاں بھی یاد کرلے ۔ سہیلوں ، سکھیوں کو جیسے وہ فلمی گانے سناتی ہے ، اسی طرح بڑے بوڑھوں کو اپنے پیارے نبیؐ کے نعت بھی سنا سکے ۔ رحمان سے جب اس نے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو اس نے فوراً تائید کی ۔ جب سے پیدا ہوا تھا اُس نے آس پاس کے دیہاتوں اور ضلع کے چھوٹے سے شہر کے علاوہ کچھ نہ دیکھا تھا ۔ جب اس طرح کا ہنستا گنگناتا جیون ساتھی " اپنے پاس ہو تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دنیا کے عجائبات اور بڑے بڑے شہروں کی چہل پہل دیکھنے کی خواہش کیوں نہ پیدا ہو ۔ مگر گھبراہٹ بھی تھی ۔ ریل پر سوار ہونا پڑے گا ، نئے نئے لوگ ہوں گے ، نئی نئی جگہیں ہوں گی اور ساتھی " ناموس " بھی ہے ۔ کیسا پڑے کیسا نہ پڑے ۔ مگر عرس کا زمانہ آتے ہی خبر ملی کہ اپنے برادری ہی کے خلیل کا کا جو دو بار حج کر چکے ہیں ، اب کے اجمیر شریف جا رہے ہیں ۔ بس رہبر بھی مل گیا اور وہ بھی گویا اپنے گھر ہی کا ۔ ایسا کہ اس سے ہر مشکل میں مدد ملنے کا یقین تھا ۔ " رخت سفر " بندھ گیا ۔ گاڑی آگرے ہو کر جاتی تھی ۔ وہاں صبح کو پہنچے تو رحمان کے دل میں شوق چرایا کہ ایک دن رک کر یہاں کا قلعہ اور تاج بی بی کا روضہ کیوں نہ اپنی نورا کو دکھا دوں ! اس نے شرماتے شرماتے خلیل کا کا سے ذکر کیا ۔ اس بوڑھے نے ساٹھ سے کچھ ہی کم برساتیں دیکھی تھیں ۔ وہ مسکرایا اور اس نے کہا " بہت اچھا خیال ہے ۔ میں یہیں اسٹیشن پر تم لوگوں کا اسباب دیکھتا ہوں ، تم دونوں گھوم پھر آؤ ۔ "

اور رحمان و نورا نے منھ کھولے کھولے تاج کا گوشہ گوشہ دیکھا ، اور جب وہ نیچے تہ خانے والی اصلی قبر پر پہنچے تو رحمان ممتاز محل کی قبر پر ہاتھ رکھ کر کہا " لوگ جو جی چاہے کہیں ۔ مگر نورا سچ مانو ۔ جتنا میں تم کو چاہتا ہوں ، اس سے زیادہ شاہ جہاں اپنی ملکہ کو نہیں چاہتا رہا ہوگا ! "

اور نورا نے چمک کر کہا " میں جب مانوں گی ، جب میرے مرنے پر تم بھی اس سے بہت چھوٹا سہی ، مگر بالکل ایسا ہی میرے مقبرہ بنوا دوگے ! "

رحمان بے تاب ہو کر بول اُٹھا " اللہ نہ کرے میں تیرے بعد جیوں ! "

وہ ہنس پڑی ۔ معلوم ہوا واقعی موتیوں کی بارش ہو رہی ہے ۔ وہ بولی " نہ بنوانے کا یہ اچھا بہانہ نکالا ! "

رحمان نے جوش میں آکر وعدہ کیا " اچھا ' اچھا ' میں جیوں گا بھی اور تیرا مقبرہ بھی بنواؤں گا ۔ بالکل تیری طرح نور میں ڈھلا ہوا ! "

اور جب نورا اجمیر شریف سے پلٹی تو ہر طرح بامراد پلٹی ۔ قوالیاں بھی " ایک سے ایک بڑھیا " یاد کر لائی ۔ پیٹ میں بچہ ہونے کا یقین بھی ساتھ لائی ، اور مقبرہ بنوا کر امر بنائے جانے کے وعدے کے پورے کئے جانے کا یقین بھی ۔ وہ حد درجہ خوش تھی ۔ وہ اپنا دامن ہر طرح بھر لائی تھی ۔ اس نے اپنی ساری سکھیوں کو بار بار اپنے سفر کی دلچسپیاں اور عجائبات بیان کر کے متعجب ہی نہ بنایا ، بلکہ ان میں سے ہر ایک پر اپنی برتری بھی ثابت کی اور یہ جتلا کر کہ اس کے میاں جیسا چاہنے والا شوہر کسی کو نصیب نہیں ، اُن میں رشک کا جلاپا بھی پیدا کر دیا ۔ اس نے بوڑھوں بوڑھیوں کو تازہ سیکھی ہوئی قوالیاں بھی سنائیں اور ان سے جیتے بسنے ، پھلنے پھولنے کی دعائیں بھی خوب خوب وصول کیں ۔ اور یہ معمول سا ہو گیا کہ ہر شب جمعہ سب رحمان کے اُسارے میں جمع ہو جاتے اور نورا انھیں اپنے گلے کا رس اتنا پلاتی اتنا پلاتی کہ وہ چھک جاتے ۔

لیکن جیسے جیسے جوہی کا پھول موتیے کی صورت اختیار کرتا گیا ۔ ان نشستوں میں کمی آتی گئی ۔ سننے والوں کا چاہے جی نہ بھرتا ہو ،

ر سنانے والی جلد ہی تھک سی جاتی ۔ پھر وہ ، انھیں قوالیوں کو بار بار دہراتے دہراتے عاجز بھی آ گئی تھی ۔ اس نے طے کیا تھا " میں
ے چاند جیسے " بھیا " کے پیدا ہوتے ہی ، اسے لے کر پھر اجمیر شریف جاؤں گی ، اور جہاں اس کے لئے خواجہ صاحب سے برکتیں
وں گی ، خود نئی نئی قوالیاں ، نئے نئے گیت سیکھ کر آؤں گی "۔

مگر زندگی تو مکڑی کے جال جیسی کمزور اور لچکیلی بھی ہے :

ایک دن رحمان سورج ڈوبنے سے پہلے کسی کام سے دوسرے گاؤں چلا گیا ۔ بیلوں کی ناند خالی رہ گئی ۔ وہ ڈکرنے لگے ۔ نورا
ن بھوسا دینے چلی گئی ۔ بیل سدھے ہوئے تھے ۔ مالکن کی صورت پہچانتے تھے ۔ اس کی بو باس سے مانوس تھے ۔ مگر اُن میں سے ایک
ا دن کچھ زیادہ بھوکا تھا ، وہ ناند کے پانی میں بھوسا ڈال کر جھکی ہوئی ہاتھ سے اسے ملا رہی تھی ، کہ بیل نے بے چینی سے ناند میں منہ ڈالا
اس کے سینگ کی تیز نوک نورا کی پسلی کے نیچے زور سے لگی ۔ نورا تڑپ کر زمین پر گری اور بے ہوش ہو گئی ۔ مامی باورچی خانے میں کھانا
نے میں لگی تھی ۔ اُسے اس حادثہ کی کوئی بھی خبر نہ ہوئی ۔ اور بیل اطمینان سے کھاتے رہے !

آدھ گھنٹے بعد جب رحمان واپس آیا اور اسے نورا نہ دکھائی دی ، تو وہ لالٹین لے کر اس کی تلاش میں نکلا ۔ لالٹین بلند کر کے جہاں
لے میں روشنی ڈالی ، وہاں چھپر میں بھی ۔ چھپر سے جہاں بیلوں کی آنکھیں چمکیں ، وہاں نورا کا چہرہ بھی چمکا ۔ وہ " ارے کیا ہوا ؟ " کہتا
ا ، اور اس نے بیوی کو گود میں اُٹھا کر اندر لے جا کر پلنگ پر لٹا دیا ۔ وہ اب بھی بے ہوش تھی اور اس کے کپڑے میں خون کے دھبے تھے ۔
لے ، جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے دئیے ۔ تو وہ ہوش میں آئی ، مگر در د سے ماہی بے آب بنی ہوئی ۔ وہ جلدی سے گاؤں کے
جی کو بلا لایا ۔ انھوں نے " ناڑی " دیکھی ، حالت سنی ، کئی بھسم کھلائے اور سینک لیپ بتا کر سر ہلاتے گھر چلے گئے ۔ گاؤں میں جس کو خبر ہوئی
دوڑا آیا ۔ رحمان بوکھلایا بوکھلایا ہر ایک کا منہ دیکھتا رہا ۔ بڑی بوڑھیوں نے موٹی چھوٹی جو دوائیں اُن کو آتی تھیں وہ سب
ڈالیں ۔ مگر اس کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی ۔ سب کی رائے ہوئی کہ " اس وقت تو رات بہت آ گئی ہے ۔ اس لئے جس طرح بنے کا تو ،
سویرے ہی شہر کے اسپتال لے جاؤ ۔ " مگر صبح سے پہلے ہی چراغ سحری بجھ گیا ۔ بس ایک منٹ کے لئے لو بھڑکی ۔ نورا نے آنکھ کھول کر
ں کو دیکھا ۔ ضِد والی مسکراہٹ اس کے نیلے لبوں پر آئی ۔ وہ بولی " بھولنا نہیں ! میرا تاج ! " ۔ اور اپنے دیہاتی مفلس شاہجہاں کو
ں کا وعدہ یاد دلا کر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ۔

رحمان نے اسی وعدے کے زیر اثر اپنے دس بیگھوں کے چک کے بیچ میں اسے دفن کیا ۔ مگر سنگ مرمر کا مقبرہ کیسا ، قبر کو پختہ
انے کے پیسے بھی اس کے پاس نہ تھے ۔ پھر بھی عزم اٹل تھا ، وہ تاج جیسا مقبرہ اپنی نور کے لئے ضرور بنوائے گا ، ضرور بنوائے گا !
ں لئے گاؤں سے نکلنا ، وطن کو چھوڑنا ضروری تھا ۔ باہر جا کر " روپئے کمانا " لازمی تھا ۔

اس نے بیل بیچ ڈالے ، بھینس بھی نکال ڈالی ۔ مامی کے سال بھر کے کھانے کو چھوڑ کر سارا غلہ فروخت کر ڈالا ۔ اسے کچھ روپئے
ر کے خرچ کو دیئے ، اس سے " نور " کی قبر کی خبر گیری کا وعدہ لیا اور گاؤں کو خیر باد کہا ۔ مگر وہ جائے تو کہاں جائے ؟ شہر میں
جی بھرتی زور شور سے ہو رہی تھی ۔ دوسری جنگِ عظیم کے سلسلے میں جاپانی برما پر قبضہ کر چکے تھے ۔ مگر رحمان کو فوجی بننے کا کوئی
ق نہ تھا ۔ وہ فطری طور پر امن پسند تھا ۔ پھر وہ جانتا تھا کہ وطن پرست اسے ملکی لڑائی نہیں مانتے ۔ گاندھی جی ، نہرو ، آزاد
ب بڑے بڑے لیڈر اسی لئے جیل میں بند ہیں ۔ اس لئے رحمان کے دماغ میں ایک ہی جگہ کا خیال آ سکتا تھا ۔ مُلا کی دوڑ مسجد
یر شریف ۔ وہ اپنے اور " نور " کے خواجہ سے کہے گا " تم ہی دلواؤ " مگر پھر راستہ میں پڑتا تھا دہلی آگرہ ، جس تاج کو نور کے ساتھ
یکھا تھا ، اسے پھر ایک بار دیکھ لینے کی خواہش دل میں مچل گئی ۔ بڑی مشکل سے سواری ملی ۔ ہزارہا غیر ملکی محاذ پر جانے اور وہاں سے

ہوکر پلٹے اور صحت یاب ہونے کے بعد تاج کی زیارت فرض سمجھتے تھے۔ رحمان نے اسی بھیڑ کے ساتھ اب کے تاج دیکھا۔ مگر اس میلے
بھی وہ جیسے اکیلا ہی تھا۔ بس ہر قدم پر اس کی "نور" دکھائی دی۔ اس کی ہنستی مسکراتی شکل کے بار دیکھ لینے کی خواہش نے اُسے
دن آگرے میں روکے رکھا۔

ایک دن جب کہ وہ تاج کے زینے پر بیٹھا، دل ہی دل میں اپنی نور سے باتوں میں مشغول تھا۔ اس نے دیکھا ایک فوجی افسر زینے سے
تے اُترتے لڑکھڑایا اور پکے پھل کی طرح زمین پر گر پڑا۔ رحمان نے دوڑ کر اسے گود میں اُٹھالیا۔ اور اس کے اشارے پر اسے ٹیکسی تک
لایا۔ اور اسے سنبھالے ہوئے ہوٹل ہی دگیا بلکہ ایک ہفتہ بعد اسی کرنل ٹامسن کے ساتھ وہ امریکہ چلا گیا۔

ٹامسن کا ٹکساس میں ایک بہت بڑا فارم تھا، جس میں کھیتی بہت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ پٹرولیم اور موٹر کی کمپنیوں میں اس کے
بڑے حصے تھے اور درآمد و برآمد اشیا کا کام بھی ہوتا تھا۔ اس کے نہ کوئی عزیز تھا، نہ کوئی لڑکا، نہ لڑکی۔ کسی زمانے میں
کی بھی ایک سہلی تھی، جس کا پیرس خود ملک الموت بنا تھا۔ ایک موٹر کے حادثہ کے سلسلے میں اس حسینہ کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ اسی
غصہ میں سارا کام معتمد منیجروں کو سپرد کرکے، ٹامسن نے خود فوج میں کمیشن لے لیا تھا۔ اور اب وہ برما محاذ سے دونوں ٹانگیں بیکار
کے امریکہ رحمان کی بیساکھی لگائے پلٹا تھا۔ اس کے زخمی دل میں رحمان کی سادگی گھر کر گئی تھی۔ اس نے اپنے اس "بھورے بیٹے کو
ہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم دلوائی اور اسے ایک ہوشیار زرعی انجینیر بنوا کر، اپنے فارم میں مختلف ذمہ داریاں دے کر، اُسے اچھی طرح
پا اور پرکھا اور اپنے فارم اور تجارت میں حصہ دار بنا لیا۔

رحمان نے اس غیر ملکی محسن کو بڑے احترام سے اپنے دل میں جگہ دی۔ وہ ٹامسن کا عصا، بیل اور اس کا بیٹا بن گیا۔ اسے
ہی سے مختلف طرح کے غموں، آزمائشوں اور ذمہ داریوں نے سنجیدہ بنا دیا تھا اب جو اس نے ایک آزاد ملک کی آب و ہوا میں
تعلیم حاصل کی، تو اُسے اپنے ملک کی غلامی بھی ستانے، دکھ دینے لگی۔ ٹامسن سے محبت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہندوستانی آزادی کا
سچے دل سے حامی تھا۔ وہ بار بار کہتا "رحمان، میں جب مر جاؤں تو تم اپنے ملک جا کر اس کی جنگ آزادی میں ضرور شرکت کرنا۔ مجھے
رے نہرو کی آن بہت پسند ہے!" ـ اور جب ہندوستان کو آزادی ملی تو اس نے رحمان کی طرف سے اپنے فارم پر ایک بہت بڑا جلسہ
، جس میں کئی سو مہمان آئے اور رات بھر ناچ اور رنگ کی بزم جمی رہی۔ اور جیسے جیسے نہرو ملک کو سدھارتے اور سنوارتے چلے گئے،
مان کے دل میں ان سے ملنے، ان کے منصوبوں میں شرکت کرنے اور اپنے ملک کو زراعتی حیثیت سے امریکہ جیسا اُپجاؤ بنانے کی خواہش
ھتی گئی۔ یہ خواہش اس کے ہیرو کے دورۂ امریکہ میں اس سے ملاقات و گفتگو سے تیز تر ہوتی گئی۔ بس، اب اس کے دل کو یہی لگن تھی
وہ کسی طرح ہندوستان پہنچے اور نورا کا مقبرہ بنا کر وہ اپنے ہیرو کے چرنوں میں اپنا سب کچھ ڈال دے۔ اس نے جیسے ہی ٹامسن کی
آنکھیں بند ہوئیں اس نے اپنے حصہ کی ساری جائیداد بیچ ڈالی اور سارا سرمایہ ہندوستانی بنکوں میں منتقل کرا کے وہ وطن کے لئے ہوائی
جہاز سے روانہ ہو گیا۔ بس اب اسے یہی دھن تھی۔ وہ "نور" کا تاج بنوا دے اور نہرو جی کے منصوبوں میں تن من دھن لگا دے۔

لیکن وہ لندن میں پہنچا تھا کہ خبر ملی کہ اس کا محبوب بھی ایک ہی رات کی بیماری میں چٹ پٹ ہو گیا۔ نورا کیا تھی، پھول پر اوس کی
بوند، صبح کی پہلی کرن میں چمکی اور پھر ختم۔ اور یہ نہرو ایک کوندا تھا، اپنی چمک سے ایک لمحہ کے لئے سارے ملک میں اجالا کیا اور پھر دہی
اندھیری گھپ اندھیرا۔ رحمان کے سارے خیالی محل گر کر خاک کا ڈھیر ہو گئے۔ مگر اس نے حواس نہ کھوئے۔ اسی وقت اسپیشل
ہوائی جہاز چارٹر کیا اور اس نے دلی آکر لاکھوں ہم وطنوں کے ساتھ آنسو بہا کر اس گلابوں سے ڈھکے پھول سے جسم کو صندلی چتا پر
جل کر خاکستر بنتے دیکھا۔

وہ اس رات اشوک ہوٹل کے ایک کمرے میں غم زدہ پڑا رہا۔ دوسرے ہی دن وہ پلہڑا کے لئے روانہ ہوگیا۔ راستے بھر نہ اس نے کچھ کھایا پیا، نہ کسی سے باتیں کیں، بس گم سم منہ لپیٹے پڑا رہا۔ دوسرے دن صبح سویرے جب وہ اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترا، اس نے اپنا مختصر سفری سامان ایک رکشے پر رکھ کر اپنے گاؤں کا رخ کیا۔ مضافات ہی میں اسے ہر طرف خشک سالی کے آثار دکھائی دئے۔ ہر درخت، ہر کھیت پر ایک سوگ سا طاری تھا۔ سب مرجھائے ہوئے، سب طرح طرح سے منہ لٹکائے ہوئے، بے زبانی پر گویا پیاس سے زبان لٹکائے ہوئے "پانی! پانی!" کی صدا لگاتے ہوئے۔

اور جب وہ گھر پہنچا تو گھر کی جگہ ایک ٹیلہ دکھائی دیا۔ نہ دیواریں، نہ چھت، نہ اسائے، نہ کوٹھریاں۔ بس ایک بے آب و گیاہ مٹی کا تودہ۔ اور وہ رکشے سے اتر کر اس خس و خاشاک کے ڈھیر کو بھیگے دیدوں سے دیکھتا رہا۔ کیسی کیسی تصویریں اس کی نظروں میں پھرتی رہیں۔ ابا جی بیٹھے نریلی پی رہے ہیں .... اماں اسے چھاتی سے لگائے پیار کر رہی ہیں، ماں اسے بہو نہ لانے پر ڈانٹ رہی ہیں، کسی کے چہرے پر اطمینان و سکون کی لکیریں، کسی کا ہاتھ ماتھے سے کانپتا ہوا، کسی کی آنکھ محبت سے ڈبڈبائی ہوئی، اور پھر دفعتاً وہ یاد آگئی۔ جو ہر آن ہنستی، گنگناتی پھرتی تھی۔ جس کے ہر بول سے رس ٹپکتا تھا، جس کی تصویر اب بھی دل کے آئینہ میں نظر آتی تھی ہے اور وہ ان بوڑھوں پر فاتحہ پڑھتے ہوئے ادھر لپکا، جدھر اس نے اس کا تاج تعمیر کرنے کے لئے اسے سپرد خاک کیا تھا۔ سارے کھیت بوئے ہوئے تھے۔ اناج اگا ہوا تھا۔ مگر ہریالی غائب تھی۔ اسی طرح وہ مزار بھی غائب تھا، جسے وہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ مختلف کھیتوں میں بھٹکتا پھرا۔ یاد پر زور دے کر وہ اس جگہ پر بھی پہنچ گیا، جہاں اس نے اپنی جان سے زیادہ عزیز "نور" کو سپرد خاک کیا تھا، مگر کوئی نشان قبر نہ تھا۔ وہ کھیت کا ایک جزو بن گئی تھی۔

وہ غصے سے اپنی بوٹیاں نوچنے لگا۔ "کس شیطان نے نور کی قبر پر ہل چلایا۔ کس نے اس کی آخری آرام گاہ کو ڈھایا۔ میں اس کا خون چوس لوں گا! میں اس کے جسم کے تکے بوٹی کرکے چیل کوؤں کو کھلاؤں گا!"۔

وہ اسی طرح غصہ میں بھنا کھیتوں سے نکلا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ ایک "صاحب" کو کھیتوں میں مارا مارا پھرتے دیکھ کر جمع ہو گئے تھے۔ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کیا چاہتا ہے۔ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کیا۔ رحمان اسے پہچانتے ہی غصہ بھولا۔ جلدی سے سر سے ٹوپ اتار کر بولا "ارے خلیل کاکا! آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں آپ کا رحمان ہوں۔"

خلیل نے گلے سے لگانے کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔ اور رحمان کو اس کمر خمیدہ بوڑھے کے سینے سے لگ کر پھر ایسا محسوس ہوا کہ وہ وہی گھبرایا ہوا نوجوان ہے، جس نے اسی بوڑھے کو اجمیر شریف کے سفر میں اپنا رہبر بنایا تھا، اور ایک قدم بھی بغیر اس کی صلاح مشورے کے نہ اٹھایا تھا۔ اور وہ اس سے ایک ایک کا نام لے کر گاؤں والوں کی "خیر صلا" پوچھنے لگا۔ اس کی ماں کی طرح ان میں سے نہ جانے کتنے مر گئے تھے۔ کتنے تعلیم پاکر شہروں میں جا بسے تھے۔ کتنی لڑکیاں جوان ہو کر سسرال چلی گئی تھیں، کتنے بچے شادی کرکے نئی نئی بہویں لائے تھے۔ گاؤں میں غلّے کی ضرور کمی تھی، لیکن نئے نئے پیدا ہونے والے بچوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ہر سال دس بیس کا اضافہ ہوتا رہا تھا۔

خلیل نے کہا "آؤ گھر چلو، وہاں ریڈیو سننے کے لئے سب جمع ہوں گے۔ وہیں باتیں ہوں گی۔"

خلیل کے اسارے میں جب وہ گیا تو وہاں بوڑھوں، جوانوں، عورتوں، بچوں کا ہجوم ملا۔ ان سے ملتے ملاتے اس کی نظر ایک ادھیڑ عورت پر پڑی، جو اس کی نور کی خاص سہیلی تھی۔ اور اسے دفعتاً اپنا مقصد یاد آگیا۔

اس نے خلیل سے پوچھا "یہ میری نور کی قبر کس نے کھیت میں ملا دی؟"

خلیل نے متانت سے جواب دیا " زمانے نے۔ پکی قبر بنانے کا اسی لئے تو حکم ہے کہ مرنے والے کی ہڈیاں گل سڑ کر اچھی کھاد بنیں اور قبریں اُپجاؤ کھیت بن جائیں۔"

رحمان نے کہا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کاکا۔ میں تو اس کی قبر پر دوسرا تاج بنانے آیا ہوں۔ دیکھئے اس کا نقشہ بھی امریکہ کے بڑے سے بڑے "آرچی ٹکٹوں" سے بنوا کر لایا ہوں۔"

اور اس نے اماڑے میں، جو تخت کا چوکا بچھا تھا، اس پر نقشہ پھیلا دیا۔ ہو بہو تاج کی نقل۔ سب دیکھ کر واہ! واہ کرنے لگے مگر بوڑھے خلیل نے سر ہلا کر کہا "مگر تمہاری اس عمارت سے گاؤں کو کیا فائدہ ہوگا؟"

رحمان سٹ پٹا گیا۔ ویسے ہی کسی نے ریڈیو کی سوئچ گھما دی۔ وہ پنڈت نہرو کی وصیت کا اعلان کر رہا تھا۔

"انھوں نے وصیت کی ہے ان کی تھوڑی سی خاک گنگا میں اس لئے بہائی جائے کہ وہ اس کے پانی میں مل کر الٰہ آباد سے کلکتہ تک کے کناروں کو چھوتی چلی جائے اور اس ساری سرزمین کو زرخیز بنائے۔ اور ان کی بقیہ خاک ملک کے ہر حصے میں ہوائی جہاز کے ذریعہ اڑائی جائے تاکہ ہوا سے اس کا کوئی نہ کوئی ذرہ ہر کھیت میں گرے اور اسے اُپجاؤ بنائے!"

لوگ ریڈیو سننے میں لگے رہے رحمان خاموشی سے اٹھا۔ اور اپنے رکشے پر آکر بیٹھ گیا۔ خلیل نے اسے روکنا چاہا۔ اس نے کہا " میں دو تین دن بعد آؤں گا۔ اور اپنی نور کے لئے نیا تاج ضرور بناؤں گا!"

چوتھے دن وہ پھر گیا اور اپنے ساتھ کئی انجینیر اور اوورسیر لے کر گیا۔ ان کے ہاتھوں میں پیمائش کے آلات اور کئی بڑے بڑے نقشے تھے۔ خلیل نے گھبرا کر جب ان کی طرف اشارہ کیا۔ تو یہ نقشے بھی تخت پر پھیلا دئے گئے۔ اور یہ نقشے تھے ایک بالکل ہی جدید طرز کے گاؤں کے۔ پکے مکانات، پکی سڑکیں، بجلی کے کھمبے، پانی کے پائپ، اسکول اور کالج کی خوبصورت خوبصورت عمارتیں، کھیل کے میدان، شاندار اسپتال اور رحمان کے کھیتوں کے ٹھیک بیچ میں ایک "ٹیوب ول" اور اس سے ہر کھیت میں شریانوں کی طرح پانی پہنچانے والی پکی نالیاں!

بوڑھا خلیل جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دئے!

بیان بابت ملکیت ماہنامہ صبح نو پٹنہ

تحت قواعد رجسٹریشن آف نیوز پیپرس فارم نمبر ۴ - رول نمبر ۸

نام رسالہ:- ماہنامہ صبح نو
مقام اشاعت:- قطب الدین لین پٹنہ - ۴

طابع، ناشر، مالک:- اے۔ اے رضوی
قومیت ہندوستانی
پتہ:- قطب الدین لین پٹنہ - ۴

ایڈیٹر:- وفا ملک پوری
قومیت:- ہندوستانی
پتہ:- کیر آف صبح نو قطب الدین لین پٹنہ - ۴

میں اے اے رضوی اس کا اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں درست ہیں۔

اے اے رضوی

قدم مِلا کے چلیں
مِل کر کام کریں

”ملک کے مختلف حصّوں میں رہنے والے عوام کو، خواہ بعض معاملوں میں اُن کے خیالات کتنے ہی مختلف ہوں، یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ اوّل ہندوستانی ہیں اور یہ کہ اُنہیں اپنے تمام اختلافات قوم اور ملک کے ناقابلِ تبدیل ڈھانچے ہی میں رہتے ہوئے دُور کرنے ہیں۔ آیئے! ہم ایکتا کے اس احساس کو بڑھاوا دینے کی ہر ممکن کوشش کریں اور قومی یک جہتی کے کام کو آگے بڑھائیں۔“

لال بہادر شاستری
وزیر اعظم

بھارت کو مضبوط کرنے اور اُس کے سبھی باشندوں کے لئے آزادی و خوشحالی کو یقینی بنانے کا ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے۔
قدم ملا کے چلیں، ایک قوم کی طرح مِل کر کام کریں۔ اپنے اندر حوصلہ، عزم، بُردباری اور خیر سگالی کا جذبہ پیدا کریں۔

ایکتا بنائے رکھیئے۔ آزادی کی حفاظت کیجئے

DA

علی عباس حسینی

ہمارا گھر

اپریل کی آخری تاریخیں تھیں، صبح کے نو بج چکے تھے، لیکن ہوا میں خاصی خنکی تھی کھلی چھت پر پھیلی ہوئی دھوپ میں چودھویں کی چاندنی جیسی ٹھنڈک تھی۔ اخباروں کی اطلاع کے مطابق لکھنؤ کے مضافات اور اس کے ہمسایہ حلقوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سیر کے اولے گرے تھے۔ پھلوں سے لدے آم کے باغوں کا اس پتھراؤ نے سنتھراؤ کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا نیچر یا قدرت بعض وقت بچوں جیسی حرکتیں کیوں کرتی ہے۔ وہ بنی بنائی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر مسمار کر دیتی ہے کیا اسے بگاڑنے میں مزہ آتا ہے؟ کیا اسے مٹانے میں لطف آتا ہے؟ عقل نے کہا شاید یہ ہماری ہمتوں کو اکسانے اور ہمیں للکارنے کی تدبیریں ہیں۔ اشارہ ہے کہ "ہم بگاڑتے جائیں تم بناتے جاؤ، ہم الجھاتے جائیں، تم سلجھاتے جاؤ۔ یہی تمہاری زندگی کا راز ہے۔ اسی طرح کد و کاوش میں لگے رہے۔ یونہی ہماری چیرہ دستی سے جنگ کرتے رہے، لڑتے رہے، ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے تو ایک دن ہم پر فتح پا لو گے اور ویسے انسان بن جاؤ گے! جس کے متعلق کہنے نے اعلان کیا ہے "خدا نے آدمی کو اپنے سے ملتی جلتی صورت کا بنایا"

غرض میں اسی طرح کے روکھے سوکھے خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ دفعتہً نو بجے کی ڈاک سے ایک دعوت نامہ ملا۔ ہندوستان بھر کے کہانی لکھنے والوں کی کانفرنس تھی۔ اصرار تھا کہ شرکت بھی کرو، اور کہانی بھی پڑھو۔

ذہن نے فوراً سوچنا شروع کر دیا "کیا کہوں، کیا سناؤں کوئی بات کہنے کی بھی تو اپنے پاس ہو۔ ہندوستان کے چودہ زبانوں کے ادیب، نقاد، مفکر، فن کار، صاحبان قلم جمع ہوں گے۔ ان کے سامنے جھوٹی باتیں نہیں بنائی جا سکتی ہیں۔ انھیں عشق و محبت کے رومان نہیں سنائے جا سکتے"۔ ان کے رو بہ رو قسمت پر آنسو نہیں بہائے جا سکتے۔ ان کی ذہانت کو قتل اور جاسوسی کے قصے سنا کر مجروح نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے لئے تو کوئی ایسی بات ہو جس میں صداقت ہو، شرافت ہو، مروّت ہو۔ آدمیت ہو کوئی ایسی بات جس سے قوم بنے، ملک سنورے، انسانیت کی تعمیر ہو، امن کا محل کھڑا ہو۔ جس کے کہنے میں وہ انداز ہو کہ دل سے نکلے اور دلوں میں تیر کی طرح ترازو ہو جائے۔

دل نے کہا "اپنی وہی کہانی سناؤ جو تم نے ملک کا دستور، کانسٹی ٹیوشن، مکمل ہونے کے بعد لکھی تھی۔ کہانی کاہے کو ہے تمثیل (Allegory) ہے، مگر مادر وطن کے معماروں کے سننے کے قابل ضرور ہے۔"

اس لئے میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے دالان میں وہاں آیا جہاں کھلی الماریوں کے تختوں پر کچھ کتابیں رکھی ہیں اور میرے بے معنی سے پرانے مسودوں کا ایک انبار ہے۔ میں نے سب کچھ الٹ پلٹ ڈالا۔ دونوں ہاتھ اور کرتے کے دامن و جیب نے گرد کی پوشش اوڑھ لی مگر جس کے گھر میں خود اس کی مطبوعہ کتابیں نہ ہاتھ آتی ہوں، وہاں مسودے کا مل جانا بالکل ویسا ہی ہے جیسا

ڈوبتے سورج کی بھاگتی کرن کو مٹھی میں بند کر لینا ۔ میں اپنی تلاش میں ہار کر عیال کے جنجال پر جھنجھلاتا پلٹا، تو میں نے دیکھا کہ میری بیوی انگنائی میں بان کے کھرے پلنگ پر بیٹھی پان بنا بنا کر ایک میلے سے کاغذ پر رکھ رہی ہیں اتفاقاً ہوا کے ایک جھونکے نے اس کاغذ کے ایک کونے کو ملیٹ دیا ۔ اپنی ہی تحریر جھلکی ۔ میں نے ایک باز کی سرعت سے جھپٹ کر اس کاغذ پر پنجہ مارا ۔ گلوریاں پہاڑی مرچوں کی طرح پلنگ پر بکھر گئیں ۔ بیگم کے منھ سے " اوئی ' یہ کیا ؟ " کی چیخ سی نکلی ۔ لیکن میری آنکھوں نے : تو پانوں کی بربادی دیکھی اور نہ ان کی برافروختگی ۔ وہ تو اسی کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھ رہی تھیں جو اب میرے ہاتھ میں تھا ۔ یہ اسی مسودے کا ایک حصہ تھا جو میں اتنی دیر سے تلاش کر رہا تھا ۔ میرا چہرہ پان کی پیک کی طرح لال ہو گیا ۔ میں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر پوچھا :

" اس کا دوسرا صفحہ کیا ہوا ؟ "

میری بیوی کے لب تو نہیں کھلے ۔ غصے نے انھیں سی دیا تھا ۔ لیکن ماما مقبولن جو اپنے ٹکڑے کی آس میں پٹی سے لگی بیٹھی تھی ذرا گھبرا کر بولی " میاں شاید وہ کاغذ نہ ہو جس میں میں نے آلو کے چھلکے بٹور کر کوڑے والے ٹین میں ڈال دیا ہے ۔ ! "

میں نے گندگی صفائی کا کوئی خیال نہیں کیا ، جب اپنی پوری پونجی کی صفائی کا سوال ہوتا ہے تو اس وقت حفظان صحت کے اصول یاد نہیں رہتے اکلوتا بیٹا سنڈاس میں گر پڑے تو نکالنا ہی پڑے گا ۔ میں نے کوڑے سے بھرے ٹین کو جلدی سے زمین پر انڈیل دیا ۔ خس و خاشاک کے ڈھیر میں ، آلو کے چھلکوں کے نیچے دبا ہوا اسی مسودے کا دوسرا صفحہ تھا ۔ معلوم ہوا میلے میں کھویا ہوا بچہ مل گیا ۔ میں نے غصے کی نظر سے بیوی اور مقبولن کو دیکھا ، اکبری نو رتن فیضی کی طرح آسمان پر شکایت بھری نظر ڈالی اور ایک ماں کی مامتا سے اس گندے بچھڑے کو کلیجے سے لگائے اپنے کمرے میں چلا آیا ۔

آپ سمجھتے ہوں گے یہ کمرہ اسٹڈی روم یا دار المطالعہ کی طرح سجا ہو گا ۔ فرش پر نرم نرم قالین ، دیواروں پر مائیکل اینجلو اور ایمبرانٹ کی بنائی ہوئی تصویریں ، آتش دان پر مرمریں مجسمے ، گلدانوں میں پھول ، صوفے ، کرسیاں بڑی سی میز ، طرح طرح کے فاؤنٹن پن ، رنگ رنگ کی پنسلیں ، مختلف اوقات کی مناسبت سے عینکیں ' اور نہ جانے کیا کیا ۔ انھیں سب سامانوں سے آراستہ ہو گا جو یورپ و امریکہ کے مصنفوں اور افسانہ نگاروں کے لئے مہیا ہوتے ہیں ۔ مگر میں تو خالص سودیشی ہندوستانی مصنف ہوں ۔ میرے پاس سوائے پلنگ اور بستر کے کچھ بھی نہیں ۔ اسی پر راتوں کو لیٹ کر نیند کی روٹھی رانی کو بلانے کے لئے کروٹیں بدلتا ہوں اور دن میں اسی سنگھاسن پر براجمان ہو کر قلم کی غلامی کرتا ہوں ۔ اور پلنگ دونوں حالتوں میں میرے گناہوں کے بوجھ سے دب کر فریاد کرتا رہتا ہے ۔

اسی پلنگ پر بیٹھ کر میں نے مسودے پر نظر ڈالی ۔ مگر میری نظر ہی کیا ۔ پھر اپنے ذہن کو کون کھٹ کہتا ہے ۔ اور یہ تو ٹھہرا لخت دل ۔ لخت جگر اس کے دیکھنے کو بصارت سے زیادہ بصیرت چاہیئے ۔ اس لئے آپ ، جو آنکھ والے ہیں ، اسے دیکھیں ، یہ ہے " ہمارا گھر " اسی گھر کی داستان جو ہم نے آزادی ملنے پر بنایا :—

" اور انھوں نے طے کیا کہ ہم اس پھولوں سے لدی وادی میں اپنے لئے گھر بنائیں گے ۔ اور ان میں سے چند دانشوروں نے کاغذ پنسل لے لی اسکیل پٹری اٹھالی اور ایک نقشہ بنا ڈالا ۔ ایسی عمارت کا نقشہ جس کی بنیادیں پاتال تک جاتی تھیں ' اور جس کے مینار زہرہ و مشتری سے آنکھ لڑاتے تھے ، جو اتنی مستحکم تھی کہ اس پر موسمی تغیرات کا اثر نہ ہو سکتا تھا ، اتنی مضبوط کہ زمانے کی گردشیں اس کو جنبش نہ دے سکیں اور اتنی کشادہ اور وسیع کہ اس کے کمروں ، ہالوں میں صبا سدا اٹھلا کر چلتی رہے اور اتنی روشن کہ اس کے گوشے گوشے میں چاند سورج کی کرنیں رات دن جھانکتی پھریں ۔

نقشہ دیکھتے ہی سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھیں ۔ ایک ساتھ سب اٹھ کھڑے ہوئے ۔ سب نے اپنی اپنی کمریں کس لیں

اور شہد کی مکھیوں کی طرح گنگناتے وہ اپنے گھر کی تیاری میں لگ گئے۔

اور کچھ نے پھاوڑے کدالیں اٹھائیں، کھرپے کرنیاں، بسولیاں اور انھوں نے گہری نیو کھود ڈالی اور بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دیں۔ ان پر چھتیں ڈالیں، محرابیں بنائیں، برجیاں بنائیں، مینار بنائے، گنبد بنائے۔

اور کچھ مضبوط بازوؤں والے بڑے بڑے تبر لے کر جنگلوں میں گھس گئے۔ انھوں نے ایک سے ایک جنگلی درخت کاٹ کر ڈھیر کر دئے۔ ان کے تنوں کو چیر کر ان سے شہتیریں بنائیں، ستون بنائے، دروازے بنائے، کھڑکیاں بنائیں، میز کرسیاں بنائیں۔

اور کچھ ہنرمند و تیز دست جوان آئے انھوں نے بیکار ملبہ صاف کیا دیواروں پر چھتوں پر قلعی کی، موقع موقع سے ان پر بیل بوٹے بنائے، اور جگہ جگہ سے طاقوں اور محرابوں کو منبت کار کیا۔

اور کچھ صاحب حوصلہ اٹھے اور ہل کاندھوں پر رکھے، بیلوں کو للکارتے کھیتوں میں نکل گئے۔ اور ان کے تیز نکیلے پھلوں نے زمین کا سینہ شق کر دیا اور اس میں سے سونے چاندی جیسے چمکتے دانے نکل آئے اور سارے کام کرنے والے جو بھوک سے بیتاب تھے، ان کی روٹیاں کھا کر پھر سے اپنے اپنے کاموں پر پل پڑے۔

اور جب ان کا گھر ہر طرح بن سنور گیا تو بڑے پیمانے پر ایک دعوت کی، اور اس میں دوست دشمن سب کو بلایا۔ اور اس ولیمہ میں سب ہی آئے ایسے بھی جو ان کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور ایسے بھی جو دل ہی دل میں جلتے تھے۔ وہ بھی آئے جن کا کام ہی ہر چیز میں مین میکھ نکالنا تھا اور وہ بھی جو سدا اُسی تھالی میں چھید کرتے تھے جس میں کھاتے تھے۔

اور دوستوں کا دل گھر بنانے والوں کی محنت سوارت ہوتے دیکھ کر باغ باغ ہو گیا لیکن دل میں کھوٹ رکھنے والے پیچ و تاب کھانے لگے کسی نے برجیوں پر اعتراض کیا، کسی نے مینار کو نام دھرا۔ کسی نے کہا "دیواریں ٹیڑھی ہیں"۔ کوئی بولا "یہ چھتیں ٹپکیں گی"۔ فوراً دفعتہً کونے میں خاموش بیٹھا ہوا بھانٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے اکتارے پر انگلیاں دوڑائیں اور وہ گانے لگا۔

"یہ مکان نہیں عمارت نہیں یہ ہمارا گھر ہے! اس کی چھتیں کمزور اس کی دیواریں ٹیڑھی، اس کی برجیاں بیکار اور اس کے مینار بے سود ہی لیکن یہ ہمارا اپنا گھر ہے! ہمارے خوابوں کی تعبیر ہمارے حوصلوں کا مجسمہ ہماری امنگوں کی مورتی۔ اس کے گارے میں ہم نے اپنا خون ملایا ہے۔ اس کی دیواروں میں ہماری ہڈیاں پیوست ہیں اور اس کی چھتوں میں ہم نے اپنی کھوپڑیاں لگائی ہیں۔ گھبراؤ نہیں، گھبراؤ نہیں، جلدی نہ کرو، جلدی نہ کرو۔ وہ دن دور نہیں جب اس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہوں گی اور اس کے گھاٹوں پر شیر اور بکری ایک ساتھ سیراب ہوں گے۔

ہاں، ہاں یہی امن کا گھر ہے! یہی اخوت کا گھر ہے! یہی مساوات کا گھر ہے! یہی انسانیت کا گھر ہے! یہی ہمارا اپنا گھر!"

اور مغنی کی انگلیاں صرف تار پر نہیں دوڑ رہی تھیں، بلکہ سامعین کے سر بُن مو میں مسرت کا ایک تموج پیدا کر رہی تھیں، اور میں اس خیالی سرود و نغمہ میں کھویا سا جا رہا تھا کہ دفعتہً میرے گھر والوں کی کڑوی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ معقولن اپنی صفائی میں میری بیوی سے کہہ رہی تھی:-

"لے لو ج بی بی! تو میں کیا جانتی تھی کہ اس موئے کاغذ کے چیتھڑے میں لعل ٹکے ہیں۔"
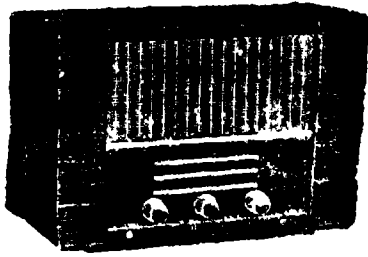
NATIONAL
EKCO
RADIOS

سب سے اچھا اور پائیدار ریڈیو

۱۔ موڈل یو ۷۵۶	قیمت =/۱۲۵	۷۔ موڈل اے ۷۸۶	قیمت =/۵۷۵
۲۔ موڈل یو ۸۱۹	قیمت =/۲۹۸	۸۔ ٹرانسسٹر موڈل پی ٹی ۷۵	قیمت =/۳۳۸
۳۔ موڈل ۸۰۶	قیمت =/۳۹۵	۹ ٹرانسسٹر موڈل بی ٹی ۷۹۲	قیمت =/۳۶۵
۴۔ موڈل اے ۷۸۹	قیمت =/۶۴۳	۱۰ ٹرانسسٹر موڈل بی ٹی ۷۵۷	قیمت =/۴۱۵
۵۔ موڈل اے ۸۲۹	قیمت =/۴۸۱		
۶۔ موڈل اے ۸۳۰	قیمت =/۷۳۵		

اس کے علاوہ فلمی گانوں کے تازہ بتازہ ریکارڈ، گرامون اور دوسرے آلات سرود

ہمارے یہاں سے خریدیئے

ایجنٹ: ظہیر اینڈ سنس، گوتم بدھ روڈ، گیا فون نمبر ۴۴۸

علی عباس حسینی

آنسوؤں کا ہار

ذیل کا مقالہ ایک ایسے مشاعرے میں پڑھا گیا تھا جو صرف ہزل گو شعرا پر تھا۔ اصرار یہ تھا کہ ہزل گوئی کی تائید بھی کرو اور لکھنؤ کی ظریفانہ نثر کا نمونہ بھی پیش کرو۔ امتثالِ امر کا قلادہ گردن میں تھا، جو کچھ بن پڑا وہ حاضر ہے۔

حضرات!

شاعری کیا ہے؟ مجھے نہیں معلوم، نہ میں شاعر، نہ متشاعر، نہ غزل گو، نہ قصیدہ خواں، نہ ناظمِ نظم نہ مرثیہ خواں، نہ بلبلِ ہزار داستاں نہ طوطیِ شکرفشاں، نہ زمزمہ خوانِ بہار، نہ عکاسِ ہوش انِ نگار، نہ استادِ مانی و بہزاد، نہ سامریِ سخن کا ہمزاد، نہ عاشقِ جگر نگار، نہ رقیبِ ناہنجار، نہ سگِ لیلیٰ، نہ خرِ عیسیٰ، نہ اس کے محل کا معمار، نہ اس کی ڈیوڑھی کا کہار! — نہ میں دستِ صبا، نہ شعلۂ ندا، نہ کلامِ جلیل، نہ نقشِ جمیل، نہ زہرِ عشق، نہ پیامِ مشرق، نہ کلامِ ہزار، نہ خودی کے اسرار، نہ بانگِ درا، نہ گلِ رعنا، نہ بہارِ دانش، نہ عیارِ دانش، نہ گلزارِ نسیم، نہ ضربِ کلیم، نہ بوستاں نہ گلستاں، نہ گلزارِ دبستاں، نہ سحر البیان، نہ انوارِ سہیلی، نہ گیتانِ علی، نہ مسدسِ حالی، نہ باغِ نظم کا مالی، نہ شیخ چلی، نہ میر زٹلی! — پھر مجھے اس شعر و سخن کے دربارِ دُربار میں بار دیا گیا تو کیوں؟ اور رسائی و پذیرائی پر اس قدر اصرار کیا گیا تو کیوں؟ اغالب کے ساتھ سینہ زوری معاف!

حسنِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہے؟

آپ فرمائیں گے یہ حسینی کا حسنی بھی کیا خوب! تو میں عرض کروں گا کہ اسی کو ضرورتِ شعری بھی کہتے ہیں اور سرقہ و توارد کی معذوری بھی۔ آپ حضرات ماشاء اللہ سے پوتڑوں کے ادیب ٹھہرے۔ آپ دونوں حاجتوں سے اچھی طرح واقف ہیں دونوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ گرتا اور چھوٹ جاتا ہے۔ پھر میرے پاس عربی تعلیل کی سپر بھی ہے جس میں "تعنی" پر بریدہ ہو کر "ق" رہ جاتا ہے اور قیں نہیں کرتا!— آپ کے زحافات کی ٹٹی بھی ہے جس کی آڑ میں گھٹانے بڑھانے کے ہزاروں کھٹکے لگے ہیں اور آج کل کی ترقی پسندی کا بڑا سا آرٹ بھی ہے۔ جس کے پیچھے زبان دانی کے کرتوں کی ایک پوری نئی دنیا ہے۔ ع "کہو اُردو کو چت کر دوں کہو اُردو کو پٹ کر دوں" یا رہا متحرک "س" کا سکون، تو جناب نہ میں اقبال کے فلسفۂ حرکت کا قائل اور نہ میرے نزدیک ہر حرکت قابلِ ذکر و اظہار۔ خلوت کے "کارِ دیگر" کو جلوت میں یہ بانگِ درا بانگ پکار کر کہنا حقیقت نگاری ہی، مگر شیوۂ شرفا نہیں! — اور سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ میں نے تجربہ کیا ہے اپنے نام کے ساتھ، اور ہر تجربہ جس میں اپنا نام ہے، خواہ وہ چاہِ زمزم کو مزدوج و مضاف ہی کرے۔ میں کیوں نہ ہو، مستحقِ ثواب بھی ہے اور نعرۂ مردانگی بھی بقولِ آتش ؎

نامرد اور مرد میں اتنا ہی فرق ہے
وہ نان کے لئے مرے یہ نام کے لئے!

لیجئے آتش نے دو لفظوں میں مارکس اور فرائڈ کا باہمی جھگڑا چکا دیا! — مگر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب جو زندہ دلوں کی بزم میں

"میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں"

تو اس "رہانزلہ" کی وجہ تسمیہ بھی سن لیجئے! مگر خدارا "رہانزلہ" کو بروزن مناظرہ و مجادلہ و مقاتلہ نہ سمجھ لیجئے گا۔ جی نہیں، بلکہ یہ بھی اسی قبیلے سے ہے جس سے مشاعرہ و مقاسدہ و مسالمہ ہیں۔ یعنی اس میں بھی پھیکے، سڑے، پھپھوندی لگے شعروں پر تعریف بھی کرنا پڑتی ہے۔ اور نغز گو ہانزل کو تعریف سخن ناشناس پر کئی کئی بل کھا کر اور پسینے نکال کر سلام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور ریائی محفل کو اس مجرے کے صلے میں "نقد و نسیہ" کی صورت میں بہت کچھ پیش کرتا اور بھگتنا بھی پڑتا ہے۔ ہاں تو اس رہانزلہ کی وجہ انعقاد ہے۔ رونے بسورنے سے اکتاہٹ! اور بقول ہر منقبت "آنسو بہانے سے نفرت" ———— ہمارے شاعروں میں جسے بھی دیکھئے ع "بیٹھے رونے پہ ہاتھ ملتے ہیں" اور "جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو" کا وظیفہ رٹتے رہتے ہیں۔ آپ نے طوفان نوح کا حال تو سنا ہی ہوگا۔ جس میں ولی عہد بہادر خود بھی ڈوبے اور خاندانی عظمت بھی ڈبوئی۔ آپ نے دونیل کے مد و جزر کے وہ احوال بھی پڑھے ہوں گے جن میں ایک ہی موج موسیٰ کے لئے تخت رواں بنا اور فرعون کے لئے گرداب نہنگ و بلا۔ آپ نے بلالہ آبادی کی نظم میں دریائے لڈور کے زور کا بھی نظارہ کیا ہوگا۔ آپ نے ظفر علی خاں کی نظم میں موسیٰ ندی کا سیلاب بھی ملاحظہ کیا ہوگا، اور آپ نے اخباروں میں برہم پترا، گھاگھرا، گنگا، گومتی، کی تباہیوں کی قہرسامانی بھی پڑھی ہوگی۔ مگر سچ مانئے ہماری غزلیہ شاعری میں آنسوؤں کا طوفان اٹھا یا گیا ہے اس کے سامنے یہ ساری باڑھیں سچ مچ پانی بھرتی ہیں۔ بالکل چھوٹی ہانڈی کا ابال ہیں!۔ ہمارے بحر ناپیدا کنار کا نہ رہے نہ چھور۔ اس کا سوتا کہاں پھوٹتا ہے اس کا سراغ لگانے میں اکثر نے غوطہ کھایا۔ میں غواصی کے فن سے ناواقف، محققین کے آکسیجن والے ظروف بھی میرے پاس نہیں، پھر دم خم بھی اتنا ہی کہ پہلی ہی ڈبکی میں چیخ اٹھوں "ہم ڈوبے تو جگ ڈوبا" اس لئے نہ تو دیر تک غوطہ لگا سکا نہ کی مٹی لا سکا۔ بس سات سو برس کے اس شورہ پانی کو کہیں کہیں پایاب پایا ہے، وہیں سے کچھ گوہر آب دار جلدی جلدی چنے ہیں۔ ظرافت کے نام پر ان آب موتیوں کا یہ ہار آج کی بزم کے تمسخر کار کے گلے میں ڈالتا ہوں ؎

جب آنکھ سے اوجھل بھیا، تڑپن لگا میرا جیا
حقا الہیٰ کیا کیا، آنسو چلے بھر لائے کر! (امیر خسرو)

خالق باری سرجن ہار کے مولف جو اپنے ظریفانہ چٹکلوں، پہیلیوں، دوسخنوں، مکرنیوں کے لئے مشہور ہیں۔ مگر جب انہوں نے غزل میں قدم رکھا تو ولائے وہی کوڑا بھر آنسو۔ اچھا صاحب! "رموز سلطنت خویش خسرواں دانند" کہہ کر آگے بڑھئے۔ ایک ولی کے حجرے میں چلئے۔ ان کا ارشاد ہے۔

اے ولی ہونا سرجن پر نثار
مدعا ہے چشم گوہر بار کا (ولی، دکنی)

دکن سے دلی کا رخ فرمائیے۔ روئے روشن کی تابانی کے باوجود، حضرت تاباں فرماتے ہیں۔

جب سے آیا عدم سے ہستی میں
آہ روتا ہی رہا تب کا! (تاباں دہلوی)

یہی نہیں، ذرا اس دہلوی تم لکھنوی کی سحر بیانی کو دیکھئے ؎

تیرا حسن یہ رونا یونہی اگر ہے گا
ظالم تو پھر کسی کا کاہے کو گھر رہے گا! (میر حسن)

ان کے قدم چومئے۔ صوفی صافی ہیں مگر زخم خوردہ دل نے میر درد بنا دیا ہے۔

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا (درد)

اس کی سنئے جس نے اشک فشانی کو فن کا رتبہ دیا ہے اور "ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے" وہ کچی نیند سے جاگ کر یوں بورا ؎

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں! (میر)

بڑھتے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے میں پانی نے مختلف سوکھوں سے اندر پہنچ کر پیٹ بھی پھلایا، وزن بھی بڑھایا اور قافیہ تنگ ہی نہ کیا اڑا بھی۔ اس بدحواسی میں مشہور حاجی "سودا" یاد آئے۔ شاید وہی "انقباض کث و انبساط آور" کوئی پھنکی دیں۔ لیکن انہوں نے نبض نہ سنا اور قارورہ تک نہ دیکھا۔ جھٹ دو دو نسخے لکھ مارے اور دونوں میں تاکید اکید یہ کہ "شربت اشک اضافہ نمودہ بنوشند!"

سودا سے یہ پوچھا میں دل میں بھی کسی کو دوں؟ وہ کر کے بیاں اپنا رود او بہت رو دیا! (سودا)
کبھو میں بات بن روئے نہیں کی اس سے پراس نے نہ پوچھا کیوں سبب کیا ہے ترے ہر بار رونے کا (سودا)

جب بقول جرأت یہ دیکھا کہ ؎ ایسے دریا میں بہہ چلے ہیں آہ جس میں ٹاپو نہیں ہے ناؤ نہیں۔ تو میں عزم راسخ کر کے عظیم آباد پہنچا، مگر وہاں کے عظیم المرتبہ شاعر نے بھی آنسو ہی بہائے۔

اپنا بھی ماجرا کے دل اک مرثیہ سا ہے بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر! (راسخ)

میں بھی بہت ہار بیٹھا۔ بچو دھو پانی کے علی الرغم میں نے تو "ٹوٹی ناؤ دیکھی نہ دریا کا بہاؤ" دیکھا، بسم اللہ مجریہا، کہا اور دھارے پر بہہ چلا، بنسوڑ انشاء بولے؎

اجی کیوں رلاتے ہو مجھ کو تمہیں کیا؟ نہیں رحم آتا مری چشم تر پر؟ (انشاء)

ان کے مد مقابل مصحفی کا صحیفہ کھولا تو یہی شعر ملا ؎

یاروں کو کیا دکھاؤں گا روئے کا اپنے رنگ لخت جگر تو اشک کے ہمراہ بھی نہیں (مصحفی)

آگے بڑھا تو نظیر اپنے ہی کو سلے؎

اب ترے رونے کا عالم حد سے گزرا ہے نظیر اشک نے تیرے تو سب جل تھل کر کر دیا۔ (نظیر اکبر آبادی)

ناسخ کی طرف رخ کیا تو وہ بھی اس مضمون کو متروک قرار نہ دے سکے

کیونکر مرے رونے سے دل نرم ہو اس بت کا پتھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا (ناسخ)

خیال آیا شاید آتش کی بھڑکتی آگ نے اس پانی کو جلا دیا مگر وہ جب چنگارے لیتے اٹھے بولے،

مزا غم کے کھانے کا جس کو پڑا! وہ اشکوں سے ہاتھ اپنے دھویا کیا (آتش)

مومن کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا:۔

دم بدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں وہ بھی رسوا ہو گیا جس نے کیا رسوا ہمیں (مومن)

خیریت گذری کہ ان حضرت مومن نے اب کے برسات سے پہلے ہی رونے دھونے سے توبہ کر لی، ورنہ ہنڈر دجن بم کا لایا ہوا طوفان ان کے اٹھائے ہوئے طوفان کے سامنے پانی بھرتا، علت توبہ تو ملاحظہ ہو،

دیوار کے گرتے ہی اٹھنے لگے طوفاں اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کریں گے (مومن)

اس بحث کو تو چھوڑیئے کہ 'بے مارکی توبہ' میں زیادہ لذت ہے کہ شکست توبہ میں اور اشک فانی کے لئے استاد ذوق کی بہانہ تراشی دیکھئے ؎

سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو ہے تو چاہت کے جتانے کو بہانہ اچھا (ذوق)

ظفر نے کہا، استاد میرا بہانہ بھی ملاحظہ ہو ؎

ہم بہانے کو اشک آنکھوں سے ڈھونڈ لیتے ہیں اک بہانہ روز (ظفر)

جلال نے فکر سے سر اٹھا کر کہا اس بہانے پر لکھنوی آب بھی ملاحظہ ہو ؎

غرض تھی رونے سے اتنی تمہیں ہنسانا تھا یہ آنسوؤں کا بہانہ تو اک بہانا تھا (جلال)

نظم کی لڑی میں بار بار نثر کی گرہ پڑ جاتی تھی، سوچا اسد اللہ کے پاس چلوں، شاید نام کی برکت سے وہی گرہ دل کی عقدہ کشائی کریں۔ آخر "حیوان ظریف" بھی تو ہیں۔ لیکن صورت دیکھتے ہی انہوں نے صبحہ کیا ؎ "ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں" پھر شاید میرے چہرے پر ایک خجل مسکراہٹ دیکھ کر انہوں نے تیوریاں چڑھا لیں اور بڑے زور سے دہاڑے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

میں نے جلدی سے مقطع کا پہلا مصرعہ تو "داشتہ آید بکار" کے طور پر اپنی گسبت میں رکھا۔ تقریر کی ابتدا میں اس کی حجامت بنا کر آپ کی خدمت میں پیش بھی کر چکا۔ اور پانی پت کے میدان پر مردانہ وار قہقہوں کی جھنکار سننے کی آرزو میں یلغار کیا۔ نظم جدید کے سالار حالی کا سامنا ہوا، ان کا حال بےحال نظر آیا۔ وہ پہلے ہی سے دونالی بندوق بھرے بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی آتش فشانی کی جگہ گہر فشانی کرنے لگے۔ پہلے تو مدوجزر میں غوطے دئے پھر ساحل پر کھینچ کر غالب پر رونے رلانے لگے ؎

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج (حالی)

میں نے جلدی میں ٹوپی تو انہیں کے قدموں میں پڑی رہنے دی اور دُرہائے ظرافت کی جستجو میں کالے پانی تک کی ڈبکی لگائی۔ قیدیوں کی جا نگھیہ اور بنڈی کے شکوہ کے ساتھ منیر دکھائی دئے، ہم قفسوں کو نئی قسم کی ڈرل کرانے میں یوں ہدایت دے رہے تھے ؎

شب فرقت میں اگر روئیں گے رونے والے
پاؤں پھیلا کے کہاں سوئیں گے سونے والے (منیر شکوہ آبادی)

گھبرا کر پلٹا تو ساحل پر بحر نے بھی ایک موتی جیب میں ڈال دیا ؎

رونے دھونے سے فائدہ اے بحر
کب یہ سینے کے داغ چھوٹتے ہیں (بحر)

اس شعر پر داغ یاد آ گئے۔ وہ نواب بھی تھے، بانکے بھی۔ ڈھارس بندھی شاید سنہی کا لعل شب چراغ اسی سرکار سے عطا ہو۔ ان کے کلاں راس پھاٹک پر درویشانہ صدا دی ع "ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا"۔ ٹکا سا جواب ملا "دوسرا دروازہ دیکھو!" ؎

آنسو نہ پئے جائیں گے اے حضرت ناصح
ہے کڑی کی جان کے کھائی نہیں جاتی (داغ)

بغل میں ایک امیر کا آستانہ دکھائی دیا۔ اس کی ڈیوڑھی پر توکل و استغنا کی نوبت بجتی تھی۔ یقین آ گیا کہ اس کے ہاں گریہ و فغاں کی تنگ دستی کی چھاؤں بھی نہ پڑی ہوگی۔ بڑی امید دل سے ہانک لگائی مگر اس کا خزانہ بھی الماس ظرافت سے خالی نکلا اور میرے کشکول میں "نان گرم" کی جگہ "آب گرم" ہی ڈال دیا گیا ؎

ہر جگہ جوشش محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا (امیر)

ایک صاحب نے خوش خبری سنائی، دُر مراد شاد کے پاس ہوگا۔ تخلص کا پاس ضرور کیا ہوگا۔ اُن کے آستاں پر جبیں سائی کرو، پٹنے کو ڈرا پٹنہ پہنچا۔ لیکن ان کی صورت دیکھتے ہی یقین آ گیا "برعکس نام نہند زنگی کا فور"! ساری شادمانی غائب ہو گئی ؎

شاد کیا کیجئے دیکھا نہیں جاتا مجھ سے
چہرہ اُترا ہوا، بہتا ہوا آنسو تیرا! (شاد)

اب پرانے طبیبان سخن سے "مایوس علاج" ہوا۔ یقین آ گیا ان کے پاس اس مرض کا کوئی "مداوا" نہیں۔ مجبوراً ادھر ادھر عام ہر جو مہ تھا تھا مگر وہاں بھی مسیحا آپ ہی بیمار نکلے۔ حسرت پُر حسرت طور پر خود ہی پھوٹ پھوٹ کر نہ رو رہے تھے بلکہ اس کو بھی رلا رہے تھے جس کے نہ رونے کی ہم سب دعائیں مانگا کرتے ہیں ؎

گریۂ شوق سے تر ہیں جو تمہاری آنکھیں
بن گئے ہیں فلک حسن کے تارے آنسو (حسرت موہانی)

اصغر نے شاعر اکبر ہونے پر بھی بڑی بڑائی دکھائی تو یہی کہ ؎

اشک اب نہیں تھمتے، دل پہ اب نہیں قابو
خود کو آزما بیٹھے، مجھ کو آزمانے سے (اصغر)

ظریف اکبر سے فریاد کی، وہ منہ بنا کے، آسمان کی طرف دیکھ کر بولے ؎

ہر اک کے لائق ہے اس کی زینت، نہ ہے تیری شان تیری قدرت
کہ آنکھ کو اشک سے ہے بھرتی، گہر سے کرتی ہے آب پیدا (اکبر الٰہ آبادی)

صفی بڑی صفائی سے بولے، ٹپک پڑتے ہیں شبنم کی طرح بےاختیار آنسو! چمن میں جب کبھی گلہائے خنداں دیکھ لیتے ہیں (صفی)

فانیؔ ہمیشہ سے مایوسی کی باتیں کرتے تھے، آنسو بہا کے بولے ؎

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو اُن کے آگے جو بار بار آیا (فانیؔ)

عزیزؔ نے جانِ عزیز کی پروانہ کی، اصرار کرکے کہا ؎

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیزؔ خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا (عزیزؔ)

ثاقبؔ شہاب کی طرح چمکے تو ضرور مگر اس میں بھی گرتے آنسوؤں کا ڈھنگ تھا ؎

سننے والے رو دئے سن کر مریضِ غم کا حال دیکھنے والے ترس کھا کر دعا کرنے لگے (ثاقبؔ)

آرزوؔ کی خدمت میں رسائی پیدا کی، اپنی آرزو پیش کی، وہاں بھی آرزو نہ بر آئی ؎

سیلاب نگاہ حسرت زا جب چاہے ڈبوئے یہ دنیا سمجھو نہ اسے سوکھا چشمہ بہتا ہوا اک دریا جانو (آرزوؔ)

تاثیرؔ سے عرض کیا "زندہ دلانِ پنجاب اپنی بذلہ سنجی کے لئے دور دور تک مشہور ہیں۔ آپ سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں فرمایا: کیا کروں ؎

حضور یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں (تاثیرؔ)

یاسؔ کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ آپ چنگیزی بھی ہیں اور یگانۂ عصر بھی۔ آپ ہی میرے درد کا درماں تجویز فرمائیے، کہنے لگے، حضت، آپ نے بھی کیا فرمائش کی، یہاں رونے سے ابھی خود ہی جی نہیں بھرا ؎

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی (یگانہؔ)

شاعرؔ قریب ہی بیٹھے تھے جھٹ بول اُٹھے، گھبرائیے نہیں ؎

آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں غمِ دل کی فضا بدل رہی ہے (شاعرؔ لکھنوی)

سالکؔ سے گذارش کی آپ ہی اس معاملے میں رہنمائی فرمائیے۔ کہنے لگے ابھی تو لوگ مجھے اسی طرح جانتے ہیں ؎

وہ گل افشانیٔ گفتار کا پیکر سالکؔ آج کوچے سے ترے اشک فشاں گذرا ہے (سالکؔ)

اثرؔ کو توجہ دلائی، شعر و سخن کی دنیا میں آپ کا بڑا اثر و نفوذ ہے۔ آپ میری عرضی منظور کرا دیجئے۔ فرمایا، میاں! میں کس منہ سے تمہاری سفارش کروں؟ خود اپنا یہ حال ہے کہ ؎

آنکھیں کب کی برس چکی ہیں کوندا اب تک لپک رہا ہے (اثرؔ)

جگرؔ کے سامنے ہمت کرکے گیا، بڑے دل گردے والے ہیں۔ یقینی کامران پلٹوں گا انہوں نے بھی جھڑک دیا ؎

انہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے (جگرؔ)

حضرت دلؔ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ آپ صاحبِ دل ہیں آپ ہی کرم فرمائیے۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولے ؎

ستم تھا لطف کے پردے میں دردِ لادوا دینا ہماری اشک باری پر کسی کا مسکرا دینا (دلؔ شاہجہانپوری)

سراجؔ سے کہا "غم و الم کے اس گھور اندھیرے میں آپ ہی منی کا کوئی دیا روشن کر دیں۔ انہوں نے روشنی دکھائی تو مگر دو ہی آنسو بہا کے ؎

آخری اشک رکا ہے سرِ مژگاں آکر ڈوب جائے یہ ستارہ تو سحر ہو جائے (سراجؔ)

رضویؔ کو یاد دلایا کہ آپ تو ان کی نسل سے ہیں جن کی ضمانت میں جانے کے بعد غم دہم پاس نہیں آسکتے۔ اپنی شاعری کی خزاں سے عاجز آکر بہار آیا ہوں خدارا آپ ہی قہقہوں کی بہار دکھائیے، مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ بولے تو یہ بولے ؎

سیلاب آیا اشکوں کا اور کشتِ تمنا ڈوب چلی ہوش میں آئے رونے والے دل کی دنیا ڈوب گئی (رضویؔ)

لکھنؤ سے تھانہ بھون ہوتا ہوا لاہور گیا۔ حضرت شوکت سے عرض کی "آپ تو نثر میں قہقہوں کا گلستاں کھلاتے رہتے ہیں نظم میں ہنسی کا ایک بوستان عنایت ہو۔ فرمانے لگے "یہ ہنسی کی بات نہیں ؎

سمجھ رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا　　نہ جانتے تھے کہ ہیں یہ بھی چشم تر کے فریب

عاجز آ کر میں نے اب ادھر کا رخ کیا جدھر ترقی پسندی کا سرخ سویرا ہے یقین تھا یہاں کی آبادی تو شوے نہ بہاتی ہوگی۔ فراق سے گفتگو ہوئی کہنے لگے کیوں اپنے قد جیسا لمبا منہ بنائے پھرتے ہو ؎

فسردہ کیوں ہے جو آنسوؤں میں کیا نہیں　　حرارتیں نئی نئی، طراوتیں نئی نئی!　　(فراق)

مجاز سے کہا، آپ حقیقت پر روشنی ڈالیں۔ فرمایا ؎

روئیں نہ ابھی اہل نظر حال پہ میرے　　ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ!　　(مجاز)

فیض کے پاس پاکستان پہنچا۔ آپ ہی سے ارباب ادب کو فیض ہے۔ بولے ؎

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن　　تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں　　(فیض)

حضرت سرور سے علی گڑھ جا کر فریاد کی۔ فرمایا "یہی صالح روش ہے" ؎

کیا ہو رہے تو آیا ہے بہاروں کا سلام　　صرف خوابوں سے حقائق کو سنوارا نہ گیا　　(سرور)

غرض، سات سو برس کی اس چھان بین کے بعد، میں صرف آنسوؤں کا ہار تیار کر سکا۔ مجھے قہقہوں کا ایک گلدستہ بھی نصیب نہ ہوا اس لئے آپ شعرا سے یہ عرض کرنا ہے کہ فردوس شعر میں قہقہہ شجر ممنوعہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی، تو ابن آدم وراثتاً اس کی لپک، اور لپک پر مجبور ہے گندم نما جو فروشوں پر طعن و تشنیع، طنز و تنقید اس کے خمیر میں ہے، پھر جنت سے نکالے جانے پر "باوا" اتنا ہلک چکے ہیں کہ ہنسنا ہر سعید فرزند کا فرض بن گیا ہے ؎

چارۂ پشیمانی خوش دلی و خوش کامی!　　توبہ از ریاکاراں خندہا، زمن تنہا!　　(یگانہ)

اس لئے صرف ہنسنے والوں کی صورت نہ بنائیے، بلکہ سچ مچ ہنسائیے اور ہنسئے اور قہقہوں کا عصا ہاتھ میں لے کر موسیٰ وار انہ رود اشک سے گزریئے، تاکہ آپ کے کسی خستہ و سوختہ، آشفتہ و گداختہ، تفتہ و برشتہ، تپیدہ و گزیدہ، کوفتہ و بختیہ، تشنہ و گرسنہ ساتھی کو بھی، جیتے جی قبر کے کنویں سے یوں ہنسی کی بھیک نہ مانگنا پڑے ؎

ہنس قبر پہ میری کھل کھلا کے　　یہ پھول چڑھا کبھی تو آ کر!　　(امیر)

بلکہ آپ میں سے کمر خمیدہ، خوں چکیدہ، مار گزیدہ، باراں دیدہ، سوکھا، بھر بھرا، سینک سلائی شاعر بھی کیکڑی تیور سے، خم ٹھونک کر یوں ہیکڑی دکھائے ؎

گر دیکھ کے ہنس دیا تو　　منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم!　　(مومن)

یہ اطوار انداز میاں خوجی کے سہی، مگر ان میں عمرو عیار کی چالاکی بھی شریک ہے۔ اسی لئے ان میں زندہ اور باقی رہنے کے آثار اور تیور ہیں، بقول ناسخ ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

میرا پسندیدہ افسانہ

"نور و نار" مجھے اس لئے پسند ہے کہ یہ بڑی حد تک الہامی ہے۔ میں کئی دن سے اس فکر میں تھا کہ میں کسی افسانے میں بیوی کا وہ تخیل پیش کروں جو مذہب اسلام میں ہے۔ دقت یہ تھی کہ جو پلاٹ ذہن میں آتا وہ ایک تبلیغی چیز بن جاتا۔ اسی ادھیڑبن میں نماز ظہر پڑھ رہا تھا کہ ذہن میں یہ کہانی آئی۔ اس لئے میں اسے ادھی دین سمجھتا ہوں۔

اب اسے اچھی طرح سمجھنے اور اس سے کماحقہ لطف اٹھانے کے لئے چند اسلامی مسائل جاننا ضروری ہیں۔

۱۔ اسلام نے بہ یک وقت چار نکاح کی اجازت دی ہے۔ یعنی ایک مرد بہ یک وقت چار بیویوں تک کا شوہر ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ شرط بڑی سخت لگا دی ہے۔ ایک سے زاید بیویوں کی اسی حالت میں اجازت ہے جبکہ مرد ان کے درمیان "عدل" کر سکے۔ یعنی چاروں کو یکساں طور پر اور برابر برابر خوش اور مطمئن رکھ سکے۔ اگر وہ اسی طرح کا عدل نہیں کر سکتا تو اس کیلئے ایک سے زاید نکاح کی اجازت نہیں۔

۲۔ نکاح کی ابتدا عورت ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔ یعنی وہ بذات خود (یا اس کا وکیل) اپنے شرائط مرد کے سامنے پیش کر کے کہتی ہے کہ میں ان شرطوں پر تم سے نکاح کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور مرد بذات خود (یا اس کا وکیل) اقرار کرتا ہے کہ میں تمہاری پیش کردہ شرائط پر تم سے نکاح کرنا قبول کرتا ہوں۔ اس لئے اگر عورت اپنے ہونے والے شوہر میں کسی قسم کی ایسی خرابی دیکھتی ہے جو اسے نامنظور (ناپسند) ہے تو اسے ایسے مرد سے نکاح ہی نہ کرنا چاہئے۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بھی اگر دوسری عورت ایک مرد کی بیوی بننا چاہتی ہے تو یہ اس کی اپنی خوشی ہے۔

مگر جب ایک بار عورت نے اپنے پیش کردہ شرائط شوہر سے منوا کر اس سے نکاح کر لیا تو اس کو وہ تمام فرائض باحسن وجوہ ادا کرنا پڑیں گے جو ساری دنیا میں بیوی پر عائد ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں کہ اسے تجربہ یہ بتائے کہ میاں سے اس سے نہیں نبھ سکتی وہ اس سے "خلع" حاصل کر سکتی ہے۔

یعنی جس طرح میاں طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح عورت بھی علحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ اس لئے بیوی کو اسلامی نقطۂ نظر سے "سوتیا ڈاہ" یا سوکن سے جلنے کا حق اس وقت تک نہیں حاصل ہوتا جب تک شوہر اس کے حقوق کماحقہ ادا کرتا ہے، یا بیوی کو اس کا یقینی علم ہو جائے کہ وہ اس کے حقوق پامال کر کے کسی دوسری کو اس پر ترجیح دیتا ہے۔

۳۔ (الف) اب اس "یقینی علم" کی بات بھی سن لیجئے۔ اسلام نے افواہ پر، اڑتی ہوئی خبروں پر، دوسروں کے کہنے پر، جلد یقین کر لینے سے منع کیا ہے۔ ہمیں دوسروں کے اعمال و افعال کے متعلق انہیں باتوں پر یقین کرنا چاہئے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے

دیکھی ہیں یا جن کی دو مرد عادل (یعنی متقی، ایماندار، سچے) یہ گواہی دیں کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اگر ان گواہوں میں سے ایک بھی جھوٹا ہوگا، یا صرف ایک ہی گواہی دینے والا ہوگا، تو ایسی باتیں قابل یقین نہ مانی جائیں گی۔ اس لئے محض سنی سنائی باتوں کا یقین کرلینا مذہبی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ اور اسے آپ علم نہیں کہہ سکتے اور نہ ان کے "علم" کا آپ دعویٰ کرسکتے ہیں۔ یعنی آپ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ "میں جانتا ہوں"۔

۴۔ (ب) یہ بھی اسلامی حکم ہے کہ ہر شخص کے متعلق "گمان خیر" رکھو۔ یعنی یہ سمجھو کہ وہ نیک اور بھلے کام کرتا ہوگا۔ اور یہ گمان خیر اس وقت تک واجب و لازم ہے، جب تک کہ تم اس کی طرف منسوب برا کام اسے کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لو یا دو سچے مرد عادل یہ گواہی نہ دیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اسے وہ برا کام کرتے دیکھا ہے۔

اس لئے کسی کے بارے میں یہ سن کر کہ وہ زنا کرتا ہے، شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے یا کوئی گناہ (ایسا فعل جس کے کرنے سے مذہب نے منع کیا ہے) کرتا ہے یقین نہ کرلینا چاہئے، اور یہ نہیں کہنا چاہئے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ زانی ہے، شرابی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہیروئن یہ یقین کرنے سے انکار کرتی ہے کہ اس کے مرد میں یہ برائیاں ہیں۔ صرف اپنی دایہ کی زبانی سنی سنائی باتیں بیان کردیتی ہے اور اسے نصیحت کرتی ہے کہ ایسی باتوں پر یقین نہ کرنا چاہئے۔

۵۔ اب اس فقرے کو بھی لے لیجئے جس سے کہانی کی ابتدا اور انتہا ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی میت میں بعد تجہیز و تکفین نماز میت بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں نماز پڑھانے والا اور اس کے پیچھے کھڑی ہوئی جماعت کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ "اے اللہ، اے ارحم الراحمین، ہم اس مردے کے بارے میں سوائے نیکی اور بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتے۔" یعنی پیش نماز کے ساتھ ساتھ سارا مجمع اس کے گناہوں کے "علم" سے انکار کرتا ہے۔ مولانا نے ملازم کے کہنے پر یقین کرلیا۔ اور داماد کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کردیا لیکن بیٹی کی تحریر نے ثابت کردیا کہ ان کے اس یقین کی بنیاد افواہ ہی ہے، اور اسے "علم" کہنا یا سمجھنا غلط ہے۔ پھر یہ بھی اسی تحریر سے واضح ہوگیا کہ ان کا داماد اپنی بری عادتوں سے تائب ہوچکا تھا۔ اور یہ بھی اسلامی مسلمات میں سے ہے کہ اگر کوئی بندۂ عاصی اپنے گناہوں سے توبہ کرلیتا ہے اور انہیں ترک کرکے نیک اعمال کرنے لگتا ہے تو توبہ کے بعد اس کے سارے پچھلے گناہ دھل جاتے ہیں اور وہ بالکل معصوم بچے کی طرح ہوجاتا ہے۔

میں نے یہ ساری اخلاقی و مذہبی باتیں ایک سادہ دل بھولی بھالی مثالی مسلم خاتون کے واقعات اور اس کے مختلف طرح کے تاثرات کے بیان کی وساطت سے پیش کی ہیں۔ اس نے اپنے حسن سیرت کے ذریعہ نہ صرف اپنے شوہر کے کردار و سیرت میں انقلاب عظیم پیدا کردیا، بلکہ مرنے کے بعد اپنے معلم اور باپ کو، جو محض ظاہری قوانین مذہب کے پابند تھے، سچی مذہبی اسپرٹ کے معنی سمجھا کر ان کی راہ راست کی طرف ہدایت کی۔

مجھے یہ کہانی اس لئے پسند ہے کہ میں کم سے کم اپنی نظر میں اتنی ساری اسلامی تعلیمات فنکارانہ طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور میں نے اسے نظریاتی پروپگنڈا یا مذہبی تبلیغ نہیں بننے دیا ہے۔

ایک بات اور عرض کردوں۔ اس کہانی کے کردار محض میری عینیت پسندی کا تخیلی نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ میرے مشاہدے میں بھی ایسی سیرتیں آئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس بیسویں صدی میں بھی اس طرح کے کردار نایاب نہیں ہیں!

(علی عبّاس حسینی)

علی عباس حسینی

نور و نار

"آپ جو جی چاہے سمجھیں ! گاؤں والے جو دل میں آئے کہیں ! مگر میں اس پاجی کی نماز جنازہ نہ پڑھاؤں گا ! ہرگز ہرگز نہ پڑھاؤں گا ! میرا داماد سہی، مگر تھا وہ زانی، شرابی اور جواری !"

مولانا اجتبیٰ نے سمدھی کو ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے جواب دیا اور گھر کا دروازہ دھڑاک سے بند کرلیا۔ اس دھڑاک نے گویا مولانا کے جواب پر مہر لگادی۔ اب اس پر نظر ثانی کی کوئی امید نہیں رہ گئی۔ سمدھی نے حسرت سے بند دروازے کو دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے گردن جھکائے نکل گئے۔

مولانا اجتبیٰ کے لئے بھی یہ فیصلہ کوئی آسان امر نہ تھا۔ اپنے ہی داماد کے جنازہ پر نماز پڑھانے سے انکار اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ آس پاس کے کسی گاؤں میں نماز پڑھانے والا نہ ہو، اخلاق، مروت، انسانیت، عزیز داری، برادری کی تمام روایتوں کے خلاف تھا۔ مگر کیا کریں، خدا کے سامنے کھڑے ہوکر کیسے کہیں کہ اس مُردے کے بارے میں اچھائیوں کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے ! وہ اپنے داماد کے کرتوتوں سے واقف تھے، وہ گاؤں والوں کو گواہ بناکر ایسا سفید جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔ سب ہی تو جانتے تھے اظہر کو۔ پولیس کا داروغہ، رشوت، بے ایمانی، جھوٹ، شراب، جوا، عیاشی۔ کون سا عیب تھا جو اس میں نہ تھا۔ اور اس پر سمدھی صاحب کی یہ خواہش کہ اسی پاجی اظہر کی نماز جنازہ پڑھادو ! گویا اس کی ساری برائیوں سے مُکرو اور محض اچھائیوں کا اقرار کرو ! خدا کے سامنے دیدہ دلیری سے جھوٹ بولو !۔ ہونہہ !

مولانا کا لمبوترا چہرہ سرخ تھا۔ اُن کی داڑھی کے سفید بال کھڑے تھے اور ان کا چھریرا جسم، جو ایک چھڑی کی موٹھ کی طرح آگے سے جھکا تھا، اس وقت کانپ رہا تھا۔ وہ سمدھی کو مایوس جاتے دیکھ کر دروازے کی کنڈی بند کرکے پاؤں پٹکتے اندر چلے آئے۔

ان کا گھر بہت پرانا تھا۔ چھوٹا سا کچا صحن، اُتر رخ کے دلان اندر دالان، پچھم طرف باورچی خانہ، اور پورب جانب دو کوٹھریاں۔ دکھن کی طرف کوئی عمارت نہ تھی۔ دیوار سے ملی ہوئی زمین کو دو فٹ کی لمبان چوڑان میں گوڑ کر دھنیا اور پودینہ لگا رکھا تھا۔ اسی مزروعہ کے پاس کاٹھ کی گھڑونچی دو مٹی کے گھڑے کٹوروں سے ڈھکے رہتے تھے اور ایک چھوٹی سی چوکی پر دو تانبے کے بدقلعی جگہ جگہ سے پچکے ہوئے لوٹے۔ باہری دالان میں تختوں کے چوکے پر چھپا ہوا فرش بچھا تھا، جس پر دیوار سے لگا ہوا ایک گاؤ تکیہ میلا چکٹ، دونوں پہلوؤں سے روئی کے پھونسڑے جھانکتے ہوئے گاؤ کی بغل میں دری کی ایک جانماز تھی اور اوراد و وظائف کی کچھ کتابیں۔ اور ایک کاٹھ کا فیض آبادی قلمدان۔ اندر والے دالان میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ اس کا بانده جگہ جگہ سے مجروح تھا۔ اور اس کی ادوائن ہر بالشت پر گرہ دار۔ اسی کے سرہانے پرانی دری میں لپٹا ہوا مولانا کا بستر رکھا تھا۔ وہیں

ایک کونے میں الگنی پر ایک تہمد لٹکی تھی۔ ایک پیوند لگی قبا اور ایک بڑی مہری کا مارکین کا پاجامہ۔ پلنگ سے ملی ہوئی ایک تپائی پر ایک فیض آبادی زیور رکھنے والا صندوقچہ رکھا تھا۔ جس پر جزدان میں لپٹی چند کتابیں تھیں اور سب سے اوپر قرآن!

مولانا دالان والے تخت پر اس طرح آکر بیٹھے کہ اس کا جوڑ جوڑ بولنے لگا۔ مگر انھوں نے اس کی فریاد پر دھیان نہ دیا۔ انھیں اس وقت غصے میں کچھ نہ سنائی دیتا تھا۔ مرنے والا ان کی اکلوتی لڑکی ذکیہ کا شوہر تھا۔ وہ کوئی غیر نہ تھا۔ وہ اپنا ہی تھا اسی لئے تو انھیں اس کی ساری حرکتوں کی خبر تھی۔ رحمن نے انھیں ایک ایک بات بتادی تھی۔ وہ کبھی اس بدمعاش اظہر کو معاف نہیں کرسکتے تھے۔ اس نے ان کی ذکیہ کو طرح طرح کے دکھ پہنچائے۔ اس کے سینے پر مونگ دلی۔ اس کے ہوتے رنڈی گھر میں بٹھائی، شراب پی، جوا کھیلا اور اپنی ہی پونجی نہیں بلکہ ذکیہ کے سارے زیور بھی چوروں کی طرح چرا کر جوئے میں ہار دئے! انھیں ظلموں نے تو ذکیہ کو بیمار ڈال کر عین جوانی میں دق کا شکار بنادیا۔ اور ذکیہ کے مرنے نے مولانا کو قبل از وقت بوڑھا کردیا، جھکا دیا، بالوں سے سیاہی آنکھوں سے نور چھین لیا۔ ذکیہ ہی تو ان کی سب کچھ تھی۔ ساری پونجی، ساری خوشی، ساری امیدیں، فقیر کے گھر کا دیا، اس کی زندگی کا اجالا۔ ذکیہ کے بعد ان کی زندگی کیا تھی۔ بالکل ایک بھول بھلیاں کہ بھٹکتے پھرو، نہ سرے کا پتہ، نہ منزل کی خبر۔ راستے میں نہ جلتا چراغ نہ روشن مشعل، نہ چھٹکی چاندنی، نہ جگمگاتی کرن! بس ایک ہڈیاں ٹھٹھرانے والی ٹھنڈک اور گھورا اندھیرا!

اور مولانا اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کا خون کھول رہا تھا۔ ان کے دل میں نہ جانے کتنی مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ وہ اس مردود اظہر سے اپنی ذکیہ کا بدلہ ضرور لیں۔ اسے کسی موقع پر پورے گاؤں کے سامنے ذلیل و رسوا کریں۔ افسوس کہ اس کی بیماری اور موت نے اس کا موقع نہ دیا۔ لیکن آج جبکہ یہ کانٹا ٹوٹ کر ہمیشہ کے لئے پہلو میں کھٹکتا رہ گیا۔ سمدھی صاحب اصرار کررہے ہیں کہ اسی (اظہر کی) نماز جنازہ پڑھاؤ اور سب کے سامنے حضرت بولو کہ یہ نیک تھا، اچھا تھا اور اس نے زندگی بھر نیکی اور بھلائی ہی کی ہے! اس کی صفائی خدا کے سامنے پیش کرو جو اپنی ذکیہ کا قاتل تھا۔ اور ان کی آنکھوں میں ذکیہ کی صورت پھرنے لگی۔

وہ اس کا بوٹا سا قد، وہ اس کا دبلا پتلا جسم، وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، اور وہ اس کا مسکراتا چہرہ! عجب دل پایا تھا اس بچی نے، نہ اسے کھانے کی فکر نہ پہننے کی، پیسے ہوں یا نہ ہوں، ہر حالت میں خوش، ترکاری گوشت نہ پکا ہو، روٹی چٹنی ہی سہی۔ ایک ہی وقت کھانا ملے کوئی عذر نہیں۔ نوکرانی گھر میں ہوئی تو اس کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہی، نہ ہوئی سارا کام خود کر ڈالا۔ جب باپ کے سامنے دسترخوان لگاتی تو اس انداز سے کھاتی اور کھلاتی کہ معلوم ہوتا صرف دال روٹی ہی سامنے نہیں ہے بلکہ انواع و اقسام کی نعمتیں دسترخوان پر چنی ہیں۔ اور مولانا کے لئے ہر نوالہ لذیذ سے لذیذ تر بن جاتا۔ وہ خوش ہو کر کہتے "ذکو تو یقینی جنتی حور ہے" اور وہ بڑی سادگی سے کہتی "اباجان! میں ایسی خوش قسمت کہاں، پر خدا کا شکر ضرور ادا کرتی ہوں کہ آپ کو میری پکائی ہوئی ہر چیز پسند آتی ہے؟"

اور مولانا اپنی تربیت و تعلیم پر خود عش عش کرنے لگتے وہ سوچتے تھے دماغ اور دل میں فرق ضرور ہے۔ انھوں نے مذہب کو دماغ کے ذریعہ سمجھا تھا۔ ان کی کتابوں میں یہی لکھا تھا۔ ان کو تعلیم بھی دی گئی تھی اور ان کی فکر بھی یہی کہتی تھی، اس لئے مجبوراً مذہبی احکام مانو۔ مگر دل نے ہمیشہ بغاوت کی۔ جو کی روٹی میں وہ مزہ کیسے ہوسکتا ہے، جو شیرمالوں میں ہے، سادے چاول اتنے خوش ذائقہ کیسے ہوسکتے ہیں جیسی بریانی ہوتی ہے۔ مارکین اور گاڑھے کے پہننے میں جسم کو وہ آرام کہاں مل سکتا ہے جو مخمل اور ریشم میں ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے گھر کی صفائی کرنے اور کھانا پکانے میں وہ راحت کہاں، جو ماما دائیوں سے کام لینے میں ہے۔ لیکن ذکیہ نے مولانا ہی کی زبانی سنی سنائی باتوں کو دل میں گرہ کر رکھا تھا۔ اس نے مذہبی احکام کو اس طرح اپنایا تھا کہ وہ اس کی طبیعت،

اس کا مزاج بن گئے تھے۔ وہ انھیں کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ محسوس ہوتا کہ مذہب کی روح نے ذکو کی صورت میں جنم لیا ہے۔

اس طرح کی بچی اور بیاہ دی گئی اظہر جیسے رندلا مذہب سے۔ عزیزوں نے اصرار کیا تھا کھاتا پیتا گھر ہے۔ لڑکا کمانے والا ہے۔ پولیس کا داروغہ ہے، خوش مزاج ہے۔ جانا بوجھا ہے، ذکیہ کو خوش رکھے گا۔ مگر... مگر... !"

اور مولانا پنجرے میں بند شیر کی طرح ٹہلنے لگے۔ ان کی نظریں اپنے غصہ کا شکار ڈھونڈ رہی تھیں۔ کوئی ایسی چیز جسے توڑ پھوڑ چیر پھاڑ کر جلاکر وہ اپنے دل کا بخار نکال سکیں۔ اور ان کی نظر ان چیزوں پر جا کر رکی جو اظہر نے اپنی زندگی سے مایوس ہونے پر ذکیہ کی یادگار کے طور پر ان کے پاس بھیج دی تھیں۔ کاٹھ کا صندوق جہیز میں دی ہوئی وظائف کی کتابیں اور جزدان میں لپٹا ہوا قرآن۔ جب سے یہ چیزیں آئی تھیں مولانا نے انھیں کھول کر نہ دیکھا تھا کہ ان میں کیا رکھا ہے۔ وہ تیز تیز قدم رکھتے ہوئے ان چیزوں کے قریب گئے اور انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے قرآن اٹھا کر بستر پر رکھا۔ پھر انھوں نے اوراد و وظائف کی کتابیں اٹھا کر ایک ایک کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک کتاب کے آخر میں چند صفحے سادے لگے تھے۔ ان پر ذکیہ کے ہاتھ کی تحریر دکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ مولانا نے تکلیف سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ان کی سوکھی انگلیاں مڑے ہوئے کاغذ کے کونے اسی طرح درست کرتی رہیں جس طرح ماں سوتے ہوئے بچے کی زلفیں سنوارتی ہے اور خود ان کا جسم اس طرح ہلتا رہا جیسے وہ پالنے میں کسی کو جھولا جھلا رہے ہیں۔ پھر انھوں نے سینے میں کھٹکتی ایک سانس لیکر آنکھیں کھولیں اور وہ ذکیہ کی تحریریں پڑھنے لگے۔

"میرے نکاح کو آج تیسرا دن ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو جسمانی اذیت پہنچانے میں اپنے کو خوشی کیسے محسوس ہوتی ہے اور لوگ اس تقریب کو شادی کیوں کہتے ہیں؟"

"میرے سرتاج نوکری پر گئے۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا انھیں کیا پسند ہے، کیا ناپسند۔ میں پہلے ہی دن سے برابر دعا کر رہی ہوں کہ خدا مجھے انھیں کی پسند کا بنا دے! خواہ اس میں مجھے کتنی ہی اذیت پہنچے!"

"لوگ ساس نندوں کو برا کہتے ہیں۔ میری ساس نندیں تو مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی وہ مجھ ہی سے لینا چاہتی ہیں۔"

"ابا جان کو آج کل کھانا کون کھلاتا ہو گا؟ کلو شام ہی کو چلی جاتی ہو گی اور وہ کھاتے ہیں رات گئے۔ انھیں گرم روٹیاں کیسے ملتی ہوں گی؟ کچھ نہیں انھیں چاہئے کہ وہ اپنا دوسرا نکاح کر لیں۔ بیٹی نہ ہو تو بیوی ضرور ہونا چاہئے!"

مولانا نے رک کر ایک لمبی سانس کھینچ لی۔ وہ تھوڑی دیر فضا میں گھورتے رہے۔ پھر انھوں نے ڈائری کے کئی ورق سرسری نظر ڈال کر پلٹ دئے۔ شروع شروع میں دو دو چار چار جملوں میں بات کہہ دی جاتی تھی۔ اب پورے پورے صفحے رنگے جانے لگے۔ گویا ابتدا میں زندگی کے کنارے پر پیراکی کی مشق کی جاتی تھی۔ پیرنے والی دو چار ہاتھ مارتی اور تھک کر پلٹ آتی۔ مگر اب وہ زندگی کی گنگا میں بھرپور اتر گئی تھی۔ دھارے کے خلاف بہت دور تک پیرتی ہوئی جاتی مگر ہمت کے بازو شل نہ ہوتے!

مولانا کی نظر دفعتہً ٹھٹھکی۔ اس نے لکھا تھا۔

"رحیمن کو اور مجھے چچا جان نھانے پہ پہنچا گئے۔ میرے سرتاج نے ہماری بالکل اسی طرح پذیرائی کی جس طرح کوئی امیر کسی بڑی دعوت میں پلاؤ قورمہ کھانے کے بعد کسی غریب عزیز کے ہاں سے کھنڈی پوریوں کا حصہ آتا رہتا ہے۔ واپس بھی نہیں کی جاتی ہیں، کھائی بھی نہیں جاتی ہیں۔ بس کسی چھینکے پر ڈال دی جاتی ہیں کہ پڑی سوکھیں!

عمو جان چند گھنٹے بعد چلے گئے۔ وہ بھلا بھتیجی کی سسرال میں کیسے ٹک سکتے تھے۔ اُن کو میری خوشی سے زیادہ اپنے دیہات کے رواج کا خیال تھا۔ اب یہ جو چچا جان کو اسٹیشن بھیجنے گئے تو دس بجے رات تک پلٹنے نہ جانے کون سا کام نکل آیا۔ رحیمن سفر کے تکان سے چور تھی۔ میں نے اسے کھلا پلا کر سلا دیا۔ مگر خود انگیٹھیوں پہ پتیلیاں رکھے بیٹھی رہی۔ جب ساڑھے دس بجے اندر آئے تو مجھے پتیلیوں کے پاس اکیلے بیٹھے دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ میں نے گرم گرم کھانا سامنے رکھا تو پوچھا "تم نے کھایا؟"

میں نے کہا "میں آپ کے پہلے کیسے کھا لیتی؟"

جواب میں انھوں نے عجیب بات کہی، میں خاک نہ سمجھی۔ وہ بولے "اچھا یہ رنگ ہیں! یہ رنگ!"

رحیمن دین و ایمان کی باتوں سے بہت کم واقف ہے۔ آج مجھے اسے ٹوک کر کئی باتیں بتانا پڑیں۔ باہر کچھ شور سا ہو رہا تھا، وہ جھٹ باورچی خانہ سے نکل دروازہ کھول کر جھانکنے لگی۔ میں نے کہا "رحیمن باہر نہ جھانکو۔ جھانکنے تاکنے کو برا کہا گیا ہے۔" وہ بولی "بٹیا تم نے تو آنکھیں ہوتے انھیں بند کر رکھا ہے۔ اب کیا میں بھی تمھاری جیسی ہو جاؤں، کچھ نہ دیکھوں؟"

میں نے کہا "بوا میری آنکھیں جو کچھ دیکھنے کے لئے بنی ہیں وہ میں سب دیکھتی ہوں، خود بنانے والے نے حکم دیا ہے اُن چیزوں کو مت دیکھو جو دوسرا چھپانا چاہتا ہے۔ جھانکنے والا کبھی اچھی چیز نہیں دیکھتا۔ نیکی ڈنکے کی چوٹ کی جاتی ہے، بدی ہمیشہ اوٹ میں کی جاتی ہے۔ تم جھانک کر دیکھوگی تو کبھی خوش نہ ہوگی۔!"

رحیمن میری باتیں تو پی گئی اور اس نے اپنی مشک کا دہانہ کھول دیا۔ "بی بی۔ تم نہ جھانکو نہ تاکو، نہ دیکھو نہ سنو، نہ ٹوکو نہ بولو اور میاں ہیں کہ اکٹر کر پوچھتے بھی نہیں!"

مجھے رحیمن کا یہ طعنہ بہت بُرا لگا۔ مرد اگر ہر وقت بیوی ہی کا منہ دیکھے گا تو وہ دنیا میں کام کر چکا۔ میں اُن کو اس طرح کا "بے کار" آدمی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کو دس کوس کے حلقے میں مجرموں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی، مقدموں، فوجداریوں، چوریوں۔ ڈاکوؤں میں تفتیش کرنا پڑتی۔ بارہ گھنٹے سولہ گھنٹے وردی پہنے، پیٹی کسے ڈیوٹی دینا پڑتی۔ بھلا ایسے میں وہ ہر وقت میرے پاس کہاں بیٹھے رہتے۔ اس لئے میں نے ذرا تیکھے پن سے کہا "بوا مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ جیسا ایک میاں کو ہونا چاہئے ویسے ہی وہ بھی ہیں۔ میں نے اس کے پہلے

کوئی بیاہ نہیں کیا کہ مجھے شوہر کے برتاؤ کے متعلق کوئی تجربہ ہو۔" میں یہ بھول گئی تھی کہ رحمن اس وقت تک چار نکاح کر چکی تھی اور اب چوتھا بچنے پر بھی پانچویں کی تاک میں تھی۔ میں نے سادہ دلی سے ایک حقیقت بیان کر دی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے رحمن کے مرچیں سی لگ گئیں۔ وہ تلملا کر بولی "اے ہے بھولی بی بی! اتنا تو آپ بھی جانتی ہی ہوں گی کہ بیوی کے رہتے سہتے رنڈی نہیں رکھی جاتی، جو آپ کے میاں چھمی جان کو گلے کا ہار بنائے جگہ جگہ لئے پھرتے ہیں۔"

نہ جانے وہ کیا سمجھتی تھی کہ چھمی جان کا نام لے کر وہ مجھے آپے سے باہر کر دے گی یا میں سوکن کے ذکر سے بدحواس ہو جاؤں گی، بیہوش ہو کر گر پڑوں گی۔ اس لئے کہ اس نے یہ فقرہ کہہ کر مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اس نے بڑا تیر مارا۔ میں سچ کہوں مجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔" ایک تو سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کرنا چاہیے۔ صحیح وہی چیز ہے جو اپنی آنکھ سے دیکھی جائے۔ سو نہ تم نے دیکھا، نہ میں نے......"

وہ بھوچکی ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں نے کہا" بوا اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ خدا و رسول کا حکم بھی ہے کہ اگر کسی پر تہمت دھری جائے تو اس پر یقین نہ کرو۔ پھر میں کہتی ہوں اگر یہ سچ بھی ہے تو انھوں نے چھمی جان سے نکاح کر لیا ہوگا۔ اختیار ہوتے وہ گناہ کیوں کرنے لگے!"

رحمن سر ہلاتی باورچی خانہ میں چلی گئی۔ وہاں بیٹھ کر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی "بی بی میں تم سے ہار گئی!" میں کچھ نہ سمجھی کہ میں نے اس میں ہار جیت والی بات کون سی کہی۔ میں نے وہی کہا، جو مذہب کا حکم ہے۔ خیر، مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے رحمن کو آج کچھ دین و ایمان کی باتیں بتا دیں۔

آج عجیب واقعہ ہوا کوئی گیارہ بجے رات کو دو سپاہی انھیں سنبھالے ہوئے ڈیوڑھی پر لائے۔ رحمن کو آواز دی "پردہ کرواؤ، داروغہ جی کو اندر لائیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ یا اللہ کیا بات ہوئی جو آج سپاہی ان کو اندر لا رہے ہیں۔ کہیں چوٹ کھائی، کسی بیماری سے بیہوش ہیں کیا بات ہے۔ کس سے پچھواؤں کیا کروں۔ رحمن ٹانگ پسارے خراٹے لے رہی تھی۔ اس کے سر پر کوئی ڈھول بھی پیٹتا تو اس کو خبر نہ ہوتی۔ مجبوراً خود اٹھی، برقعہ اوڑھ کر خود کنڈی کھول دی۔ وہ لوگ جب انہیں پلنگ پر لٹا کر چلے گئے تو میں نے آ کر دیکھا۔ سارے کپڑے پہنے بیہوش سے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ میں نے چاہا جھک کر ان کی اچکن کے بٹن کھول کر اسے اتار دوں تو ان کے کھلے منہ سے ایسی بو آئی کہ سر چکرانے لگا۔ میں نے سانس روک کر اچکن اتاری اور جوتا موزہ اتارا، پنڈا چھو کر دیکھا گرم نہ تھا۔ دل کی حرکت بھی ٹھیک تھی، ہاں نبض البتہ کچھ تیز چل رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون سی بیماری ہے پھر خود ہی خیال آیا کہ اگر کوئی خدشے، خطرے کی بات ہوتی تو سپاہی ضرور ڈاکٹر حکیم کو بلا لاتے۔ پھر بھی میں رحل پر سے اپنا قرآن اٹھا لائی، اور میں نے اس کے پاک ورقوں کی انھیں ہوا دی۔ اور تحفۃ العوام میں جتنی دعائیں بیماریوں کی لکھی ہیں وہ سب پڑھ کر ان پر دم کر ڈالیں۔ لیکن بدبو سے میرا سر پھٹنے لگا۔ میں نے سوچا ان بیچارے کی

کیا حالت ہوگی، جو اس وقت بیمار بھی ہیں۔ اس لئے میں نے ان کے سر میں بہت سا یوڈی کلون لگا دیا اور ان کے کپڑوں میں تکیوں میں۔ چادر میں پوری شیشی عطر لوٹ ڈالا۔ رات بھر میں جاگتی رہی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے برے خیالات آتے تھے۔ بار بار دل کو ڈھارس بندھاتی رہی کہ اللہ موجود ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا تھا۔ وہ جو کچھ کرے گا بہتر ہی ہوگا۔

صبح کو جب وہ اٹھے تو بڑی دیر تک انگڑائی لے لے کر جسم توڑتے رہے۔ میں نے چاہا ہاتھ پاؤں دبا دوں۔ کسل دور ہو جائے۔ مگر انھوں نے ہاتھ رکھتے ہی اسے الگ کر کے کہا "کیا درد اور بڑھانا چاہتی ہو؟" ——— میں بھوچکا سی ہو گئی۔ میری ساس نے ہر شام پنڈلیاں دبواتے وقت کہا "جیتی رہو بیٹی۔ جہاں تم ہاتھ لگاتی ہو جسم کا درد کافور ہو جاتا ہے۔" وہ اور جٹھانیاں، نندیں سب ہی تو میرے ہاتھ کی نرمی، سبکی اور صفائی کی تعریفیں کرتی ہیں۔ مگر ان سب کی پسند بیکار۔ جس کی خدمت کیلئے یہ ہاتھ بنے ہیں ان کو تو نہیں بھاتے۔ ان کے جسم کا درد تو ان سے بڑھتا ہے! مگر قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں وہ اٹھ کر باہر چل دئیے۔

جاتے وقت جب وہ رحمین کے پاس سے گزرے تو اس نے ان کی طرف گھور کر کہا "دولھا میاں شرم تو نہیں آتی!" اور انھوں نے اس کی بدتمیزی پر نہ اسے ڈانٹا، نہ پھٹکارا بلکہ سر اور نہوڑا لیا۔ میرا جی چاہا میں رحمین سے پوچھوں یہ کا ہے کی شرم دلائی جا رہی ہے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! خود تو رات بھر پڑی سوتی رہیں۔ ان کے دشمنوں کی کیسی تو حالت تھی، کیسے بے سدھ پڑے رہے، نہ دین کی خبر نہ دنیا کی اور اس وقت اپنی بے پروائی پر شرمانے کی جگہ ان کو شرم دلانے لگیں۔ لیکن فوراً خیال آیا، ہوگا ان دونوں کے درمیان کوئی معاملہ نہیں تو وہ یوں چپ سادھے کیوں چلے جاتے۔ اس لئے میں نے زبان روک لی۔ مجھے کسی کے بیچ میں بولنے کا کیا حق تھا؟"

آج دیوالی کی رات ہے۔ شام سے چاروں طرف مکانوں پر دئیے جل رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تھانے پر بھی چراغاں ہے۔ مردانے میں بہت سے لوگ آئے ہیں، سنتی ہوں کہ آس پاس کے بڑے بڑے زمیندار بھی اکٹھا ہیں۔ آج بڑے کھیل تماشے ہوں گے۔

مجھے صبح ہی حکم ملا تھا۔ آج دعوت کے کھانے پکیں گے۔ میں نے رحمین کے ساتھ مل کر کوئی بیسیوں طرح کی چیزیں تیار کر دی ہیں۔ مرغ مسلم، شامی کباب، گولے سیخ، پلاؤ، زردہ، قورمہ، قلیا، مچھلی کا قورمہ، مچھلی کے کباب، تلی ہوئی روٹیاں، پوریاں، پراٹھے، باقرخانی، بادام کا حلوہ، پستے کی لوزینہ، شاہی ٹکڑے، شکرقند کی کھیر، ترکاریوں میں آلو گوبھی، بھنڈی، شلجم، ٹماٹر، پول جو اس دیہات میں مل سکا ہے یا شہر سے آسکا ہے، سب کچھ پکا ڈالا ہے۔ کیا معلوم کہ ان کے دوستوں کو کیا پسند ہے۔ اب فکر ہے تو یہی کہ ان تمام نعمتوں میں ان کو بھی کوئی چیز پسند آتی ہے یا نہیں۔ ابا جان کو میری پکائی ہوئی دال روٹی میں بھی مزہ آتا تھا، خدا مجھے سوارت کرے اور وہ بھی ایک آدھ چیزیں چٹخارے لے لے کر کھائیں!

میں یہ لکھ رہی تھی کہ رحیمن چیخی ۔ میں دوڑی کہ کیا آفت آئی ۔ وہ صحن میں کھڑی کوس رہی تھی "موؤں کا ہیاؤ تو دیکھو ۔ پولیس والوں کا تھانہ ہے، سیکڑوں آدمی باہر کا بھی موجود ہے، رات کے ابھی گیارہ بجے ہیں اور ابھی سے لگے ڈھیلے پھینکنے ۔
میں نے کہا "کون ڈھیلا پھینک رہا ہے؟"
وہ بولی "چور!"
مجھے ہنسی آگئی ۔ اس بڑھیا کی بھی کیسی مت ماری گئی ہے ۔ بھلا ہمارے ہاں تھانے میں چوروں کا کیا گزر؟ مانا کہ میں جس مکان میں رہتی ہوں اس کے پیچھے کھیت ہی کھیت ہیں اور ادھر کی دیوار بھی کچی اور نیچی ہے مگر سب جانتے ہیں کہ یہ مکان تھانے ہی کا حصہ ہے اور وہاں چور پکڑنے والے رہتے ہیں، چوری کرانے والے نہیں رہتے ۔ بھلا کیسے چور کی ہمت پڑ سکتی ہے کہ ڈھیلے پھینکے یا ہمارے ہاں سیند لگائے ۔ مگر رحیمن کا اصرار ہے کہ ڈھیلے چوروں ہی نے پھینکے ہیں ۔
اس نے کہا "ارے بی بی، تم کیا جانو، دیوالی میں چور بھی اپنے اپنے دیوتا جگاتے ہیں ۔ اگر آج کی رات وہ چوری کرنے کامیاب ہو جائیں تو پھر سال بھر جس جس کو چاہیں موس لیں، کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا ۔"
مجھے یقین نہیں آتا کہ چور بھی دیوی دیوتا کو مانتا ہوگا ۔ اگر اسے ان پر یقین ہوتا تو وہ چوری ہی کیوں کرتا ۔ ارے جس نے پیدا کیا ہے وہ تو ہر جگہ ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے ۔ پھر اس سے کوئی چھپ کر کہاں چوری کرے گا ۔ اور چوری کر کے جائے گا کہاں؟ کسی اور نے کوئی جگہ بنا رکھی ہے جہاں اسے پناہ ملے گی؟ میں جب ان باتوں کو سوچتی ہوں تو مجھے ہنسی آجاتی ہے ۔ دنیا کے چونڈے پک گئے مگر اس میں رہنے بسنے والے اب بھی بچے ہی ہیں اور بچوں ہی جیسی حرکتیں کرتے ہیں ۔

ان کی بھی عجیب باتیں ہوتی ہیں جیسے میں ان سے بھی اپنے روپے پیسے، گہنے پاتے عزیز رکھتی ہوں ۔ جو کچھ ہے وہ انھیں کا تو ہے ۔ میرے بکس میں رکھے ہونے سے کیا ہوتا ہے ۔ جب میں ان کی میری جان ان کی، میرا رویاں رویاں ان کا تو پھر میری چیزیں میری کیسے رہ سکتی ہیں ۔ سب کچھ ان کا ہے ۔ لیکن بعض وقت ایسا تکلف برتتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انھیں شک ہے کہ میں یا میری چیزیں بالکل ان کی نہیں ہیں ۔
رات ہی کی باتیں دیکھئے ۔ ایک مرتبہ تو سو روپے خود مانگ کر لے گئے ۔ دوسری بار گہنوں کا صندوقچہ مجھ سے چھپا کر جو لے جانے لگے تو ایسے گھبرائے کہ گر پڑے ۔ مجھے اب بھی ان کی حرکت پر ہنسی آتی ہے ۔ ہوا یہ کہ رات کوئی گیارہ بجے جب سب لوگ کھانا دانا کھا چکے تو وہ باہر ہی اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے رہے ۔ میں نے عشاء نوافل کے ساتھ پڑھی اور سو رہی ۔ کوئی تین بجے ہوں گے کہ وہ دبے پاؤں اندر آئے ۔ مگر میں آہٹ سے جاگ گئی ۔ ان کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ سی تھی ۔ میں نے

پوچھا کیا بات ہے؟ کوئی جواب نہ دیا بلکہ میرے پلنگ کی پٹی پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں اٹھنے لگی تو بولے "نہیں تم لیٹی رہو۔"

پھر خود ہی میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولے "تمہارے پاس کچھ روپے ہیں؟"

میں نے کہا "ہیں، کیوں نہیں؟"

بولے "کتنے؟"

میں نے کہا "پورے ایک سو!"

کہنے لگے "کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "بکس میں ہیں نکال دوں؟"

بولے "نہیں، کنجی دے دو، میں نکال لوں گا۔"

میں نے سرہانے سے کنجی اٹھا کر دے دی۔ انھوں نے بکس کھولا، روپئے نکالے اور کنجی لئے ہوئے چلے گئے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھے اس وقت کیسی خوشی ہوئی۔ ابا جان نے جو ہاتھ روک کر خرچ کرنے کا سلیقہ سکھایا تھا اور کچھ نہ کچھ بچا کر رکھ چھوڑنے کی تاکید کی تھی وہ کیسے موقع پر کام آئی۔ میں نے یہاں آنے کے بعد گھر کے خرچ سے دس دس پندرہ پندرہ روپیہ مہینہ کر کے جو بچایا تھا وہ آج اُن کے کام آیا۔ ان کو دے کر انھیں خوش کیا۔ اس سے بہتر میری اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا، صبح اٹھتے ہی دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنا طے کیا اور میں سو رہی۔

ایک گھنٹہ بعد پھر آہٹ سے آنکھ کھل گئی، مرغ بول رہے تھے، جھٹ پٹے سے پہلے کا دھندلکا تھا ان کا چہرہ اچھی طرح سے دکھائی نہ دیتا تھا، مجھ پر بھی نیند کی کسل تھی، بولا نہ گیا، میں چپکی لیٹی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اس کمرے کی طرف گئے جہاں گہنوں کا صندوقچہ تھا۔ اور اُسے اٹھا کر میرے پلنگ کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے چلے، مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ہنسی کی بات ہی تھی۔ چھ فٹ کا مردوا، جب اپنے ہی گھر میں بلی کی چال چلے اور اپنی ہی چیز لے جانے میں اس طرح کی حرکت کرے کہ معلوم ہو کہ کسی کی چوری کر رہا ہے تو ہنسی آئے یا نہ آئے۔ لیکن میری ہنسی بے موقع ثابت ہوئی۔ وہ ایسا گھبرائے کہ سامنے ہی رکھی ہوئی میز انھیں نہ دکھائی دی۔ وہ اس کے پائے سے الجھے اور صندوقچہ سمیت فرش پر گر پڑے۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میری بے ساختہ ہنسی سے ان کے چوٹ لگی۔ لیکن جب تک میں یہ کہتی پلنگ سے اٹھوں اُٹھوں کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی، وہ جلدی سے صندوقچہ اٹھا کر باہر بھاگ گئے!

میں بڑی دیر تک اُن کے اس بھاگنے پر ہنستی رہی۔ اس بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا کوئی شخص اپنی ہی چیز چرا سکتا ہے؟

آج مجھے یقین ہو گیا کہ رحمین جو ان کو طرح طرح سے بدنام کرتی ہے وہ سراسر جھوٹ اور غلط ہے۔ وہ واقعی بڑے سیدھے سادے شریف انسان ہیں۔ کوئی بدطینت آدمی اپنے کئے پر پچھتاتا نہیں۔ پھر کوئی کتنا ہی

بڑا قصور کرے۔ اگر اس نے توبہ کرلی تو پھر تو وہ اتنا ہی گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے، جتنا کہ دودھ پیتا گود کا بچہ۔

آج ہی کی بات کو لے لیجئے۔ صبح جو وہ گہنوں کا صندوقچہ لے کر بھاگے تو دس بجے دن تک گھر میں نہ آئے۔ باہر کی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے رات کے ساتھی ایک ایک کر کے چلے گئے مگر وہ پھر بھی اندر نہ آئے۔ میں نے سمجھا کسی کام میں ہوں گے۔ رحیمن سے کہا "پچھوالو، ناشتہ باہر ہی بھیج دیا جائے یا اندر آکر کریں گے۔" مگر وہ تو سیدھی بات کرنا جانتی ہی نہیں۔ اپنے مالک کو بھی ڈانٹنے اور نصیحت کرنے کا اپنے کو حقدار سمجھتی ہے۔ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور ڈیوڑھی پر جاکر اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ شاید وہ اکیلے ہی تھے۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے ڈانٹا۔ "واہ دولہ میاں واہ! آپ یہاں اکیلے بیٹھے مکھی مار رہے ہیں اور وہاں بٹیا ناشتہ لئے بیٹھی ہیں!"

مجھے رحیمن کا یہ انداز بہت برا لگا۔ وہ نوکرانی تھی۔ اور وہ اس کے آقا میں بیوی تھی اور وہ میرے سرتاج۔ ہمارا تو کام ہی تھا کہ ہم ان کی خوشی دیکھیں۔ ان کی فرصت کا انتظار کریں۔ یہی ہماری عبادت ہے، یہی ہماری جنت! مگر قبل اس کے کہ میں رحیمن کو ٹوکوں وہ خود ہی سر جھکائے اندر چلے آئے۔ ان کی چال اتنی سست تھی کہ جان پڑتا تھا کوسوں کا چکر لگا کر آرہے ہیں۔ میں نے لوٹے، منجن، صابون، بیسن کی طرف اشارہ کیا۔ "ذرا منہ ہاتھ دھو لیجئے، رات بھر جاگے ہیں۔ کچھ کھا کر آرام کیجئے۔"

مگر وہ کچھ بولے نہیں۔ مجھے بڑی حسرت سے دیکھا اور اپنے پلنگ پر جاکر گر پڑے۔ میں گھبرا کر جلدی سے پاس پہنچی۔ انھوں نے کروٹ لیکر منہ پھیر لیا۔ میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ ہو نہ ہو، مجھ سے کسی بات پر ناراض ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پنڈلی دبانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ انھوں نے ٹانگیں کھینچ لیں اور مجھے زبردستی پلنگ پر بٹھا کر میری گود میں سر رکھ کر بولے "میں تمہارا قصوروار ہوں میں نے تمہارے سارے گہنے کھو دئے! مجھے سچے دل سے معاف کر دو!!"

مجھے ہنسی آگئی، میرا مرد بھی کتنا بھولا ہے، جیسے وہ گہنے میرے ہی تو تھے! انہوں نے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ میں نے زبردستی متین بن کر کہا "وہ گہنے پہنتی میں ضرور تھی، مگر تھے وہ آپ ہی کے اگر آپ نے انھیں کسی کو دے دیا تو آپ کی خوشی۔ میں آپ کے سر عزیز کی قسم کھاتی ہوں میں اس حالت میں بھی اتنی ہی خوش ہوں جتنی کہ پہلے تھی!"

میرے اس کہنے پر بھی ان کے چہرے پر افسردگی کے آثار موجود پائے بلکہ اب ان میں شرمندگی کی جھلک بھی تھی۔ میں سوچنے لگی میں کون سی بات ایسی کہوں یا کروں جس سے ان کے چہرے پر رنج کی جگہ خوشی کی لہر دوڑنے لگے۔ انھوں نے جو معافی کی لفظ استعمال کی تھی اس نے مجھے ایک ایسی بات یاد دلادی جس کی ہر مرد کو اپنی بیوی کی طرف سے فکر ہوتی ہے اور جس کے متعلق میں پہلے ہی دن سے دل میں ٹھانے بیٹھی تھی کہ میں اُن سے ضرور کہوں گی۔ آج تک کہنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ آج ان کو اس طرح اپنی گود میں سر رکھے دیکھ کر وہ بات یاد آگئی۔ میں نے ان کے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا،

"میں نے سچے دل سے اپنا ہر آپ کو معاف کیا !"

اس طرح اچھل پڑے جیسے میری بات ان کے دل پر گھونسا بن کر لگی۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ہنسے رکے بولے "زکو، مولانا جو تمہیں کہتے ہیں اس کا مجھے بھی آج یقین آگیا۔ تم واقعی جنتی حور ہو!" اور وہ میری گود میں منہ چھپا کر سسکنے لگے۔ !

رحیمن کہتی ہے تم نے اب میاں پر جادو کر دیا ہے اور کھمی جان نے تر پر۔ پہلے الزام کی وجہ وہ یہ بتاتی ہے کہ دیوالی کے دن والی شفتنگو کے بعد ہی کھمی جان نکال دی گئیں۔ باہر کا بیٹھنا آدھی آدھی رات تک گھومنا ترک کر دیا گیا۔ اب جب بھی سرکاری کاموں سے فرصت ملتی ہے وہ میرے ہی پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مجھے اس اس طرح گھورتے ہیں کہ مجھے ہنسی آجاتی ہے، کبھی میں شرم سے پسینے پسینے ہو جاتی ہوں۔ سچ مچ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے آنکھوں کے ذریعے کھا جانا چاہتے ہیں، سینے میں رکھ لینا چاہتے ہیں۔ خود کہتے ہیں میں اندھا تھا اب آنکھیں کھلی ہیں۔ تمہیں نے ان نینوں میں نور ڈالا ہے، تمہیں سے آنکھیں لڑانا ہوں تمہارے ہی حسن سے آنکھیں سینکتا ہوں، تمہیں کو دیکھ کر آنکھوں میں روشنی بڑھتی ہے، جی ہی نہیں بھرتا ! . نہ جانے اور کیا کیا کہتے ہیں۔ مجھ کو ان کی چلتی ہوئی زبان روکنے کے لئے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دینا پڑتا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اللہ سب کو ایسا ہی چاہنے والا میاں دے !

دوسرے الزام کی وجہ رحیمن یہ بتاتی ہے کہ کھمی جان کے جانے کے ساتویں دن میرے ہاں استقاط ہوا اور اس وقت سے جو طبیعت بگڑی ہے تو سنبھلنے ہی کو نہیں آتی۔ گاؤں کی چمارن نے خوب خوب پیٹ ملا شہر سے دائی بھی آئی اور ہفتوں رہا کی اور اپنی ساری ترکیبیں کر کے ہار کر چلی گئی۔ حکیم، وید، ڈاکٹر سب ہی آگئے مگر نہ کھانسی جاتی ہے، نہ حرارت۔ کل ڈاکٹرنی آئی تھی۔ کہتی تھی تم کونسوانی خرابی سے دق ہو گئی ہے بھوالی جانا پڑے گا۔ میں نے کہہ دیا میں نہ جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے موت مقررہ وقت پر آئیگی نہ ایک لمحہ بعد نہ ایک لمحہ پہلے۔ پھر میں اس کے قدم کیوں چھوڑوں جس کی وجہ سے زندگی جنت ہے ! مرنے کے بعد وہ ملنے کی نہیں۔ میری جیسی گنہگاروں کا وہاں کیا گزر۔ پھر میں آدھی چھوڑ کر ساری کے پیچھے کیوں دوڑوں ؟

ہاں، ایک سوہان روح ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ موئی بیماری ایک سے دوسرے کو ہو جاتی ہے میں لاکھ چاہتی ہوں وہ مجھ سے الگ رہیں۔ اپنے کھانے کے برتن، گلاس، کٹورا، چا کی پیالی، بستر، تولیہ ہر چیز الگ کر لی ہے۔ رحیمن پر تاکید رکھتی ہوں کہ میری استعمال کی ہوئی چیزیں اُن کے پاس نہ پہنچنے پائیں۔ لیکن وہ ہیں کہ ہر وقت لڑی رہتے ہیں۔ میری ہر چیز اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ جیسے مجھے کوئی بیماری ہی نہیں۔ اندر آئیں گے تو جھٹ میرے پلنگ پر بیٹھ جائیں گے رات کو سوئیں گے تو مجھے گودی میں لے کر سوئیں گے۔ کھانستے کھانستے اٹھ جاؤں گی تو برابر پیٹھ سہلائیں گے۔ تولیہ سے منہ پونچھتے رہینگے اور کھانسی رکے گی تو منہ چوم لیں گے !

بس خدا سے ہر وقت دعا ہے کہ وہ ہر طرح کی بیماری آزاری سے محفوظ رہیں۔ اے میرے اللہ! اپنی گنہگار بندی کی اتنی سی بات سُن لے!"

مولانا کے آنسوؤں نے اُن کا پڑھنا بند کر دیا۔ اور اب پڑھنا ہی کیا تھا۔ مصنف نے کتاب کی آخری سطریں لکھ دی تھیں۔ اور آج اظہر نے مرکزیت بالخیر کا فقرہ بھی بڑھا دیا تھا! ....

ساحل پر کھیلنے والے دونوں پریمی آج دریا پار کر چکے تھے! زندگی کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے سرچشمے میں جا کر مل گئے تھے۔ اور ذکیہ کے دل کی تہ سے نکلی ہوئی دعا کیوں قبول نہ ہوئی اس کا مولانا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مولانا کو ایسا محسوس ہوا جیسے ذکیہ اپنے دلنشیں انداز میں ان سے کہہ رہی ہے "ابا جان، ابا جان! ملاقات کی بھوکی روح اپنے ہمدم کو پاس بلا لینے میں کامیاب ہوئی۔ ہم جدائی کے زخم کو ناسور میں بدلنا نہ چاہتے تھے۔ ہماری جنت ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہنے میں ہے: .... اور ابا جان جسے میں اچھا سمجھتی تھی اسے آپ برا سمجھنے والے کون؟ اور جسے آپ نے گناہ کرتے نہیں دیکھا، اس کے گناہ گار ہونے کا آپ کو یقین کیسے؟

اور مولانا اجتبیٰ کو خیال آیا اظہر کی لاش مسجد کے سامنے اب بھی رکھی ہے اور لوگ منتظر کھڑے ہیں کہ امام آ لے تو نماز پڑھی جائے۔ اور وہ لپکتے ہانپتے کانپتے گھر سے نکلے اور صفوں کے آگے کھڑے ہو کر انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر گواہی دی۔

"سب کے بخشنے والے! ہم اس میت کے بارے میں سوائے نیکی اور بھلائی کے کچھ نہیں جانتے!"

ممتاز افسانہ نگار

یوں تو اُردو زبان نے بڑے بڑے افسانہ نگار پیدا کیے، لیکن جناب علی عباس حسینی صاحب اردو کے ایک ایسے مقتدر اور ممتاز افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی روشن آپ بنائی اور اُردو افسانہ نگاری میں ایک نئے طرز کا اضافہ کیا ہے۔ حسینی صاحب صاحبِ علم اور بلند نظر انسان ہیں اور درحقیقت خود ان کے افسانوں سے نمایاں ہوتی ہے۔ ان کو عوام سے وابستگی اور ہمدردی ہے اس لئے ان کے افسانوں میں عوامی زندگی کی بھی جھلک ملتی ہے۔ حسینی صاحب اپنے افسانوں کے ذریعہ صرف اردو زبان و ادب کی خدمت نہیں بلکہ قوم و وطن کی خدمت بھی بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ سادگی اور سنجیدگی ان کے افسانوں کی خاص صفت ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بعض افسانے بلند ہوں اور بعض ہلکے اور پھیکے —— درحقیقت ان کا ہر افسانہ ایک نئی جدت کا حامل ہوتا ہے۔ ان کے افسانے نہ محض دلچسپ ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی افادی حیثیت بھی ہوتی ہے۔

"صبح نو" کا "علی عباس حسینی نمبر" نکال کر آپ اُردو کے اس عظیم المرتبت خادم کو اس کا صحیح اور جائز مقام دے رہے ہیں۔ جو اس کا حق ہے اس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

صحیح تو یہ ہے کہ اُردو کی تاریخ "علی عباس حسینی" کو فراموش نہیں کر سکتی

عبد القیوم انصاری
(وزیر صحت اور جیل حکومت بہار)
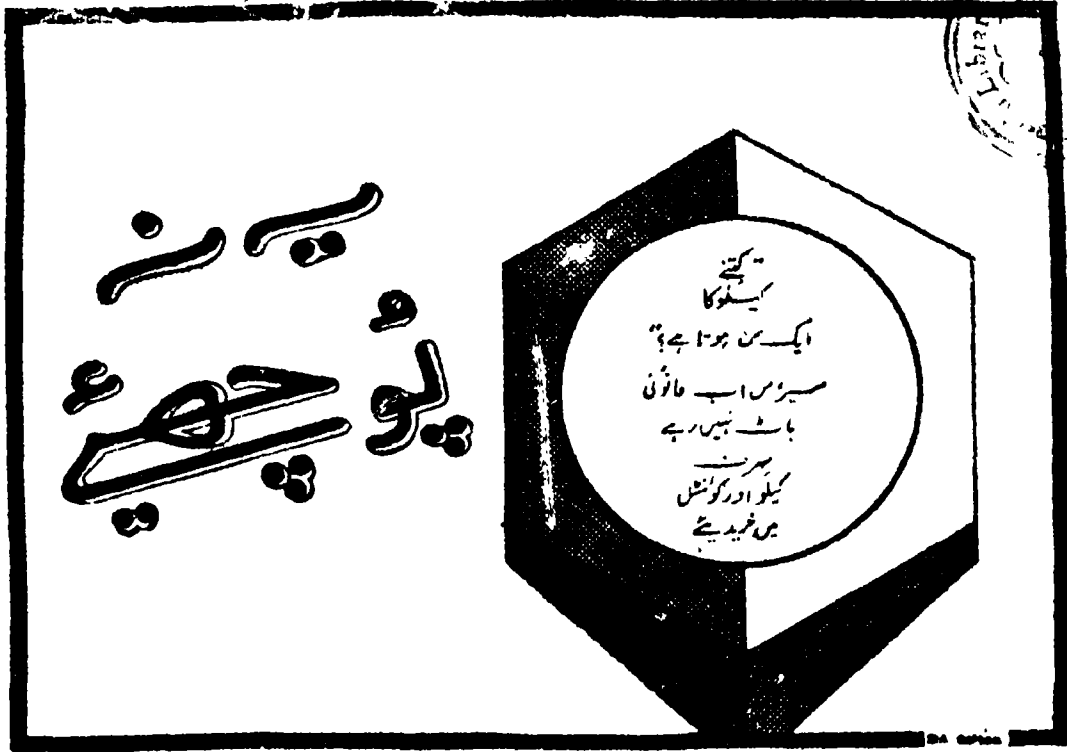
مت پوچھئے

کتنے
کیلو کا
ایک من ہوتا ہے؟
سیر، من اب مانی
باٹ نہیں رہے
صرف
کیلو اور کوئنٹل
میں خریدیے

سردار اوپٹیکل کمپنی

(چودھری مارکٹ۔ پٹنہ ۴)

• بی۔ این۔ کالج کے سامنے •

تشریف لایئے

۱۹۶۵ء کے نئے اور خوبصورت ڈیزائن کے ٹھنڈے چشمے، فریم اور دوسرے سامان، عورتوں، مردوں اور بچوں ہر ایک کی پسند کے مطابق

خوبصورت فٹنگ • پائیدار حسن • مناسب قیمت

مکمل اطمینان اور مستعد خدمت کے لئے

آزمائش شرط ہے

تھوک اور خردہ فروشی اور نسخہ کے مطابق عینک سازی کیلئے مشہور

SARDAR OPTICAL COMPANY

Specialist in Prescription Work

WHOLESALE AND RETAIL OPTICIANS

3, Chowdhary Market

OPP. B.N College Patna-4

TRIAL SOLICITED

تین سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا
سیاسی، ادبی اور ثقافتی ہفتہ وار ـــــ!

ہفتہ وار **مورچہ** گیا

قیمت	قیمت
فی شمارہ: ۱۵ پیسے	سالانہ: آٹھ روپے

پتہ: ہفتہ وار مورچہ ۔ بیراگی ۔ گیا

فون نمبر ۴۴۳

کلام حیدری

معین شاہد

12876
19.10.92

سرخ نشان

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو آپ سمجھ لیں کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اور یہ سمجھ لینے کے بعد آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنا سالانہ چندہ فوراً بذریعہ منی آڈر ارسال فرمائیں ......اور

اگر کسی وجہ سے آپ فوراً زرسالانہ بھیجنے سے معذور ہیں یا آئندہ صبح نو کی خریداری جاری رکھنا نہیں چاہتے ہیں تو صرف چھ پیسے کا ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع کردیں۔۔

اگر آپ نے خاموشی سے کام لیا تو آئندہ ماہ کا شمارہ بذریعہ وی پی ارسال ہوگا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی اور قومی فریضہ ہوگا
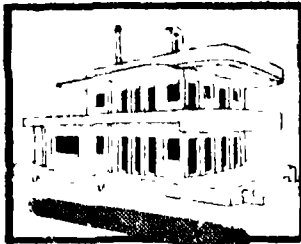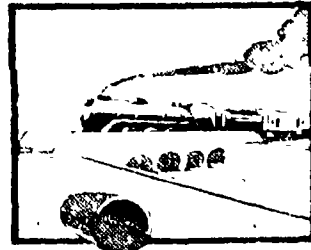
Printed at :— Label Litho Press, Ramna Road, Patna-4